

بانگِ درا

شارح: اسرار زیدی

تشریح الفاظ: نثار اکبر آبادی





- شارح: جناب اسرار زیدی
 تشریح الفاظ: جناب ثارا کبر آباد
 356-1 باگ درہ
 584-357 بال جبریل
 818-585 ضرب کلیم
 909-819 ارمغان حجاز

محمد ابو بکر صدیق نے یہ کلیات اقبالؒ (ندیم یونس پرنٹرز لاہور)

چھپوا کر شیخ محمد بشیر اینڈ سنز لاہور سے شائع کی

فہرست

شمار	نظم	صفحہ
60	پہام صبح	26
61	عشق اور موت	27
63	زہد اور رندی	28
65	شاعر	29
65	دل	30
68	سوج دریا	31
69	رخصت اے بزم جہاں	32
71	طفل شیرخوار	33
73	تصویر درد	34
80	نالہ فراق	35
82	چاند	36
84	بلال	37
86	سرگزشت آدم	38
88	ترانہ ہندی	39
89	جگنو	40
92	صبح کا ستارہ	41
93	ہندوستانی بچوں کا قوی گیت	42
95	نیا سوال	43
99	داغ	44
100	ابر	45
101	ایک پرندہ اور جگنو	46
103	بچہ اور شمع	47
105	کنار راوی	48
	التجائے مسافر	49
	غزلیات	50
	حصہ دوم	
	1- ہمالہ	14
	2- گل رتنیں	18
	3- عمد طفلی	19
	4- مرزا غالب	20
	5- ایر کوہسار	23
	6- ایک ککڑا اور کھی	25
	7- ایک پہاڑ اور گھری	27
	8- ایک گائے اور بکری	29
	9- بچے کی دعا	31
	10- ہمدردی	32
	11- ماں کا خواب	33
	12- پرندے کی فریاد	34
	13- خندگان خاک سے استفسار	35
	14- شمع دپردانہ	37
	15- عقل و دل	38
	16- صدائے درد	40
	17- آفتاب (ترجمہ گاہنوی)	42
	18- شمع	44
	19- ایک آرزو	48
	20- آفتاب صبح	50
	21- درد عشق	53
	22- گل پشمرہ	54
	23- سید کی لوح تربت	55
	24- ماہ نو	57
	25- انسان اور بزم قدرت	58
161	(1905ء سے 1908ء تک)	

176	78- دوستارے	129	51- محبت
179	79- گورستان شای	131	52- حقیقت حسن
185	80- نمود صبح	132	53- پیام
186	81- تقصیرین بر شعر انسی شاملو	133	54- سوامی رام تیرتھ
187	82- فلسفہ غم	134	55- طلبہ علی گڑھ کالج کے نام
191	83- پھول کا تحفہ عطا ہونے پر	135	56- اختر صبح
192	84- ترانہ ملی	136	57- حسن و عشق
193	85- وطنیت	137	58- ... کی گود میں ملی دیکھ کر
195	86- ایک حاجی مدینے کے راستے میں	139	59- کلی
196	87- قطعہ	140	60- چاند اور تارے
197	88- شکوہ	141	61- وصال
208	89- جواب شکوہ	142	62- سلمیٰ
223	90- چاند	143	63- عاشق ہر جا کی
224	91- رات اور شاعر	146	64- کوشش نا تمام
229	92- بزم انجم	147	65- نوائے غم
228	93- سیر فلک	148	66- عشرت امروزی
229	94- نصیحت	150	67- انسان
231	95- رام	151	68- جلوہ حسن
232	96- موٹر	152	69- ایک شام
233	97- انسان	153	70- ننائی
233	98- خطاب بہ نوجوانان اسلام	153	71- پیام عشق
235	99- غزۂ شوال یا ہلالِ عمید	155	72- فراق
238	100- شمع اور شاعر	156	73- عبدالقادر کے نام
249	101- مسلم	158	74- صقلیہ
251	102- حضور رسالت ماب میں		75- غزلیات
252	103- شفا خانہ حجاز		حصہ سوم
253	104- ساقی		
254	105- تعلیم اور اس کے نتائج		
255	106- قرب سلطان		
256	107- شاعر	173	(1908ء) سے ...
257	108- نوید صبح	174	76- بلاد اسلامیہ
258	109- دعا	177	77- ستارہ

- 110- عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں 259
111- فاطمہ بنت عبد اللہ 260
112- شبنم اور ستارے 261
113- محاصرہ اور نہ 263
114- غلام قادر رحیلہ 264
115- ایک مکالمہ 266
116- میں اور تو 267
117- تقصیم بر شعر ابو طالب کلیم 267
118- شبلی و حالی 268
119- ارتقا 270
120- صدیق رحمۃ اللہ علیہ 271
121- تہذیب حاضر 272
122- والدہ مرحومہ کی یاد میں 273
123- شعاع آفتاب 283
124- عنی 284
125- ایک خط کے جواب میں 285
126- ناک 286
127- کفر و اسلام 287
128- بلال رضی اللہ عنہ 288
- 129- مسلمان اور تعلیم جدید 289
130- پھولوں کی شہزادی 290
131- تقصیم بر شعر صائب 291
132- فردوس میں ایک مکالمہ 292
133- مذہب 294
134- جنگ یرموک کا ایک واقعہ 294
135- مذہب 296
136- پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ 296
137- شب معراج 297
138- پھول 297
139- شکستہ پتھر 299
140- میں اور تو 300
141- اسیری 302
142- در یوزہ خلافت 303
143- ہمایوں 303
144- خضر راہ 304
145- طلوع اسلام 317
146- غزلیات و ظریفانہ 317

محمد ابوبکر صدیق نے یہ کلیات اقبال (ندیم یونس پر نثر لاہور)

چھپوا کر شیخ محمد بشیر اینڈ سنز لاہور سے شائع کی

سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور فون: 7660736

پیشکش: مجلس اقبال

نشر و توزیع: محمد اسلم باقر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حصہ اول

ہمالہ

001

اے ہمالہ! اے فکیل کشور ہندوستان چومتا ہے تیری پیشانی کو جبک کر آسمان
 تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشان تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیان
 ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے چشم پینا کے لیے
 تو تجلی ہے سراپا
 امتحان دیدہ ظاہر میں کوہستان ہے تو پاسباں اپنا ہے تو دیوار ہندوستان ہے تو
 مطلع اول فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو سوئے خلوت گاہ دل دامن کش انساں ہے تو
 برف نے باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر خندہ زن ہے جو کٹاہ مر عالم تاب پر
 تیری عمر رفتہ کی اک آن ہے عہد کسں وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن
 چوئیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرم سخن تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن
 چشمہ دامن ترا آئینہ سیال ہے چشمہ موج ہوا جس کے لیے رومال ہے
 ابر کے ہاتھوں میں رہوار ہوا کے واسطے آزیانہ دے دیا برق سر کوہسار نے
 اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی بنے دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے
 پائے کیا فرط طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر نل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر
 جنبش موج نسیم صبح گوارہ بنی جموعتی ہے نشہ ہستی میں ہر گل کی کلی
 یوں زبان برگ سے گویا ہے اس کی خامشی دست گلچیں کی جھلک میں نے نہیں دیکھی کبھی
 کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا کج خلوت خانہ قدرت ہے کاشانہ مرا
 آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرابی ہوئی
 آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی سنگ رہ سے گاہ پختی گاہ نگرانی ہوئی
 چھینرتی جا اس عراق دل نشیں کے ساز کو اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو
 لہلہی شب کو کھولتی ہے آکے جب زلف رسا دامن دل سمجھتی ہے آبشاروں کی صدا

وہ خوشی شام کی جس پر نظم ہو نذا وہ درختوں پر نظر کا سماں چھایا ہوا
 کانپتا پھرتا ہے کیا رنگ شفق کسار پر
 خوشنا لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر
 اے ہمالہ! داستان اس وقت کی کوئی سنا مسکن آہائے انساں جب بنا دامن ترا
 کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا داغ جس پہ غازہ رنگ تکلف کا نہ تھا
 ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو
 دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو۔



اس نظم پر بات کرنے سے قبل اس امر کی نشاندہی ناگزیر ہے کہ جس طرح ”بانگ درا“ علامہ اقبال کی شاعری کا اولین مجموعہ ہے اسی طرح ”ہمالہ“ ان کی ابتدائی نظموں میں سے ہے اور ”بانگ درا“ کی بھی پہلی نظم ہے۔ ”بانگ درا“ کی پوری شاعری کے بارے میں مختصراً اس شرح کے دیباچے میں گفتگو کی گئی ہے۔ اسی حوالے سے ہمالہ کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس میں اقبال اپنی مخصوص فکری سطح کی بجائے فطرت اور ایک پہلو سے وطنیت کے جذبے کا اظہار کرتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ دوسرے اردو شاعری کے مجموعوں اور ”بال جبریل اور ضرب کلیم“ میں اقبال نے جو فلسفیانہ اور فکری نقطہ نظر پیش کیا ہے اجتماعی سطح پر ”بانگ درا“ کی شاعری اس سے قدرے مختلف نظر آتی ہے۔ چنانچہ ”ہمالہ“ کو بھی اسی حوالے سے دیکھا جانا چاہیے۔

پہلا بند معنی: ہمالہ: برف کا گہرا (مراد پہاڑ)۔ ویرینہ روزی: بچی عمر۔ کلیم: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لقب۔ وہ کوہ طور پر خدا سے باتیں کرتے تھے۔ طور سینا: پہاڑ کا نام۔ چشم بیٹا: دیکھنے والی آنکھ۔

مطلب: جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں نشاندہی کی گئی ہے کہ اس نظم کا پورا منظر نامہ ”فطرت نگاری اور وطنیت“ کے جذبے سے ہم آہنگ ہے۔ چنانچہ اس بند میں اقبال ”کوہ ہمالہ“ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو وہ بلند و بالا پہاڑ ہے جو نہ صرف یہ کہ مملکت ہندوستان کے محافظ اور فسیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ تیری چوٹیوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ آسمان بھی جھک کر چوم رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ تیری بلندی آسمان سے بھی قوت رکھتی ہے۔

اے ہمالہ! تیرا وجود ہر چند کہ ابتدائے آفرینش سے قائم ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ تو اس شام و سحر کی گردش کے مابین اسی طرح زندہ و وابستہ ہے جس طرح کہ ابتدائے میں تھا اور لا تعداد صدیاں بیت جانے کے باوجود تجھ میں کسی کمزوری کے آثار نہیں پائے جاتے۔

اس شعر میں اقبال ”حضرت موسیٰ علیہ السلام اور کوہ طور کے جلوے کی علامتوں کے حوالے سے ہمالہ سے کہتے ہیں کہ تیرا وجود تو ان کے لیے بھی ایک خصوصی حیثیت کا حامل ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہر چشم بیٹا کے لیے تو ایک تجلی کا منظر ہے۔ مراد یہ ہے کہ تیری بلندی اور سرسبز وادیاں انسان کے لیے ایک عجوبہ کی طرح ہیں۔

دوسرا بند معنی: ویدہ: آنکھ۔ دامن کش: دامن کھینچنے والا۔ دستار فضیلت: بزرگی کی پگزی۔ کلاہ مہر عالم تاب: دنیا کو روشن کرنے والے سورج کی ٹوپی۔

مطلب: یہ درست ہے کہ اے ہمالہ تو بظاہر ایک پہاڑ ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ تو ہمارا محافظ بھی ہے اور ہندوستان کے لیے بھی ایک حفاظتی دیوار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر تجھے ایک شاعر کا دیوان تصور کر لیا جائے تو اس کا مطلع یعنی اولین شعر آسمان کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ تیرا وجود تو ہر انسان کے لیے باعث کشش ہے جس کی قیمت اسے سکون فراہم کرتی ہے۔ تیری سچ اور چوٹیوں پر جو برف پڑی رہتی ہے وہ اس سفید رنگ کی دستار فضیلت کے مانند ہے جو بزرگوں کے سروں پر احتراماً باندھی جاتی ہے۔ یہ دستار فضیلت تو سورج کی زریں کلاہ پر بھی خندہ زن نظر آتی ہے۔ اس بند میں بھی علامہ نے مناظر فطرت کی خوبصورت منظر کشی کے ساتھ بلند پایہ علامت نگاری کے حوالے سے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

کوہ ہمالہ کو کسی شاعر کے دیوان سے تشبیہ دینے کے علاوہ اس پر بربکاری کے مناظر کو کسی بزرگ کی دستار فضیلت قرار دینے کے ساتھ سورج کی زریں کلاہ پر اس دستار کا خندہ زن ہونا یقیناً خوبصورت علامت نگاری کے مظاہر میں سے ہیں۔

تیسرا بند معنی: ثریا: وہ سات ستارے جو بہت فاصلے پر ہیں 'پروین'۔ پسنائے فلک: آسمان کی وسعت۔ آئینہ سیال: بھنے والا رواں۔

مطلب: اے ہمالہ! تیری عمر رفتہ کا دور اس قدر طویل ہے کہ عہد ماضی کی شان و شوکت کا مظہر بن گیا ہے۔ تیری بلند و بالا چوٹیوں کا سایہ تیرے گرد و پیش کی وادیوں پر اس طرح پڑ رہا ہے جیسے وہاں نیچے آویزاں ہوں۔ یہی بلند و بالا چوٹیاں یوں لگتا ہے جیسے آسمان پر موجود ستاروں سے باتیں کر رہی ہوں۔ یہ درست ہے کہ تو زمین پر استلوا ہے لیکن تیری بلندی آسمان کی وسعتوں سے ہم کنار نظر آتی ہے۔ تیرے دامن میں پانی کے جو جھٹے رواں دواں ہیں وہ اس قدر شفاف ہیں جس طرح سیال آئینے ہوں۔ اور یہاں جو ہوا چلتی ہے وہ ان چشموں کے پانیوں کو مزید شفاف بناتی ہے۔

چوتھا بند معنی: رہوار ہوا: ہوا اکھوڑا۔ کوہسار: پہاڑ۔ بازی گاہ: کھیل کی جگہ۔ فیل: ہاتھی۔

مطلب: علامتیں اور استعارے اپنے کلام میں اقبال نے جس خوبی اور چابکدستی کے ساتھ استعمال کیے ہیں یہ اس کی ایک خوبصورت مثال کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اے ہمالہ! تیرے گرد و پیش اور ماحول کو دیکھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ یہاں جو ہوا رواں دواں ہے وہ ایک تیز رو گھوڑے کی مانند ہے۔ اس کی رفتار کو مزید تیز کرنے کے لیے تیری چوٹیوں پر چپکنے والی بھلیوں نے بادلوں کے ہاتھوں میں ایک تازیانہ دے دیا ہے۔ کیا ایسا تو نہیں ہے کہ تیرا دامن بھی ایک کھیل کے میدان کی طرح ہے۔ ایسا میدان جسے قدرت نے خود اپنے ہاتھوں سے بڑی صنایع کے ساتھ بنایا ہے۔ یہاں کس جوش و مسرت کے ساتھ بادل اس طرح خوب رواں دواں ہیں جیسے وہ بے زنجیر ہاتھی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پانچواں بند معنی: جنبش موج نسیم: ہوا کی لہری روانی۔ گوارہ: جھولا۔ برگ: پتا۔

مطلب: نظم کا یہ بند بھی سابقہ بند کے ساتھ موضوعاتی سطح پر مربوط ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ ایسا ماحول ہے جس موج کی ہوا کی جنبش ایک گوارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسا گوارہ جہاں کلیاں زندگی کے نشے میں جھومتی نظر آتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ کلیوں کی خامشی اپنی پتیوں کی زبان سے یوں کہتی ہو کہ میرا تو پھول توڑنے والے سے بھی کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ مراد یہ ہے کہ ہمالہ کی اس بلندی تک انسان کی رسائی

مکن نہیں۔ جہاں یہ کلیاں کھل رہی ہیں۔ اس بند کے آخری شعر میں ہمالہ زبان حال سے یوں گویا ہوتا ہے کہ میری خامشی یہی دراصل میری داستان حیات کی مظہر ہے اور قدرت کا بخشا ہوا یہ گوشہ ہی دراصل میری پرسکون آماجگاہ ہے۔

چھٹا بند معنی: فراز کوہ: پہاڑ کی بلندی۔ شاہد قدرت: معشوق۔ عراق: موسیقی کا ایک راگ۔

مطلب: اس بند میں بھی اقبال نے ایک طرح کی مظہر کشی کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمالہ کی بلندیوں سے ندی کی شکل میں جو پانی لہریں مارتا نیچے آتا ہے اس کی آواز سننے والوں کو یوں محسوس ہوتی ہے جیسے کوئی گا رہا ہو۔ ندی کا مظہر اس درجے خوبصورت ہوتا ہے کہ کوثر و تسنیم کی موجیں بھی اس سے شرابا جائیں۔ یوں لگتا ہے کہ یہ ندی مناظر فطرت کے مشاہدہ کرنے والے کو آمینہ دکھاتی ہوئی اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ اس کا انداز کچھ یوں ہوتا ہے کہ راہ میں آنے والے سنگریزوں سے کبھی بچ کر نکلنے کی کوشش کرتی ہے تو کبھی ان سے ٹکرا بھی جاتی ہے۔ اس بند کے آخری شعر میں اقبال ندی کو ایک مسافر کے طور پر تصور کر کے اس سے کہتے ہیں کہ تو اسی طرح دل بھانے والی موسیقی کے ساز کو چھیڑتی جا کہ میرا دل تیری اس صدا کی معنویت سے پوری طرح آشنا ہے۔

ساتواں بند معنی: لہلہی شب: لیلیٰ یعنی کالی رات۔ غازہ: پودہ۔

مطلب: یہاں بھی اقبال 'ہمالہ پر رات کی آمد اور تاریکی کی خوبصورت مظہر کشی کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہیں کہ جب رات کی محبوبہ اپنی لمبی لمبی زلفیں دراز کرتی ہے تو ان لمحات میں آبشاروں کی صدا میں انتہائی دلکش اور دلنواز محسوس ہوتی ہیں کہ ان لمحوں کی خامشی پر محفلگو بھی قربان کی جاسکتی ہے۔ اس لئے تو یوں لگتا ہے کہ درخت بھی کسی سوچ میں مبتلا ہیں مراد یہ ہے کہ پورا مظہر خامشی اور سکوت سے ہم کنار ہے۔

اس بند کے آخری شعر میں ہمالہ پر سرشام شفق کا مظہر پیش کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ فطرت شاید اس کے چہرے پر رنگا رنگ غازہ مل رہی ہے اور یہ غازہ بے حد خوشنما محسوس ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب شام کے وقت شفق کی سرخی ہمالہ پر پڑتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے فطرت نے اس کے چہرے پر غازہ مل دیا ہو۔

آٹھواں بند معنی: مسکن: رہنے کی جگہ۔ آبائے انساں: انسان کے باپ دادا۔

مطلب: نظم کے اس آخری بند میں اپنے کلام کو تمام کرتے ہوئے اقبال ہمالہ سے یوں مخاطب ہوتے ہیں کہ "اے ہمالہ! ذرا تجھے اس وقت کا احوال تو بتا جب ہزار ہا سال قبل باوا آدم نے یہاں آکر تیرے واسن میں پناہ لی تھی۔ ظاہر ہے کہ تو ان لمحات کا راز دان ہے۔ ان ایام کی زندگی کس قدر سیدھی سادی ہو گی جس میں کسی نوع کا تکلف نہ تھا۔ اے ہمالہ! ذرا ان دنوں کے بارے میں ہمیں واقعات و حقائق سے آگاہ کر! کہ وہ لمحات تو ہر طرح کے تکلفات سے نا آشنا تھے۔ آخری شعر میں اقبال ہمالہ کی خامشی سے مایوس ہو کر خود اپنی تعجیلی اور تصوراتی کیفیت کا سہارا لیتے ہوئے اس سے ہی فرماتے ہیں کہ ان ایام کا نقشہ تم ہی مجھ سے بیان کرو کہ یہ پہاڑ تو آخر ایک خاموش پتھری نکلا۔ جب کہ تم میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ گزرے ہوئے ماضی کو چنانچہ اس کی پوری داستان مظہر عام پر لے آؤ۔

گل رنگیں

002

تو شناسائے خراش عقدہ مشکل نہیں اے گل رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
 زیب محفل ہے شریک شورش محفل نہیں یہ فراغت بزم ہستی میں مجھے حاصل نہیں
 اس چمن میں میں سراپا سوز و ساز آرزو
 اور تیری زندگانی بے گداز آرزو
 توڑ لینا شاخ سے تجھ کو مرا آئیں نہیں یہ نظر غیر از نگاہ چشم صورت ہیں نہیں
 آدا یہ دست جو اے گل رنگیں نہیں کس طرح تجھ کو یہ سمجھاؤں کہ میں گل چیں نہیں
 کام مجھ کو دیدہ حکمت کے الجھٹلوں سے کیا
 دیدہ بلبل سے میں کرتا ہوں نظارہ ترا
 سو زبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے
 میری صورت تو بھی اک برگ ریاض طور ہے میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے
 مطمئن ہے تو پریشاں مثل بو رہتا ہوں میں
 زخمی شمشیر ذوق جستجو رہتا ہوں میں
 یہ پریشانی مری سامان جمعیت نہ ہو یہ جگر سوزی چراغ خانہ حکمت نہ ہو
 ناتوانی ہی مری سراپا قوت نہ ہو رشک جام جم مرا آئینہ حیرت نہ ہو
 یہ تلاش متصل شمع جہاں افروز ہے
 تو سن اور اک انساں کو خرام آموز ہے

*

یہ نظم بڑی حد تک نازک اور حساس کیفیات و جذبات سے ہم آہنگ ہے۔ جس میں اقبال نے ایک
 انسان اور پھول کی فطرت کا موازنہ کیا ہے۔ عملاً یہ نظم بھی ان کی ابتدائی نظموں میں سے ہے۔ تاہم
 اقبال کی اولین نظم ”ہمالہ“ سے قدرے مختلف نظر آتی ہے۔ اس میں اپنے اپنے مقام پر پھول اور انسان
 کی نفسی کیفیات کی جانب اشارے کیے گئے ہیں۔ لیکن اول و آخر جملہ مسائل کے باوجود انسان کی
 افضلیت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلا بند معنی: شناسا: واقف، جاننے والا۔ عقدہ مشکل: وہ عسفی جسے سلجھانا آسان نہ ہو۔ گل رنگیں:
 رنگین پھول۔ زیب محفل: محفل کی زینت۔ فراغت: سلت، فرمت۔ گداز: نرم، مہلنا۔

مطلب: یہاں اقبال پھول سے مخاطب ہیں اور فرماتے ہیں کہ تجھے اس حقیقت کا کیا علم کہ زندگی کے
 مسائل کون کون سے ہیں۔ اس لیے کہ یہ معاملات تو وہی جان سکتا ہے جس کے پہلو میں دل ہوا اور شاید
 یہی چیز تیرے پاس موجود نہیں ہے۔ ہر چند کہ تیرے وجود سے محفل کی زینت میں تو اضافہ ہوتا ہے تاہم
 عملی سطح پر وہاں جو ہنگامے برپا ہوتے ہیں ان میں تیری شرکت کسی طور پر بھی ممکن نہیں کہ یہی تو انسانی سطح
 پر عملی جدوجہد کا حصہ ہے جس سے تو بہر حال محروم ہے۔ تو جس انداز سے ساکن و ثابت رہتا ہے وہ

انسانی فطرت سے کسی طور پر بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ کہ انسان تو ہر لمحے زندگی کی گونا گوں مشکلات و مسائل سے دوچار رہتا ہے۔

اس بند کے آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ اے گل رنگیں! اس دنیا میں جہاں میں اور تو دونوں بود باش رکھتے ہیں وہاں میری طرح ہر انسان اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے مضطرب اور پریشانوں سے دوچار رہتا ہے جب کہ تیری زندگی میں تو سرے سے ایسی خواہش اور مقصد کا کوئی وجود ہی نہیں ہے کہ اس نوع کی خواہش اور تمنا تو صرف اہل دل کو ہی ہوتی ہے اور بس!

دوسرا بند معنی: دیدہ حکمت: تدبیر والی آنکھ۔

مطلب: اس بند میں اقبال اپنی ذات کے حوالے سے پھول کو بتاتے ہیں کہ میرا یہ دستور نہیں کہ تجھے اپنی چھوٹی موٹی خوشیوں اور ضروریات کے لیے شاخ سے جدا کر دوں کہ یہ شیوہ تو محض ظاہر پرستوں کا ہے۔ جب کہ میں تو صورت اور سیرت دونوں کے حسن کا قائل ہوں۔ میرا ہاتھ کسی سنگدل گلچس کا بھی نہیں ہے جو تحقیق اور ذاتی مقاصد کے لیے تجھے شاخ سے علیحدہ کر کے جتنی جتنی میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس میں تو اسی طرح تجھ کو پسند کرتا ہوں جیسے بلبل اپنی چاہت کا اظہار کرتی ہے۔

تیسرا بند معنی: مستور: چھپا ہوا۔

مطلب: اگر تیری پتوں کو زبانوں کے مانند سمجھ لیا جائے تو اس کی کیا وجوہات ہیں کہ تو ہمیشہ خاموش رہتا ہے۔ اس خاموشی کا سبب وہ کون سا راز ہے؟ اے پھول! جو تیرے سینے میں چھپا ہوا ہے اور جس کو تو افشا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تو بھی میری طرح بہشت کا ایک فرد ہے لیکن آدم کی طرح میری طرح تجھے بھی وہاں سے نکالا چکا ہے۔ اس کے باوجود تو اس زندگی پر مطمئن ہے۔ جب کہ میں اپنی منزل کو پانے کے لیے بدستور جدوجہد کر رہا ہوں۔

چوتھا بند معنی: جام جم: جمید کا پیالہ۔ سن: گھوڑا۔ اور اک: عقل۔

مطلب: اے پھول! تیرے برعکس میں جو ہر لمحہ پریشان و مضطرب رہتا ہوں، کہیں یہی پریشانی میرے لیے وجہ سکون نہ بن جائے۔ کہ یہ جگر سوزی اور کچھ پانے کی جدوجہد ہی انسان کی دانش و حکمت میں اضافہ کرتی ہے۔ اور کائنات کے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے کے لیے آسانی ہے۔ پھر میں جو خود کو کمزور و ناتواں سمجھ رہا ہوں شاید یہ کمزوری اور ناتوانی ہی میرے لیے قوت کا سرچشمہ بن جائے اور مجھ میں جو کچھ پانے کی جستجو ہے وہی حصول مقاصد کا ذریعہ بن جائے۔ کہ اس طرح مسلسل جستجو پورے زمانے کو روشنی عطا کرتی ہے اور یہی انسانی عقل و شعور میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔

عہد طفلی

003

تجھے دیارِ نو زمین و آسمان میرے لیے وسعتِ آغوشِ مادرِ اک جہاں میرے لیے
تمہی ہر اک جنبشِ نشانِ لطفِ جاں میرے لیے حرفِ بے مطلبِ تھی خود میری زباں میرے لیے
دورِ طفلی میں اگر کوئی رلاتا تھا مجھے

شورش زنجیر در میں لطف آتا تھا مجھے
 سکتے رہتا ہاے! وہ سپروں تلک سوئے قمر وہ پھٹے بادل میں بے آواز پا اس کا سفر
 پوچھتا رہ رہ کے اس کے کوہ و صحرا کی خبر اور وہ حیرت دروغ مصلحت آمیز پر
 آنکھ وقف دید تھی لب مائل گفتار تھا
 دل نہ تھا میرا سراپا ذوق استغفار تھا

*

صرف دو بند پر مشتمل یہ مختصر نظم عملاً ایک باشعور اور صاحب فکر و نظر شاعر کی ابتدائی داستان
 حیات کا ایک حصہ ہے۔ اس نظم کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے عہد بلوغت میں جب شاعر اپنے
 بچپن پر نظر ڈالتا ہے تو اس کے تاثرات کیا ہوتے ہیں اور وہ ان تاثرات کو کس انداز میں بیان کرتا ہے۔
 پہلا بند معنی: دیار نو: نیا شہر۔ آغوش مادر: ماں کی گود۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ اپنے ایام طفلی میں زمین اور آسمان تو میرے لیے قطعی اجنبی حیثیت کے
 حامل تھے۔ میری حقیقی پناہ گاہ تو ماں کی آغوش تھی جو فی الواقع ایک وسیع کائنات کے مانند محسوس ہوتی
 تھی۔ ہر محرک شے میرے نزدیک دلچسپی کا باعث ہوتی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ میری زبان سے بھی جو
 صدا اُٹیں برآمد ہوتی تھیں ان کا مفہوم میں خود بھی نہ سمجھ سکتا تھا۔ اگر کسی تکلیف کے سبب رونے لگتا تو
 دروازے کی زنجیر کے کھٹکھٹانے سے ہی بھل جاتا تھا۔

دوسرا بند معنی: آواز پا: پاؤں کی آہٹ۔ دروغ مصلحت آمیز: اچھا نتیجہ پیدا کرنے والا جھوٹ۔
 وقف دید: دیکھنے میں مصروف۔

مطلب: رات آتی تھی تو میں آنکھ جھپکے بغیر آسمان پر روشن چاند کو تکتا رہتا تھا۔ چاند جو بادلوں کے
 ٹکروں کے پیچھے بڑی خاموشی اور سکون کے ساتھ اپنا سفر طے کر رہا ہوتا تھا۔ اپنے عزیز و اقارب سے جب
 میں چاند کے بارے میں سوالات کرتا تو اپنی لاعلمی کے سبب وہ مجھے اس کے بارے میں ایسی باتیں بتایا
 کرتے تھے اب جن کے بارے میں سوچ کر ہنسی آتی ہے۔ لیکن ان دنوں میں حیرت زدہ ہو کر خاموش ہو
 جاتا۔ ان دنوں ہر شے کو تکتا رہتا اور میں اپنے دل میں ہی سوال کرتا رہتا تھا۔

مرزا غالب

004

فکر انسان پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا بے مرغ تخیل کی رسائی تا کجا
 تھا سراپا روح تو بزم سخن چیکر ترا زیب تحفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
 دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
 بن کے سوز زندگی ہر شے میں جو مستور ہے
 محفل ہستی تری ربط سے ہے سرمایہ دار جس طرح ندی کے ثغور سے سکوت کو ہمار
 تیرے فردوس تخیل سے ہے قدرت کی بہار تیری کشت فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ دار
 زندگی مضمر ہے تیری شوقی تحریر میں

تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں
 نطق کو سونا ہیں تیرے لب اعجاز پر
 شاید مضمون تصدق ہے ترے انداز پر
 خندہ زن ہے غنچہ دلی گل سیراز پر
 آہ! تو اجزی ہوئی دلی میں آرمیدہ ہے
 گلشن ویرا میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے
 لطف گویائی میں تیری ہم سری ممکن نہیں
 ہو کخیل کا نہ جب تک فکر کامل ہم نشیں
 ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستان کی سرزمین
 آہ! اے نظارہ آموز نگاہ نکتہ میں
 گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
 شمع یہ سووائی دل سوزی پروانہ ہے
 اے جہان آباد! اے گوارہٴ علم و ہنر
 ہیں سراپا نالہ خاموش تیرے بام و در
 ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
 یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گمر
 دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے
 تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

*

یہ امر ناقابل تردید ہے کہ اردو زبان نے اب تک غالب جیسا شاعر پیدا نہیں کیا۔ عصر جدید میں بھی جب کہ اردو شاعری بے شمار تجرباتی مراحل سے گزر چکی اور گزر رہی ہے۔ اس کے باوجود جدید غزل کے شعراء بھی غالب کے اثر سے باہر نہیں نکل سکے۔ بلکہ اس عظیم شاعر نے غزل کی جو قدیل روشن کی تھی وہ اس کو آج بھی روشن رکھے ہوئے ہیں۔ اقبال کی زیر تشریح نظم مرزا غالب ایک بڑے شاعر کی جانب سے دوسرے بڑے شاعر کی عظمت کا اعتراف ہے۔ اقبال نے اس نظم میں جس طرح مرزا غالب سے اظہار عقیدت کیا ہے اس سے اس امر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی نظر میں اس عظیم شاعر کا کیا مقام تھا؟

پہلا بند معنی: تاکجا اکب تک۔

مطلب: اقبال یہاں غالب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تیرے وجود نے فکر انسانی پر یہ بات واضح کر دی کہ خیالات کی روکس بلندی تک پرواز کر سکتی ہے۔ یعنی تیری متعلیہ کی بلندی تک رسائی کے لیے انتہائی فکر کی ضرورت ہے۔ شاعری کی بزم میں تیری ذات اس کی روح معلوم ہوتی ہے اور تیرا وجود اس کی رونق بھی رہا اور ان معنوں میں اس سے پوشیدہ بھی رہا کہ تیرے ہم عصر لوگ فی الواقع تیری شاعرانہ عظمت تک رسائی حاصل نہیں کر سکے۔

دوسرا بند معنی: مربوط سارگی ایک بابے کا نام۔ کشت فکر: سوچ کی بکیتی۔ مضمحل: چھپا ہوا۔

مطلب: جس طرح رواں دواں گاتی گنگنا تکی ندی پہاڑوں کے سکوت میں ارتعاش پیدا کرتی ہے اسی طرح اس کائنات میں تیری متعلیہ نے اہل ذوق کا دامن حکمت و دانش سے بھر دیا۔ تیرے خیالات نے فطرت کے مظاہر کو بھی ہمارا آشنا کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ تیری شاعرانہ فکر نے ایسی دنیا میں تخلیق کی جس جو انسانی ذہن کو تازگی اور سرشاری سے ہمکنار کر گئیں۔

تیری شعری تخلیقات میں حکمت کے ساتھ ایسی شوخیاں بھی موجود ہیں جو ساکت و جامد تصاویر کو بھی لب کھولنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک غالب کی شاعری میں خیال و فکر اور آہنگ کا غلبہ پوشیدہ ہے۔

تیسرا بند معنی: نطق: ہونا گویائی۔ لب اعجاز: وہ لب جس کی باتیں معجزہ ہوں۔ آرا امیدہ: آرام پائے ہوئے۔

مطلب: تیرے کلام میں ایسے اعجاز پوشیدہ ہیں جو انسانی قوت بیان کے لیے باعث فخر و ناز قرار دیے جاسکتے ہیں۔ اور تیرے تخیل کی بلندی پر آسمان کا سب سے زیادہ بلند اور درخشندہ ستارہ بھی حیرت زدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ شاعری میں تیرا انداز بیان اس قدر منفرد اور دلنشین ہے جس پر مضامین خود نثار ہونے پر آمادہ رہتے ہیں۔ تیرے کلام میں ایسی تازگی اور محاسن ہے کہ اس کے بالمقابل شیراز کے حافظ اور سہی جیسے بلند پایہ شعراء کا رنگ بھی پھیکا پڑ جاتا ہے۔ مراد یہ کہ غالب دوسرے باکمال شعراء سے بھی عظیم ہے۔

لیکن کتنا اندو گھیں انقلاب ہے کہ تو اب اس دلی میں مدفون ہے جو انحطاط و زوال کا نمونہ ہے اور تخلیقی و تہذیبی اعتبار سے اجڑ چکا ہے۔ غالب! تیرے ہم عصر شعراء میں عالی سطح پر تجھ سا بلند پایہ شاعر تو جرمنی کا گوٹے ہے جو وہاں کے مشہور اور زندہ شاعر ”ویمر“ میں دفن ہے۔

چوتھا بند معنی: نظارہ آموز: دیدار سکھانے والا۔

مطلب: اے شاعر عظیم! جب تک کوئی تیرے فکر و تخیل کی بلندی سے آشنا نہیں ہوتا وہ تیری ذات سے کس طرح واقف ہو سکتا ہے اور تیرے انداز بیان کی برابری کا کیسے حقدار ہو سکتا ہے؟ نہ جانے تیرے بعد ہندوستان کی سرزمین تخلیقی سطح پر کیوں بچر ہو گئی اور اب وہاں تجھ سا عظیم شاعر اور دانشور کیوں پیدا نہیں ہو رہا؟

حالانکہ اردو زبان ابھی ترقی کے ابتدائی مراحل میں ہے اور اس کے عروج و ارتقاء کے لیے تجھ ایسے بلند پایہ شعراء درکار ہیں۔

پانچواں بند معنی: گہوارہ: گہرا۔ گہر: موتی۔

مطلب: نظم کے اس آخری بند میں اقبال دہلی سے براہ راست مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تو جو ابتداء سے ہی علم و ہنر کا گہوارہ رہی ہے۔ اب تیری وہ عظمت کیا ہوئی؟ تیرے گہے گہے کیوں حکمت و دانش سے خالی نظر آتے ہیں؟ حالانکہ تیری خاک میں بے شمار ایسے ماہرین علم و حکمت دفن ہیں جن کی شہرت و عظمت سے خود تیرا وجود روشن اور درخشندہ ہے۔

لیکن اتنا بتاؤ کہ کیا تیری خاک میں غالب سا بھی کوئی بلند پایہ شاعر دفن ہے جو علم و حکمت، تخیل اور شاعرانہ لطافت میں یکائے روزگار ہے۔

ابر کو ہسار

005

ہے بلندی سے فلک بوس نشین میرا ابر کسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا
 کبھی صحرا کبھی گلزار ہے ممکن میرا شہر و دیوانہ مرا بحر مرا بن میرا
 کسی دادی میں جو منظر ہو سوتا مجھ کو
 سبزہ کوہ ہے نخل کا بچھونا مجھ کو
 مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے در انشاں ہونا ناتھ شاہد رحمت کا حدی خواں ہونا
 غم زدائے دل افسردہ دہقان ہونا رونق بزم جوانان گلستان ہونا
 بن کے گیسو رخ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں
 شانہ موجہ صرصر سے سنور جاتا ہوں
 دور سے دیدہ امید کو ترساتا ہوں کسی بستی سے جو خاموش گزر جاتا ہوں
 سیر کرتا ہوا جس دم لب جو آتا ہوں بالیاں نسر کو گرداب کی پہناتا ہوں
 سبزہ مزرع نوخیز کی امید ہوں میں
 زادہ بحر ہوں پردردہ خورشید ہوں میں
 چشمہ کوہ کو دی شورش قلزم میں نے اور پردوں کو کیا محو ترنم میں نے
 سر پہ سبزہ کے کھڑے ہو کے کماقم میں نے غنچہ نخل کو دیا ذوق تبسم میں نے
 فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے
 جمونپڑے دامن کسار میں دہقانوں کے

*

اقبال کی یہ نظم بھی مناظر فطرت کی آئینہ دار ہے۔ یہاں انہوں نے جو خوبصورت منظر نگاری کی ہے وہ انتہائی طور پر قابلِ داد ہے۔ پوری نظم بلند و بالا پہاڑوں پر چھائے ہوئے بادلوں کے مکالموں کی آئینہ دار ہے۔ بادل برستے ہیں تو کھیت سرسبز و شاداب ہو جاتے ہیں۔ کاشتکاری کے عمل میں کسان ان سے استفادہ کرتا ہے۔ باغوں میں پھلوں اور پھولوں کی کاشت بھی ان کے بغیر ممکن نہیں۔

پہلا بند معنی: فلک بوس: آسمان کو چومنا، یعنی بلند۔ گل پاش: پھول برسانے والا۔

مطلب: نظم کے تمام اشعار میں واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں ابر کسار مکالمہ کرتا ہے کہ میری مستقل بود و باش تو آسمانوں کو چھونے والے بلند و بالا پہاڑوں پر رہتی ہے۔ لیکن زمین پر پھول بکھیرتا رہتا ہوں یعنی جب تک نہ برسوں پھولوں کی نمود ممکن نہیں۔ کبھی صحرا میں برستا ہوں اور کبھی باغوں پر بارش برساتا ہوں۔ اس اعتبار سے شہروں کے علاوہ دیر ان مقامات اور کبھی جنگل پر بھی میرا تسلط رہتا ہے۔ مزاد یہ ہے کہ جب بادل برستے ہیں تو زمین پر موجود تمام مقامات کو سیراب کرتے ہیں۔

ابر کسار کہتا ہے کہ کبھی پہاڑوں کی وادیوں میں برستا ہوں تو وہاں اگا ہوا سبزہ جو نخل کی مانند ہوتا ہے وہی میری آماجگاہ بن جاتا ہے۔

دوسرا بند معنی: در انشاں: موتی بکھیرنے والا۔ ناتھ: اونٹنی۔

مطلب: اس بند میں بھی ابر کسار پہلے بند کے تسلسل کے ساتھ یوں مکالمہ کرتا ہے کہ قدرت نے مجھے بارش کی بوندوں کی شکل میں زمین پر موتی برساتنا سکھایا ہے کہ یہ بوندیں موتیوں سے مشابہت رکھتی ہیں۔ میں جب برستا ہوں تو ان لمحات میں بوندوں کے گرنے سے جو خوبصورت اور دلکش آوازیں پیدا ہوتی ہیں ان کو رحمت باری کے لیے نغمہ سرائی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اور جب خشک و بخر کھیتوں پر برستا ہوں تو ان کی آبیاری سے کسانوں کے پژمرده دل مسرتوں اور خوشیوں سے لبریز ہو جاتے ہیں اور جب باغوں پر برستا ہوں تو وہاں پھلوں اور پھولوں پر تازگی اور شباب جھلک اٹھتا ہے۔

میرا وجود تو حیات و کائنات کے لیے ایک دل خوش کن حیثیت کا مالک ہوتا ہے اور جب ہوائیں چلتی ہیں تو مجھے سکجا ہوا کر زمین پر برسنے اور اسے نکھارنے میں مدد دیتی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ بادل جب برستے ہیں تو نہ صرف یہ کہ فصلوں کی کاشت میں اضافہ ہوتا ہے، باغات میں پھل پھول کو زندگی اور نمو بخشتے ہیں بلکہ زمین کے حسن و زیبائش کا سبب بھی بنتے ہیں۔

تیسرا بند معنی: مزرع نوخیز: نئی اگی ہوئی کھیتی۔ زادہ: بچہ جو سمندر سے پیدا ہوا ہو۔

مطلب: اس بند میں ابر کسار یوں مکالمہ کرتا ہے کہ پہلے بیان کے باوصف اگر میں کسی بہتی پر سے برے بغیر گزر جاتا ہوں تو جو کسان اور باغبان میرے برسنے کے منتظر ہوتے ہیں وہ ناامیدی اور مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس عالم میں رحمت باری کے طلبگار نظر آتے ہیں۔ ان کی امیدیں تشنہ رہ جاتی ہیں اور میرے برسنے کی دعائیں مانگتے ہیں۔ پھر جب کسی ندی پر زور شور کے ساتھ برستا ہوں تو اس کے پانی میں بھنور سے پڑنے لگتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ میرے دم سے تازہ اگی ہوئی فصلیں اور باغوں کے سبزہ زار قائم ہیں۔ میں ان کے لیے امید و آس کی حیثیت رکھتا ہوں۔ میں سمندر سے پیدا ہوا ہوں اور سورج نے میری پرورش کی ہے۔ فطری اور سائنسی اصولوں کے مطابق سورج کی گرمی سے سمندر کا پانی بھاپ بن کر اڑتا ہے پھر بادل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس شعر میں اقبال نے اس نکتے کی جانب اشارہ کیا ہے۔

چوتھا بند معنی: چھشت کوہ: پانی کا سوا۔ قم: اٹھ، کھڑا ہو۔ شبستانوں: امیروں کے سونے کی جگہ۔

مطلب: اس آخری بند میں ابر کسار یوں گویا ہے کہ پہاڑوں سے برآمد ہونے والے چشموں کو میں نے ہی سمندر جیسا جوش و خروش عطا کیا۔ میرے سبب ہی گرمی کے مارے پرندے سکھ کا سانس لے کر نغمہ سرا ہوتے ہیں۔ میری وجہ سے ہی پامال اور مرجھایا ہوا سبزہ پھر سے لہلہانے لگتا ہے اور یہ میں ہی ہوں کہ جب باغوں پر برستا ہوں تو غنچے چمک کر خوشنما اور خوشبودار پھولوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں یعنی میرے بغیر یہ سب کچھ ممکنات سے نہیں ہے۔

میرے ہی فیض و برکت سے پہاڑوں کے دامن میں کسانوں کے جموں پڑوں میں بھی رونق آ جاتی ہے اس لیے کہ میرے سبب ان کی کھیتیاں لہلہاتی ہیں اور انہیں خوشحالی عطا کرتی ہیں۔ میں ان کے لیے مسرتوں کا باعث بنتا ہوں۔

ایک مکڑا اور مکھی

006

(ماخوذ)

(بچوں کے لیے)

اک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا
لیکن مری کنیا کی نہ جاگی کبھی قسمت
غیروں سے نہ ملنے تو کوئی بات نہیں ہے
اُو جو مرے گھر میں تو عزت ہے یہ میری
مکھی نے سنی بات جو مکڑے کی تو بولی
اس جال میں مکھی کبھی آنے کی نہیں ہے

چڑھا، پھر نہیں اترتا

جو آپ کی سیڑھی پہ

مکڑے نے کہا واہ! فریبی مجھے سمجھے
منظور تمہاری مجھے خاطر تھی، وگرنہ
اڑتی ہوئی آئی ہوئی خدا جانے کہاں سے
اس گھر میں کئی تم کو دکھانے کی ہیں چیزیں
لنگے ہوئے دروازوں پہ باریک ہیں پردے
مہمانوں کے آرام کو حاضر ہیں بچھونے
مکھی نے کہا: خیر یہ سب ٹھیک ہے لیکن
ان نرم بچھونوں سے

خدا مجھ کو بچائے

سو جائے کوئی ان پہ

مکڑے نے کہا دل میں سنی بات جو اس کی
سو کام خوشامد سے نکلے ہیں جہاں میں
یہ سوچ کے مکھی سے کہا اس نے بڑی بی
ہوتی ہے اسے آپ کی صورت سے محبت
آنکھیں ہر کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں
تھیں، یہ پوشاک، یہ خوبی، یہ صفائی!
مکھی نے سزا، جب یہ خوشامد تو پسچی
انکار کی عادت کو سمجھتی ہوں برا میں
یہ بات کہی اور اڑی اپنی جگہ سے

پھانسی اسے کس طرح یہ کبخت ہے دانا
دیکھو جسے دنیا میں خوشامد کا ہے بند
اللہ نے بخشا ہے بڑا آپ کو رجا
ہو جس نے کبھی ایک نظر آپ کو دیکھا
سر آپ کا اللہ نے کافی سے سجایا
پھر اس پہ قیامت ہے یہ اڑتے ہوئے گانا
بولی کہ ہمیں آپ سے مجھ کو کوئی کٹنا
سچ یہ ہے کہ دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا
پاس آئی تو مکڑے نے اچھل کر اسے پکڑا

بھوکا تھا کئی روز سے اب ہاتھ جو آلی
آرام سے گھر بیٹھ کے کبھی کو اڑایا



”بانگ درا“ کے حصہ اول میں سات ایسی نظمیں شامل ہیں جو علامہ اقبال نے خصوصی طور پر بچوں کے لیے تخلیق کیں۔ ان نظموں کا بنیادی مقصد اقبال کے نزدیک بچوں کی ذہنی اور نفسیاتی تربیت تھی۔ ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اقبال بچوں کے معاملات میں کس قدر دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ درست ہے کہ ان سات نظموں میں سے بیشتر موضوعاتی سطح پر مغربی ممالک کے بعض شعراء کی تخلیقات سے ماخوذ ہیں۔ تاہم اہم بات یہ ہے کہ ان نظموں کی روح مشرقی ہے۔

پہلا بند معنی: کنیا: جھوپڑی۔ نادان: بے وقوف۔

مطلب: زیر تشریح نظم ”ایک کڑا اور کبھی“ بھی مغربی شاعر کی نظم سے ماخوذ ہے جس کے مطابق ایک کڑا کسی کبھی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تم ہر روز ادھر سے گزرتی ہو لیکن کبھی بھولے سے بھی تم نے میرے غریب خانے میں قدم رکھنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی۔ یہ درست ہے کہ اگر غیروں سے نہ ملا جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اپنوں کے ساتھ اس طرح کی لافعلی مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ اگر تم میرے گھر میں آؤ تو میری عزت افزائی ہوگی۔ میری یہ دعوت منظور کر لو تو سامنے جو بیڑھی ہے اس سے آجاؤ! کبھی نے کڑے کی بات کو بغور سنا پھر گویا ہوئی کہ حضرت! یہ دھوکا کسی احمق کو بھیجیے! اس لیے کہ میں تو اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہوں کہ جو آپ کی بیڑھی پر چڑھا پھر واپس نہیں آیا۔

دوسرا بند معنی: فریبی: دھوکہ باز۔ کنیا: جھوپڑی۔

مطلب: اس مرحلے پر کڑے نے بڑی سختی کے ساتھ کبھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ تم مجھے دھوکے باز سمجھ کر نادانی کا ثبوت دے رہی ہو۔ میں نے جو تمہیں یہاں آنے کی دعوت دی تو محض تمہاری خاطر داری منظور تھی جب کہ اس میں میرا کوئی فائدہ نہ تھا۔ تم جانے کتنی دور دراز سے اڑتی ہوئی آ رہی ہو۔ اس میں برائی کیا ہے کہ چند لمحوں کے لیے یہاں رک کر سانس لے لو۔

ہر چند کہ میرا گھر باہر سے بالکل معمولی نظر آتا ہے لیکن اس میں کئی ایسی نادر اشیاء موجود ہیں جنہیں دیکھ کر تم خوش ہو جاؤ گی۔ اندر جو دروازے موجود ہیں ان پر میں نے خوش رنگ پردے لٹکائے ہوئے ہیں۔ اور جو دیواریں ہیں ان پر شیشے جڑے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مہمانوں کے آرام کے لیے بستر بھی حاضر ہیں۔ تم جانتی ہی ہو کہ ہر شخص کو ایسی آسائشیں میسر نہیں ہوتیں۔ کبھی نے جواباً کہا بے شک تمہاری بات درست ہوگی۔ پھر بھی میں اچھی طرح اس حقیقت سے واقف ہوں کہ ان بستروں پر اگر کوئی بد قسمت سو جائے تو پھر قیامت تک نہیں اٹھ سکتا۔ لہذا مجھ سے یہ توقع نہ رکھنا کہ سب کچھ جانتے بوجھتے تمہارے گھر آجاؤں گی۔

تیسرا بند معنی: کھٹکا: زور، خوف۔ کبھی کو اڑایا: کبھی کو کھایا۔

مطلب: کبھی کا جواب سن کر کڑا حیرت زدہ رہ گیا کہ یہ کم بخت تو بڑی ہوشیار نکلی۔ چنانچہ سوچنے لگا کہ

اس کو بھانسنے کے لیے کونسا حربہ آزمایا جائے؟ پھر چند لمحوں تک خاموش رہ کر یوں گویا ہوا کہ بی بی! بے شک اللہ نے آپ کو بڑا مرتبہ عطا کیا ہے۔ جو کوئی نظر بھر کر دیکھ لیتا ہے۔ آپ سے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔ آپ کی آنکھوں میں ہیرے کی سی چمک ہے اور سر پر اللہ نے کلفتی سجائی ہے۔ آپ کی خوبصورتی لباس اور نفاست میں کس کو شک ہو سکتا ہے؟ اور جب پرواز کے دوران جب آپ نغمہ سرا ہوتی ہیں تو قیامت کا سماں بندھ جاتا ہے۔

کبھی نے مکرے کی جب یہ خوشامد باتیں سنیں تو بے چین مگنی اور کہنے لگی مجھے آپ سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ اگر کئی اس طرح کی دعوت دے تو میں انکار کو خود بہت برا سمجھتی ہوں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ کسی کا دل توڑنا اچھا فعل تو نہیں۔ یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اڑ کر جیسے ہی مکرے کے پاس پہنچی تو اس نے اچھل کر کبھی کو دو بوج لیا۔ یوں بھی وہ کئی روز سے بھوکا تھا۔ چنانچہ کسی توقف کے بغیر کبھی کو ہڑپ کر گیا۔

ایک پہاڑ اور گلہری

007

(ماخوذ از ایمر سن)

بچوں کے لیے

تجھے ہو شرم، تو پانی میں جا کے ڈوب مرے
یہ عقل اور یہ سمجھ، یہ شعور! کیا کتنا!
جو بے شعور ہوں یوں باتیں بن بنائیں
زمین ہے پست مری آن بان کے آگے
بھلا پہاڑ کہاں! جانور غریب کہاں
یہ کبھی باتیں ہیں دل سے انہیں نکال ذرا
نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا
کوئی بڑا، کوئی چھوٹا، یہ اس کی حکمت ہے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اس نے
نری بڑائی ہے! خوبی ہے اور کیا تجھ میں
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

کوئی پہاڑ یہ کتنا تھا اک گلہری سے
ذرا سی چیز ہے، اس پر غور! کیا کتنا
خدا کی شان ہے ناچنے چیز بن بنائیں
تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے؟
جو بات مجھ میں ہے تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں
کہا یہ سن کے گلہری نے، منہ سنہمال ذرا
جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا
ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اس نے
قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں
جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں

*

نظم بھی ایک کترا اور کبھی کی طرح بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کا بنیادی خیال ایمر سن کی ایک نظم سے ماخوذ ہے۔ یہاں اس رائے کا اظہار غیر ضروری نہ ہو گا کہ اقبال نے بچوں کے لیے جو نظمیں تخلیق کی ہیں ان میں خصوصیت کے ساتھ اس امر کا اہتمام کیا گیا ہے کہ وہ لفظی اور نفسیاتی سطح پر بچوں کی سوچ اور معیار کے مطابق ہوں۔ یہ ایک سادہ سی نظم ہے لیکن بچوں کے لیے ہی نہیں بلکہ بڑوں کے لیے بھی سبق آموز ہے۔ فرماتے ہیں۔

① کسی پہاڑ نے زبانِ حال سے گھری سے کہا کہ میرے مقابلے پر تو اتنی چھوٹی اور مختصر چیز ہے کہ اگر تجھ میں معمولی سی شرم بھی ہو تو کہیں جا کر ڈوب مرے۔

② ہر چند کہ تو مختصر سی شے ہے۔ اس کے باوجود نہ جانے کس رتے پر اتنا غرور کرتی ہے۔ تو نے تو یہ سمجھ رکھا ہے کہ تجھ سے زیادہ نہ کسی اور میں عقل اور سمجھ موجود ہے بلکہ خود کو ہر شخص سے زیادہ باشعور تصور کرتی ہے۔

③ تجھے دیکھ کر تو خدا کی شانِ نظر آ جاتی ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ کتنی عجیب بات ہے جو بے حیثیت سے خود کو باحیثیت! اور جو بے شعور ہے وہ خود کو باشعور سمجھنے لگ جائے!

④ اے گھری! میری شان و شوکت کے بالقابل تیری تو حیثیت کچھ بھی نہیں جب کہ زمیں بھی میرا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

⑤ جو عز و جاہ مجھ کو نصیب ہے وہ بھلا تیرے مقدر میں کہاں ہے؟ میں تو ایک بلند و بالا پہاڑ ہوں اور تو ننھی سی گھری! تیری حیثیت میرے نزدیک بے معنی سی ہے۔

⑥ پہاڑ کی باتیں سن کر گھری کو بھی طیش آ گیا وہ بڑے غصے سے یوں گویا ہوئی کہ تو نے جو کچھ کہا میں نے سن لیا۔ تیرے لیے مناسب تو یہ تھا کہ منہ سنبھال کر بات کرے مگر تو تو خوا خواہ احساسِ برتری کا شکار ہے۔ تو نے جو کچھ باتیں کہی ہیں تجھ پر لازم ہے کہ انہیں اپنے دل سے نکال پھینک ورنہ خراب و خستہ ہو جائے گا۔

⑦ اے پہاڑ! غور سے سن لے کہ اگر میں تیری طرح بلند و بالا نہیں تو اس حقیقت سے کیسے انکار کر سکے گا کہ تو بھی تو میری مانند چھوٹا نہیں ہے۔

⑧ اس حقیقت سے کس طرح انکار کر سکے گا کہ کائنات میں جو شے بھی تخلیق کی گئی ہے اس سے قدرتِ خداوندی ہویدا ہے۔ اور اگر قدرتِ قائم کے اعتبار سے بڑا یا چھوٹا ہے تو اس امر کا تعلق اسی کی حکمت و دانش سے ہے۔

⑨ اس بات کو کیوں بھولتا ہے کہ خدا نے اگر تجھے بڑا بنا دیا تو اس امر سے اختلاف ممکن نہیں تو یہ بتا کہ قدرت نے جہاں تیرے قد کو اس قدر بلند کیا تو مجھے بھی تو درخت کی بلندیوں پر چڑھنا سکھا دیا ہے۔

⑩ یہ بھی جان لے کہ صرف بلندی ہی کوئی خوبی نہیں ہے کہ تو تو اس قدر مجبور و مغرور ہے کہ اپنی جگہ سے ایک قدم آگے کی طرف بھی حرکت نہیں کر سکتا۔

⑪ اے پہاڑ! اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ تو واقعی بڑا ہے تو میں ایک معمولی سی شے چھالہ تیرے پاس رکھے دیتی ہوں اگر تجھ میں کوئی ہنر اور طاقت موجود ہے تو اس کو ہی تو زبردست کھا دے۔

⑫ تو اپنی بلندی پر اس قدر غرور نہ کر بلکہ اس حقیقت کو تسلیم کر لے کہ خدا نے عز و جل نے اس عالم رنگ و بو میں جن چیزوں کو بھی پیدا کیا ہے ان میں سے کوئی شے بھی بیکار نہیں بلکہ ہر چیز کوئی نہ کوئی مقصد لیے ہوئے ہے۔

008

ایک گائے اور بکری

(ماخوذ)

بچوں کے لیے

اک چہ اگاہ ہری بھری تھی کہیں
 کیا سماں اس بار کا ہو بیاں
 تھے اتاروں کے بے شمار درخت
 ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کہیں آتی تھیں
 کسی ندی کے پاس اک بکری
 جب ٹھہر کر ادھر ادھر دیکھا
 پہلے جھک کر اسے سلام کیا
 کیوں بڑی بی! مزاج کیسے ہیں!
 کت رہی ہے بری بھلی اپنی
 جان پر آ بنی ہے کیا کہہ
 دیکھتی ہوں خدا کی شان کو میں
 زور چلتا نہیں غریبوں کا
 آدمی سے کوئی بھلا نہ کرے
 دودھ کم دوں تو بڑھاتا ہے
 ہتھکنڈوں سے غلام کرتا ہے
 اس کے بچوں کو پالتی ہوں میں
 بدلے نیکی کے یہ برائی ہے
 سن کے بکری یہ ماجرا سارا
 بات سچی ہے بے مزا لگتی
 یہ چراگہ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
 ایسی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں
 یہ نرے آدمی کے دم سے ہیں
 اس کے دم سے ہے اپنی آبادی
 سو طرح کا بنوں میں ہے کھڑکا
 ہم پہ احسان ہے بڑا اس کا

تھی سراپا بار جس کی زمیں
 ہر طرف ندیاں تھیں صاف رواں
 اور پتیل کے سایہ دار درخت
 طائروں کی صدا کہیں آتی تھیں
 چرتے چرتے کہیں سے آنکلی
 پاس اک گائے کو کھڑے پایا
 پھر سلیقے سے یوں کلام کیا
 گائے بولی کہ خیر اچھے ہیں
 ہے مصیبت میں زندگی اپنی
 اپنی قسمت بری ہے کیا کہہ
 رو رہی ہوں ہروں کی جان کو میں
 پیش آیا لکھا نصیبوں کا
 اس سے پالا پڑے خدا نہ کرے
 ہوں جو دلی تو بیچ کھاتا ہے
 کن فریبوں سے رام کرتا ہے
 دودھ سے جان ڈالتی ہوں میں
 میرے اللہ! تری دہائی ہے
 بولی ایسا گلہ نہیں اچھا
 میں کہوں گی حمر خدا لگتی
 یہ ہری گھاس اور یہ سایا
 یہ کہاں بے زباں غریب کہاں
 لطف سارے اسی کے دم سے ہیں
 قید ہم کو بھلی کہ آزادی؟
 واں کی گزر ان سے بچائے خدا
 ہم کو زیبا نہیں گلہ اس کا

قدر آرام کی اگر سمجھو آوی کا کبھی گلہ نہ کرو
 گائے سکر یہ بات شرابی آوی کے گلے سے پچھائی
 دل میں پرکھا بھلا برا اس نے اور کچھ سوچ کر کہا اس نے
 یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
 دل کو گنتی ہے بات بکری کی

✱

یہ نظم اٹھارویں صدی کے مشہور برطانوی شاعر ولیم کاؤپیر کی ایک نظم سے ماخوذ ہے۔ یہ نظم بھی پہلی دو نظموں کی طرح ایک مکالمے پر مشتمل ہے لیکن اس بار مکالمہ ”گائے اور بکری“ کے مابین ہے۔ نظم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان کو بلا جواز کسی دوسرے سے گلہ مند نہیں ہونا چاہیے۔

اس نظم کے ابتدائی چار اشعار میں اقبال ایک سرسبز چراگاہ کا منظر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس چراگاہ میں ہرے بھرے درختوں اور پودوں کی فراوانی، بہار کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ہر جانب شفاف پانی کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ اناروں کے پھل دار اور پتیل کے بے حساب درخت موجود تھے۔ چراگاہ میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور ہر جانب پرندے چھمارہے تھے۔

(1) اسی چراگاہ میں ایک ندی کے پاس ہی کہیں سے ایک بکری چرتے چرتے آگئی۔ ادھر ادھر نظر آئی تو دیکھا کہ قریب ہی ایک گائے بھی اپنا پیٹ بھرنے میں مصروف ہے۔

(2) بکری نے پہلے ادب و احترام کے ساتھ گائے کو سلام کرتے ہوئے اس کی خیر و عافیت کے بارے میں پوچھا پھر بولی! یہ تو فرمائیے، آپ کے مزاج کیسے ہیں؟

(3) گائے نے قدرے بیڈلی سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ اچھے ہیں۔ بری بھلی کٹ ہی رہی ہے۔ البتہ عملی طور پر زندگی مصائب سے دوچار ہے۔

(4) اے بکری! کیا حال پوچھتی ہے۔ جان پر بنی ہوئی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قسمت ہی بری ہے۔ ہر جانب خدا کی شان کا مظاہرہ کرتے ہوئے بروں کی جان کو رو رہی ہوں۔ مقدر میں جو لکھا ہے وہ بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ آخر غریبوں کا زور ہی کس پر چل سکتا ہے؟ اب تو اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ آوی کے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کرنا چاہیے۔ خدا کرے اس سے کسی کا واسطہ نہ پڑے۔

(5) یہ آوی تو ایسا احسان ناشناس ہے کہ اگر دودھ کم دوں تو ہر لمحہ گلے شکوے کرتا رہتا ہے۔ دہلی ہو جاؤں تو مجھے قصابوں کے ہاتھ فروخت کر ڈالتا ہے۔ میرے ساتھ طرح طرح کے ہاتھ کرتا رہتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بچوں کی پرورش کر رہی ہوں۔ میرا دودھ نہ ہو تو وہ بھوکوں مر جائیں۔ لیکن اس نیکی کا بدلہ وہ برائی ہی سے دیتا ہے۔

(6) گائے کی زبانی یہ احوال سن کر بکری نے کہا کہ اس انداز کی شکایت اور گلہ مناسب نہیں ہے۔ ہر چند کہ سچی بات ہمیشہ کڑی لگتی ہے لیکن سچ کے بغیر وہ بھی نہیں سکتی۔ یہ تو بتائیے کہ جو ہری ہری گھاس آپ چر رہی ہیں اور میاں جو سایہ دار درخت موجود ہیں جن کے پتوں سے چھن چھن کر ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں کیا یہ محض آوی کی محنت اور مشقت کے سبب سے وجود میں نہیں آئیں اور کیا ہم غریب اور بے سرمائے مویشی ان سے فائدہ نہیں اٹھا رہے۔ یہ آوی ہی ہے جس کے ہم سے ہمیں ایسی سولتیں، میسر

آئی ہیں۔ پھر آپ کا گلہ قلعی بے جا نظر آتا ہے۔
 (7) بکری کی حقیقت بیانی سے گائے کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ شرماتے ہوئے بولی، تم مجھ سے بے شک چھوٹی ہو لیکن تمہاری باتیں سچی ہیں اور دل کو بھی لگتی ہیں۔

بچے کی دعا (ماخوذ) بچوں کے لیے

009

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا مرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

*

اقبال کے بقول اس نظم کا مرکزی خیال مغرب کے ایک شاعر کی نظم سے لیا گیا ہے۔ اس کے باوجود صرف چھ اشعار پر مشتمل دعائیہ نظم بچوں کی مقبول ترین نظم ہے۔ پاکستان کے تو ہر سکول میں دن کی تعلیم کا آغاز اسی نظم سے ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی متحدہ ہندوستان کے سکولوں میں بھی یہ دعا بڑی باقاعدگی سے پڑھی جاتی تھی۔ یہ تقسیم سے پہلے کی بات ہے۔

خدائے عز و جل کی بارگاہ میں بچہ دعا کرتا ہے کہ میرے لبوں پر یہ دعا آرزو بن کر پھل رہی ہے کہ میری زندگی شمع کی مانند ہو۔ شمع جو گھور اندھیرے کو منور کر دیتی ہے لیکن خود جلتی رہتی ہے۔ دنیا میں جہالت کی جو تاریکی چھائی ہے، بار اللہ! وہ میرے علم کی بدولت دور ہو جائے۔ جس طرح پھول چمن کی زیبائش اور زینت کا سبب ہوتا ہے اسی طرح میری ذات میرے وطن کی زیبائش کا سبب بن جائے۔ خداوند! جس طرح پروانہ شمع پر شمار ہو کر زندہ جاوید ہو جاتا ہے اسی طرح مجھ کو بھی صلاحیت عطا کر کہ اپنی جدوجہد اور قربانی سے وطن کو سنوار سکوں۔ میری ذمہ داری یہ ہے کہ ہر شخص سے محبت کروں، غریبوں، کمزوروں اور ضرورتمندوں کے کام آؤں۔

میرے مولانا مجھے ہر طرح کی برائی سے بچا کر نیکی کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا کر۔

ہمدردی (ماخوذ از ولیم کوپر) بچوں کے لیے

010

نہی کسی شجر کی تنہا بلبل تھا کوئی اداس بیضا
کتا تھا کہ رات سر پہ آئی اڑنے چکنے میں دن مزارا
پنچوں کس طرح آسیاں تک ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سن کر بلبل کی آہ و زاری جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے کیزا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل چکا کے مجھے دیا بتایا
ہیں لوگ دی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

*

علامہ اقبال نے خود بتایا ہے کہ بچوں کے لیے اس نظم کا مرکزی خیال انہوں نے برطانیہ کے ایک شاعر ولیم کوپر کی نظم سے لیا ہے۔ بچوں کے لیے اقبال کی دوسری نظموں کی طرح ”ہمدردی“ بھی ایک سیدھی سادی نظم ہے جس میں ایک بلبل اور جگنو کے مابین مکالمہ ہے۔ اس میں جو اشعار شامل ہیں ان کے مطالعہ سے ہی اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نظم کس قدر سبق آموز ہے۔

نظم میں بتایا گیا ہے کہ کسی درخت کی شاخ پر ایک بلبل تھا اور اداس بیضا ہوا کہ رہا تھا کہ سارا دن تودانہ دکا چکنے میں گذر گیا اور اب رات سر پہ آگئی ہے۔ ساری فضا پر تاریکی چھا گئی ہے۔ ایسے میں کس طرح اپنے گھونسلے تک پہنچ سکوں گا؟

بلبل کی یہ دکھ بھری داستان قریب کے درخت پر بیٹھے ہوئے ایک جگنو نے بھی سن لی۔ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ عود کر آیا، کہنے لگا۔ بے شک میں ایک حقیر سا کیزا ہوں۔ اس کے باوجود تمہاری مدد کے لیے ہر طرح سے حاضر ہوں۔ اے بلبل! اس بات کا غم نہ کرو کہ رات تاریک ہے۔ اور ہر سمت اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ تاہم مجھ میں قدرت نے یہ صلاحیت بخشی ہے کہ اپنی روشنی سے تمہارے راستے کی تاریکی دور کر دوں۔ باری تعالیٰ نے تو میرے جسم کو روشنی عطا کر کے دیئے کے مانند بنا دیا ہے۔ چنانچہ تمہاری رہنمائی کا فریضہ اپنے ذمے لیتا ہوں۔ نظم سے یہ سبق ملتا ہے کہ دنیا میں وہی لوگ اچھے ہوتے ہیں جو مشکل میں دوسروں کے کام آتے ہیں۔

ماں کا خواب

(ماخوذ)

بچوں کے لئے

011

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب
یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں
لڑتا تھا ڈر سے مرا پال پال
جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی
زرد سی پوشاک پہنے ہوئے
وہ چپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں
اسی سوچ میں تھی کہ میرا پر
وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا
کہا میں نے پہچان کر میری جاں
جدائی میں رہتی ہوں میں بے قرار
نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی
جو بچے نے دیکھا مرا بیچ و تاب
رلاتی ہے تجھ کو جدائی مری
یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چپ رہا
سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے؟
ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے



نظم ماں کا خواب بھی بچوں کی دیگر نظموں کی طرح ایک نظم ہے۔ یہ نظم بھی کسی مغربی شاعر کی نظم سے ماخوذ ہے جو ایک ایسی ماں کے خواب پر مشتمل ہے جس کا بچہ وفات پا چکا ہے۔ اس کے غم میں وہ مسلسل آہ و زاری کرتی ہے۔ دوسری نظموں کی طرح بچوں کے لیے یہ نظم بھی ایک پس منظر لیے ہوئے ہے۔ فرماتے ہیں:-

ایک ماں اپنا خواب بیان کرتے ہوئے کہتی ہے کہ رات کو سوتے ہوئے کیا دیکھتی ہوں کہ میں کہیں جا رہی ہوں لیکن اس قدر تاریکی ہے کہ راستہ نظر آتا ہے۔ اس منظر سے میری بے چینی میں اس قدر اضافہ ہوا کہ خوف کے مارے کانپنے لگی اور قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔

کچھ حوصلہ کر کے آگے بڑھی تو دیکھا لڑکوں کی ایک لمبی قطار ہے جو ایک جانب رواں دواں ہے۔ ان کے لباس سبز ہیں اور وہ ہاتھوں میں چلتے ہوئے چراغ لیے ہوئے ہیں۔ بڑی خاموشی کے ساتھ چل رہے تھے۔ نہ جانے ان کی منزل کو کونسی تھی؟ اس قطار میں مجھے میرا بیٹا بھی نظر آیا جو قطار کے آخر میں قدرے

آہستگی سے چل رہا تھا۔ اس ہاتھ میں بھی اگرچہ ایک چراغ تھا لیکن بجھا ہوا تھا۔ اس نے بیٹے کو پہچان کر اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ تو کہاں چلا گیا تھا۔ تیری جدائی میں میری حالت تباہ ہو کر رہ گئی ہے۔ ہر وقت روتی رہتی ہوں۔ اس لمحے بیٹے نے قدرے دکھ کے ساتھ منہ پھیر لیا اور جواب میں کہا کہ آپ کی آواز ساری سے میرا چراغ بجھ کر رہ گیا ہے اور اس سے مجھے تو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔

پرندے کی فریاد

(ماخوذ)

012

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ وہ باغ کی بہاریں وہ چڑیوں کا چھمکانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی اپنی خوشی سے آتا اپنی خوشی سے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم جنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی صورت آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا
آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں
کیا بد نصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں
آتی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
اس قید کا الٹی دکھڑا کسے سناؤں
دور ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں
جب سے چہن چھنا ہے یہ حال ہو گیا ہے دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے
آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زبان ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے



بچوں کے لیے اقبال کی یہ نظم برطانیہ کے شاعر ”ولیم کوپر“ کی ایک نظم کا آزاد اردو ترجمہ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ آزادی خواہ انسان کے خواہ پرندے کے لیے بھی ایک نعمت سے کم نہیں۔ غلامی تو ایک لعنت ہے۔ اسی موضوع پر علامہ نے ایک پرندے کے مکالمے کو ان اشعار میں پیش کیا ہے۔ یہ پرندہ پنجرے میں محبوس ہے اور زبان حال سے کہتا ہے۔

آج مجھے وہ گزرا ہوا زمانہ یاد آ رہا ہے جب میں باغ میں دوسرے پرندوں کے ساتھ مل کر چھمکایا کرتا تھا۔ اب وہ آزادی کہاں نصیب ہے جب میں اپنی مرضی سے گھونسلے میں آیا جایا کرتا تھا۔ جس لمحے ماضی کی باتیں یاد آتی ہیں تو دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔ وہ لمحات بھی یاد آتے ہیں جب کلیوں پر جنم کرتی تھیں اور وہ کھل کر پھول بن جایا کرتی تھیں۔ اب تو میرے ساتھی بلبل کی نہ صورت نظر آتی ہے نہ ہی اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہی تو میرا ہم سفر تھا۔ جس کے دم سے میرا گھر آباد تھا۔ میں پنجرے میں بند ہوں۔

اس کی آواز تک کانوں میں نہیں آتی۔ اے کاش! یہاں سے رہائی میرے بس کی بات ہوتی۔
 میں کس قدر بد نصیب پرندہ ہوں جو گھر کے لیے ترس رہا ہوں۔ میرے تمام ساتھی وطن میں ہیں اور
 میں یہاں قید میں پڑا ہوا ہوں۔ باغ میں بہار آئی ہوئی ہے اور کلیاں مسکرا رہی ہیں جب کہ میں اس
 تاریک پنجرے میں گرفتار اپنے مقدر کو رو رہا ہوں۔ اس قید کا دکھ اٹھانے والا بھی کوئی نہیں۔ مجھے تو اب یہ
 خدشہ ہے کہ آزادی کے غم میں کہیں اپنی جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھوں!
 صورت یہ ہے کہ جس وقت سے اپنا وطن اور گھر چھوڑنا ہے تو غموں سے نڈھال ہو رہا ہوں۔ ہر وقت
 دل گرفتہ رہتا ہوں۔ میں جس لے میں فریاد کر رہا ہوں اسے گانا سمجھ کر سننے والوں کو لطف اندوز نہیں ہونا
 چاہیے بلکہ یہ تو ایک دکھ ہوئے دل کی فریاد ہے۔ اے مجھے قید کرنے والے! خدا را اس پنجرے سے آزاد
 کر دے کہ میں ایک بے زبان قیدی ہوں تو مجھے چھوڑ کر دعا قبول کر لے۔

خفتگان خاک سے استفسار

013

شانہ ہستی پہ ہے بکھرا ہوا گیسوئے شام
 محفل قدرت مگر خورشید کے ماتم میں ہے
 ساحر شب کی نظر ہے دیدہ بیدار پر
 ہاں، مگر اک دور سے آتی ہے آواز درا
 کھینچ لایا ہے مجھے ہنگامہ عالم سے دور
 کا تماشا کی ہولناکی!

سبج تہائی ہوں میں

اور اس ہستی پہ چار آنسو گرانے دے مجھے
 کچھ کہو اس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم
 اور پیکار عناصر کا تماشا ہے کوئی؟
 اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا؟
 اس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا؟
 شعر کی گرمی سے کیا واں بھی پگل جاتا ہے دل؟
 اس گلستان میں بھی کیا ایسے کھیلے خار ہیں؟
 روح کیا اس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے؟
 قافلے والے بھی ہیں، اندیشہ ریزن بھی ہے؟
 خشت و گل کی فکر ہوتی ہے مکاں کے واسطے؟
 امتیاز ملت و آئیں کے دیوانے ہیں کیا؟

واں بھی کیا فریاد بلبل پر چمن روتا نہیں؟
 اس جہاں کی طرح واں بھی درد دل ہوتا نہیں؟

میر روشن چھپ گیا انھی نقاب روئے شام
 یہ سیہ پوشی کی تیاری کسی کے غم میں ہے
 کر رہا ہے آسمان جادو لب گفتار پر
 غوطہ زن دریائے خاموشی میں ہے موج ہوا
 دل کہ ہے بیتابی الفت میں دنیا سے نفور
 منظر حرام نصیبی

ہم نشین خفتگان
 تھم ذرا بیتابی دل! بیٹھ جانے دے مجھے
 اے مے غفلت کے سرمستو! کہاں رہتے ہو تم!
 وہ بھی حیرت خانہ امروز و فردا ہے کوئی؟
 آدمی واں بھی حصار غم میں ہے محصور کیا؟
 واں بھی جل مرتا ہے سوز شمع پر پروانہ کیا؟
 یاں تو اک مصرع میں پہلو سے نکل جاتا ہے دل
 رشتہ و پیوندیاں کے جان کا آزار ہیں
 اس جہاں میں اک معیشت اور سو افتاد ہے
 کیا وہاں بجلی بھی ہے، دھماکا بھی ہے خرمن بھی
 تنگے؟ پختے ہیں وہاں بھی آشیاں کے واسطے؟
 واں بھی انساں اپنی اصلیت سے بیگانے ہیں کیا؟

باغ ہے فردوس یا اک منزل آرام ہے؟
 کیا جنم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے؟
 کیا عوض رفتار کے اس دیس میں پرواز ہے؟
 اضطراب دل کا سماں یاں کی ہست و بود ہے
 دید سے تسکین پاتا ہے دل مجبور بھی؟
 جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا؟
 آؤ! وہ کشور بھی تاریکی سے کیا معمور ہے؟
 یا رخ بے پردہ حسن ازل کا نام ہے؟
 آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصد تادیب ہے؟
 موت کہتے ہیں جسے اہل زمیں کیا راز ہے؟
 علم انساں اس ولایت میں بھی کیا محدود ہے؟
 لن ترانی کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی؟
 واں بھی انساں ہے قلیل ذوق استغنام کیا؟
 یا محبت کی حجتی سے سراپا نور ہے؟

تم بتا دو راز جو اس گنبد گرداں میں ہے
 موت اک چبھتا ہوا کانٹا دل انساں میں ہے



چھپیں اشعار کی یہ نظم تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے حصے میں صرف چھ اشعار ہیں۔ دوسرے میں بارہ اور آخری حصے میں آٹھ اشعار ہیں۔ پہلے حصے میں اقبال شام کے اوقات میں ایک قبرستان کا منظر پیش کرتے ہیں۔ دوسرے حصے میں حیات و کائنات کے بالقابل حیات بعد از ممات کا تقابلی جائزہ ہے جب کہ تیسرا حصہ بھی کم و بیش اسی نوعیت کے جائزے پر مشتمل ہے۔

① معنی: خفتگان خاک: خاک میں سوئے ہوئے۔ استفسار: سوال۔ مہر: سورج۔ روئے شام: شام کا چہرہ۔ ساحر: جادوگر۔ غوطہ زن: غوطہ لگانا، ڈبکی لگانا۔ نفور: نفرت کرنے والا۔

مطلب: شام ڈھل رہی ہے اور سورج غروب ہو چکا ہے۔ چاروں طرف شام کے سائے پھیل رہے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قدرت اپنے تمام مناظر کے ساتھ ڈوبنے والے سورج کے غم میں ماتم کنساں ہے۔ یوں تو نہیں کہ آسمان نے گفتگو کرنے والے لبوں پر سحر پھونک دیا ہے اور رات کا کردار ایک ایسے ساحر کے مانند ہے جو زندہ انسانوں پر خواب طاری کرنے کی صلاحیت کا حامل ہے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ ہوا بھی سکت ہو کر رہ گئی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس کیفیت میں بھی ایک ایسی آواز سنائی دے رہی ہے جیسے کسی سرگرم سفر قافلے میں ہر اول دستے کے اونٹوں کی گھنٹیوں کی آواز ہو۔ یہی وہ عالم ہے جس نے مجھے (یعنی اقبال کو) اس عالم فانی سے متفر کر دیا ہے اور اس کو ترک کر کے اس قبرستان میں آگیا ہوں جہاں زندگی سے گزر جانے والے کج تنہائی میں خاموش سو رہے ہیں۔ یہاں میں بھی ان کا ہم نشین ہوں۔

② معنی: مے غفلت: غفلت کی شراب۔ امروز و فردا: آج اور کل۔ پیکار عناصر: غصروں کی لڑائی۔ افتاد: مصیبت، آفت۔ امتیاز ملت و آئیں: قوم اور شرع کا فرق۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال بڑے دکھ بھرے اور اضطراب انگیز لہجے میں اہل قبور سے استفسار کرتے ہیں کہ تمہاری اس غمناک اور اندوگہیں بستی پر میں اشک افشانی کرنے پر مجبور ہوں لیکن اتنا تو بتاؤ کہ جس بستی میں تمہاری بود و باش ہے اس کی کیفیت کیا ہے؟ کیا یہ بستی بھی میری دنیا کی مانند ہے جہاں ہر لمحہ انسان انسان سے برسویکار رہتا ہے۔ کیا یہاں بھی تم میری دنیا کے باشندوں کی طرح مجبور و معذور ہونے کے ساتھ ہر طرح کی محرومیوں کا شکار ہو؟

اے اہل قبور! کیا تمہاری ہستی میں بھی شمع کی روشنی پر پروانہ اپنی جان نثار کر دیتا ہے؟ پھول اور بلبل کے بارے میں جو روایتی داستانیں ہماری دنیا میں موجود ہیں کیا تمہاری ہستی بھی اسی نوعیت کی داستانوں سے مزین ہے۔ میری دنیا میں تو شاعر کا ایک مصرعہ ہی دل کو تڑپانے کا موجب ہوتا ہے۔ کیا تمہارے ساتھ تمہارا دل بھی شعر کی حدت سے کھل جاتا ہے۔

جس طرح اس دنیا میں انسانی رشتے باہمی نفرتوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ کیا تم لوگ بھی اسی صورت حال سے دوچار ہو؟ اس دنیا کی معیشت تو بے شمار جھیلوں میں گھری ہوئی ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ ہمارے معاشرے کی طرح کیا تمہارے بھی بجلی، کسان اور کچے گھر دندے ہیں۔ کیا وہاں بھی اہل قافلہ کو ہزینوں سے لٹ جانے کا خوف ہوتا ہے۔ کیا وہاں کے پرندے بھی اپنے گھونسلوں کے لیے ننگے پختے ہیں اور کیا ہماری طرح تم لوگ بھی مکانوں کی تعمیر کے لیے اینٹ اور گارے کا استعمال کرتے ہو۔ یہ بھی بتاؤ کہ جس طرح ہمارے لوگ اپنی حقیقت کو فراموش کر بیٹھے ہیں اور ذاتی عقیدوں کے جنون میں مبتلا ہیں۔ کیا تمہارے ہاں بھی یہی معاملات ہیں؟ ہمارے معاشرے میں ظلم و جبر کے خلاف جس طرح آواز بلند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی کیا تمہاری دنیا کی صورت حال بھی یہی ہے؟

③ معنی: معیص سوزی: گناہوں کو جلائے۔ تادیب: سزا، گونہائی۔ ہست و بود: ہستی اور وجود مراد زندگی۔ مجبور: جبر، جہدائی۔ لن ترانی: تلخ ہے۔ مطلب ہے کہ اے موسیٰ! تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔ قتل: مارا ہوا۔ گنبد گرداں: گھونٹنے والا گنبد۔

مطلب: یہ اشعار بھی دوسرے حصے کا تسلسل ہیں جن میں اقبال خفگان خاک سے سوال کرتے ہیں کہ یہ تو بتاؤ! تمہاری دنیا میں جس خطے کا نام بہشت ہے کیا وہ کوئی باغیچہ ہے یا آرام گاہ ہے یا پھر اس مقام پر حسن ازل بے نقاب ہو کر سامنے آگیا ہے؟ جنم جو ہے کیا اس کے شعلوں میں گنہگاروں کو ڈال کر سزا دیتا ہے یا پھر یہی شعلے گناہوں کو بحسم کرنے کا ذریعہ ہیں؟ اس دنیا میں تو انسان اپنے مادی جسم کے باوجود محو پرواز رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن تمہاری دنیا میں بھی کیا یہی صورت ہے؟ یہ بھی بتاؤ! کہ ہم جس شے کو موت کہتے ہیں کیا تم اس راز سے آگاہ ہو؟

اے اہل قبور! ہماری دنیا میں تو زندگی اور موت کا مسئلہ انتہائی اضطراب کا سبب ہے۔ کیا تمہاری دنیا میں بھی علم اتنا ہی محدود ہے؟ محبوب کی ایک جھلک سے کیا وہاں بھی سکون قلب حاصل ہوتا ہے یا پھر کوہ طور پر اس دنیا میں حضرت موسیٰؑ کو خدا نے اپنا جلوہ دکھانے سے انکار کیا تھا کیا وہاں بھی ایسا ہوتا ہے؟ کیا تمہاری دنیا میں بھی تحقیق و جستجو سے روح کو آسودگی نصیب ہوتی ہے اور کیا وہاں بھی فرد عقل و فہم کا ادراک رکھتا ہے؟ مجھے اتنا بتاؤ کہ تمہاری محبت کی جلی سے نور کا سراپا بنی ہوئی ہے یا وہاں بھی نفرتوں کی تاریکی چھائی ہوئی ہے؟ کائنات کا سب سے بڑا راز موت ہے جو مشکف نہ ہونے کے سبب قلب انسان میں کانٹے کی طرح معلق ہے۔

شمع و پروانہ

014

پروانہ تجھ سے کرتا ہے اے شمع! پیار کیوں؟ یہ جان بے قرار ہے تجھ پر نثار کیوں؟

سیماب وار رکھتی ہے تیری ادا اسے آداب عشق تو نے سکھائے ہیں کیا اسے؟
 کرتا ہے یہ طواف تری جلوہ گاہ کا پھونکا ہوا ہے کیا تری برق نگاہ کا؟
 آزار موت میں اسے آرام جاں ہے کیا؟ شعلے میں تیرے زندگی جادواں ہے کیا؟
 غم خانہ جہاں میں جو تیری ضیاء نہ ہو اس فتنہ دل کا محل تمنا ہر آنہ ہو
 گرنا ترے حضور میں اس کی نماز ہے ننھے سے دل میں لذت سوز و گداز ہے
 کچھ اس میں جوش عاشق حسن قدیم ہے چھوٹا سا طور تو یہ ذرا سا کلیم ہے
 پروانہ اور ذوق تماشاے روشنی
 گیزا ذرا سا اور تمنائے روشنی

*

معنی: سیماب وار: پارہ کی طرح بے قرار۔ آزار موت: مرنے کا دکھ۔ فتنہ دل: جلا ہوا دل۔ محل تمنا: تمنا کا درخت۔

مطلب: اس نظم میں اقبال، شمع سے مکالمہ کرتے ہوئے استفسار کرتے ہیں کہ تجھ میں ایسی کون سی خصوصیت ہے کہ پروانہ تجھ سے اتنی والمانہ محبت کرتا ہے۔ وہ تو اس قدر تیرے لیے چاہ رہتا ہے کہ اپنی جان بھی تجھ پر قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔ حیرت ہے کہ تیرے گرد یہ ہر لمحہ طواف کرتا رہتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تیری محبت اسے پارے کی طرح بے غور رکھتی ہے۔ تو ہی بتا دے کہ عشق و محبت کے یہ آداب کیا تو نے اسے سکھائے ہیں؟ اور کیا تیری برق نظر نے اسے جلا کر راکھ کر دیا ہے؟ کیا تیرے شعلے میں اسے اپنے لیے حیات جادواں نظر آتی ہے جو اس طرح موت کو قبول کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔ اے شمع! یوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر دنیا کے اس غم کدے میں تیری روشنی موجود نہ ہو تو پروانے کا دل نا صبور کبھی بھی آسودہ نہیں ہو سکتا۔ تابی اس کو سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے ننھے سے دل میں عشق و محبت کا سوز و گداز اتنا شدید ہے کہ تجھ پر فدا ہونے کو یہ عبادت تصور کرتا ہے۔ اے شمع! مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ پروانے میں ماضی کے روایتی عشق کا جذبہ بھرپور انداز میں موجود ہے اور اگر یہ کہوں تو بے جا نہ ہو گا کہ تیرا وجود ایک چھوٹے سے کوہ طور کے مانند ہے اور یہ پروانہ ایک ننھے سے کلیم کی حیثیت رکھتا ہے کہ جلوہ دیکھتے ہی بے ہوش ہو جائے۔ یہ پروانہ ہر چند کہ ننھا سا گیزا ہے تاہم اس میں روشنی پر نثار ہونے کا بلند جذبہ اور ذوق بہر حال موجود ہے۔

عقل و دل

015

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
 ہوں زمیں پر، گزر فلک پہ مرا دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں
 کام دنیا میں رہبری ہے مرا مثل خضر خجستہ پا ہوں میں
 ہوں مفسر کتاب ہستی کی منظر شان کبریا ہوں میں
 بوند اک خون کی ہے تو لیکن غیرت لعل بے بہا ہوں میں

دل نے سن کر کہا یہ سب ج ہے پر مجھے بھی تو دیکھ، کیا ہوں میں
 راز ہستی کو تو سمجھتی ہے اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
 ہے تجھے واسطہ مظاہر سے اور باطن سے آشنا ہوں میں
 علم تجھ سے، تو معرفت مجھ سے تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
 علم کی انتہا ہے بے تابی اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
 شمع تو محفل صداقت کی حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
 تو زمان و مکاں سے رشتہ پا طائرِ سدرہ آشنا ہوں میں
 کس بلندی ہے مقام مرا
 عرش رب جلیل کا ہوں میں

*

تیرے اشعار پر مشتمل یہ نظم عملی سطح پر عقل اور دل کے مابین ایک مکالمہ ہے جس میں عقل اور دل
 اپنی اپنی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ یہ مکالمہ علامہ اقبال نے تخیلی بنیاد پر یہاں منظوم صورت میں پیش
 کیا ہے۔ نظم کے تیرہ میں سے پانچ اشعار عقل کی زبانی بیان کیے گئے ہیں جب کہ باقی کے آٹھ شعروں میں
 دل اپنی خصوصیات بیان کرتا ہے۔

عقل

(ایک تپانچ): معنی خضر: ایک پیغمبر کا نام۔: خجستہ: مبارک۔ مفسر: تفسیر کرنے والا۔

مطلب: نظم کا آغاز عقل کی زبانی ہوتا ہے جو دل سے ایک دن یوں گویا ہوتی ہے کہ جہاں تک میری
 ذات کا تعلق ہے تو یہ جان لے کہ میں ان لوگوں کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتی ہوں جو اپنے صحیح راستے
 سے ہٹ کر غلط راہ پر چل پڑے ہیں۔ بے شک میرا وجود زمین پر قائم ہے۔ اس کے باوجود میری پہنچ
 آسمان تک ہے کہ میں اپنی قوت استدلال کے سبب زمین پر رہتے ہوئے بھی آسمان کی وسعتوں اور ان کے
 عوامل سے پوری طرح آگاہ رہتی ہوں۔ اس دنیا میں میرا کام تو ان لوگوں کی صحیح رہبری کرنا ہے جو اپنی راہ
 سے ہٹ چکے ہیں۔ یوں میری حیثیت حضرت خضر کی سی ہے جن کے ذمے قدرت نے یہ فریضہ لگایا ہے۔
 اگر زندگی کو ایک صحیفہ تصور کر لیا جائے تو یہ جان لے کہ میں اس کی تفسیر کی اہلیت رکھتی ہوں۔ یہی نہیں
 بلکہ شانِ خداوندی کا اظہار بھی میرے ہی دم سے ہوتا ہے۔ تیری حیثیت تو اسے دل بس اتنی ہی ہے کہ تو
 خون کی ایک بوند کے مانند ہے جب کہ میرا وجود ایک نایاب لعل کی طرح سے ہے جس کی قیمت کوئی ادا
 نہیں کر سکتا۔

دل

(9-6) معنی: معرفت: خدا کی پہچان۔ خدا نما: خدا کو دکھانے والا۔

مطلب: عقل کی زبان سے یہ الفاظ سن کر دل نے جواب میں کہا 'تو نے جو کچھ کہا ہے بے شک درست ہو گا لیکن تو نے میری حقیقت کو جاننے کی بھی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی اس امر کا تجزیہ کر سکی کہ فی الواقع میں کیا شے ہوں؟ مانا کہ زندگی کے اسرار کا تجھ کو ادراک ہے لیکن یہ نہ بھول کہ میں تو ان کو خود اپنی نگاہ بصیرت سے دیکھنے کا اہل ہوں۔ تیرا واسطہ تو محض ظاہری اشیاء سے ہے جب کہ میں داخلی سطح پر ہر شے کے باطن سے شناسا رہتا ہوں۔ اس حقیقت کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ تیرا دائرہ کار علم ہے۔ تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کائنات کے جملہ اسرار کی پہچان کا منبع میں ہوں۔ خدا کو شناخت کرنے کا عمل بھی تیری بجائے میرے وجود سے وابستہ ہے۔

(10-13) معنی: سدرہ: وہ مقام جو جزائیل کی پرواز کی آخری حد ہے۔

مطلب: اے عقل! یہ بھی جان لے کہ علم جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اس کا رد عمل اضطراب اور بے چینی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے لیکن یہ تو محض ایک عارضہ ہے۔ چنانچہ میری ذات ہی اس مرض کے لیے سیمیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ تو اگر سچائی کی محفل میں شمع کے مانند ہے تو میں بھی حسن کی بزم میں ایک روشن دیئے کی حیثیت رکھتی ہوں۔ اگر شعر میں دل یوں گویا ہوتا ہے کہ اے عقل! اگر تیری رسائی زمان و مکان تک ہے تو یہ حقیقت نہ بھول کہ میری پرواز ان مراحل تک ہے۔ جہاں زمان و مکان کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ بس اس سے زیادہ اور میں کیا کہہ سکتی ہوں کہ میرا مرتبہ انتہائی بلند ہے۔ بس اتنا جان لے کہ میرا وجود تو ریت جلیل کے عرش کی مانند ہے۔ مراد یہ ہے کہ اے عقل تو بڑی حد تک خوش فہمیوں کا شکار ہے جب کہ میں فطرت کی حقیقتوں سے پوری طرح آشنا ہوں اور ان کا مکمل ادراک رکھتی ہوں۔

صدائے درد

016

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
سرزمین اپنی قیامت کی اتفاق انگیز ہے
بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
لذت قرب حقیقی پر
مٹا جاتا ہوں میں

اختلاط موجب و ساحل سے گھبراتا ہوں میں
دانہ خرمن نما ہے شاعر معجز بیاں
حسن ہو کیا خود نما؟ جب کوئی مائل ہی نہ ہو
ذوق گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینے سے یہ یہ جو ہر نکلا کیوں نہیں
کب زباں کھولی ہماری لذت گفتار نے

پھوٹک ڈالا جب چمن کو آتش پیکار نے

*

پہلا بند معنی: محیط: گھیرنے والا، گھیرا۔ خرمن: نلے کا انبار، نکمیاں۔ اختلاط: میل جول۔

مطلب: نواسعار پر مشتمل اس نظم کے دو بند ہیں۔ پہلے بند میں پانچ اشعار ہیں اور دوسرے میں چار شعر ہیں۔ ”بانگ درا“ کی یہ نظم پوری کی پوری وطن پرستی کے جذبات سے عبارت ہے۔ اس میں قوی دردی وہ تنھک دکھائی دیتی ہے جو خصوصیت کے ساتھ ”بال جبریل“ ضرب کلیم اور اقبال دوسرے مجموعوں میں نظر آتی ہے۔ اس نظم کے پہلے بند کا آغاز وہ اس طرح سے کرتے ہیں۔

ہندوستان کے باشندوں کے مابین نفاق کا جو عالم ہے اس نے مجھے جلا کر دکھ دیا ہے۔ اسی دکھ کے سبب مجھے ایک لمحے کے لیے بھی اضطراب سے نجات نہیں ملتی۔ اسی دکھ سے میں لمحہ یہ لمحہ تڑپ رہا ہوں۔ اس سے شاید یوں نجات مل جائے کہ میں دریائے گنگا میں ڈوب کر مر جاؤں۔ شاید یہی عمل میرے سکون کا سبب بن سکے اور اس کرب سے نجات حاصل کر سکوں۔ افسوس کہ میرا وطن عدم اتفاق اور نفاق کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ یہاں جو مختلف قومیں آباد ہیں وہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں ہر طرف فرقہ وارانہ فسادات کا زور ہے۔ یہ ایسی صورت حال ہے جس میں امن و اتحاد کی گنجائش کا قطعی امکان نہیں ہے۔ ایک ساتھ رہنے کے باوجود نفرتوں کا یہ عالم ہے کہ کوئی ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔

③ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہاں اتفاق اور باہمی یگانگت کا مظاہرہ ہوتا۔ اس کے برعکس اس سرزمین پر موجود ہر شخص دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔ اقبال بڑے دکھ کے ساتھ اس صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک ہی سرزمین پر بود و باش رکھتے ہوئے باہمی سطح پر نفاق اور عداوت کا یہ انداز انتہائی درد انگیز ہے۔ یہاں کی فضاء محبت و اخوت کے جذبوں سے خالی ہے۔ سو میرا جیسا درد مند شاعر ایسی فضا میں کس طرح شعری تخلیق کر سکتا ہے؟ کس طرح اپنے نئے یہاں بکھیر سکتا ہے۔ میں تو ہندوستان کے باشندوں کے مابین حقیقی قرب اور اتحاد کا خواہاں ہوں جب کہ موج اور ساحل کے مابین جو ٹکراؤ اور تصادم کی فضا ہوتی ہے وہ کم از کم میرے لیے اضطراب و بے چینی کا سبب بن جاتی ہے۔

علامہ اقبال نے یہ نظم واضح رہے کہ تقسیم ہند سے کچھ عرصہ قبل اس وقت کہی جب ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات کی وبا پھوٹ پڑی تھی۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ یقیناً یہی وہ صورت حال تھی جس کے پیش نظر انہوں نے بعد میں تقسیم ہند اور پاکستان تصور پیش کیا۔ علامہ نے یقیناً اس حقیقت کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین شدید نفرت کی ایسی خلیج حاصل ہو گئی ہے جس کو پائنا مشکل ہے۔ اس کا حل مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ ہی ہو سکتا ہے۔

دوسرا بند معنی: دانہ خرمن: وہ دانہ جو کھلیاں کا پتہ بتائے۔ خود نما: اپنے آپ کو نمایاں کرنے والا۔ آتش پیکار: لڑائی کی آگ۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح ایک دانے سے پورے کھلیاں کی حقیقت اور اس کے معیار کا اندازہ ہو جاتا ہے اسی طرح شاعر اور اس کا کلام کسی قوم کا آئینہ ہوتا ہے لیکن خرمن کی تباہی سے دانے کا وجود بھی برقرار نہیں رہتا اسی طرح قوم ہی سبکا اور باہم نہ ہو تو پھر حقیقی شاعر کا وجود ہی ممکن نہیں ہوتا۔

اقبال اسی خیال کو دوسرے شعر میں یوں بیان کرتے ہیں کہ اگر کوئی توجہ کرنے والا ہی موجود نہ ہو تو

اپنے حسن کی افادیت بھی ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے کہ شمع تو محفل کو منور کرتی ہے اور جب محفل کا کوئی وجود ہی نہ ہو تو شمع کے جلنے کا کیا فائدہ! مراد یہی ہے کہ جب متحد و متفق قوم ہی موجود نہ ہو تو کوئی شاعر ایسی صورت میں اپنے فن کا اظہار کیسے کر سکے گا۔

آخری دو اشعار میں اقبال انتہائی یاس و اضطراب کے عالم میں کہتے ہیں کہ مذکورہ صورت حال میں نہ جانے میں عرض ہنر سے گریز کی راہ کیوں نہیں اختیار کر لیتا۔ نہ جانے مجھ میں جو تخلیقی صفات موجود ہیں ان کا خاتمہ کیوں نہیں ہو جاتا۔ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس لمحے شعر گوئی کا آغاز کیا ہے جب کہ ہندوستان افتراق و فراق کی آگ میں جل رہا ہے اس حالت میں میرے نغے کون سنے گا۔

آفتاب

017

(ترجمہ گاہتوی)

اے آفتاب! روح و روان جہاں ہے تو
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا
قائم یہ غصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثابت ہے
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
اے آفتاب! ہم کو نیا نئے شعور دے
ہے محفل وجود کا سماں طراز تو
تیار کمال ہستی ہر جان دار میں
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو
نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری
آزاد قید اول و آخر نیا تیری

*

اس نظم کی تشریح سے قبل یہ امر ضروری ہے کہ گاہتوی کی اصطلاح کو واضح کر دیا جائے۔ ”گاہتوی“ اہل ہند کی مقدس کتاب ”رگ دید“ کا مشہور و معروف منتر ہے۔ اس نظم میں اقبال نے منسکرت زبان سے گاہتوی منتر کا آزاد ترجمہ کیا ہے۔ واضح رہے کہ گاہتوی منتر کو اہل ہند ”رگ دید“ کی روح سمجھتے ہیں۔ عالم نزع میں اس منتر کا جاپ کیا جاتا ہے۔

معنی: شیرازہ: انتظام۔ ثبات: قیام، پائیداری۔ خرد: عقل۔ کوسار: پہاڑ۔

مطلب: علامہ اقبال نے اس نظم کو پہلی بار شائع کراتے وقت جو نوٹ تحریر کیا تھا اگر اس کو یہاں شامل کر دیا جائے تو اس سے نظم کی معنویت کا صحیح طور پر اندازہ ہو سکے گا۔ فرماتے ہیں ”ذیل کے اشعار“ ”رگ دید“ کی نہایت ہی قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں۔ جس کو گاہتوی کہتے ہیں۔ یہ دعا عبودیت کی صورت میں ان تاثرات کا اظہار ہے جنہوں نے نظام عالم کے حیرت ناک مشاہدے سے اول اول انسان

ضعیف البیان کے دل میں ہجوم کیا ہو گا۔ اس قسم کی تحریریں کا مطالعہ علمِ مل و النحل کی عالموں کے لیے انتہائی درجہ کا ضروری ہے۔ کیونکہ ان سے انسان کے روحانی نمو کے ابتدائی مراحل کا پتہ چلتا ہے۔

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال کہتے ہیں ”یہی وہ دعا ہے جو چاروں دینوں میں مشترک پائی جاتی ہے۔ اور جس کو برہمن اس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت کسی کے سامنے اس کو پڑھنا تک نہیں۔ جو لوگ السنہ شرقیہ کی تصانیف سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ سرویم جوئس کو اس دعا کے معلوم کرنے میں کس قدر تکلیف اور محنت برداشت کرنی پڑی تھی۔ مغربی زبانوں میں اس کے بہت سے ترجمے کیے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ زبانِ سنسکرت کی لغوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنہ حال میں وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔

اس مقام پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل سنسکرت میں لفظ ”سوتر“ استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے اردو لفظ نہ ملنے کے باعث ہم نے لفظ ”آفتاب“ رکھا ہے۔ لیکن اصل میں اسی آفتاب سے مراد اس آفتاب سے ہے جو فوق الحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسبِ نیاں کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے نیز صوفیاء نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے۔ ”اللہ نور السموات والارض“ اور شیخ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں۔ لیکن وہ خود نظر نہیں آتا۔ علیٰ ہذا القیاس۔ افلاطون الٰہی کے مصری پیروؤں اور ایران کے قدیم انبیاء کا بھی یہی مذہب تھا۔

ترجمے کی مشکلات سے تو ہر شخص واقف ہے لیکن اس خاص صورت میں وقت اور بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ اصل آواز کی موسیقیت اور وہ طہانیت آمیز اثر جو ان کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے اردو زبان میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ گاہتوی کے مصنف نے ملک الشعراء ثنیٰ سن کی طرح اپنے اشعار میں ایسے لفظ استعمال کیے ہیں جن میں حرف علت اور صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا غیر زبان میں منتقل ہونا ناممکنات سے ہے۔

اس مجبوری کی وجہ سے میں نے اپنے ترجمے کی بنیاد اس سوکت (گفتارِ زیبا) پر رکھی ہے جس کو سوریا نرائن اپنشد نے گاہتوی مذکور کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ سنسکرت والی اصحاب اس پر وہی رائے قائم کریں گے جو چیپ مین نے پوپ کے ترجمہ ہو مر کو پڑھ کر قائم کی تھی۔ یعنی شعر تو خاصے ہیں لیکن یہ گاہتوی نہیں ہے۔

① تا ② اس پس منظر میں یہ بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ زیر تشریح نظم ”آفتاب“ ایک طرح سے ”گاہتوی“ کا آزاد ترجمہ ہے جس میں اقبال، آفتاب سے یوں مخاطب ہیں تو یہی ہے جو اس جہاں کی روح رواں ہے اور تیرے ہی دم سے اس کائنات کا نظام قائم و دائم ہے۔ تو نہ ہو تو یہ نظام درہم و برہم ہو کر رہ جائے۔ یہاں موت اور زندگی کا جو سلسلہ ہے اس کا اظہار تیرے ہی دم سے ہوتا ہے یہی نہیں بلکہ اس دنیا میں جو رونق اور چل چل پھل ہے وہ بھی تجھ سے ہے۔

③ اے آفتاب! آگ، پانی، مٹی اور ہوا چاروں عناصر کے مابین جو ربط اور شیرازہ بندی ہے اس کی بنیاد بھی تو یہی ہے مزید براں کائنات میں جو بھی جاندار اشیاء موجود ہیں ان میں زندگی کی لہر تیرے ہی دم سے دوڑتی ہے۔

④ عالم رنگ و بو میں جو چیز بھی نظر آتی ہے اس کا وجود تیرے سبب سے ہی قائم ہے تیری شہادت کے بغیر یہ چیزیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ خود تیرے وجود میں جو روشنی اور حرارت ہے وہی ان اشیاء کے لیے حیات کا سبب ہیں۔

⑤ تیرے وجود سے ہی پوری کائنات روشن اور منور رہتی ہے اور اسی روشنی کے سبب دل، عقل اور روح مسرور و شادماں رہتے ہیں۔

⑥ اس شعر میں اقبال ایک دوسرے انداز سے آفتاب سے مکالمہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں بھی اپنے نور سے خرد اور شعور کی روشنی عطا کر اور اسی نور سے ہماری عقل اور خرد کو بھی منور کر دے۔

⑦ اس دنیا کی ترتیب اور نظم و ضبط تیرے بغیر ممکن نہیں۔ تو ہی ہے جو ان کا اہتمام کرتا ہے اس کائنات میں نظم پیدا کرنے والی ذات تیری ہے یہی نہیں بلکہ یہاں جو بھی اوئی و اعلیٰ ہے، چھوٹا بڑا ہے اس کی تخلیق تیرے دم سے ہی ہے۔

⑧ کائنات کی ہر شے تیرے کمال فن کی آئینہ دار ہے یہاں تک کہ پہاڑوں کے جو سلسلے ہیں وہ بھی تیرے فن کا شاہکار ہیں۔

⑨ اے آفتاب! تو تو ہر چیز میں موجود زندگی کا خالق ہے اور دنیا میں جتنی بھی روشن و منور چیزیں ہیں ان کا سر تاج بھی تو ہی ہے۔

⑩ کوئی بھی نہیں جانتا کہ تیری ابتداء اور انتہا کیا ہے۔ تیرا نور تو ان حدود سے قطعی آزاد ہے جن کا تعلق ازل اور ابد سے ہے۔ یہ امر پہلے ہی واضح کر دیا گیا ہے کہ گاہنتوی کے مطابق اس نور (آفتاب) سے مراد خالق کون و مکان ہے۔

شمع

018

بزم جہاں میں میں بھی ہوں اے شمع درد مند
دی عشق نے حرارت سوز دروں تجھے
اور گل فروش اشک شفق گوں کیا مجھے
ہو شمع بزم عیش کہ شمع مزار تو
ہر حال اشک غم سے رہی ہمکنار تو

یک میں تری نظر صفت عاشقان راز میری نگاہ مایہ آشوب امتیاز
کعبے میں بتکدے میں ہے یکساں تری ضیا میں امتیاز دیر و حرم میں پھنسا ہوا
ہے شان آہ کی ترے دور سیاہ میں
پوشیدہ کوئی دل ہے تری جلوہ گاہ میں؟

جلتی ہے تو کہ برق تجلی سے دور ہے بیدرد تیرے سوز کو سمجھے کہ نور ہے
تو جل رہی ہے اور تجھے کچھ خبر نہیں جیتا ہے اور سوز دروں پر نظر نہیں
میں جوش اضطراب سے سیماں دار بھی آگاہ اضطراب دل بے قرار بھی
تھا یہ بھی کوئی ناز کسی بے نیاز کا

تھا یہ بھی کوئی ناز کسی بے نیاز کا
 احساس دے دیا مجھے اپنے گداز کا
 یہ آگئی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار
 یہ امتیاز رفعت و پستی اسی سے ہے
 گل میں مک، شراب میں مستی اسی سے ہے
 بستان و بلب و گل و بو ہے یہ آگئی
 اصل کشاکش من و تو ہے یہ آگئی
 صبح ازل جو حسن ہوا دستان عشق
 یہ حکم تھا کہ گلشن کن کی بہار دیکھ
 ایک آنکھ لیکے خواب پریشاں ہزار دیکھ
 مجھ سے خبر نہ پوچھ حجاب وجود کی
 وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا
 قیدی ہوں اور قفس کو چن جانتا ہوں میں
 یاد دامن فردگی بے سبب بنی!
 شوق نظر کبھی، کبھی ذوق طلب بنی
 اے شمع! انتائے فریب خیال دیکھ
 مضمون فراق کا ہوں، ثریا نشاں ہوں میں
 باندھا مجھے جو اس نے تو چاہی مری نمود
 گوہر کو مشت خاک میں رہنا پسند ہے
 چشم غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے
 یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کند ہے
 منزل کا اشتیاق ہے گرم کردہ راہ ہوں
 صیاد آپ، حلقہ دام ستم بھی آپ
 میں حسن ہوں کہ سراپا گداز ہوں
 مسجود ساکنان فلک کا مال دیکھ
 آہنگ طبع ناظم کون و مکاں ہوں میں
 تحریر کر دیا سر دیوان ہست و بود
 بندش اگرچہ ست ہے مضمون بلند ہے
 عالم ظہور جلوۂ ذوق شعور ہے
 طوق گلوئے حسن تماشا پسند ہے
 اے شمع! میں اسیر فریب نگاہ ہوں
 بام حرم بھی، طائر بام حرم بھی آپ
 نکلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

ہاں آشنائے لب ہو نہ راز کمن کہیں
 بھر چھڑ نہ جائے قصہ دار و رسن کہیں

پہلا بند معنی: فریاد و درگہ: جس کی گرہ میں فریاد ہو مراد فریادی۔ دانہ سپند: کالا دانہ، حرمل۔ شفق
 گوں: شفق کی مانند، سرخ۔

مطلب: علامہ اقبال کی یہ نظم چھ بند پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں وہ شمع سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ
 اے شمع! تیری طرح میں بھی غم زدہ اور دکھیا ہوں۔ میری کیفیت بھی حرمل کے اس دانے کی مانند ہے جو
 آگ کی تپش سے چمکنے کی آواز پیدا کرتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ میرا دل جب سوز غم سے بھڑک اٹھتا
 ہے تو اس میں سے درد انگیز نالے اٹھتے ہیں۔ جس طرح عشق نے تجھے داخلی کرب کی آگ میں جلنے پر

مجبور کر دیا ہے یعنی مجھے بھی خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیا ہے۔ مجھے علم ہے کہ تو کسی عشرت کدے میں روشن ہو یا کسی مزار پر جلے دونوں صورتوں میں تیری آنکھ سے آنسو ٹپکتے رہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ شمع خواہ خوشی کی محفل میں جلے یا کسی غم کدے میں اس کے پھٹنے سے بہر حال موم کے قطرے ٹپکتے رہے ہیں۔ اقبال نے انہی کو آنسوؤں سے تعبیر کیا ہے۔

دوسرا بند معنی: یک ہیں: ایک دیکھنے والی۔

مطلب: اے شمع! جس طرح قدرت کے بھید جاننے والے عشاق ہر شے کو کسی جانب داری کے بغیر مساوی سطح پر دیکھتے ہیں تیری کیفیت بھی ان سے ملتی جلتی ہے جب کہ میں اشیاء کے مابین فرق و امتیاز کا جائزہ لیتا ہوں۔ تیری روشنی تو خواہ کعبہ ہو یا بت خانہ، دونوں کو یکساں طور پر منور کرتی ہے جب کہ میری نظردیر و حرم کے مابین جو فرق ہے اس کی مماثل ہے۔

تیرے جلنے سے جو دھواں اٹھتا ہے اس کی کیفیت قلب انسان سے برآمد ہونے والی آہ کی سی ہے۔ لگتا ہے کہ تیرے اندر بھی انسان کی طرح کوئی دل چھپا ہوا ہے۔

تیسرا بند معنی: بیٹا: دیکھنے والا بیٹائی۔

مطلب: شاید تو اس غم میں جل رہی ہے کہ تو روشنی کے حقیقی منبع سے دور ہے لیکن تیرے اس عمل کو بیدار لوگ روشنی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اقبال نے جلنے کا لفظ اس بند میں دونوں طرح سے استعمال کیا ہے۔ روشنی کے حوالے سے اور کڑھنے کے حوالے سے! چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ تو جل رہی ہے تاہم حیرت اس امر پر ہے کہ تجھے اپنے جلنے کا بھی کچھ پتہ نہیں ہے۔ اس قدر چشم بینا رکھتے ہوئے بھی تو اپنی داخلی جلن سے آگاہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس میں اضطراب و بے چینی کے سبب پارے کی طرح تڑپ رہا ہوں۔ اور اس اضطراب و بے چینی سے میرا دل پوری طرح آگاہ ہے۔ شاید مجھے رب اعلیٰ نے جلنے اور پھٹنے کا احساس عطا فرما دیا ہے۔

چوتھا بند معنی: آگئی: واقعیت۔ کشاکش: کھینچنا، پھینچنا۔

مطلب: مجھے اپنی ذات کی شناخت کا جو شعور عطا کیا گیا ہے بظاہر یہ ایک معمولی سی چنگاری کے مانند ہے تاہم اس میں بے شمار آتشکدے پوشیدہ ہیں۔ بلندی و پستی میں امتیاز کی خصوصیت اسی کے سبب پائی جاتی ہے۔ آگئی کا یہی وہ شعور ہے جس کے سبب پھولوں میں خوشبو اور شراب میں نشہ کا عنصر برقرار ہے۔ یہی آگئی بلبل، پھول اور اس کی خوشبو کے علاوہ بندہ و آقا کے مابین فرق کا سبب بن جاتی ہے۔

پانچواں بند معنی: دلستان عشق: عشق کا دل لینے والا۔

مطلب: اس بند کے چھ اشعار بظاہر پوری نظم کے موضوع سے کچھ علیحدہ نظر آتے ہیں لیکن چوتھے اور چھٹے بند کے آخری اور ابتدائی حصے کے حوالے سے ان میں گہرا ربط نظر آتا ہے۔ زیر تشریح بند میں اقبال نے فلسفہ وجود کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ جب خالق کون و مکان نے ”کن“ کی صدا کے ساتھ کائنات کی تخلیق کی تو حسن عملاً عشق کا گردیدہ ہوا اور اسی کیفیت نے عاشق کے دل میں ایک تڑپ اور اضطراب پیدا کر دیا۔ اس لمحے انسان کو حکم دیا گیا کہ اسی جذبے کے تحت کائنات کے مظاہر کا جائزہ لے۔ لہذا، ”کہہ کر اس عالم موجودات میں آتے گئے کہہ کر، اشیاء کو تخلیق رکھا گیا ہے۔“

خالق ارض و سما نے انسان کو پیدا کر کے اس کے وجود اور جسم کو ایک ایسے حصار میں ڈال دیا جس کے سبب وہ اپنی حقیقت اور وجود سے بے خبر اور بڑی حد تک بے نیاز ہو گیا۔ چنانچہ یہی لمحہ تھا جب تخلیق کے ساتھ ہی حقیقت ازل سے وجود کے جحر کا آغاز ہو گیا۔ بالفاظِ دگر پہلے انسان ان قیود سے آزاد تھا جب کہ اب قدرت نے اس پر بیشتر ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال کر اسے ایک محدود حصار میں بند کر دیا۔ اب وہ زمانہ ختم ہو گیا جب انسانی وجود کا مسکن کوہ طور کے ایک درخت پر تھا۔ اس لمحے تو وہ کسی حجاب کے بغیر نور کبریائی کا نظارہ کیا کرتا تھا۔

اب تو صورت حال یہ ہے کہ انسان اپنے وجود میں ہی محصور ہو کر رہ گیا ہے اور الہیہ یہ ہے کہ وہ اس قید خانے کو ہی ایک باغ تصور کر بیٹھا ہے۔ اس کے علاوہ جس مقام پر وہ ایک اجنبی کی طرح بود و باش اختیار کیے ہوئے ہے۔ اس کو اپنا وطن سمجھتا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ وہ اپنے حقیقی وطن کی یاد میں افسردہ و پریشان رہتا ہے اور اس خالق حقیقی کی طلبِ دل و نظر کو مضطرب رکھتی ہے جس سے کبھی اس کا براہ راست رابطہ تھا۔

چھٹا بند معنی: مجبور: جسے سجدہ کیا جائے۔ آہنگ: آواز۔ گمند: ری جس کے ذریعے کوٹھے پر چڑھا جاتا ہے۔ طوق: حلقہ پٹا۔

مطلب: نظم کے اس آخری بند میں اقبال پھر سے شمع سے مکالمہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس پس منظر سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کس قدر فریب خوردہ ہے جو اپنے فانی وجود کو ہی ایک مستقل حقیقت سمجھ بیٹھا ہے حالانکہ ساکنانِ فلک کو سجدوں کا مال بھی اس کے رو برو ہے۔ ہر چند کہ میرا مقام بہت بلند ہے پھر بھی جحر کا ستیا ہوا ہوں۔ پھر بھی خالق کون و مکان کی مشیت سے ہم آہنگ ہوں۔ اس نے مجھ پر جو پابندیاں عائد کیں غالباً ان سے مقصد یہی تھا کہ ان سے زندگی کے ارتقائی مراحل طے کروں۔ اسی سبب ربِ اعلیٰ نے مجھے حیات و ممات کا عنوان بنا دیا ہے۔

یہ ایک حقیقتِ ابدی ہے کہ نایاب موتیوں کا مسکن بھی مٹی اور خاک کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اس کے باوجود وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ اب جو گمرانی میں اتر کر دیکھتا ہوں تو اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تصور میری بصارت اور بصیرت کا ہے و حقائق کو ان کے صحیح منظر نامے میں دیکھنے سے گریزاں ہے جب کہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ کائناتِ تخلیقی شعور کی منظر ہے۔ یہ فریب نہیں تو کیا ہے کہ تمام حقائق کو نظر انداز کر کے فرد اپنے شعور کی نمائش کا خواہاں ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا میں افتراق و امتیاز کی علیحدگی و امت پھیل رہی ہے۔

زمان و مکان کا سلسلہ انسانی حیات کے گرد ایک حصار کے مانند ہے۔ ہر چند کہ اپنی راہ گم کر بیٹھا ہوں۔ پھر بھی منزل تک رسائی میرا مطمح نظر ہے۔ فریبِ نظر میں جھٹلا ہونے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ حقائق کا سامنا کروں۔ لیکن صورت یہ ہے کہ خود ہی صیاد بن چکا ہوں اور اس کے دامن میں گرفتار بھی خود ہی ہوں۔ یہ کیا ستم ہے کہ خود کو حرم کی بلندی بھی سمجھتا ہوں اور اس پر استغلا پرندہ بھی! انی الواقع میں تو اس حقیقت سے بھی آگاہی نہیں رکھتا کہ حسن ہوں یا عشق کا گداز مجھ پر تو یہ بھید بھی نہیں کھلتا کہ محبوب ہوں یا میری حیثیت عاشق کی ہے چنانچہ میرے لیے یہ خدشہ بے جا نہیں کہ اپنی زبان پر وہی راز قدیم لے آؤں جس کا نتیجہ بھانسی کے پھندے کے سوا اور کچھ نہیں کہ جگ کا نتیجہ ہمیشہ تلخ ہی ہوتا ہے۔

ایک آرزو

019

کیا لطف انجن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو
شرائے جس سے جلوت، خلوت میں وہ ادا ہو
نخسے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
سرخ لپے سنہری ہر پھول کی قبا ہو
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو
میں اس کا ہمنوا ہوں، وہ میری ہمنوا ہو
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر درد مند دل کو رونا مرا رلا دے
بیہوش ہو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

*

یہ نظم بیس اشعار پر مشتمل ہے۔ حمید احمد خاں کے بقول اس نظم کو اگر سیوئیل راجرز کی نظم Wish کا آزاد ترجمہ بھی سمجھ لیا جائے اس صورت میں بھی ”ایک آرزو“ عملاً ایک شاہکار نظم غمرتی ہے۔ نظم کے ابتدائی دو تین اشعار میں اگرچہ یاسیت کی ایک جھلک ملتی ہے لیکن بعد کے کم و بیش تمام اشعار رجائیت کے آئینہ دار ہیں جن میں اقبال اپنی دلی خواہش کا کمال چاہکدستی سے اظہار کرتے ہیں چنانچہ نظم کا آغاز اس طرح سے ہوتا ہے۔

معنی: دل ہی بجھ گیا، دل ادا اس ہو گیا۔ شورش: شور۔ عزلت: گوشہ نشینی۔ جلوت: جہاں تنہائی نہ ہو۔
درا: جرس، ٹھنکی۔

مطلب: اقبالؒ رب ذوالجلال کو مخاطب کر کے اس طرح سے گویا ہوتے ہیں کہ اب دنیا کی محفلوں اور ان کے بھیلیوں سے میری طبیعت اکتا گئی ہے اس لیے کہ جب حوادثِ زمانہ سے دل ہی بھج کر رہ جائے تو ایسی محفلوں کا وجود بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب تو دنیا کے شور و شر سے طبیعت بیزار ہو کر رہ گئی ہے چنانچہ مجھے ایسی خامشی اور سکوت کی تلاش ہے جس پر تقریر کو بھی رشک آجائے۔

میں تو اب پر سکون زندگی پر فدا ہونے کا خواہاں ہوں اور اتنی ہی آرزو ہے کہ کسی پہاڑ کے دامن میں ایک مختصر سا جھونپڑا میسر آجائے جہاں ساری دنیا سے الگ تھلگ پر سکون زندگی پر فدا ہونے کا خواہاں ہوں اور اتنی ہی آرزو ہے کہ کسی پہاڑ کے دامن میں ایک مختصر سا جھونپڑا میسر آجائے جہاں ساری دنیا سے الگ تھلگ پر سکون زندگی بسر کر سکوں۔ صورت یہ ہو کہ انتہائی تنہائی میں دن گزارنے کے باوجود ہر قسم کے فکر و فاقے سے آزاد ہو جاؤں اور یہاں دنیا کا ایسا کوئی غم نہ ہو جو میرے سکون کو برباد کر سکے۔

میرے مسکن کے گرد و پیش کی کیفیت یہ ہو کہ چیزوں کی چچھاہٹ میں نفعی بکھر رہے ہوں اور بستے ہوئے چشموں کی صداؤں میں باجا سا بھتا محسوس ہو رہا ہو۔ کلیاں جب چٹکنیں تو یوں گلے چیسے وہ کسی کا پیغام مجھ تک پہنچا رہی ہیں۔ کلیوں اور پھولوں کے شگفتہ دہانے میرے لیے ایسے ساغر کی حیثیت اختیار کر لیں جن میں تمام مناظرِ فطرت کا جائزہ لے سکوں۔

اس جھونپڑے میں جب آرام کی خواہش ہو تو فرشِ زمین کی سبز سبز گھاس میرا بچھو تا ہو اور سر ہانا خود میرا ہاتھ ہو۔ اس لیے ایسی تنہائی کا عالم ہو جو انجمنِ آرائی سے کیسے دلنشیں محسوس ہو۔ وہاں موجود بلبل اور دوسرے ننھے ننھے پرندے مجھ سے اس طرح مانوس ہو جائیں جس طرح کہ ان کے دل سے ہر طرح کا خوف دور ہو گیا ہو۔

یہی نہیں بلکہ ہر جانب سرسبز پودے پوری شان و شوکت سے استلوا رہے ہوں۔ سامنے ندی کا شفاف پانی ایسے بہہ رہا ہو جس طرح کہ اس میں ان پودوں کی تصویر منعکس ہو رہی ہو۔ یہاں موجود پہاڑوں کا نظارہ بھی اتنا دلکش ہو۔ ندی اور چشموں کا پانی موجوں کی صورت میں بلند ہو کر جس کو دکھ سکے۔

یہاں اس امر کی نشاندہی بھی غیر ضروری نہ ہو گی کہ کم و بیش پوری نظم میں اقبالؒ نے مناظرِ فطرت کے بیان میں جو ایجبری پیش کی ہے وہ بے مثال ہے۔ چنانچہ آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ سرسبز گھاس اس طرح سے استلوا رہا ہو جیسے کہ وہ زمین کی آغوش میں محو خواب ہو۔ اور جہاں تک بستے ہوئے پانی کا تعلق ہو وہ جھاڑیوں میں سے گزرتا ہوا شفاف آئینے کے مانند چمک رہا ہو۔ پھر اس بستے ہوئے پانی کو پھولوں کی شبنمیں اس طرح سے چھو رہی ہو جیسے کوئی خوب رو حسینہ آئینہ دیکھ رہی ہو۔

انتہائی خوبصورت منظر نگاری کرتے ہوئے اس شعر میں اقبالؒ کہتے ہیں کہ وقت غروب جب سورج کی سرخ اور سنہری کرنیں شام کے وقت عکس ریز ہوں تو یوں محسوس ہو جیسے دلہن کو مندی لگائی جا رہی ہے۔ پھولوں کی کیفیت بھی ایسی ہو جیسے وہ سرخ اور سنہرے رنگ کی قبا پہنے ہوئے ہوں۔ بلاشبہ غروب ہوتے ہوئے سورج کی عکس ریزی کے حوالے سے اس سے زیادہ خوبصورت منظر کشی ممکن نہیں ہو سکتی۔ آگے چل کر اقبالؒ کہتے ہیں کہ رات کے راہی جب سفر کرتے کرتے تھک کر رہ جائیں تو میرے جھونپڑے کے دیئے کی دھندلی روشنی ان کے لیے امید کی علامت بن جائے اور جب آسمان پر ہر طرف بادل چھائے ہوئے ہوں اور راستہ نظر نہ آئے تو بجلی اس طرح سے چمک اٹھے کہ اس کی روشنی میں ان

تھکے ہوئے مسافروں کو میری کنیا نظر آجائے۔

یہی نہیں جب رات کے آخری لمحات میں صبح کے موزن کی طرح کو نکل کی صدا بلند ہو تو میں اس کا ساتھ دوں اور اسی طرح وہ میری ہم نوا بھی ہو۔ مسجدوں اور مندروں سے سحر کے عبادت گزاروں کو مطلع کرنے کے لیے جو اذانیں بلند ہوتی ہیں اور ناقوس کی صدا آتی ہے۔ مجھے ان کی ضرورت نہ ہو بلکہ طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنیں میری جھونپڑی کے روزنوں سے اندر داخل ہو کر مجھے بیداری کا پیغام دیں۔ اور جس لمحے صبح دم خشم پھولوں پر اس طرح برسے جیسے انہیں وضو کر رہی ہو تو اس لمحے میری آہ و فغاں میرے لیے وضو اور دعا کا کام دے۔ اس خامشی کے عالم میں میری آہ و فغاں اتنی بلند ہو جائے کہ تاروں کے قاتلوں کے لیے آواز سفر کا سبب بن جائے۔ یوں میرا رونا اس قدر موثر ثابت ہو کہ ہر درد مند دل بھی میرے ہمراہ گریہ کنساں ہو جائے اور میری آہ و فغاں سے جو صدا بلند ہو ممکن ہے کہ ان لوگوں کی بیداری کا سبب بن جائے جو ایک عرصے سے مست دبے ہوش پڑے ہیں۔

آفتاب صبح

020

شورش میخانہ انساں سے بالاتر ہے تو زینت بزم فلک ہو جس سے وہ ساغر ہے تو
 ہو در گوش عروس صبح وہ گوہر ہے تو جس پہ سیائے افق نازاں ہو وہ زیور ہے تو
 صفحہ ایام سے داغ مداد شب منا
 آسماں سے نقش باطل کی طرح کوکب منا
 حسن تیرا جب ہوا بام فلک سے جلوہ گر آنکھ سے اڑتا ہے یکدم خواب کی مے کا اثر
 نور سے معمور ہو جاتا ہے دامن نظر کھولتی ہے چشم ظاہر کو ضیا تیری مگر
 ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ تماشا چاہیے
 چشم باطن جس سے کھل جائے وہ جلوہ چاہیے
 شوق آزادی کے دنیا میں نہ نکلے حوصلے زندگی بھر قید زنجیر تعلق میں رہے
 زیر و بالا ایک ہیں تیری نگاہوں کے لیے آرزو ہے کچھ اسی چشم تماشا کی مجھے
 آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو
 امتیاز ملت و آئیں سے دل آزاد ہو
 بستہ رنگ خصوصیت نہ ہو میری زباں نوع انساں قوم ہو میری وطن میرا جہاں
 دیدہ باطن پہ راز نظم قدرت ہو عیاں ہو شناسائے فلک شمع تخیل کا دھواں
 عقدہ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے
 حسن عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے
 صدمہ آجائے ہوا سے گل کی پتی کو اگر اشک بن کر میری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر
 دل میں ہو سوز محبت کا وہ چھوٹا سا شرر نور سے جس کے طے راز حقیقت کی خبر
 شاہد قدرت کا آئینہ ہو دل میرا نہ ہو

سر میں جز ہمدردی انساں کوئی سودا نہ ہو
تو اگر زحمت کش ہنگامہ عامل نہیں یہ فضیلت کا نشان اے نیر اعظم نہیں
اپنے حسن عالم آرا سے جو تو محرم نہیں ہمسریک ذرۂ خاک در آدم نہیں
نور مجبود ملک گرم تماشا ہی رہا
اور تو منت پذیر کج فردا ہی رہا
آرزو نور حقیقت کی ہمارے دل میں ہے لیلی ذوق طلب کا گھر اسی محل میں ہے
کس قدر لذت کشود عقدہ مشکل میں ہے لطف صد حاصل ہماری سہی بے حاصل میں ہے
درد استغمام سے واقف ترا پہلو نہیں
جستوئے راز قدرت کا شناسا تو نہیں

*

سات بند پر مشتمل اس نظم میں علامہ اقبال نے صبحدم طلوع ہوتے ہوئے سورج سے مکالمہ کیا
ہے اور اپنی ذات کے حوالے سے آفتاب کے ساتھ نوع انسانی کے تعلق اور موخر الذکر کی امتیازی
حیثیت کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کی یہ نظم بھی امجری اور منظر نگاری کے اعتبار سے انتہائی بلند
مرتبے کی حامل ہے۔

پہلا بند معنی: درگوش: کان کا موتی، ایک زیور جو کان میں پنا جاتا ہے۔ سیمائے افق: افق کی پیشانی۔
مداوشب: رات کی سیاہی۔

مطلب: اس ابتدائی بند میں علامہ اقبال طلوع ہوتے ہوئے آفتاب سے یوں مخاطب کرتے ہیں کہ بے
شک تو انسانی دنیا کے ہنگاموں سے بہت زیادہ بلند و بالا ہے اس اعتبار سے بلند ہے کہ تیرا وجود انسانی دنیا
سے بہت زیادہ دور ہے اور تیرا تعلق آسمان سے ہے۔ تیرے ہی دم سے وہاں کا حسن اور رونق برقرار
ہے۔ اگر صبح کو دہسن کے مانند تصور کر لیا جائے تو اے آفتاب تجھے اس کے کان کو زینت بخشے والا موتی
تصور کیا جائے گا۔ تو ایسے حسین زیور کی طرح ہے جو افق کی پیشانی کے لیے بھی باعث ناز و فخر ہے۔ اے
آفتاب! تیرے طلوع ہونے کے ساتھ ہی دنیا سے رات کی تاریکی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ
آسمان پر ستارے بھی حرف غلط کی مانند غائب ہو جاتے ہیں۔

دوسرا بند مطلب: تو جس لمحے طلوع ہوتا ہے اور تیری حسین اور خوبصورت شعاعیں زمیں پر عکس
ریز ہوتی ہیں تو دنیا بھر کے لوگوں کی نگاہوں سے خند کا غلبہ ختم ہو جاتا ہے اور ان کی نظریں تیری روشنی
سے لبریز ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ تیری روشنی بظاہر آنکھوں کو نور عطا کرتی ہے تاہم امر واقع یہ ہے کہ میں وہ
منظر دیکھنے کا خواہاں ہوں جس کی بدولت کائنات کے پوشیدہ اسرار مجھ پر داہو جائیں اور میں حقیقت کا
ادراک کر سکوں۔

تیسرا بند معنی: زیر و بالا: اوپر نیچے۔ سرشک آباد: آنسوؤں کا گھر۔ امتیاز ملت و آئیں: قوم اور
شرع کا فرق۔

مطلب: اے آفتاب! ہر چند کہ میں ہمیشہ سے آزادی کا خواہاں تھا لیکن میری یہ طلب پوری نہ ہو سکی

اس کے برعکس ساری زندگی دنیوی تعلقات کے جھیلوں میں پھنسا رہا جب کہ تیری روشنی یہاں ہر اونٹنی و انٹی شخص کے لیے اور ہر کوئی بلا امتیاز اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ مجھے بھی ایسی نگاہ درکار ہے جو تیری مانند ہرست و بلند اور اپنے بیگانے کو کسی امتیاز کے بغیر دیکھنے کی حامل ہو۔ میں تو ایسی آنکھ چاہتا ہوں جو ہر کہہ و نہ کہہ کے دکھ و درد میں آنسو بہانے کی قائل ہو۔ یہی نہیں بلکہ مختلف اقوام اور وہاں کے قوانین سے منفی انداز کی تکلیف دہ روش سے آزاد ہو۔

چوتھا بند معنی: بستہ رنگ خصوصیت: خصوصیت کے رنگ میں بندھی ہوئی۔ عقدہ: مشکل بات۔

مطلب: میرا لب و لہجہ اور زبان ایسی ہو کہ کسی مخصوص جماعت یا گروہ کے اثرات سے ہم آہنگ نہ ہو۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ پوری انسانیت میری قوم ہو اور پوری دنیا میرے وطن کی مانند ہو۔ مجھ پر قدرت کی نعمتوں کے راز سربستہ انشاء ہو جائیں۔ یہی نہیں بلکہ میرا تخیل آسمان کی بلندیوں تک بھی رسائی رکھنے کا اہل ہو۔

اے آفتاب صبح! میری یہ دلی آرزو ہے کہ مجھے اس عالم فانی کے تفرقے اور جھیلے پریشان نہ کریں۔ اس کے برعکس مجھے ہر شے میں ایسا حسن اور خوبصورتی نظر آئے جو میرے عشق جنوں خیز میں لمحہ لمحہ اضافہ کر دے یعنی ہر شے سے بے نیاز ہو کر محبت اور وفا کو ہی اپنا مسلک سمجھوں۔

پانچواں بند معنی: شاہد: معشوق۔

مطلب: اے آفتاب صبح! میں تو اس قدر گداز طبع ہوں کہ اگر کسی پھول کی پتی کو بھی کوئی تکلیف پہنچے تو میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو جائیں یہی نہیں بلکہ میرے دل میں محبت کی ایسی آگ روشن ہو گئی ہے جس کی روشنی سے مجھ پر راز حقیقت کا انکشاف ہو جائے۔ جہاں تک میرے دل کا تعلق ہو وہ فطرت کے آئینے کی مانند ہو کہ اس میں سب کچھ نظر آجائے۔

چھٹا بند معنی: نیر اعظم: بڑا ستارہ مراد سورج۔

مطلب: اے آفتاب! اگر تو دنیا کے ہنگاموں اور مصائب کو برداشت کرنے کا اہل نہیں ہے تو یہ امر قطعی فخر و مباہات کا سبب نہیں جب تو اپنے حسن کی حقیقت سے ہی آگاہ نہیں جو پوری کائنات کا منور کرنے کا باعث ہوتا ہے تو اس صورت میں انسان کی ہمسری اور برابری کا اہل نہیں۔ انسانی نگاہ تو اے سورج تجھ کو دیکھتی رہی لیکن تو تھا کہ آنے والی کل کا خطر ہی رہا۔

ساتواں بند معنی: سعی: کوشش۔ استفہام: سوال۔

مطلب: ہم تو حقائق کے نور کی خواہش دل میں لیے ہوئے ہیں۔ جو کائنات کے رازوں کو بے نقاب کر دے کہ یہی ہمارا بنیادی مسئلہ ہے تو اس حقیقت سے قطعی طور پر بہرہ ور نہیں ہے کہ مشکل مسائل کو حل کرنے میں کس قدر لطف موجود ہے اور اسی کوشش میں وہ کیفیت موجود ہے جو کچھ پانے کی جستجو سے تعلق رکھتی ہے۔ اے آفتاب! آگاہی کے اس جذبے سے تو قطعی محروم ہے اس لیے کہ فطرت کے اسرار کو پانے کی طلب تجھ میں موجود ہی نہیں ہے۔

درد عشق

021

اے درد عشق! ہے گھر آب دار تو ناعرموں میں دیکھ نہ ہو آشکار تو
 پنہاں تہ نقاب تری جلوہ گاہ ہے ظاہر پرست محفل نو کی نگاہ ہے
 آنی نئی ہوا چمن ہست و بود میں اے درد عشق! اب نہیں لذت نمود میں
 ہاں! خود نمائیوں کی تجھے جستجو نہ ہو منت پذیر نالہ بلبل کا تو نہ ہو
 خالی شراب عشق سے لالے کا جام ہو پانی کی بوند گریہ شبنم کا نام ہو
 پنہاں درون سینہ کہیں راز ہو ترا اشک جگر گداز نہ غماز ہو ترا
 گویا زبان شاعر رنگیں بیاں نہ ہو آواز نے میں شکوہ فرقت نماں نہ ہو
 یہ دور نکلت چسپ ہے کہیں چھپ کے بیٹھ رہ
 جس دل میں تو کہیں ہے وہیں چھپ کے بیٹھ رہ

غافل ہے تجھ سے حیرت علم آفریدہ دیکھ جو یا نہیں تری نگہ نارسیدہ دیکھ
 رہنے دے جستجو میں خیال بلند کو حیرت میں چھوڑ دیدہ حکمت پسند کو
 جس کی بہار تو ہو یہ ایسا چمن نہیں قابل تری نمود کے یہ انجمن نہیں
 یہ انجمن ہے کشتہ نظارہ مجاز مقصد تری نگاہ کا غلوت سرائے راز
 ہر دل سے خیال کی مستی سے چور ہے
 کچھ اور آج کل کے کلموں کا طور ہے

*

معنی: گھر آب دار: چمکدار موتی۔ ظاہر پرست: چیزوں کے ظاہر پر مرنے والا۔ ہست و بود: ہستی اور وجود۔ نے: بانسری۔

مطلب: ①② اس نظم میں اقبال عشق کے جذبے میں جو کھکھوتی ہے اس سے مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تو ایک انسانی چمکدار موتی کے مانند ہے لہذا تجھ پر لازم ہے کہ جو اس جذبے سے آگاہی نہیں رکھتے ان کے رد و رد اپنے وجود کو آشکار نہ کرے۔ تیری کیفیت تو اس حسین چہرے کی سی ہے جو نقاب میں چھپا ہونے کے باوجود بھی اپنی تابندگی مظہر ہوتا ہے۔ میں تجھے اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ عہد نو کے لوگ محض ظاہری چیزوں کو ہی اہمیت دیتے ہیں اور باطن تک ان کی نظر نہیں پہنچتی۔

③④ اے درد عشق! اس کائنات میں تو ایسی ہوا چل پڑی ہے کہ باشعور لوگ اب اپنے رد و رد ظاہر اشیاء سے لطف نہیں اٹھا سکتے چنانچہ تیرے لیے لازم ہے کہ اپنے وجود کو ظاہر کرنے کی جستجو نہ کرنے اور خود کو اسی طرح ظاہر میں نگاہوں سے محفوظ رکھے یوں بھی تیرے لیے کیا ضروری ہے کہ خود کو نالہ بلبل کی احسان مندی قبول کرے۔ کہ اس طرح تو تیری حیثیت ظاہر ہونے کا امکان ہے۔

⑤⑥ اے درد عشق! موجودہ صورت حال میں تو ایسی کیفیت دہنی چاہیے الے کے پھول کے حوالے سے بھی جذبہ محبت کے مظہر کا امکان نہ ہو۔ اور کائنات پانی کی بوندوں میں شبنم کے قطرے کی

کرے۔ تیرا زہد ستور سینے کے کسی گوشے میں پوشیدہ رہنا ضروری ہے تاہی تجھ سے منسوب آہ بھی سنائی دے جو سننے والے کے جگر کو تڑپا کر اور گداز کر کے رکھ دیتی ہے۔

⑦⑧ بالکل اسی طرح سے جیسے کہ شاعر نگیں نوا اپنے نغموں کا سلسلہ منقطع کر دیتا ہے یا کوئی بانسری بجانے والا اپنے سروں میں جدائی کی کیفیت کا اظہار کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اے درد عشق! تجھ پر بھی یہ لازم ہے کہ اس عند نکتہ چیں سے خود کو کہیں روپوش کرے۔ تیرے لیے مناسب یہی ہے کہ جو دل تیری آماجگاہ ہے وہیں مستقل طور پر اپنا مسکن بنالے! مراد یہ ہے جذبہ عشق کی کک اظہار کے ساتھ ہی اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہے۔ لہذا اس باطن تک ہی محدود کرنا لازم ہے۔

⑨⑩ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اے درد عشق! تیرے وجود سے اہل علم و دانش آگاہ نہیں اور تیری کک کا بھی انہیں اور اک نہیں! لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے تو ان اہل علم و دانش کو اسی طرح سے حیرت زدہ ہی رہنے دے اور جو لوگ خود کو حکمت و آگہی کا مظہر سمجھتے ہیں انہیں بدستور عدم واقفیت کا شکار ہی رہنے دے۔

(11-12) یہ ماحول ایسا نہیں ہے جو تیرے سبب بار آفریں بن سکے۔ اس لیے کہ یہ تو ایسی جگہ ہے جہاں تیری نمود کی گنجائش ہو۔ مراد یہ ہے کہ اس عالم رنگ و بو کے لوگ عملی طور پر بے حس ہو چکے ہیں اور لطیف جذبوں سے محروم ہیں۔ یہ پورا ماحول باطنی اسرار کی آگہی سے قطعی طور پر نا آشنا ہے جب کہ تیرا دراک تو وہی کر سکتا ہے جو باطن میں جھانکنے کی صفت کا حامل ہو۔ آج کل کے لوگوں کی کیفیت تو بس ایسی ہے کہ وہ اپنے اپنے خیالات میں گم رہنے والے ہیں اس طرح عصر موجود کے باسیوں کے طور طریقے ہی ماضی کی نسبت بڑی حد تک تبدیل ہو کر رہ گئے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ آج کا دور محض اک مادی دور ہے جس میں باطنی سطح پر معاملات کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ ظاہری حقیقتوں کا اور اک ہی ان کی فطرت ہے سوائے عشق کی کک تیری اہمیت اسی صورت میں برقرار رہ سکتی ہے کہ اپنے وجود کو ایسے لوگوں سے پوشیدہ رکھے۔

گل پڑ مردہ

022

کس زباں سے اے گل پڑ مردہ تجھ کو گل کہوں!
کس طرح تجھ کو تمنائے دل بلبل کہوں
تھی کبھی موج صبا گموارۂ جنبیل ترا
نام تھا صحن گلستاں میں گل خنداں ترا
تیرے احساں کا نسیم صبح کو اقرار تھا
باغ تیرے دم سے گویا طبلہ عطار تھا

تجھ پہ برساتا ہے شبنم ویدہ گریاں مرا
ہے نہاں تیری اداسی میں دل ویراں مرا
میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اک تصویر تو
خواب میری زندگی تھی جس کی ہے تعبیر تو
بچو نے از نیتان خود حکایت ی کنم
بشنو اے گل! از جدانہا شکایت ی کنم

*

نظامہ اقبال کی زیر تشریح مختصر سی نظم محض دو بند پر مشتمل ہے۔ ان اشعار کے مندرجات سے اس

امر کا بخوبی انداز ہوتا ہے کہ علامہ کی نظر زندگی کے کم و بیش تمام مسائل پر تھی۔
 پہلا بند معنی: گل پژمرده: مرجحایا ہوا پھول۔ گوارہ جنبیل: ہلنے والا جھولا۔ طبلہ عطار: عطر
 فروخت کرنے والے کا صندوقچہ۔

مطلب: اس بند میں اقبال کا مکالمہ ایک ایسے پھول سے ہوتا ہے جو مرجحایا چکا ہے اور اس طرح اپنی
 تازگی کے علاوہ آب و تاب بھی کھو چکا ہے چنانچہ وہ اس مرجحائے ہوئے پھول سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں
 اب تیری ہیئت ہی تبدیل ہو چکی ہے اس صورت میں تجھے پھول قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کیفیت میں تو تو
 بلبل کے لیے بھی کشش کا سبب نہیں ہو سکتا۔ میں اس دور کو یاد کرتا ہوں کہ موج صبا تجھے ہلکارے دیا کرتی
 تھی اور اس کی آغوش تیرے لیے ہلتے ہوئے گوارے کی مانند ہوا کرتی تھی اور بارغ میں تیرا وجود
 مسکائوں کا آئینہ دار رہتا۔ صبح کی نسیم تیری خوشبو سے معطر ہوتی تھی اور یہ خوشبو پھر سارے گلستاں کو
 معطر کر دیتی تھی۔

دوسرا بند معنی: نیتان: سرکنڈوں کی جگہ (مراد ہے وطن)۔

مطلب: آج تیری صورت دیکھ کر اے مرجحائے پھول ہوئے میری آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ اور
 یوں لگتا ہے کہ تیری اداسی میں میرا دل ویران پوشیدہ ہے۔ دیکھا جائے تو تیرا وجود میری بربادی کی ایک
 چھوٹی سی تصویر ہے جس شے کی میری زندگی ایک خواب بھی بظاہر یوں لگتا ہے کہ تو اس خواب کی تعبیر
 ہے۔

اے مرجحائے ہوئے پھول (غور سے سن کہ میں تجھے اپنی اس کیفیت کا گلہ کر رہا ہوں جو ہجر و فراق
 سے عبارت ہے۔

سید کی لوح تربت

023

اے کہ تیرا مرغ جاں تار نفس میں ہے اسیر
 اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ
 اے کہ تیری روح کا طائرِ قفس میں ہے اسیر
 شر جو اجڑا ہوا تھا اس کی آبادی تو دیکھ
 فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی
 صبر و استقلال کی بھیتی کا حاصل ہے یہی

سنگِ تربت ہے مرا گرویدہٴ تقریر دیکھ

چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

دعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں! ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھانا کہیں

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے دیکھ! کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

مخفل نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیر

رنگ پر جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیر

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا

عرض مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تھے نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تھے
 بندہ مومن کا دل نیم و ریا سے پاک ہے
 قوت فرماں روا کے سامنے بیباک ہے
 ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامہ معجز رقم شیش دل ہو اگر تیرا مثال جام جم
 پاک رکھ اپنی زبان، تمیز رحمانی ہے تو ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو
 سونے والوں کو دگا دے شعر کے اعجاز سے
 خرمن باطل جلا دے شعلہ آواز سے

✽

علامہ اقبال کے ہم عصر دانشور اور بعض شارحین کے نزدیک یہ نظم عملی سطح پر ”سرسید احمد خاں“ کے پیغام کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم میں سرسید کے نظریات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ یہ نظم ایک طرح سے چار بند پر مشتمل ہے۔

پہلا بند معنی: گرویدہ تقریر: تقریر کا شیدائی۔

مطلب: اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں ان اشعار میں بتایا ہے کہ سرسید احمد خاں کی تربت کا کتبہ زبان حال سے ہندوستان کے باشندوں سے یوں گویا ہے کہ تم زندگی کی بھول بھلیوں میں گرفتار ہو اور تمہاری روح بھی شب و روز کے عوامل میں مقید ہے۔ ذرا ان لوگوں کی جانب بھی نظر کرو جیساں آزادی سے نغمہ پیرائی تو کر رہے ہیں لیکن یہ امر بھی ذہن میں رہے کہ میں نے تو اپنی جد و جہد اور فکری کاوشوں سے اس دیرانے میں ایک شہر بسا دیا ہے۔

سن لو کہ جو محفل میرے خوابوں کی ماحصل تھی وہ اپنی تعبیر کی حیثیت سے تمہارے روہرو ہے۔ میں نے جس صبر و استقامت کے ساتھ اپنی جد و جہد سے جو کھیتی کاشت کی تھی اس کا پھل سامنے آچکا ہے۔ چنانچہ میری لوح تربت جن الفاظ میں تجھ سے عالم خیال میں مخاطب ہے اپنی چشم باطن سے اس کی طرف سنجیدگی سے توجہ کرو۔

دوسرا بند معنی: روانہ کرنا: نہ کھولنا۔

مطلب: اے لوگو! اگر دنیا میں تمہارا مقصد دین کی تعلیم پھیلانا ہے تو خدا را اپنی قوم کو رہبانیت یعنی دنیا کو ترک کرنے کا سبق نہ دینا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ فرقہ بندی کی حمایت میں کبھی اپنی زبان نہ کھولنا۔ اس لیے کہ یہ ایک ایسی لعنت ہے جو ملک و ملت کی تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔ اس کے برعکس تمہاری ہر تحریر اور تقریر نے اتحاد و اتفاق کا عنصر نمایاں ہونا چاہیے۔ اور نہ ہی ایسی گفتگو کرنا جو دوسروں کے لیے دل دکھانے کا سبب بن جائے۔ مزید یہ کہ آج کے ترقی پذیر معاشرے میں ماضی کی روایات کو دہرانا درست نہیں۔ اس لیے کہ اب اس نوع کی افسانہ طرازی ماحول میں کوئی رنگ نہیں بھر سکتی تاہی اس سے کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہو گا۔

تیسرا بند معنی: مدبر: تدبیر کرنے والا۔ ارباب سیاست: سیاسی لوگ۔

مطلب: سرسید کی تربت اس بند میں یوں گویا ہے کہ تم لوگوں سے جو مدبر اور سیاستدان ہیں وہ خود

نیرا پیغم سن لیں کہ جرات مندی اور دلیری ان کا شعار ہونا چاہیے کہ وہ ملک و ملت کے مفاد میں حقیقت پسندی اور راست گوئی کے ساتھ اپنا مافی الضمیر پیش کریں۔ اور سچائی کے انکار میں کسی قسم کی جھجک کسی طور پر بھی مناسب نہیں اس لیے کہ اگر ملت درست ہو تو اپنی بات کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔ یوں بھی نیک اور حق گو انسان کا دل کسی بھی جھجک اور تذبذب کا شکار نہیں ہوتا اور حکمران خواہ کتنے بھی جاہل ہوں ان کے روہرو اپنے نقطہ کا انکار پوری ییابی اور جرات مندی کے ساتھ کرتا ہے۔

چوتھا بند معنی: خامہ معجز رقم: ایسا قلم جس کی تحریر معجزہ ہو۔ تلمیذ رحمانی: خدا کا شاگرد (مراد ہے خدا سے فیض پانے والا)۔

مطلب: اگر تم میں سے کوئی ادیب یا شاعر ہے تو تیرا دل ہر طرح کی منافقت اور ریاکاری سے پاک ہونا ضروری ہے اس لیے کہ تم لوگ فطرت کے شاگرد ہو لہذا تمہارا لب و لہجہ کسی حالت میں بھی بے آبرو نہیں ہونا چاہیے! اپنے اشعار کے اعجاز سے ان لوگوں کو بیدار کر دو جو ایک عرصے سے غفلت کی نیند سو رہے ہیں۔ آخری بات یہ ہے کہ جمہور اور باطل کو اپنی حق گوئی اور راست بازی سے فدا کر دو!

اقبال نے اس نظم میں سرسید احمد خاں کی لوحِ تربت کے مکالمے کے حوالے سے بعض ایسی حقیقتوں کا انکار کیا ہے جو سرسید اور خود اقبال کی فکر سے مطابقت رکھتی ہیں۔ ان کے نزدیک ایسی ہی انقلابی کارکردگی کے سبب معاشرے کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک ایسی نظم ہے جو ہر پہلو سے غور طلب اور بے حد اہم ہے۔

ماہ نو

024

نوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل ایک کلوا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل
 طشت گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خون ناب نشتر قدرت نے کیا کھولی ہے فصد آفتاب
 چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی
 نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی
 قافلہ تیرا رواں بے منت بانگِ درا گوشِ انساں سن نہیں سکتا تری آواز پا
 گھٹنے بڑھنے کا سماں آنکھوں کو دکھلاتا ہے تو ہے وطن تیرا کدھر؟ کس دیس کو جاتا ہے تو؟
 ساتھ اے سیارہ ثابت نمائے چل بچھے خارِ حسرت کی خلش رکھتی ہے اب بیکل مجھے
 نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں میں
 ظفلک سیماب پا ہوں کتبِ ہستی میں میں

*

پہلا بند معنی: طشت گردوں: آسمان کا تھمال (مراد ہے آسمان)۔ خون ناب: خالص خون یعنی سرفی۔
 شیمِ خام: خالص چاندی۔

مطلب اس انتہائی مختصر نظم میں اقبال نے حسب معمول نہایت خوبصورت استعاروں کے ذریعے
 ... کے کردار کا جائزہ لیا ہے اور ان حوالوں سے اپنی بات بھی کی ہے۔ اس بند میں شام کا منظر بیان کرتے

ہو۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب سورج اپنا سفر تمام کر کے شام کے دھندلکے میں غرق ہو گیا تو یوں محسوس ہوا کہ اس کے نور کا ایک ٹکڑا سطح آسمان پر ہلال نوکی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اس لمحے کا منظر بیان کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ لمحہ وہ ہے کہ شفق کی سرخی اپنی انتہا پر پہنچ چکی ہے بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ فطرت نے سورج کی سرخی انہیل کر رکھ دی ہے۔ ہلال نو کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے شام ایک دلہن کی مانند ہے اور ہلال نواس کے کانوں کی بانی ہے یا پھر شفاف پانی میں چاندی کے رنگ جیسی مچھلی تیر رہی ہو۔

دوسرا بند معنی: سیارہ ثابت نما: وہ سیارہ جو حرکت کرتا ہے لیکن محسوس ہوتا ہے کہ کھڑا نہیں ہوتا۔

مطلب: اس بند میں اقبال ”ہلال نو“ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں تیرا قافلہ گھنٹیوں کے بغیر بڑی خاموشی سے رواں دواں ہے۔ یہ ایسا سکوت ہے جو انسانی کانوں تک جس کی رسائی ممکن نہیں۔ کبھی تو اپنے انجم میں کم ہو جاتا ہے اور کبھی زیادہ! قدرتی طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ تیرا سفر کس جانب رواں ہے اور تیری قیام گاہ کہاں ہے؟ اسے رواں دواں رہنے والے سیارے مجھے بھی اپنے ہمراہ لے چل۔ اس لیے کہ میں خود بھی اس ماحول سے پریشان ہوں جو میرے گرد و پیش موجود ہے۔ میں تو تاریکی کی بجائے روشنی کا طالب ہوں اور ایسے بچے کی مانند ہوں جو مدرسے کے نامناسب ماحول سے گھبرا آتا ہے۔

انسان اور بزم قدرت

025

صبح خورشید درخشاں کو جو دیکھا میں نے
پر تو مہر کے دم سے ہے اجالا تیرا
مہر نے نور کا زیور تجھے پہنایا ہے
گل و گلزار ترے خلد کی تصویریں ہیں
سرخ پوشاک ہے پھولوں کی درختوں کی ہری
ہے ترے خیمہ گردوں کی طلائی جھار
کیا بھلی لگتی ہے آنکھوں کو شفق کی لالی
رجہ تیرا ہے بڑا شان بڑی ہے تیری
صبح اک گیت سراپا ہے تری سطوت کا
میں بھی آباد ہوں اس نور کی بستی میں مگر
نور سے دور ہوں ظلمت میں گرفتار ہوں میں

کیوں یہ روز، یہ بخت، یہ کار ہوں میں
بام گردوں سے یا صحن زمیں سے آئی
بہاؤں ہے تری ہستی ہے گلزار وجود
مشق کا تو ہے صفیہ تری تفسیر ہوں میں
بار جو مجھ سے نہ اٹھا، وہ اٹھایا تو نے
میرے گلے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے

نور خورشید کی محتاج ہے ہستی میری اور بے منت خورشید چمک ہے تیری
 ہو نہ خورشید تو ویراں ہو گلستاں میرا منزل عیش کی جا، نام ہو زنداں میرا
 آہ! اے راز عیاں کے نہ سمجھنے والے حلقہ دام تمنا میں الجھنے والے
 بائے غفلت! کہ تری آنکھ ہے پابند مجاز ناز زیبا تھا تجھے، تو ہے مگر گرم نیاز
 تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
 نہ یہ روز رہے پھر نہ یہ کار رہے



پہلا حصہ معنی: معمورہ ہستی: زندگی کی ہستی یعنی دنیا۔ پر تو مہر سورج کی روشنی۔ سیم سیال: ہستی
 ہوئی چاندی۔ سورہ والشمس: قرآن پاک کی ایک سورت جو الشمس سے شروع ہوتی ہے۔ سطوت: برع۔
 مطلب: اس نظم کا اگر گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو اس امر کا اندازہ ممکن ہے کہ علامہ نے یہاں
 پہلی بار فلسفہ خودی کی نشاندہی کی ہے اور یہی فلسفہ آگے جا کر ان کی شاعرانہ فکر کا بنیادی مرکز بنا۔ چنانچہ
 نظم کے پہلے شعر میں فرماتے ہیں کہ چمکتے ہوئے سورج کے لمحات میں جب میں نے صبح کے وقت کا نظارہ کیا تو
 اس کائنات سے استفسار کیا جس میں خود میری ذات بھی موجود ہے کہ مجھ میں جو اجالا ہے وہ اسی سورج کی
 روشنی کے سبب ہے اور تیرے دریاؤں کا چاندی کے مانند شفاف پانی بھی اسی کے دم سے ہے۔ یہ سورج
 ہی ہے جس نے تجھے نور کا زور پڑایا ہے اور اسی سورج کا وجود تیری بزم میں ایک روشن شمع کے مانند ہے
 جس کی روشنی سے ہر شے منور دکھائی دیتی ہے۔ اے کائنات یہ جو تیرے دامن میں گل و گلزار ہیں وہ
 بہشت کا منظر پیش کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ یہ سب قرآن کریم کے سورہ والشمس کی تفسیریں ہیں۔
 مذکورہ باغات میں جو پھول اور اشجار موجود ہیں، علی الترتیب ان کا لہارہ سرخ اور سبز رنگ کا لگتا ہے بالکل
 اسی طرح جیسے کہ تیری محفل میں کوئی سبزی اور کوئی لال پری ہو۔

اے دنیا تیرا جو آسمان ہے وہ ایسے خیمے کی طرح سے ہے جس کے گرد سنہری جھال لٹک رہے ہوں اور
 افق پر جو سرخی مائل بدلیاں دکھائی دیتی ہیں ان کے ساتھ شفق کی سرخی بھی انتہائی بجلی لگتی ہے جس کے
 سبب شام کا وقت بھی سرخی مائل دکھائی دیتا ہے۔ اے دنیا تیرا مرتبہ بہت بلند ہے اور تیری شان بھی بڑی
 ہے۔ اسی لیے تیرے دامن میں جو بھی چیز موجود ہے وہ نور کے پردے میں چھپی ہوئی ہے۔ صبح کو دیکھا
 جائے تو پتہ چلا ہے کہ یہ بھی تیری عظمت کے گیت گارہی ہے اور جہاں تک خورشید کا تعلق ہے تو اس
 کے منظر نامے میں تاریکی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ تیری اس نور کی ہستی میں ہر چند کہ میں بھی رہاؤں
 پذیر ہوں لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ میری قسمت کا ستارہ روشنی سے محروم ہے تیری ان روشنیوں سے
 دور ہوتے ہوئے میرا وجود ظلمت کے محبس میں ایک قیدی کے مانند ہے چنانچہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں
 کہ پھر کیا وجہ ہے کہ میں ہی تیرے دامن میں رہتے ہوئے بدنصیبی اور بد قسمتی کا شکار ہوں؟

دوسرا حصہ معنی: بود و نبود: ہونا نہ ہونا۔ صحیفہ: آسمانی کتاب۔

مطلب: نظم کے اس حصے کا آغاز اقبال پہلے استفسارات کے جوابات کی صورت میں یوں کرتے ہیں کہ
 میں ابھی اپنے انہی خیالات میں گم تھا کہ معائیں سے میرے کانوں میں آواز آئی تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا

کہ یہ آواز آسمان سے یا پھر زمین سے بلند ہوئی۔

اے انسان! اس حقیقت کو جان لے کہ کائنات کا عدم یا وجود صبح دم طلوع ہوتے ہوئے سورج کے دم سے نہیں بلکہ تیری ذات سے ہے کہ تیری ہی ذات ہے جو میرے گلستاں کے لیے ایک باغبان کی مانند ہے۔ اے انسان! تیرا وجود ہی ہر نوع کی خوبصورتیوں کا مجموعہ ہے اور جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو ان خوبصورتیوں اور مظاہر فطرت کے عکس کی طرح سے ہوں تو ہی عشق کا وہ صحیفہ ہے جس کی تفسیر میری ذات ہے۔ تو ہی ہے جس نے میرے بڑے ہوئے کاموں کی مثبت انداز میں تکمیل کی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کارکردگی کے ضمن میں جو بوجھ میں نہ اٹھا سکی وہ تو نے ہی اٹھایا ہے۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے دیکھا جائے تو وہ سورج کی روشنی کی محتاج ٹھہرتی ہے جب کہ تجھ میں جو چمک اور تابندگی ہے اس کے لیے سورج کی روشنی قطعی طور پر درکار نہیں۔ اگر سورج کا وجود نہ ہو تو میرا گلستاں اور میری ہستی ایک ویران صحرا میں تبدیل ہو کر رہ جائے اس کے برعکس تیری ذات سورج کے کسی جوہر کی محتاج نہیں۔ سورج کے بغیر تو میرے تمام عشرت کدے، عملاً زندانوں میں تبدیل ہو کر رہ جائیں۔

افسوس! اے انسان تو اس راز کو بھی نہ سمجھ سکا جو عملاً بالکل واضح ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ تو خود ہی اپنی خواہشوں کے دام میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ یہ کیسی غفلت ہے اور مقام افسوس بھی ہے کہ تیری آنکھ محض ظاہر پرست ہے اور اس کے ساتھ ہی حقائق سے نا آشنا بھی ہے تیری حیثیت تو محبوب و مطلوب کی ہے جب کہ اپنی کج فہمی کے سبب تو طالب بن کر رہ گیا ہے آخری بات یہ ہے کہ اگر تو اپنی حقیقتوں کا پوری طرح ادراک کر لے تو اس کے بعد تیری بد بختی اور بدنصیبی ختم ہو کر رہ جائے۔

سایم صبح (ماخوذ از لائک فیلو)

026

نسیم زندگی پیغام لائکی صبح خنداں کا
کنارے کھیت کے شانہ ہلایا اس نے دھاقاں کا
اندھیرے میں اڑایا تاج زر شمع شبستری کا
برہمن کو دیا پیغام خورشید درخشاں کا
نہیں کھکا ترے دل میں نمود مر تباہی کا
چمک او غنچہ گل! تو موزن ہے گلستاں کا
چمکنے کو ہے جگنو بن کے ہر ذرہ بیاباں کا
تو یوں بولی نظاراً دیکھ کر شہر خموشاں کا

اجالا جب ہوا رخصت جبین شب کی افشاں کا
جگایا بلبل رنکس نوا کو آشیانے میں
طلسم ظلمت شب سورۃ والنور سے توڑا
پڑھا خوابیدگان دیر پر افسون بیداری
ہوئی بام حرم پر آ کے یوں گویا موزن سے
پکاری اس طرح دیوار گلشن پر کھڑے ہو کر
دیا یہ حکم صحرا میں، چلو اس قاف! اور!
سوئے گور غریباں جب مہنی زندوں کی ہستی ہے

ابھی ترام تے نہ رہو میں پھر بھی آؤں گی
ملا دوں گی جہاں خواب سے تم کو جگاؤں گی

معنی: افشال: ستارے سے جو عورتیں آرائش کے لیے اپنے بالوں پر چھڑکتی ہیں۔ وہقال: کسان۔ سورۃ والنور: یہاں مراد ہے سورج کا اجالا۔ خوابیدگان دیر: بت خانے میں سونے والے۔ شمر خوشاں: چپ رہنے والوں کی بہتی یعنی قبرستان۔

مطلب: نواشعار پر مشتمل یہ نظم مشہور زمانہ امریکی شاعر ”لانگ فیلو“ کی تخلیق (Day Break) The دی ڈے بریک کا آزاد ترجمہ تو نہیں کہی جاسکتی البتہ بقول علامہ اقبال اس سے ماخوذ ضرور ہے اس نظم میں اقبال نے جس نوع کی امیجری اور فطرت نگاری سے کام لیا ہے وہ ان کی فن پر مکمل گرفت اور قادر الکلامی کی دلیل ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ جب آسمان پر ستارے ڈوب گئے اور شب کا اختتام ہوا تو نہستی کھلتی زندگی پیغامِ سحر لے کر نمودار ہو گئی یعنی صبح اپنے اجالے کے ساتھ وارد ہو گئی اور اپنے عمل میں اس طرح مصروف ہوئی کہ بلبل جو اپنے گھونسلے میں محو استراحت ہوئی پہلے اسے جگایا اس کے بعد کسان جو کھیت کے کنارے پر محو خواب تھا اسے بھی بیدار کر دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے سورۃ والنور کی قوت سے ظلمتِ شب کا ظلم توڑ ڈالا اور عشرت گاہوں میں روشن ہونے والی شمعوں کو بھی بجھا دیا۔ جو برہمن مندروں میں سو رہے تھے ان کو بھی بیدار کیا اور طلوع ہونے والے سورج کا پیغام بھی دیا۔ دوسری جانب اس نے موزن سے مسجد میں پہنچ کر یوں مکالمہ کیا کہ سورج نکلنے کے بعد نہ اذان کا وقت باقی رہے گا تاہی نماز کا! اس لیے بیدار ہو کر اذان بھی دے اور نماز بھی ادا کر۔ پھر وہ باغ میں آئی اور غنچوں کو چٹکنے کی طرف راغب کیا۔ اس کے بعد صحرا کی جانب نکل گئی اور تھکے ماندے قافلوں کو پھر سے آنا سفر کے لیے آمادہ کیا کہ اب دھوپ نکلنے والی ہے اس لیے روانہ ہو جاؤ۔ اس کے بعد وہ قبرستان میں جا پہنچی تو وہاں سنانے کو دیکھ کر اہل قبور سے یوں گویا ہوئی کہ ابھی تم آرام سے لیٹے رہو کہ میں بعد میں پھر یہاں آؤں گی اور زمانے بھر کو بیدار کرنے کے بعد تمہاری بیداری کا اہتمام کروں گی۔

عشق اور موت (ماخوذ از پی سن)

027

سہانی نمود جہاں کی گھڑی تھی تبسم فشاں زندگی کی کلی تھی
کیسں مر کو تاج زر مل رہا تھا عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی
سہ پیرہن شام کو دے رہے تھے ستاروں کو تعلیم تابندگی تھی
کیسں شاخ ہستی کو لگتے تھے پتے کیسں زندگی کی کلی پھوٹی تھی
فرشتے سکھاتے تھے شبہم کو رونا ہنسی گل کو پہلے پہل آ رہی تھی
عطا درو ہوتا تھا۔ شاعر کے دل کو خودی تشنہ کام مئے بخودی تھی
انہی اول اول گھٹا کالی کالی کوئی حور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی
زمیں کو تھا دعویٰ کہ میں آسماں ہوں
مکان کہ رہا تھا کہ میں لامکاں ہوں

غرض اس قدر یہ نظر تھا پیارا
ملک آزاتے تھے پرواز اپنی
فرشتہ تھا اک، عشق تھا نام جس کا
فرشتہ کہ پتلا تھا بیتابیوں کا
بچے میر فردوس کو جا رہا تھا
یہ پوچھا ”ترا نام کیا؟ کام کیا ہے؟
ہوا سن کے گویا قضا کا فرشتہ
اڑاتی ہوں میں رخت ہستی کے پرے
مری آنکھ میں جادوئے نیستی ہے
مگر ایک ہستی ہے دنیا میں ایسی
شر بن کے رہتی ہے انسان کے دل میں
پہنتی ہے آنکھوں سے بن بن کے آنسو
سنی عشق نے گفتگو جب قضا کی
گری اس تبسم کی بجلی اجل پر
بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ
قضا تھی، شکار قضا ہو گئی وہ

*

یہ نظم ممتاز برطانوی شاعر ٹینیسن کی نظم ”Love and Death“ سے ماخوذ ہے۔ اقبال نے نظم کے مرکزی اور بنیادی خیال کو پوری مہارت کے ساتھ اپنے مخصوص خوبصورت انداز میں اپنے ہاں منتقل کیا ہے۔ یہ نظم عملاً دو بند پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں اقبال نے آغاز کائنات کے حوالے سے مختلف عناصر کی صورت حال کو پیش کیا ہے جب کہ دوسرے بند میں عشق اور موت کے مابین جو مراحل ہیں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

پہلا بند معنی: تبسم فشاں: مسکراتی ہوئی۔ تشنہ کام: پیاسی۔

مطلب: نظم کے اس حصے میں اقبال آغاز کائنات کے ان لمحات کا ذکر کرتے ہیں جب تخلیق کے عمل کا آغاز ہوا تھا اور زندگی کی کلی کھل رہی تھی۔ ان لمحات میں خالق لم یزل کی جانب سے کہیں آفتاب کو کائنات پر دھوپ اور روشنی بکھیرنے کی صلاحیت ملی تھی اور کہیں ماہتاب کو چاندنی پھیلائے کی قوت عطا ہو رہی تھی۔ شام کے وقت کو یہ لباس فراہم کیا جا رہا تھا جب کہ ستاروں کو چمک کا تحفہ دیا جا رہا تھا۔ کرۂ ارض پر زندگی اور تخلیق کے جذبوں سے نوازا جا رہا تھا۔ ان لمحات میں فرشتے شبنم کو آنسو بہانے کی تربیت دے رہے تھے اور کہیں پہلی بار کلی چمک کر پھول کے لبوں کو خندہ زن کر رہی تھی۔ شاعر کے دل میں درد کی لذت بھی اسی لمحے فراہم کی گئی اور خودی کو بھی بے خودی کے جذبے سے مسحور کیا جا رہا تھا۔

پاؤں کی چوٹیوں پر پہلی بار کالی کالی گھٹاؤں کی اس طرح آمد ہوئی کہ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی حور اپنے گھٹنے مال اکھولے ہوئے کھڑا ہے۔

دوسرا بند معنی: نظارگی: دیکھنا، نظارہ کرنا۔ قصار: اتفاق سے۔

مطلب: آغاز کائنات کے لمحات بقول اقبال اس قدر خوبصورت اور نظر فریب تھے کہ یہ مناظر سراپا ایک دیکھنے کی چیز بنے ہوئے تھے۔ ان لمحات میں آسمانوں پر فرشتے بھی اس قدر مسرور تھے کہ چاروں جانب اس طرح دواں دواں تھے جیسے اپنی قوت پرواز کی آزمائش کر رہے ہوں۔ ان کی پیشانیوں سے نور ازل آشکار ہو رہا تھا۔ ان میں ایک فرشتہ عشق کے جذبے کا بھی تھا جو دوسرے فرشتوں کی رہنمائی کیا کرتا تھا۔ اس فرشتے میں اضطراب کا عنصر اس طرح نمایاں تھا جیسے اس کے وجود میں پارا مٹھک ہو۔

عشق کا یہ فرشتہ جنت کی سیر کو جا رہا تھا کہ اچانک اسے راستے میں موت کا فرشتہ یعنی ملک الموت مل گیا۔ عشق کے فرشتے نے اس سے استفسار کیا کہ بتاؤ تو سہی! تو کون ہے اور تیرا کام کیا ہے؟ تجھے دیکھ کر مجھے کچھ ناگوار سی کیفیت محسوس ہو رہی ہے۔ اس مرحلے پر ملک الموت نے جواب کہا! حیرت ہے کہ تو میری ذات سے واقف نہیں۔ میں ہی تو وہ ہوں جو ہر زندہ شے کو فنا کے گھاٹ اتارنے پر قادر ہوں۔ میں ہی زندگی کے پرزے اڑاتی ہوں اور اسے بیش کے لیے موت کی نیند سلا دیتی ہوں۔ میری آنکھوں میں وہ جاوہ ہے جو وجود کو عدم وجود سے آشنا کرتا ہے اور جس کا پیغام فنا ہے۔ مگر ایک ہستی ایسی بھی ہے جو اس دنیا میں آگ کی مانند ہے اور حقیقت یہ ہے کہ میں اس کے مقابلے میں پارے کی حیثیت رکھتا ہوں۔ یہ ہستی قلب انسان میں ایک شعلے کی مانند پوشیدہ رہتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہی خدائے لم یزل کی آنکھوں کا تار ہے۔ مراد یہ کہ خداوند عالم اسے بہت عزیز رکھتا ہے۔

یہی ہستی یعنی عشق انسان کے دل میں موجزن رہتا ہے اور اس کا وجود اس کے لیے تلخ ہونے کے باوجود ایک خوش گوار حیثیت رکھتا ہے۔

عشق کے فرشتے نے جب ملک الموت کی گفتگو سنی تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی اور اس کا بھی تبسم بجلی بن کر موت کے فرشتے پر گرا۔ اس لیے کہ روشنی کے رو بہو تاریکی کا وجود باقی نہیں رہتا۔ عشق تو زندگی کا منظر ہے۔ ظاہر ہے موت اس کے رو بہو کیسے ٹھہر سکتی تھی۔

زہد اور رندی

028

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی شہرہ تھا بہت آپ کی صوفی منشی کا کہتے تھے کہ پنہاں سے تصوف میں شریعت لبریز سے زہد سے تھی دل کی صراحت کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی مدت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا پابندی احکام شریعت میں ہے کیسا؟

تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھائی کرتے تھے ادب ان کا اعلیٰ و ادانی جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی تھی ۔ میں کہیں درد خیال ہمہ دانی منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی تھی رند سے زائد کی ملاقات پرانی اقبال کہ ہے قمری شمشاد معانی گو شعر میں ہے رشک کلیم ہمدانی

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل کچھ عار اسے حسن فردشوں سے نہیں ہے گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے مجموعہ اصداد ہے اقبال نہیں ہے رندی سے بھی آگاہ شریعت سے بھی واقف اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی القہہ بہت طول دیا وعظ کو اپنے اس شہر میں جو بات ہواڑ جاتی ہے سب میں اک دن جو سر راہ ملے حضرت زاہد فرمایا، شکایت دو محبت کے سبب تھی میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے ثم ہے سر تسلیم مرا آپ کے آگے مگر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے؟ کچھ اس میں تسخیر نہیں، واللہ نہیں ہے

*

زہد اور رندی ایک ایسی نظم ہے جس میں ایک جانب تو علامہ اقبال نے بڑے خوبصورت اور واضح انداز میں اپنے عقائد کا ذکر کیا ہے اور دوسری جانب ان تضادات کی نشاندہی بھی کی ہے جو ملازم اور پابائیت کے تعصبات کی پیداوار ہیں۔ اس نظم کے عملی سطح پر دو کردار ہیں۔ ایک مولوی اور دوسرا ایسا آزاد خیال مسلمان جو اسلام کو انتہائی وسیع المنسوب مذہب تصور کرتا ہے جب کہ مولوی اسے اپنے ذاتی تعصبات کی عینک سے ہی دیکھتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں!

معنی: صوفی منشی: صوفی مزائی: اعلیٰ: اعلیٰ کی تہ: بڑے لوگ۔ درو خیال: چمچت۔ ہمہ دانی: سب کچھ جانتا۔ کلیم ہمدانی: ایران کے شہر ہمدان کا ایک شاعر۔ قرب مکانی: مکان کی نزدیکی یعنی پڑوس۔ تسخیر: مذاق۔ مطلب: میں یہاں آپ کو ایک مولوی صاحب کی داستان سنانے لگا ہوں۔ میرے اس عمل کا مقصد قطعی طور پر یہ نہیں ہے کہ محض اپنی طبع کی تیزی کا اظہار کروں بلکہ کچھ ایسے حقائق ہیں جن کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ جن مولوی صاحب کی داستان سنائی جا رہی ہے ان کے بارے میں یہی شہرت تھی کہ وہ تصوف کے فلسفہ سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اسی سبب ہر چھوٹا بڑا موصوف کا بہت احترام کرتا تھا۔

ان مولوی صاحب کا عقیدہ یہ تھا کہ تصوف کے فلسفے میں شریعت اس طرح پوشیدہ ہے جیسے کہ الفاظ میں معانی چھپے ہوتے ہیں۔ ان کا دل بھی کہا جاتا ہے کہ زہد سے لبریز تھاویں بھی وہ خود کو بہت حید و عاقل تصور کرتے تھے۔ اور کسی دوسرے کو خاطر میں بھی نہیں لاتے تھے۔ ان کے اس رویے کا بنیادی مقصد فی الواقع اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اپنے مریدوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔

اقبال کہتے ہیں کہ یہ مولوی صاحب عرصہ دراز سے میرے پڑوس میں سکونت اختیار کیے ہوئے تھے۔ میں تو خیر رند ہی تھا لیکن زہد کے ان وعویدار سے پڑوسی ہونے کے ناطے میری پرانی واقفیت تھی۔ ایک روز انہوں نے میری بجائے میرے ایک واقف کار سے استفسار کیا کہ یہ شخص اقبال جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بلند پایہ شاعر ہے اس کے مطلق سنا گیا ہے کہ ہندو کو کافر نہیں سمجھتا اس نوع کا عقیدہ تو محض ایسے شخص کا ہو سکتا ہے جو محض فلسفے پر یقین رکھتا ہو۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ اقبال اگرچہ شاعر تو بہت اچھا ہے تاہم احکام شریعت کی پابندی بھی کرتا ہے یا نہیں؟

مزید برآں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اقبال کی فطرت میں شیعیت کے عقیدے کا بھی کچھ عمل و دخل ہے۔ اس لیے کہ وہ خلفاء میں حضرت علیؑ کو افضل تصور کرتا ہے۔ اس کے علاوہ راگ رنگ کو بھی عبادت کا ایک حصہ خیال کرتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ مذہب کا مذاق اڑاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ تو طوائفیت کو بھی برا نہیں سمجھتا۔ مگر محض اقبال سے ہی یہ شکایت نہ ہونی چاہیے اس لیے کہ ہمیشہ سے ہمارے شعراء کا یہی دلیہ رہا ہے۔

وہ یہی تو کرتے ہیں کہ رات کو گانے سے محفوظ ہونا اور صبح دم قرآن کریم کی تلاوت کرنا! یہ صورت حال بحال ایک ایسا راز ہے جس کی تعبیر سے کم از کم ہم ابھی تک آگاہ نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے مریدوں سے یہ بھی سنا ہے کہ وہ عالم شباب میں بھی بے داغ کروار کا مالک ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال اضداد کا مجموعہ ہے یعنی اس کا دل تو حکمت و دانش کا خزینہ ہے جب کہ طبیعت میں قدرے جنون کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ مولوی صاحب اپنے استفسارات کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھ پر اس شخص کی حقیقت واضح نہیں ہوتی کیا وہ کسی نئے اسلام کا بانی تو نہیں ہے؟ اقبال کہتے ہیں کہ ان کی لمبی چوڑی تقریر کافی دیر تک جاری ہے چونکہ اس شریں کوئی بات چھپی نہیں رہتی اس لیے مولوی صاحب کے ارشادات کا ہر طرف جو چرچا ہوا اس کی داستان مجھ تک بھی پہنچی۔

اقبال کہتے ہیں کہ بعد میں ایک روز مولوی صاحب سر راہ اچانک مل گئے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بولے برا نہ منانا وہ باتیں جو تم تک پہنچیں دراصل وہ تو محبت کے سبب کہی گئی تھیں۔ میرا مقصد تو تمہیں محض شیعیت کی راہ سے آگاہ کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اقبال کہتے ہیں اس مرحلے پر میں نے جواباً کہا کہ پڑوسی ہونے کے ناطے آپ نے جو کچھ فرمایا وہ یقیناً آپ کا حق تھا مجھے اس پر کوئی گلہ اور شکایت نہیں!

مولانا! میں تو آپ کا نیا زمند ہوں۔ دیے بھی آپ میرے بزرگ ہیں۔ رہا یہ مسئلہ کہ اگر آپ میری حقیقت سے آگاہ نہیں تو اس پر حیرت بھی نہیں ہوتی نا ہی اس میں کسی دانش کا دخل ہے۔ اس لیے کہ میں تو خود بھی اپنی حقیقت سے واقفیت نہیں رکھتا۔ میرے خیالات میں جو گمراہی ہے اس کا علم تو مجھے بھی نہیں۔ میری بھی یہی خواہش ہے کہ اقبال کو خود بھی دیکھوں۔ میں نہیں جانتا کہ میں کیا شے ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اقبال خود بھی اقبال کی حقیقت سے آگاہ نہیں۔ اور اس معاملے میں کسی طرح کے طغوز مزاح کی گنجائش نہیں ہے۔

شاعر

029

قوم کو یا جسم ہے، افراد ہیں اعضاء قوم منزل صنعت کے رہ چکا ہیں دست دپائے قوم
مخل نظم حکومت، چہرہ زیبائے قوم شاعر رنگیں نوا ہے دیدہ دینائے قوم
بتلائے درد کوئی عضو ہو، رہتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

① معنی: رہ پینا: راستہ چلنے والے۔ عضو: حصہ۔

مطلب: تین اشعار پر مشتمل یہ نظم اقبال کی انتہائی خوبصورت جامع اور مختصر نظموں میں سے ہے۔ ان اشعار میں انہوں نے انتہائی جاندار الفاظ میں شاعری اہمیت کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق قوم کو اگر ایک جسم تصور کر لیا جائے تو افراد کو اس کے اعضاء سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ان افراد میں سے جو لوگ صنعت و حرفت کے پیشے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ عملاً قوم کے دست در بازو کی حیثیت کے حامل ہیں۔

② اس کے علاوہ جو لوگ نظم و نسق کے ذمہ دار ہوتے ہوئے نظام حکومت چلاتے ہیں وہ قوم کے چہرے پر حسن و خوبصورتی کے مظہر ہوتے ہیں۔ مراد یہ کہ جس طرح کسی شخص کی خوبصورتی کا اندازہ اس کے چہرے کو دیکھ کر ہوتا ہے اسی طرح کسی قوم کی خوبیوں کو برسرِ اقدار بطے کی صلاحیت اور کردار سے پرکھا جاسکتا ہے تاہم شاعر کی حیثیت ان سب سے بلند ہے کہ وہ قوم کے لیے دیدہ دینا کی طرح سے ہے۔

③ شایدے اور تجربے کے مطابق یہ بات بڑے اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جسم کے کسی حصے کو بھی تکلیف پہنچے تو اس کا اظہار آنکھ سے ہی ہوتا ہے۔ مراد یہ کہ اس تکلیف کے سبب آنکھ میں ہی آنسو آ جاتے ہیں۔ اس امر سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ آنکھ جسم کی کس قدر ہمدرد ہوتی ہے مطلب یہ کہ شاعر کو اگر قوم کی آنکھ تسلیم کر لیا جائے تو پوری قوم کو اسے غم گسار بھی ماننا پڑے گا۔

دل

030

قصہ دار و رسن بازی مظلانہ دل التجائے انہی سرخی افسانہ دل
یا رب! اس ساغر لبریز کی سے کیا ہو گی جاوے ملک بٹا ہے خط پیمانہ دل
ابر رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یا رب! جل گئی مزرع ہستی تو اگا دانہ دل
حسن کا سنج گرا نمانیہ تجھے مل جانا تو نے فریاد! نہ کھودا کبھی دیرانہ دل
عرش کا ہے کبھی کعبہ کا ہے دھوکا اس پر کس کی منزل ہے الہی! مرا کاشانہ دل
اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا دل کسی اور کا دیوانہ میں دیوانہ دل
تو سمجھتا نہیں اے زاہد ناداں! اس کو رشک صد سجدہ ہے اک لغزش مستانہ دل
خاک کے ڈھیر کو اکیر بنا دیتی ہے وہ اثر رکھتی ہے خاکستر پر دانہ دل
عشق کے دام میں پھنسی کر یہ رہا ہوتا ہے

برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

✱

معنی: بازی طفلانہ: بچوں کا کھیل۔ مزرع: بھتی۔ حسن: محبوب۔ خاک کے ڈھیر: مراد انسان ہے۔

مطلب: اقبال اس نظم کے دل کے محاسن و خصائص بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عام لوگوں کے لئے اپنی جان پر کھیل جانا بے شک ناممکنات سے ہے لیکن جو اہل دل ہیں یعنی عشاق ہیں ان کے لیے یہ عمل بچوں کے کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ دل کی ماہیت کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب بس اتنا ہی ہے کہ خدائے عزوجل کا جلوہ دیکھنے کی خواہش اس داستان کا عنوان بنتا ہے۔

① تا ③ اقبال نے اس شعر کی دوسرے مصرع میں کوہ طور کے واقعہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔ کہ یہ عمل تو دل کے لیے ایک سہل کام ہے۔ اور ایسا دل جو معرفت کی شراب سے لبریز ہو۔ سوچنے تو سہی اس کی قیمت کیا ہوگی؟ کہ یہ تو انسان کے لیے بتائے دوام کی حیثیت رکھتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اگر انسان دل کو اپنا رہنما لے تو جذبہ عشق اسے بتائے دوام عطا کرتا ہے۔ دراصل اقبال کے نزدیک عشق ایسا جذبہ ہے جس کا تعلق دل سے ہے۔ نہ جانے یہ ابر رحمت تھا یا عشق کی بجلی کہ آخر الذکر کا کام جلا نا اور فنا کرنا ہے جب کہ ابر رحمت تو تخلیق کی علامت ہے۔ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ عشق کے جذبے نے تو زندگی کو فنا کر کے رکھ دیا تھا پھر یہی جذبہ ابر رحمت کی صورت میں ظاہر ہوا اور یوں دل کی تخلیق وجود میں آئی۔

④ یہاں فرما دے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے کہ تو اگر دل کی گمراہیوں میں اترنے کی صلاحیت رکھتا تو اپنے عشق میں یقیناً کامیاب ہو جاتا پھر تجھے مشروط بنیاد پر جوئے شیر لانے کے لیے پہاڑ کو کھودنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔

⑤ اس شعر میں اقبال عالم حیرت میں کہتے ہیں کہ کبھی تو دل پر عرش کا دھوکا ہوتا ہے اور کبھی یہ کعبہ کے مانند لگتا ہے۔ دوسرے مصرع میں وہ رب ذوالجلال سے استفسار کرتے ہیں کہ تو ہی مجھ پر یہ راز ظاہر کر دے کہ میرا یہ دل آخر کس فرد کی آماجگاہ ہے؟ اس شعر سے باسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شاعر نے یہ اشارہ ذات خداوندی کی جانب کیا ہے کہ وہی انسان کے دل میں مقیم ہوتی ہے۔

⑥ اقبال کے اس شعر میں تغزل پوری انتہا پر پہنچا ہوا ہے۔ فرماتے ہیں دل اور میں عملی سطح پر دونوں ہی مجنوں اور سوداگی ہیں تاہم فرق اتنا ہی ہے کہ یہ دل تو کسی اور کا دیوانہ ہے جب کہ میں دل پر فریفتہ ہوں۔ مقصد یہ ہے کہ میرا دل کائنات کو پیہا کرنے والے کے عشق میں سرشار ہے۔ لہذا اس پر میرا فدا ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ عشق کا یہ تعلق بالواسطہ ہے۔

⑦ وہ کہ جسے زہد کا دعویٰ ہے وہ اس حقیقت کا ادراک کیسے کر سکے گا عشق کی ایک لغزش عملی سطح پر سینکڑوں سجدوں سے افضل و اعلیٰ ہے۔

⑧ عشق میں جلتے والے دل کی راکھ تو ایک ایسی اکسیر کی حیثیت رکھتی ہے جو مٹی کے ڈھیر پر ڈال دی جائے تو اس کو بھی سونا بنا دے۔ مراد یہ کہ عشق میں وہ کیفیت ہے جو انسان کو بلند مہاراج بخشی ہے۔

⑨ اس شعر میں دل کو متفاد کیفیتوں کا اہل بتایا گیا ہے کہ عشق کے دام میں پھنس جانے کے باوجود وہ خود کو آزاد سمجھتا ہے اور اگر اسے ایک پودا تصور کر لیا جائے اور اس پر بجلی گر جائے تو دل خاک ہونے کی بجائے سرسبز ہو جاتا ہے۔

موج دریا

031

مضطرب رکھتا ہے میرا دل بیتاب مجھے عین ہستی ہے تڑپ صورت سیماں مجھے
 موج ہے نام مرا بحر ہے پایاب مجھے ہو نہ زنجیر کبھی حلقہ گرداب مجھے
 آب میں مثل ہوا جاتا ہے تو سن میرا
 خار مائی سے نہ انکا کبھی دامن میرا
 میں اچھلتی ہوں کبھی جذب مہ کامل سے جوش میں سر کو پگھلتی ہوں کبھی ساحل سے
 ہوں وہ رہو کہ محبت ہے مجھے منزل سے کیوں تڑپتی ہوں یہ پوچھے کوئی میرے دل سے
 زحمت تنگی دریا سے گریزاں ہوں میں
 وسعت بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

*

پہلا بند معنی: پایاب: تھوڑا پانی جس سے آدی پیدل گذر جائے۔ تو سن: گھوڑا۔ خار مائی: مچلی کا کاٹنا۔
 مطلب: دو بند پر مشتمل اس نظم میں اقبال نے دریا کی زبان سے ایک مکالمے کو اپنی اس تخلیق کا
 موضوع بنایا ہے۔ ان کے بقول پہلے بند میں دریا یوں گویا ہوتا ہے کہ میرا بے چین دل ہر لمحے مجھے مضطرب
 رکھتا ہے اس لیے کہ پارے کی مانند تڑپ اور متحرک رہتا ہی میری حقیقی زندگی ہے۔ میرا نام موج ہے اور
 سمندر کا گہرا پانی میرا ذخیرہ ہے جس میں رد و نما ہونے والے بھنور عملی سطح پر میرے لیے زنجیر نہیں بن سکتے۔
 اس لیے کہ میں طبعاً آزاد ہوں اور کوئی پابندی میرے لیے ناقابل قبول ہے۔ اسی سبب کوئی شے میری
 راہ میں کسی طور پر بھی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ میں پانی میں تیز گھوڑے کی مانند ہوا کی رفتار سے سفر کرتی
 ہوں۔ اس سفر کے دوران وہ مچھلی بھی میری راہ میں حائل نہیں ہو سکتی جس کی پشت پر ایک بڑی ہڈی ہوتی
 ہے۔

دوسرا بند معنی: جذب: بھینپنا۔ گریزاں: بھاگنے والی۔ وسعت: بحر: سمندر کی وسعت۔

مطلب: اس بند میں موج دریا یوں گویا ہوتی ہے کہ کبھی تو چودھویں رات کے چاند کی کشش سے
 مدوجز سے ہٹتا رہتی ہوں اور کبھی جوش و خروش کے عالم میں ساحل کے کناروں سے ٹکراتی ہوں۔
 میں تو دراصل اس مسافر کے مانند ہوں جس کو منزل ہی راس آتی ہے اور اسی سے اس کا تعلق خاطر ہوتا
 ہے۔ لیکن مجھ میں یہ بے چینی اور اضطراب کیوں ہے اس کو کوئی میرے دل سے ہی پوچھے تو اس کا جواب
 ممکن ہو سکتا ہے۔ امر واقع یہ ہے کہ میں جو فطری سطح پر وسیع العشوب ہوں۔ دریا کی تنگ و اماںی سے
 نجات حاصل کرنے کی خواہاں رہتی ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ سمندر کی وسعت اور فراخی کو پانے کے
 لیے میرا دل ہمیشہ مضطرب رہتا ہے۔

رخصت اے بزم جہاں

(ماخوذ از ایمرن)

032

رخصت اے بزم جہاں! سوئے وطن جاتا ہوں
 بلکہ میں افسردہ دل ہوں، درخور محفل نہیں
 قید ہے دربار سلطان و شہستان وزیر
 گو بڑی لذت تری ہنگامہ آرائی میں ہے
 مدتوں تیرے خود آراؤں سے ہم صحبت رہا
 مدتوں بیٹھا ترے ہنگامہ عشرت میں میں
 مدتوں ڈھونڈا کیا نظارہ گل خار میں
 چشم حیراں ڈھونڈتی اب اور نظارے کو ہے
 چھوڑ کر مانند بو، تیرا چمن جاتا ہوں میں
 گھر بتایا ہے سکوت دامن کسار میں
 ہمنشین زمرگ شہلا، رفتی گل ہوں میں
 شام کو آواز چشموں کی سلاتی ہے مجھے
 بزم ہستی میں ہے سب کو محفل آرائی پسند
 ہے جنوں مجھ کو کہ گھبراتا ہوں آبادی میں میں
 شوق کس کا سبزہ زاروں میں پھراتا ہے مجھے؟
 طعنہ زن ہے تو کہ شیدا کج عزت کا ہوں میں
 ہم وطن شہاد کا، قمری کا میں ہراز ہوں
 کچھ جو سنتا ہوں تو اوروں کو سنانے کے لیے
 عاشق عزت ہے دل، نازاں ہوں اپنے گھر میں
 لیتا زیر شجر رکھتا ہے جادو کا اثر
 علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود؟
 گل کی پتی میں نظر آتا ہے راز ہست و بود

*

① تا ⑤ معنی: درخور محفل، محفل کے قابل۔ خود آراؤں: خود پسند لوگ۔ موج بحر: سمندر کی لہر۔ مطلب: جیسا کہ بتایا گیا ہے یہ نظم اقبال کی طبع زاد نہیں بلکہ ایمرن کی ایک نظم سے ماخوذ ہے۔ اس کے باوجود اکثر مقامات پر اس نظم میں علامہ کے فکر و نظریات کی جھلک موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دنیا سے میرا دل اچاٹ ہو چکا ہے۔ یہ دنیا تو ایک ایسی آبادی کی مانند ہے۔ عملی سطح پر جو ایک دیرانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا دل اس سے گھبرانے لگا ہے۔ حقیقت ہے کہ میں اتنا افسردہ دل ہو چکا ہوں کہ کسی طرح کی محفل آرائی کو پسند نہیں کر سکتا بس اے دنیا اب تو اس نیچے پر پہنچا ہوں کہ نہ ہی تو

میرے قاتل ہے اور تابی میں تیرے قاتل ہوں۔ یہ دنیا امیر و وزیر اور بادشاہوں کے درباروں میں گرفتار ہو کر رہ گئی ہے اور جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو ان زنجیروں کو توڑ کر آزاد فضا میں سانس لینے کا خواہاں ہوں۔

یہ تسلیم کہ تجھ میں جو زندگی اور رونق ہے وہ ہر شخص کے لیے بیشک کشش انگیز ہے اس کے برعکس میرے لیے تو تیرا وجود اجنبی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ درست ہے کہ ایک عرصے تک ان خود پسند اور متکبر لوگوں کے درمیان زندگی گزار رہا ہوں جو تیرے دامن میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ ہر ممکن برداشت کے باوجود ان کے مابین اس طرح سے مضطرب اور تڑپا رہا جس طرح کہ سمندر کی بے چین موج مضطرب اور پریشان رہتی ہے۔ مراد یہ کہ یہ ماحول سدا سے میرے لیے ناقابل برداشت ہی رہا۔

⑥ تا ⑨ معنی: یوسف: تبلیح ہے حضرت یوسف کی۔ زرگس شہلا: زرگس کے پھول کی ایک قسم۔

مطلب: ”بزم جہاں“ سے مخاطب ہوتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ایک مدت تک تیرے ہنگاموں میں شریک رہا ہوں لیکن یہ عرصہ ایک طرح سے بیکار ہی ضائع ہوا۔ میں نے ہر چند کوشش کی کہ اس غلمت کدے سے روشنی پالوں لیکن کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ یہ میری راہ کے کانٹے تھے جن میں مدتوں پھول کے نظارے تلاش کرتا رہا لیکن تیرے بازار میں اس یوسف کو نہ پاسکا۔ مراد یہ ہے کہ ہر ممکن سعی کے باوجود میں حصول مدعا میں ناکام رہا۔ اب تو یہ کیفیت ہو چکی ہے کہ میری آنکھیں ایک اور نظارے کی تلاشی ہیں جو اس امر کی آرزو مند ہیں کہ میں جو طوفان میں گھرا ہوا ہوں اس کی ساحل تک رسائی ہو جائے۔ چنانچہ تیرے چمن کو اس طرح سے چھوڑ کر جا رہا ہوں جس طرح سے کہ پھول سے خوشبو رخصت ہوتی ہے۔ اس صورت میں تجھ سے اے بزم جہاں رخصت ہو کر اپنے حقیقی وطن جا رہا ہوں۔

⑩ تا ⑬ معنی: گوش بر آواز: جس کے کان صدا پر لگے ہوتے ہیں۔ عاشق عزلت: تنہائی کا عاشق۔

مطلب: نظم کے اس حصے میں اس دوسرے منظر کی نشاندہی کرتے ہیں جو بقول ان کے حقیقی وطن بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے اس وطن میں رہنے کے لیے جو گھر بنایا ہے وہ دامن کسار میں واقع ہے اور وہاں ایسا سکوت ہے جس کے مقابلے پر آواز کی موسیقیت میں بھی لطف نہیں ہوتا۔ یہاں میں زرگس اور گلاب کے پھولوں کی ہم نشینی اور رفاقت حاصل ہے۔ یہاں کا گلستاں ہی میرا وطن ہے جہاں بلبل کے گھونسلے کی قربت میں میرا گھر واقع ہے اس خوبصورت ماحول میں چشموں کی مست آوازیں مجھے نیند سے ہم کنار کرتی ہیں اور صبحدم کوئل کی کوک میرے لیے بیداری کا پیغام دیتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی زندگی میں خواص و عوام ہر لمحے محفل آرائی اور ہنگاموں کو پسند کرتے ہیں اس کے برعکس مجھ ایسے شاعر کو تو ایسا گوشہ مرغوب ہے جو ہر طرح سے پرسکون ہو۔

(14): نظم کے اس حصے میں اقبال ایک بار پھر اپنی کیفیت اور اضطراب کا احوال بیان کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں کہ میں تو شاید سوداگی ہو گیا ہوں کہ آبادی سے گھبراہٹ ہونے لگی ہے۔ بار بار خود ہی اس سوچ میں گم ہو رہا ہوں کہ وہ کون سی ہستی ہے جس کو دامن کوہ میں تلاش کرنے آ نکلا ہوں۔ ایسا کس چیز کا

شوق ہے جو مجھے ان سبزہ زاروں میں سرگرداں کیے ہوئے ہے اور جس کے سبب میں چشموں کے کناروں پر نحو استراحت ہوتا ہوں۔

اے بزم جہاں! تو مجھے یہ طعنہ دے رہی ہے کہ میں تہائی کا عادی ہو گیا ہوں حالانکہ تجھے اس حقیقت کا علم ہی نہیں کہ میں تو فطرت اور اس کے مظاہر کو پیش کرنے والا ہوں۔ میں تو صنوبر کے درخت کی قوت سے استفادہ کر رہا ہوں اور قمری کے رازوں سے بھی آگاہی رکھتا ہوں۔ ہر چند کہ یہ جن جہاں میں مقیم ہوں پر سکوت ہے لیکن اس کی خاموشی میں بھی کچھ ایسی آوازیں ہیں جن کو میں سننے کا اہل ہوں اور یہاں جو کچھ سنتا ہوں اس کو دوسروں تک بھی پہنچاتا ہوں۔ مزید برآں جو کچھ دیکھتا ہوں وہ دوسروں کو دکھانے کی سعی بھی کرتا ہوں۔ بے شک میں تہائی کا عاشق ہوں لیکن میرا دل اپنے اسی گھر پر ناز کرتا ہے۔ اس کے مقابلے پر دارا اور سکندر جیسے شان و شوکت رکھنے والے بادشاہوں کے عشرت کدے میرے نزدیک انتہائی مضحکہ خیز ہیں۔ جب کسی درخت کے زیر سایہ شب کو نحو استراحت ہوتا ہوں اور اس عالم میں آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں پر نظر پڑتی ہے تو مسرور ہو کر رہ جاتا ہوں۔ مجھے تو پھول کی پتی سے ہی موت اور زندگی کے پوشیدہ اسرار کا انکشاف ہو جاتا ہے جب کہ علم و فلسفے میں میرے نزدیک یہ خصوصیت ناپید ہے۔

طفل شیرخوار

033

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاتا ہے تو
پھر پڑا روئے گا اے نووارد اقلیم غم
آہ! کیوں دکھ دینے والی شے سے تجھ کو پیار ہے؟
گیند ہے تیری کہاں؟ چینی کی پلی ہے کدھر؟
تیرا آئینہ تھا آزاد غبار آرزو!
ہاتھ کی جنبش میں طرزدید میں پوشیدہ ہے
زندگانی ہے تری آزاد قید احتیاز
جب کسی شے پر گز کر مجھ سے چلاتا ہے تو
آہ! اس عادت میں ہم آہنگ ہوں میں بھی ترا
عارضی لذت کا شیدائی ہوں چلاتا ہوں میں
میری آنکھوں کو لہجا لیتا ہے حسن ظاہری
تیری صورت گاہ گریاں گاہ خنداں میں بھی ہوں
دیکھنے کو نوجواں ہوں طفل ناواں میں بھی ہوں



① تا ③ معنی: نووارد اقلیم غم: غم کے ملک میں نیا نیا آنے والا وجود۔

مطلب: علامہ اقبال نے بلکہ دودھ پیتے بچوں کی نفسیات پر بھی کتنی مری نظر رکھتے تھے اور اس حوالے

سے اور اپنے نقطہ نظر کے اظہار میں جو طرز عمل اختیار کرتے تھے اس کا اندازہ زیر تشریح قلم سے ہوتا ہے۔ یہاں وہ ایک دودھ پیتے بچے سے مخاطب ہوتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے طفل نادان! تیرے ہاتھ میں چاؤ تو دیکھ کر مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ چنانچہ میں نے اسے تیرے ہاتھ سے چھین لیا اس پر توجیح پڑا اس لیے کہ تجھے اس حقیقت کا علم نہ تھا کہ اس تیز دھار ہتھیار سے تجھے نقصان بھی پہنچ سکتا ہے مگر تو نے تو میرے اس عمل کو نامہربانی پر محمول کیا حالانکہ میرا یہ فعل تو خالصتا مہربانی کا حامل تھا۔

اس کے بعد تو نے قریب پڑا ہوا قلم اٹھا لیا تجھے تو اس امر کا علم بھی نہ تھا کہ اس قلم کی نوک کتنی تیز اور باریک ہے۔ کہیں چبھ گئی تو تکلیف سے رونے لگے گا۔ نہ جانے تو ان تکلیف دینے والی اشیاء کا اتنا گرویدہ کیوں ہے؟ کھینٹا ہی ہے تو اس کاغذ کے ٹکڑے سے کھیل کہ اس کے لمس سے تجھے قطعی طور پر تکلیف نہیں پہنچے گی۔

④ مطلب: پیارے بچے! مجھے یہ تو ہما کہ تیرے کھلونے کیا ہوئے۔ تیری گیند کہاں ہے اور چینی کی وہ خوبصورت پلی کیا ہوئی جس کا سر ٹوٹا ہوا ہے۔ پیدا ہونے سے قبل تو تجھ میں کسی خواہش کا وجود نہ تھا کہیں اس عالم رنگ و بو کی فضا میں آتے ہی خواہشات نے تجھے گھیر لیا۔ لیکن جس طرح تو ابھی اپنی نقل و حرکت میں آزاد نہیں اسی طرح تیری خواہشات بھی ہاتھوں کی حرکت اور دیکھنے کے انداز میں پوٹیدہ ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جو چیز تجھے پسند آ جاتی ہے اسی کو ہتھیانے کی کوشش کرتا ہے کہ تیری خواہشات بھی تیری طرح نئی نئی وجود میں آئی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تیرا وجود ابھی ہر نوع کے اختلاف و امتیاز سے یکسر آزاد ہے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ اب بھی قدرت کے بیشتر اسرار تجھ پر آشکار ہیں۔ ہر چند کہ تو ان کا اظہار اپنی زبان سے نہیں کر سکتا۔

⑧ سے (12) معنی: آزاد غبار آرزو: آرزو کی گرد سے آزاد۔ نوزائیدہ: جو نئی پیدا ہوئی ہو۔ قید امتیاز: تمیز کی پابندی سے آزاد۔ ہویدا: ظاہر۔ ہم آہنگ: ہم نوا، ساتھی۔ تلون آشنا: جس کا مزاج ایک حالت پر قائم نہ رہے اور لمحہ بہ لمحہ بدلتا جائے۔

مطلب: اے بچے! جب بھی کسی چیز کے چھینے جانے کی بنا پر مجھ سے بگڑتا ہے اور غم و غصے کی حالت میں گر یہ وزاری کے ساتھ چلانے لگتا ہے تو میں تجھے ہسلانے کے لیے تیرے ہاتھ میں ردی کاغذ کا ایک ٹکڑا تھما دیتا ہوں۔ عجب تماشا یہ ہے کہ اس عمل سے ہی تو بھل کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اے عزیز تیری یہ عادت بالکل میری عادت سے ملتی جلتی ہے یعنی تیری طرح میں بھی تعصیر پذیر فطرت کا حامل ہوں۔ میں بھی تو عارضی خوشی میں مست ہو جاتا ہوں اور صورت حال اس کے برعکس ہو تو چیخنے چلانے لگتا ہوں۔ میری بھی کیفیت یہی ہے کہ غصہ بھی جلد آ جاتا ہے اور اس کے بعد جلد ہی من جاتا ہوں۔ میری آنکھوں کو بھی ظاہری حسن پوری طرح مسحور کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری نادانیاں بھی تیری نادانی سے کسی طرح کم نہیں! میں بھی تیری مانند کبھی روتا ہوں تو کسی مرحلے پر ہنسنے اور قہقہے لگاتا ہوں اگر دیکھنے کو بے شک نوجوان ہوں لیکن عملی سطح پر تیری مانند طفل نادان ہوں یعنی میری حالت بھی بالکل نئے بچوں کی سی ہے۔

تصویر درد

034

خوشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری
 یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری
 جن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
 جن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری
 سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری
 حیات جادواں میری، نہ مرگ ناگماں میری
 وہ گل ہوں میں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری
 زفیض دل طہیلان ہا خروش بے نفس دارم
 خوشی روتی ہے جس کو، میں وہ محروم مسرت ہوں
 میں حرفِ زیر لب، شرمندہ گوشِ سماعت ہوں
 سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کلدورت ہوں
 سراپا نور ہو جس کی حقیقت میں وہ علمت ہوں
 کسی کو کیا خبر ہے میں کہاں ہوں، کس کی دولت ہوں؟
 میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں
 میں اس میخانہ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں
 وہی کتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے
 کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہمزبانوں میں
 مرا آئینہ دل بے قضا کے رازدانوں میں
 کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
 لکھا کلک ازل سے مجھ کو تیرے لوحِ خالوں میں
 تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغباںوں میں
 عنادلِ باغ کے غافل نہ، بیخیں آشیانوں میں
 وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائرِ بوستانوں میں
 تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
 دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کمن کی داستاںوں میں
 زمیں پر تو ہو، اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
 تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستاںوں میں
 جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

نہیں منت کش تابِ شنیدن داستاں میری
 یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
 اٹھائے کچھ ورقِ لالے، کچھ زمیں لے، کچھ گل لے
 اڑا لی قبریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے
 ٹپک اے شمع! آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
 الٹی! پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا؟
 مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گستاں کا
 ”دریں حسرتِ سرا عمریتِ افسونِ جرس دارم
 ریاضِ دہر میں نا آشناے بزمِ عشرت ہوں
 مری بگلی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویا کی
 پریشان ہوں میں مشتِ خاک، لیکن کچھ نہیں کھلتا
 یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا
 خزینہ ہوں، چھپایا مجھ کو مشتِ خاک صحرا نے
 نظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصہ ہستی
 نہ صہبا ہوں، نہ ساتی ہوں، نہ مستی ہوں، نہ پیانہ
 مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
 عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیاںوں میں
 اثر یہ بھی ہے اک میرے جنونِ فتنہ سماں کا
 رلاتا ہے ترا نظارہ اسے ہندوستان! مجھ کو
 دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
 نشانِ برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
 چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
 سن اے غافلِ صدا میری! یہ ایسی چیز ہے جس کو
 وطن کی فکر کرناو! مصیبت آنے والی ہے
 ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
 یہ خاموشی کہاں تک؟ لذتِ فریاد پیدا کر؟
 نہ سمجھو گے تو مت جاؤ گے اے ہندوستان والو!
 یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے

ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کر کے چھوڑوں گا
 چلانا ہے مجھے ہر لمحہ دل کو سوزِ پنہاں سے
 مگر غمبوں کی صورت ہوں دل درد آشنا پیدا
 پرونا ایک ہی نتیجہ میں ان بکھرے دانوں کو
 مجھے اے ہم نشیں! رہنے دے شعلِ سینہ کاوی میں
 دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
 جو ہے پردوں میں پنہاں، چشمِ بیٹا دیکھ لیتی ہے
 کیا رفعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے
 رہا دل بستہ محفل، مگر اپنی نگاہوں کو
 فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر
 تعصبِ چھوڑناو، دہر کے آئینہ خانے میں
 سراپا نالہ بیداو سوزِ زندگی ہو جا؟
 صفائے دل کو کیا آرائشِ رنگِ تعلق سے
 زمیں کیا آساں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے
 زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
 کنوئیں میں تو نے یوسف کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا
 ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگیں بیانی کی
 دکھا وہ حسنِ عالم سوزِ اپنی چشم پر غم کو
 ترا نظارہ ہی اے بوالہوس! مقصد نہیں اس کا
 اگر دیکھا بھی اس نے سارے عالم کو تو کیا دیکھا
 شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
 نہ اٹھا جذبہ خوردشید سے اک برگ گل تک بھی
 پھرا کرتے نہیں مجروح الفت فکر درماں میں
 محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے!
 دوا، ہر دکھ کی ہے مجروحِ تنغ آرزو رہنا
 شرابِ بخودی سے تالک پرواز ہے میری
 تجھے کیا دیدہ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
 بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا
 جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
 یہ استغنا ہے پانی میں گوں رکھتا ہے ساغر کو
 نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری

لو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
 تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا
 جن میں مشت خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا
 جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا
 کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا
 تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا
 زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے
 گزاری عمر پستی میں مثالِ نقش پا تو نے
 کیا بیرون محفل سے نہ خیرت آشنا تو نے
 مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے
 یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے
 سپند آساگرہ میں باندھ رکھی ہے صدا تو نے
 کفِ آئینہ پر باندھی ہے اداواں! حنا تو نے
 غضب ہے سطرِ قرآن کو چلیپا کر دیا تو نے
 بنایا ہے بت پندار کو اپنا خدا تو نے
 ارے غافل! جو مطلق تھا متعبد کر دیا تو نے
 نصیحت بھی تری صورت ہے، اک افسانہ خوانی کی
 جو تڑپاتا ہے پروانے کو، رلواتا ہے شبنم کو
 بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشمِ آدم کو
 نظر آئی نہ کچھ اپنی حقیقت جام سے جم کو
 یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو
 یہ رفعت کی تمنا ہے کہ لے اڑتی ہے شبنم کو
 یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنے مرہم کو
 ذرا سے جج سے پیدا ریاض طور ہوتا ہے
 علاجِ زخم ہے آزاد احسانِ رفو رہنا
 شکستِ رنگ سے سیکھا ہے میں نے بن کے بورہنا
 عبادتِ چشمِ شاعر کی ہے ہر دمِ بادِ صو رہنا
 جن میں آہ! کیا رہتا جو ہو بے آبرو رہنا
 غلامی ہے امیر امتیازِ ماو تو رہنا
 تجھے بھی چاہیے مثلِ حبابِ آبجو رہنا
 اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خوا! رہنا

سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا
کیا ہے اپنے بختِ خفته کو بیدار قوموں نے
یہ دیرانہ قفس بھی، آشیانہ بھی، چمن بھی ہے
جس بھی، کارواں بھی، راہبر بھی، راہزن بھی ہے
چھپا جس میں علاجِ گردشِ چرخِ کمن بھی ہے
یہ پروانہ جو سوزان ہو تو شمعِ انجمن بھی ہے
یہ شیریں بھی ہے گویا، بستوں بھی، کوکمن بھی ہے
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے؟
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تابِ سخن بھی ہے
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تابِ سخن بھی ہے

”نہمگودید کو تہِ رشتہ معنی رہا کروم
حکایت بود بے پایاں، خاموشی اوا کروم“

*

انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں میں اقبال جو نظمیں پڑھتے رہے ”تصویرِ درد“ بھی انہی میں سے ایک نظم ہے۔ اس نظم میں انہوں نے عصری صورتِ حال کے حوالے سے اہلِ وطن کی بے بسی پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اس امر پر متنبہ کیا ہے کہ اگر انہوں نے اپنی روش نہ بدلی تو تباہی ان کا مقدر بن جائے گی۔ لہذا ان کے لیے لازم ہے کہ اپنی بہتری کے لیے متحد ہو کر جدوجہد کریں۔ فرماتے ہیں کہ

① سے ④ معنی: منت کش تابِ شنیدن: کوئی سننے کی تاب نہیں لاسکتا۔ دستورِ زباں بندی: بات کرنے کا حکم نہیں۔

مطلب: مجھے اس امر کا شدید دکھ ہے کہ میں نے جو داستانِ بیان کی ہے اس پر کسی نے بھی توجہ نہیں دی۔ اس صورتِ حال کے سبب میں نے خاموشی اختیار کر لی ہے کہ بعض حالات میں اس نوع کی بے زبانی ہی زبان بن جاتی ہے۔ دوسرے شعر میں وہ قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ تیری بزم میں تو زباں بندی کا دستور اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اب یہاں میری زبان کسی سے بات کرنے کے لیے بھی ترس گئی ہے۔ اس کے باوجود میرے لیے یہ حقیقت بھی قدرے واضح ہے کہ میری داستان کے کچھ اوراق مختلف پھولوں یعنی افراد نے اٹھا لیے جب کہ یہ سارے چمن میں بکھرے پڑے تھے اس طرح کچھ لوگوں نے میرے طرزِ سخن اور افکار پر ڈاکہ ڈال دیا اور اس طرح میری متاعِ کوٹ لیا۔

⑤ سے ③ مطلب: اس مرحلے پر اقبال شمع سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں تو سر لپا درد بن کر رہ گیا ہوں اور میری داستان میں اب حسرتوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اے شمع! تو ہی میری غم گسار بن جا اور پروانے کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک جا۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح قوم کے درد میں میں آنسو بہاتا ہوں۔ تو بھی میرا ساتھ دے۔ اگلے شعر میں اقبال خدا سے کہتے ہیں کہ یہ بتا! میرے لیے تیری اس دنیا میں قیام کرنے کا کیا لطف ہے جب کہ میرا نہ زندگی پر اختیار ہے ناپی موت پر! یعنی میں تو عملاً بے دست و پا

فرد ہوں اور یہ صرف میری اپنی فریاد ہی نہیں بلکہ سارے زمانے کی اجتماعی فریاد ہے۔ میں تو ایک ایسے پھول کے مانند ہوں جو پورے چمن کی خزاں اور بربادی کو اپنی خزاں تصور کرتا ہے۔ اس حسرت و مایوسی کی دنیا میں میری ذات تو ایک انتخاب کرنے والی کھٹی کی طرح سے ہے اس لیے کہ جب تڑپتا ہوں تو اس کا اظہار بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنے اشعار میں کرتا ہوں لیکن افسوس یہ ہے کہ انتخاب کے باوجود میری آواز زاری پر کوئی کان نہیں دھرتا۔

⑨ سے (16) معنی: حرف زیر لب: آہستہ بات جو سنائی نہ دے سکے۔ شرمندہ گوش سماعت: جو بات کان تک نہ پہنچے۔ سیرِ عرصہ ہستی: زندگی کے میدان کی سیر۔ صبا: شراب۔

مطلب: میں تو باغِ دنیا میں ایک ایسی شخصیت ہوں جو مسرت و خوشی سے یکسر محروم ہوں۔ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جن پر مسرت اور خوشی بھی آنسو بہاتی ہے۔ میری تقدیر تو اس قدر بگڑ چکی ہے جس کی کیفیت کا اظہار بھی انتہائی الم انگیز ہے۔ میری آواز تو ہونٹوں تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور ہر کوئی اس کو سننے سے قاصر ہے۔ میں بظاہر ایک مشت خاک کی مانند ہوں جب کہ آج تک مجھ پر اس امر کا انکشاف نہیں ہو سکا کہ نصف دنیا کو فتح کرنے والے سکندر کی مانند ہوں یا جمشید کا وہ پیالہ جس میں وہ ساری دنیا کے متاع و کیم لیتا تھا یا پھر غبار کے مانند بے حقیقت شے ہوں۔ مراد یہ کہ اس وار فانی میں اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے باوجود خود کو شناخت نہیں کر سکا۔ ان ساری کیفیتوں کے باوجود اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ میرے وجود کو برقرار رکھنا قدرت کے بنیادی مقاصد کا حصہ ہے اور اسی سبب میں خود کو ایک ایسی خلقت سے تعبیر کر سکتا ہوں جو عملی سطح پر سراپا نور کی حیثیت رکھتی ہو۔ دراصل میں ایک ایسے خزانے کی طرح ہوں جو کسی صحرا کی خاک میں چھپا ہوا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ میری حقیقت کیا ہے اور میں کس کی متاع ہوں؟ ایسی صورت میں مجھ سے کون استفادہ کر سکے گا۔ میری نظر کو کیا غرض پڑی ہے کہ زندگی کے ساتھ پوری کائنات پر نظر رکھے جب کہ میری ذات تو بذاتِ خود ایک چھوٹی سی دنیا کے مانند ہے اور یہ چھوٹی سی دنیا میں میری اپنی سلطنت کی طرح سے ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ میں نہ تو شراب ہوں نہ ساقی نہ ہی مستی اور نہ ہی پیمانہ ہوں۔ اس کے برعکس یہ زندگی کا جو میخانہ ہے اس میں موجود ہر چیز کی حقیقت کا مظہر ہوں۔ مراد یہ ہے کہ اس پورے نظامِ کائنات میں باری تعالیٰ نے انسان کو مختار کل بنا کر بھیجا ہے۔ اس کے بغیر تو زندگی نامکمل اور ناکارہ شے ہے۔ میرا دل تو ایک ایسے آئینے کی مانند ہے جس میں دونوں جہانوں کے راز ہائے سرستہ واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ میں اپنے اشعار میں ان حقائق کو سامنے لاتا ہوں۔ جو عملی سطح پر میرے مشاہدے میں آتے ہیں۔

(17 سے 20) معنی: جنونِ فتنہ سالماں: وہ جنون جو فتنہ اٹھائے۔ رزمِ آرائیاں: لڑائیوں کے لیے صفیں باندھنا۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ جو لوگ بڑے رنگین بیاں تھے فطرت نے مجھے ان میں سب سے علیٰ حد ایسی طرزیات عطا کی ہے کہ آسمانوں پر جو خوش الحان فرشتے ہیں وہ بھی میرے ہمنوا بن گئے ہیں۔ مجھ میں جو عشق کا جذبہ موجود ہے اس کے سبب میں اپنی شعری تخلیقات میں قصا و قدر کے تمام سرستہ راز پیش کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ اس شعر میں اقبال اپنے عہد کے ہندوستان کا نقشہ کھینچتے ہوئے بڑے افسردہ

لہجے میں کہتے ہیں کہ تیری افسوسناک صورت حال پر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے اس لیے کہ دنیا کے دوسرے افسانوں میں تیرا افسانہ سب سے زیادہ عبرت انگیز دکھائی دیتا ہے۔ تیری حالت پر میں جو افسردہ ہوں تو یوں لگتا ہے کہ قدرت نے میرا نام تیرے نوحہ خوانوں میں شامل کر دیا ہے۔

(21 سے 24) مطلب: یہاں اقبال بڑے دکھ کے ساتھ پھول توڑنے والے یعنی دشمن سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب باغ کے مالی اور رکھوالے ہی آپس میں دست و گریباں ہوں تو اس باغ کو برباد کرنے کے عمل میں تجھے کوئی قیادت محسوس ہوگی۔ یوں بھی آسمان نے اپنے دامن میں بجلیاں چھپا کر رکھی ہیں۔ اس صورت میں اہل چین کو آسمانوں نے انتباہ کیا ہے کہ اسی مرحلے پر اگر تم نے غفلت سے کام لیا تو نتیجہ بربادی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ میری آواز کو غور سے سنو! کہ یہ ایسی چیز ہے جس کو غیر وظیفہ جان کر سنتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ دوسرے تو میری بات کا بے حد احترام کرتے ہیں جب کہ تم اہل وطن اس سے غفلت برت رہے ہو۔ اے میرے عزیز! تو کتنا نادان ہے کہ اپنے وطن کے تحفظ کا خیال نہیں کرتا جب کہ آسمانوں پر تیری بربادیوں کے مشورے جاری ہیں۔

(25 سے 29) معنی: اسلوب فطرت: قدرت کا دستور۔ ہویدا: ظاہر۔ مشت خاک: منہی بھر خاک۔ شغل سینہ کاوی: تڑپنے میں مشغول۔

مطلب: ذرا اس منظر کا جائزہ لے کہ اب تک یہاں کیا ہو چکا ہے اور آئندہ کیا ہونے والا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ تو ماضی کی داستانوں میں گھرا ہوا ہے۔ حالانکہ عصر نو میں ان داستانوں کی اہمیت ہی ختم ہو چکی ہے۔ ہمارے تو اس طرح کب تک خاموش رہے گا۔ اپنی آواز اس طرح بلند کر کہ تیری صدا میں سے آسمان تک رسائی حاصل کر لے۔ زیر تشریح اشعار میں اقبال اہل ہند سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ میرے انتباہ کے باوجود اب بھی تم بیدار نہ ہوئے اور اپنے معاملات کو نمٹانے کے لیے جدوجہد کا آغاز نہ کیا تو جان لو کہ ماضی اور حال سے متعلق داستانوں میں تمہاری داستان کا ذکر تک نہ ہو گا کہ قدرت کا نظام بھی یہی ہے اور فطرت کے اصول بھی اسی طرح کے ہیں کہ جو راہ عمل پر گامزن رہتا ہے خدا اسے ہی محبوب رکھتا ہے۔

(29 سے 32) معنی: مثال نقش پا: پاؤں کے نشان کی طرح یعنی پست۔ دل بستہ محفل: محفل کا شیدا۔ سپند آسا: حرل کے دانے کی طرح۔ چلیپا: سیلاب۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال انسانی رنج و الم مگر جوش اور جذبے کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ آج اپنے چھپے ہوئے زخموں کو نمایاں ہی کر کے چھوڑوں گا۔ میری آنکھوں سے لہو نئے گا جو پورے باغ و وطن میں پھیل جائے گا۔ میرے دل میں جو درد چھپا ہے اس کی آج ہر دل کی شمع کو روشن کر دوں گا۔ اور اسی شمع سے میں اے وطن تیری تاریک راتوں کو جگمگا دوں گا۔ میں تو اپنی جان بھی قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوں بشرطیکہ تیرے بایسوں کے سینوں میں دل درد آشنا پیدا ہو جائے۔ میرے اہل وطن فراق اور نفرت کی آگ میں جل رہے ہیں۔ میں اس حقیقت سے پوری طرح سے آگاہ ہوں تاہم خود پر اتنا اعتماد بھی ہے کہ اگر یہ کام مشکل ہے تو اس کو آسمان بھی کر دوں گا۔

(33 سے 35) معنی: مطلق تھا: پوری طرح آزاد۔ بوالہوس: ہوس میں الجھا ہوا۔ ریاض: باغ۔

مطلب: اے میرے ہم نشین! مجھے اپنے سینے کو کھرچنے کے عمل میں ہی مصروف رہنے دے کہ اس طرح میں ان داغوں کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں جو فی الواقع محبت کے داغ ہیں۔ میری نگاہ حقیقت میں نے اب تک جو منظر دیکھے ہیں ساری دنیا کو ان کا نظارہ کرا دوں گا۔ تاکہ وہ غنائی اور نفرتوں کو چھوڑ کر اتحاد و یکجہت سے بہرہ ور ہو سکے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمام احساسات اپنی تخلیقات کے ذریعے لوگوں تک پہنچا دوں گا۔ مجھے اس امر پر مکمل اعتماد ہے کہ جب لوگ میرے مشاہدات، تجربات اور احساسات سے واقف ہوں گے تو دم بخود ہو کر رہ جائیں گے۔

اس بند کے آخری شعر میں اقبال یوں گویا ہوتے ہیں کہ صرف میں ہی نہیں بلکہ ہر نگاہ حقیقت میں کی ان مناظر تک رسائی ہو جاتی ہے جو ابھی تک پردوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایسی حقیقت شناس نظرس اپنے عہد کے تقاضوں کو بھی پوری طرح پہچان لیتی ہیں۔

(36 سے 40) معنی: آزاد احسان رفو: زخم سلوانے کا احسان نہ لینا۔ امتیاز ماوتو: ایک دوسرے میں فرق۔ استغنا: بے پروائی۔

مطلب: اس پورے بند میں اقبال اس عالم بے عمل سے براہ راست مخاطب ہیں جو مذہب کا اجارہ دار بنا ہوا ہے۔ بعض شارحین نے زیر تفریح اشعار کو وطن کے حوالے سے دیکھا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ ان کا مخاطب مذہب کا اجارہ دار وہ برخود تسلط ملائی ہے جس نے معمولی اختلافات کو ہوا دے کر دلوں میں نفرتوں کے بیج بو دیئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ تو نے کسی مرحلے پر بھی وسعت قلبی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تاہی تیری نگاہوں میں وہ رفعت پیدا ہوئی جو فرد کو فرشتے سے بھی افضل بنا دیتی ہے اس کے برعکس تو نے تو تمام عمر غناقت اور نفرت کی پستیوں میں گزاری۔ ہر چند کہ تیرے دم سے محفلوں میں دل بستگی کا سامان تو پیدا ہوا لیکن تو اس قدر داخلیت پسند تھا کہ یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ محفلوں سے باہر بھی تو بہت کچھ ہے۔ تو دوسروں کی خوبصورتیوں اور اداؤں پر قربان تو رہا لیکن تیرے اندر اگر کوئی خوبصورتی چھپی ہوئی تھی اس کی جانب کوئی توجہ نہ کی۔ خدا کے اپنے متعصبانہ نقطہ نظر سے گریز کر کہ تو جن چیزوں کو برا سمجھ رہا ہے وہ تو اس دنیا کی زندہ حقیقت ہیں۔ وطن اور اہل وطن پر جو ظلم و ستم ہو رہے ہیں ان کے خلاف تو تجھے سراپا احتجاج بن جانا چاہیے تھا لیکن تو نے تو اس صورت حال کے خلاف اپنی زبان اس طرح بند کر رکھی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ مراد یہ ہے کہ غیر ضروری اور فغان انگیز باتوں پر تو توجیح چاہتا ہے لیکن جن باتوں پر احتجاج کرنا چاہیے ان پر اپنی زبان بند رکھتا ہے اور احتجاج کی جرات نہیں کرتا۔

(41 سے 45) معنی: بخت خفتہ: سوئی ہوئی قسمت۔ دشت غرمت: بے وطنی کا صحرا۔

مطلب: اگر دل و ضمیر صاف ہوں تو ان کے بارے میں کسی قسم کی رنگ آمیزی کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن تو نے تو اے عالم بے عمل آئینے کی شفاف سطح پر بھی مندی لگا کر اسے رنگنے کی کوشش کی ہے۔ تو اس قدر کج میں ہے کہ زمین ہی نہیں بلکہ آسمان بھی تیرے اس رویے کے خلاف مضطرب اور مضطرب ہے کہ تو نے تو قرآن کی آیات کو بھی اپنے زیر متاغلط معنی پھندا دیئے ہیں۔ اپنی زبان سے تو تو خدا کی وحدانیت کا دعویٰ کرتا ہے لیکن عملی سطح پر اپنے مفاو کے تحت کئی بت پال رکھے ہیں۔ اے عالم بے عمل تو نے حضرت یوسف کی حقیقت بیان کرتے ہوئے حدود و قیود سے آزاد چیزوں کو حدود و قیود کا پابند بنا کر رکھ

دیا ہے۔ تیرا مقصود تو محض یہی ہے کہ منبر پر اپنی رنگیں بیانی کے جو ہر دکھائے۔ حد تو یہ ہے کہ تو جو نصیب جس کرتا ہے وہ محض افسانہ خوانی سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتی۔

(46 سے 52) مطلب: ان اشعار میں اقبال اپنے حمد کے عالم بے عمل کو مشورہ دیتے ہیں کہ اپنی نمناک آنکھوں کو اس حسن سے آشنا کر جو پروانے کے دل میں اضطراب و تڑپ پیدا کرتا ہے اور جس کے سبب جبینم کو اشک آلودہ ہونا پڑتا ہے۔ تو جس انداز سے کائنات کے معاملات کو دیکھتا ہے وہ قدرت کے مقاصد کی نفی کا حامل ہے حالانکہ خدائے عز و جل نے بالآخر سوچ سمجھ کر انسان کی آنکھوں کو بنایا ہے۔ جشید نے بے شک جو پالہ تیار کیا تھا اس کے ذریعے وہ پوری دنیا کے مناظر کو دکھاتا رہا اس کے باوجود وہ حقائق کا نظارہ کرنے سے محروم ہی رہا۔ سوا اس عمل سے کچھ فائدہ نہ تھا۔ سن لے کہ فرقہ آرائی ایک ایسے درخت کے مانند ہے جس کا پھل تعصب کے سوا اور کچھ نہیں! مراد یہ ہے کہ فرقہ بندی سے معاشرے کو توڑ پھوڑ اور منافرت کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ تفرقہ بازی کے سبب ہی یہ صورت بنی کہ حضرت آدم جنت سے نکالے گئے۔ اقبال اس شعر میں کہتا ہے چاہتے ہیں کہ فرشتوں اور آدم کے مابین نفرت کی جو فضا پیدا ہوئی اس کے رد عمل کے طور پر آدم جنت سے نکالے گئے۔ اقبال اگلے شعر میں کہتے ہیں کہ سورج اتنی بلندی پر اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے اس کے باوجود وہ ایک پھول کی پتی کو بھی زمین سے اوپر اٹھانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس یہ جبینم ہے جو اڑ کر بلند فضاؤں سے جا ملتی ہے اس لیے کہ وہ بلند فطرت کی مالک ہے۔ مزید یہ کہ اہل محبت کو اپنے زخم بھرنے کی قطعی پروا نہیں ہوتی کہ یہ لوگ تو خود ہی اپنے زخموں کے لیے مرہم پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کو کسی بھی دوسرے معالج اور دوا کی حاجت نہیں ہوا کرتی۔ یہ محبت کا شعلہ ہی ہے جو عملی سطح پر نور مطلق کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ محبت ہے جو ایک معمولی بیج کے طور پر اس امر کی اہل ہے جو طور کے پائعات کی تخلیق کرے۔ اقبال کا نقطہ نظر یہ ہے کہ محبت کے جذبے کی بنیاد پر قلب انسانی عملی طور پر باری تعالیٰ کے نور سے منور ہو جاتا ہے۔

(53 سے 61) معنی: داستان درد: درد بھری داستان۔ رشتہ معنی: دعا کا رشتہ۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال حمد کی صورت حال کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا میں جتنے بھی دکھ ہیں ان کا ازالہ محبت کے جذبے سے ہی ممکن ہے کہ کسی زخم کا حتمی علاج اس کو سلوانے میں نہیں بلکہ مرہم کے ذریعے ہوتا ہے۔ اور انسانی دکھوں کے زخم کا بہترین علاج محبت کے سوا اور کچھ نہیں۔ میرے تخیل کی پرواز جو آسمان تک ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے پھولوں کی ماہیت سے کچھ نتائج اخذ کیے ہیں۔ بے شک پھولوں کا رنگ تو کسی نہ کسی مرحلے پر اڑ جاتا ہے تاہم ان میں جو خوشبو ہوتی ہے وہ فضاؤں کو اکثر و بیشتر مسطر کرتی رہتی ہے۔ میں جو وطن اور اہل وطن کی بے حسی اور بے عملی پر ہر دم گریہ کنال رہتا ہوں وہ ایک فطری امر ہے اس لیے کہ میرے لیے ہی نہیں بلکہ ہر شاعر کے لیے یہ عمل عبادت سے کم نہیں کہ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے اس صورت حال کا چرچا کرے۔

اس سارے پس منظر میں سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب وطن اور اہل وطن کی بے عملی اپنے انتہائی عروج پر ہو تو ایک باشعور اور غیرت مند تخلیق کار یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جہاں عزت و آبرو کا تصور ہی مفقود ہو کر رہ جائے وہاں بود و باش اختیار کرنے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ ہر فرد کے لیے لازم ہے کہ آزادی کے حصول کے لیے محبت بنیادی جذبہ ہے اس کے برعکس جہاں تک نفرت کا تعلق ہے وہ تو اسے

غلامی سے ہمکنار کرتی ہے۔

یہ بے نیازی کا طور ہی ہے جو پیالے کو پانی میں ڈبوئے رکھتا ہے بالکل اسی طرح جیسے کسی ندی میں پانی کے بلبلے اوپر نیچے حرکت کرتے رہتے ہیں لیکن ڈوبتے نہیں تیرے لیے بھی لازم ہے کہ شان بے نیازی اختیار کر لے۔ تو نے تو نفرتوں اور افتراق کے ذریعے خود کو دوسروں سے الگ تھلک کر رکھا ہے۔ تاہم دنیا میں رہنا ہے تو یہ انداز ترک کر دے اور سب سے مل کر رہ۔ اس لیے کہ محبت و یگانگت کے طویل سی نوع انسان خوش حال اور مطمئن رہ سکتی ہے۔ میں جو شراب کے بغیر ہی مست و مخمور رہتا ہوں تو اس کا سبب محبت ہے۔ محبت ہی فی الواقع ایسا جذبہ ہے جس کے سبب ذہنی اور نفسیاتی سطح پر بیمار قومیں شفا پاتی ہیں۔ اور اسی کے سبب ان میں بیداری کی لہر پیدا ہوتی ہے۔ یہاں اقبال کی مرواوی یہ ہے کہ نفرت اور افتراق قوموں کو تباہی کے اندھیرے میں دھکیل دیتے ہیں۔ یہ محبت ہی ہے جو انہیں دنیا میں کامیاب و کامران کرتی ہے۔

(62 سے 69)

مطلب: نظم کے اس آخری بند میں اقبال یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ محبت ہی اس عالم رنگ و بو میں سب کچھ ہے اور اس سے یہ کائنات قائم ہے۔ یہ درست ہے کہ محبت کسی مرتبے پر صحرا اور دیرانے کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے اور کہیں وطن بھی اس کا منظر بن جاتا ہے۔ کہیں نفس، کہیں دیرانہ، کہیں آشیانہ اور کسی مرتبے پر جن کا روپ محبت ہی دھار لیتی ہے۔ محبت ہی وہ جذبہ ہے کہ جو منزل اور کہیں صحرا، کہیں اہل کارواں کے لیے آواز برس کی مانند تو کہیں رہبری بھی کرتی ہے اور کبھی راہنہ بھی۔ یوں تو سب لوگ محبت کو ایک مرض سے تعبیر کرتے ہیں لیکن یہ ایسا مرض ہے جس میں کائنات کے جملہ امراض کا علاج پوشیدہ ہے۔ اس جذبے سے جب دل جتنا ہے تو سراپا نور میں ڈھل جاتا ہے اس لیے کہ یہ ایسا پروانہ ہے جو جل کر شمع محفل کی تقویت کا سبب بنتا ہے۔

محبت تو ایسا حسن ہے جو ہر شے میں نظر آتا ہے۔ دیکھا جائے تو شیریں، کوہِ بینوں اور فراد میں بڑا فرق ہے تاہم محبت کے جذبے نے ہی انہی ایک دوسرے سے منسلک کر رکھا ہے۔ نفرت و افتراق نے ہی قوموں کی بربادی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے لیکن میرے اہل وطن اس حقیقت سے بے خبر نظر آتے ہیں۔ انہیں وطن کی کوئی فکر نہیں۔ یہ داستان درد اور بھی طویل ہو سکتی تھی کہ میرے تجلیل میں بڑی وسعت ہے۔ نظم کو وہ نظیری کے فارسی شعر پر ختم کرتے ہیں کہ مضمون کا سلسلہ مختصر نہ ہوتا تھا اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا۔ یہ ایسا بیان تھا جو لاجمہ و دو تھا۔ لہذا اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ خاموشی اختیار کر لوں۔

نالہ فراق

035

(آرنلڈ کی یاد میں)

جا با مغرب میں آخر اے مکاں تیرا کہیں! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمین

آگیا آج اس صداقت کا مرے دل کو یقین غلت شب ہے خیائے روزِ فرقت کم نہیں
 "تاز آغوشِ دواش داغِ حیرت چیدہ است
 بچو شمع کشتہ در چشم نگہ خوابیدہ است"

کشتہ عزت ہوں، آبادی میں گھبراتا ہوں میں شرے سودا کی شدت میں نکل جاتا ہوں میں
 یاد ایامِ سلف سے دل کو تڑپاتا ہوں میں ہر تسکھی تیری جانب دوڑتا آتا ہوں میں
 آنکھ گو مانوس ہے تیرے در و دیوار سے
 اجنبیت ہے مگر پیدا مری رفتار سے

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا آئینہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا
 نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا آہ! کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا
 ابرِ رحمتِ دامن از گزار من بچید و رفت
 اند کے برغچہ ہائے آرزو بارید و رفت

تو کہاں ہے اے کلیمِ ذرۂ سینائے علم تھی تری موجِ نفس بادِ نشاطِ افزائے علم
 اب کہاں وہ شوقِ رہِ پیائیِ محرائے علم تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم
 شورِ لیلیٰ کو کہ باز آرائشِ سودا کند
 خاکِ مجنون را غبارِ خاطرِ صحرا کند

کھول دے گا دستِ وحشت عقدۂ تقدیر کو توڑ کر پنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو
 دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو کیا تسلی ہو مگر گردیدۂ تقریر کو؟
 "تابِ گویائی نہیں رکھتا وہن تصویر کا
 خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا"

*

پانچ بند پر مشتمل یہ نظم اقبال اپنے استاد پروفیسر ٹامس آرنلڈ کی یاد میں اس وقت لکھی جب وہ
 1904ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت ترک کر کے واپس انگلستان چلے گئے۔ وہ 1897ء سے اس
 کالج میں فلسفے کے استاد تھے۔ لاہور آنے سے قبل پروفیسر ٹامس آرنلڈ علی گڑھ کالج میں تدریس کے
 فرائض انجام دے رہے۔ جہاں بے شمار طلباء کے علاوہ علامہ شبلی نے بھی ان سے استفادہ کیا۔ واضح رہے
 کہ علامہ شبلی بھی بحیثیت استاد اس کالج سے وابستہ تھے۔

پہلا بند معنی: چیدہ است: پہنے ہیں۔ شمع کشتہ: بجھی ہوئی شمع۔

مطلب: نظم کے پہلے بند میں اقبال لاہور میں پروفیسر آرنلڈ کی قیام گاہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ
 تیرا مکین بالاخر مغرب میں جا بسا۔ افسوس یہ ہے کہ اس کو مشرق کی یہ سرزمین پسند نہ آئی۔ استاد کی جدائی
 میں آج مجھے اس صداقت پر پوری طرح سے یقین آگیا ہے کہ پچھرنے کے لمحات، رات کی تاریکی سے
 کسی طور پر بھی کم نہیں ہوتے۔ یعنی جس طرح رات کی تاریکی میں انسان کو کچھ دکھائی نہیں دیتا اسی طرح
 کسی سے جدائی کے لمحات میں بھی دل و دماغ مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس بند کے تیسرے شعر سے مراد
 یہ ہے کہ اپنے عزیز استاد آرنلڈ کی جدائی کے صدمے کی وجہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میری جینائی

رخصت ہو گئی۔

دوسرا بند معنی: یاد ایام سلف: گذرے ہوئے دنوں کی یاد۔

مطلب: دوسرے بند میں فرماتے ہیں کہ میں تو پہلے ہی تنہائی کا مارا ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ آبادی سے گھبراتا رہا ہوں۔ گذرے ہوئے دنوں کی یاد سے دل کو تڑپاتا رہتا ہوں۔ اور جب کہیں بھی سکون نہیں ملتا تو اسے استاد کی قیامگاہ تیری جانب دوڑتا ہوا آ جاتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ تیرے در و دیوار سے میری آنکھیں مانوس ہیں اس کے باوجود تیرے کلین کی عدم موجودگی میں یہاں اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔

تیسرا بند معنی: خورشید آتش: سورج سے فیض پانے والا۔ عالم نما: جس میں سارا جہان نظر آئے۔

مطلب: اقبال تیسرے بند میں کہتے ہیں کہ اپنے استاد کی شفقت اور فیضانِ محبت سے میں ذرۂ ناچیز آفتاب کی مانند تابانی سے ہمکنار ہونے والا تھا۔ مراد دل لاکھ ٹوٹے ہوئے آئینے کے مانند ہے اس کے باوجود اس امر کا قطعی امکان تھا کہ استاد کی تربیت کے طفیل اس شکستہ آئینے میں ساری دنیا کا نظارہ کر سکوں۔ اس امر کی توقع بھی تھی کہ میری آرزوؤں اور خواہشات کی تکمیل ہو جائے۔ کون جانے کہ میں آئندہ ترقی کر کے کیا سے کیا ہونے والا تھا۔ تیسرے فارسی شعر سے مراد یہ ہے کہ بقول اقبال میں نے ابھی اپنے عظیم استاد سے بہت کچھ سیکھنا تھا کہ وہ داغِ مفارقت دے گئے۔

چوتھا بند معنی: ذرۂ: کنگرہ یعنی چوٹی بلندی۔ بانشاط افزائے: خوشی بڑھانے والی ہوا۔

مطلب: چوتھے اور پانچویں بند کے اشعار میں اقبال آرنفلڈ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ علم کو اگر کوہ طور سمجھ لیا جائے تو ذات بھی علم و حکمت کے کلیم کے مانند ہے۔ تیری گفتگو سے میرے علم اور مسرت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ تیرے بغیر تو جیسے حصولِ علم کا شوق ہی ناپید ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لیے کہ تیری موجودگی کے طفیل ہی میرے سر میں حصولِ علم کا جنون تھا لیکن تیرے جانے کے بعد تو یہ جنون جیسے ختم ہو گیا۔ اب وہ فضا ہی نہ رہی جس سے علم و حکمت کا پر چا تھا۔ اے محترم استاد تو نہیں تو اب کچھ بھی نہیں ہے۔

پانچواں بند مطلب: اس بند میں علامہ اپنے عزم اور خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک روز یقیناً ایسا آئے گا جب میں حسبِ خواہش پنجاب کو چھوڑ کر، اے عظیم استاد پھر تیرے سایہِ التفات تک رسائی حاصل کر سکوں گا۔ میری نگاہیں تو یہاں بھی تیری تصویر کو بغور دیکھتی رہتی ہیں۔ اس کے باوجود وہ اطمینان حاصل نہیں ہوتا جو تیری تصویر اور گفتگو سے حاصل ہوتا تھا۔ میں اس امر کا ادراک تو رکھتا ہوں کہ تصویر قوتِ گویائی سے محروم ہوتی ہے بالفاظِ دگر یہ خاشی ہی عملی سطح پر کسی تصویر کی گفتگو ہوتی ہے۔

چاند

036

میرے دیرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن ہے مگر دریائے دل، تیری کشش سے موجزن

قصد کس محفل کا ہے؟ آتا ہے کس محفل سے تو
آفرینش میں سراپا نور تو، غفلت ہوں میں
آہ! میں جلتا ہوں سوز اشتیاق دید سے
ایک حلقے پر اگر قائم تری رفتار ہے
زندگی کی رہ میں سرگرداں ہے تو حیراں ہوں میں
میں رہ منزل میں ہوں تو بھی رہ منزل میں ہے
تو طلب خو ہے تو میرا بھی یہی دستور ہے
انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں
مہر کا پرتو ترے حق میں ہے پیغام اجل
پھر بھی اے ماہ مبیں! میں اور ہوں تو اور ہے
گرچہ میں غفلت سراپا ہوں سراپا نور تو
جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے، جیوں جس سے تری محروم ہے

① سے ④ معنی: موجزن: لہریں لے رہا ہے۔ رنج وہ منزل: لمبے سفر کی زحمت۔ آفرینش: پیدائش
کے لحاظ سے۔ سیہ روزی: بد نصیبی۔

مطلب: اس نظم میں اقبال چاند سے یوں مکالمہ کرتے ہیں کہ اے چاند! ہر چند کہ تیری آماجگاہ میرے
وطن سے بہت دور ہے اس کے باوجود میرے دل میں ہر لمحے تیری کشش موجزن رہتی ہے۔ ذرا مجھے اتنا بتا
دے کہ تو کس مقام سے آتا ہے اور وہ کون سی جگہ ہے جہاں جا کر قیام کرے گا۔ تیرے چہرے پر جو زردی
پھیلی ہوئی ہے یوں لگتا ہے کہ زیادہ مسافت طے کرنے کے ضمن میں اس کی تھکن سے تیرا چہرہ زرد ہو کر
رہ گیا ہے۔ تخلیقی سطح پر بے شک تیرا وجود سراپا نور ہے اس کے برعکس میری ذات اندھیرے کے مانند ہے
لیکن جہاں تک بدعتی کا تعلق ہے ہم دونوں میں کافی یکسانیت پائی جاتی ہے کہ دونوں کے مقدر میں جلتے
کے سوا اور کیا ہے۔ میں اپنے محبوب کے بھر میں اور تو اس لیے کبیدہ خاطر رہتا ہے کہ روشنی حاصل کرنے
کے لیے تجھے سورج کا شرمندہ احسان بنانا پڑتا ہے۔

⑤ سے ⑦ معنی: گردش پر کار: ایک ہی دائرہ میں گھومنا۔

مطلب: بے شک اے چاند! یہ درست ہے کہ جس طرح تیرا سفر ایک دائرے کی طرح محدود ہے تو میری
حرکت بھی پر کار کے مانند ہے کہ ایک مقام سے چل کر ادھر ادھر گھومنے کے بعد پھر اسی مقام پر واپس آ
جاتا ہوں۔ تو اگر اس کائنات میں سرگرداں ہے تو میں بھی حیرتوں میں ڈوبا ہوا ہوں۔ یہ درست ہے کہ تو
اس کائنات میں روشن رہتا ہے جب کہ میں بھی آتش عشق سے جلتا رہتا ہوں۔ بد قسمتی یہ ہے کہ طویل
مسافتوں کے باوجود تو بھی راستے میں سرگرداں ہے اور یہی کیفیت میری بھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ تو اس
صورت حال پر خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے۔

⑧ سے ⑩ معنی: مہر کا پرتو: سورج کی روشنی۔ ماہ مبیں: روشن چاند۔

مطلب: اے چاند! جان لے کہ اگر تو کسی کو چاہتا ہے تو خود میری کیفیت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ اگر روشنی تیرا نور ہے تو میرا عشق بھی نور کے مانند ہے۔ میں جس دنیا میں رہاؤں پذیر ہوں وہاں میرے گرد و پیش انجمن آرائی کے لیے ہزار ہا انسان موجود ہیں۔ مگر بے شمار ستاروں میں گمراہ ہونے کے باوجود جس طرح تو بھی خود کو تھا اور بے مثال محسوس کرتا ہے کچھ ایسی ہی کیفیت میری بھی ہے۔ آفتاب کا طلوع ہونا جس طرح تیرے لیے موت کی مانند ہے اسی طرح خالق کائنات کا جلوہ مجھے اپنے وجود سے غافل کر دیتا ہے۔

(11)

مطلب: اے چاند! تجھ میں اور مجھ میں اگرچہ بہت سی باتیں اور خصوصیات مشترک حیثیت کی حامل ہیں۔ اس کے باوجود عملی سطح پر تو کچھ اور شے ہے میں کچھ اور شے ہوں۔ یعنی تجھ میں اور مجھ میں بڑا فرق ہے۔ اس لیے کہ جو پلودرو کا حامل ہو اس سے تو واقف نہیں جب کہ میں پوری طرح آشنا ہوں اور یہ بھی جان لے کہ بے شک میں سراپا تاریکی کے مانند ہوں اور تیرا وجود نور اور روشنی کا حامل ہے۔ اس کے باوجود یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ تو اپنی حقیقت سے بیگانہ ہے جب کہ میں اس کا پورا پورا شعور رکھتا ہوں۔ مراد یہ کہ تو اپنی شناخت سے بیگانہ ہے جب کہ میں اپنے وجود سے مکمل آگاہی رکھتا ہوں۔ میں تجھ پر یوں بھی فضیلت رکھتا ہوں کہ مجھے اپنی تخلیق کے مقصد کا پوری طرح سے علم ہے۔ میری انفرادیت یہی ہے جس سے تجھے محروم رکھا گیا ہے۔

بلالؒ

037

چمک اٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا جش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے نمکدے کی آبادی تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وہ آستان نہ چھتا تجھ سے ایک دم کے لیے کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لیے
جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں
نظر تھی صورتِ سلمانؑ ادا شناس تری شراب دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
تجھے نظارے کا مثلِ کلیمؑ سودا تھا اولیں طاقات دیدار کو ترستا تھا
مدنہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا ترے لیے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا
تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرت دید خنک دلے کہ تہد دے نیا سائید
گری وہ برق تری جان نا ٹھیکبا پر کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰ پر
پیش ز شعلہ گرفتند و بر دل تو زدند
چہ برق جلوہ بخاشاک حاصل تو زدند
اوائے دید سراپا نیاز تھی تیری کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری

اذانِ ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی نماز اس کے نگارے کا اک بہانہ بنی
خوشا وہ وقت کہ میثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا



جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ بلال حبشیؓ کا شمار حضور سرور کائناتؐ کے ممتاز صحابیوں میں ہوتا ہے۔ ان کا سب سے بڑا اعزاز یہ تھا کہ مسجد نبویؐ میں باقاعدہ طور پر اذان دیا کرتے تھے۔ تاریخی سطح پر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ بڑے خوش الحان تھے۔ علامہ اقبال نے یہ نغمہ ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر کہی ہے۔ پوری نظم تین بند پر مشتمل ہے جس میں تیرا اشعار ہیں۔

پہلا بند معنی: آستان: چوکٹ۔

مطلب: اس نظم میں اقبال صحابی رسولؐ مقبول حضرت بلال حبشیؓ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ تیرے مقدر کا ستارہ ہی چمک اٹھا تھا کہ تو حضورؐ کی دید اور خدمت کے لیے حبشہ سے حجاز میں آہوا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت بلالؓ یہ فام حبشی ہونے کے باوجود اس قدر خوش الحان تھے کہ سرور کائناتؐ نے انہیں مسجد نبویؐ میں اذان دینے کی خدمت پر مامور کر دیا۔ فرماتے ہیں کہ اے بلالؓ حبشیؓ تو جو اپنے وطن میں بے کیف زندگی گزار رہا تھا حضورؐ کی غلامی میں پہنچ کر اس سعادت کا اہل ہوا کہ اس غلام پر ہزار آزادیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ پر اعدائے دین کی یلغار اور تجھ پر ظلم و ستم کے باوجود تو نے حضورؐ کے آستانے کو تا زندگی ایک لمحے کے لیے نہیں چھوڑا۔ اس لیے کہ تو اس رمز سے آگاہی حاصل کر چکا تھا جو محبوب کے عشق میں غیروں کی جو جفائیں بربداشت کرنی پڑتی ہیں وہ اہل دل کے لیے جفا نہیں ہوتیں اس لیے کہ ان کے بغیر محبت میں کچھ لطف حاصل نہیں ہوتا۔

دو سرا بند معنی: سلمان: عاشق رسولؐ۔ مثل کلیمؑ سودا: حضرت موسیٰؑ کی طرح جنون۔ اولیس: عاشق رسولؐ۔ جان ناٹھکیا: بے سیرجان۔

مطلب: اے بلالؓ حبشیؓ! امر واقع یہ ہے کہ صحابی رسولؐ حضرت سلمان فارسیؓ کی طرح تیری نظر بھی ادا شناس تھی اور حضورؐ کی عظمتوں سے پوری طرح سے آگاہی رکھتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ پیغمبر اسلامؐ کی قربت میں تیرا جذبہ وارفتگی مزید فروغ پاتا تھا۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ کلیمؑ اللہ کو دیدار خداوندی کا جنون تھا اور حضرت اولیسؑ قرنیؓ جس طرح نبی اکرمؐ کی زیارت کے لیے ترستے رہے اسی طرح تو نے مدینے کو محض اس لیے نور حقیقت تصور کر لیا تھا مزید یہ کہ اس صحرا کو کہہ طور کی مانند سمجھ لیا تھا کہ حضور سرور کائناتؐ اس شر بے مثال میں اقامت پذیر تھے۔ تجھے بیشک حضورؐ کا دیدار حاصل رہا اس کے باوجود تیرا ذوق دید تشنگی محسوس کرتا رہا۔ بے شک وہ دل خوش قسمت ہے جو ہمیشہ عشق رسولؐ مقبول میں ترپتا رہا۔ عشق رسولؐ نے تیری شخصیت کو اس طرح منور کر دیا تھا کہ تیرا سیاہ رنگ حضرت موسیٰؑ کے یہ بیضا پر خندہ زن رہا۔ تیرا دل شعلے کی مانند تھا اور عشق رسولؐ نے تجھ وہ سوز عطا کیا جو تیرا سرا یہ حیات بن گیا۔

تیسرا بند معنی: میثرب: مدینہ کی ایک بہتی کانام (مراد مدینہ)۔

مطلب: حضور اکرمؐ کے روئے مبارک کی زیارت تیرے لیے سراسر عجز و انکساری کے جذبے پر مبنی تھا

اور دیکھا جائے تو تیرے لیے یہ عمل سراسر نماز اور سجدہ خداوندی سے کم نہ تھا۔ تیری اذان محض اذان نہ تھی بلکہ اسے عشق محبوب کے لیے ترانے سے تشبیہ دی جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ اے بلال حبشی! نماز تو حضور کی زیارت کا بہانہ تھی کہ وہ لمحات کتنے باعثِ رحمت تھے جب حضورؐ میثرب میں مقیم تھے اور عام لوگ ان کی زیارت سے استفادہ کرتے تھے۔

سرگزشت آدم

038

نے کوئی مری غمت کی داستاں مجھ سے
لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
رہی حقیقت عالم کی جستجو مجھ کو
ملا مزاج تغیر پسند کچھ ایسا
نکالا کعبے سے پتھر کی صورتوں کو کبھی
کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا
کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں
سنایا بند میں آ کر سرودِ ربانی
دیوارِ بند نے جس دم مری صدا نہ سنی
بنایا ذروں کی ترکیب سے کبھی عالم
لوہ سے لال کیا نیکیوں زمینوں کو
سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
کیا امیرِ شعاعوں کو برقِ معطر کو
مگر خبر نہ ملی آہ! رازِ ہستی کی
ہوئی جو چشمِ مظاہر پرستِ دا آخر

بھلایا قصہ پیمانِ اولیٰں میں نے
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے
دکھایا اوجِ خیالِ فلکِ نشیں میں نے
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے
کبھی بتوں کو بنایا حرمِ نشیں میں نے
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے
کیا فلک کو سفرِ چھوڑ کر زمیں میں نے
دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے
پسند کی کبھی یونان کی سرزمیں میں نے
بسایا خطہِ جاپان و ملکِ چین میں نے
خلافِ معنیِ تعلیمِ اہلِ دین میں نے
جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقلِ ددیں میں نے
اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے
سکھایا مسئلہِ گردشِ زمیں میں نے
لگا کے آئندہ عقلِ دوریں میں نے
بنا دی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میں نے
کیا خرد سے جہاں کو نہ نکلیں میں نے
تو پایا خانہِ دل میں اسے کہیں میں نے

*

دیکھا جائے تو زیرِ شرحِ نظم میں اقبال نے ایک طرح سے ازل سے ابد تک انسان کے عروج و زوال کی داستانیں رقم کی ہیں۔ انہوں نے پیغمبروں اور بعض دوسرے مذاہب کے رہنماؤں کی عظمت اور قربانیوں کے حوالے سے ایسے نقشے پیش کیے ہیں جن سے انسانیت کا منظر نامہ ترتیب پاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اٹھارہ اشعار پر مشتمل یہ نظم تخلیقِ کائنات اور اس کے بعد عہد بہ عہد عروج و زوال کی نشاندہی کرتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے! علامہ فرماتے ہیں!

① سے ③ معنی: پیمانِ اولیٰں: پہلا عہد (مراد روزِ ازل)۔ جامِ آتشیں: تیز شراب کے پیالہ سے مراد

ہے۔ خیال فلک نشیں: آسمان تک پہنچنے والا خیال۔

مطلب: یہاں انسان یوں گویا ہوتا ہے کہ میری وطن سے دوری اور غربت کا احوال سنتا ہے تو سنو کہ جس مرحلے پر میں نے خالق دو جہاں کی ربوبیت کا اقرار کیا اور میری دانش نے مجھے اپنی حقیقت کے ظلم سے آگاہ کیا تو عجب کیفیت رونما ہوئی کہ میرا دل جنت کی قیام گاہ سے اکٹرا کر رہ گیا۔ شاید یہی وہ لمحہ تھا جب میرا شعور بیدار ہوا تھا۔ اس لمحے دل میں یہ لگن پیدا ہوئی کہ کائنات کی جملہ حقیقتوں سے آگاہی حاصل کروں! اس لمحے میرا داغ عرش معلیٰ پر تھا۔

④ سے ⑧ معنی: تغیر پسند بدلنے والا۔

مطلب: انسان کتا ہے کہ کائنات کی حقیقتوں سے آگاہی کے جذبے کے علاوہ میرا مزاج اس قدر تغیر پسند واقع ہوا تھا کہ میں نے زمین پر پہنچنے کے بعد کسی ایک مقام پر قیام کو گوارا نہ کیا۔ چنانچہ کبھی تو پیغمبر خدا حضرت ابراہیمؑ کا وجود اختیار کر کے بتوں سے کعبہ کو پاک کیا اور کبھی آذر بن کر کعبے کو بتوں سے مزین کر دیا۔ کسی مرحلے پر خدائے لم یزل سے مکالے کا جنون پیدا ہوا تو حضرت موسیٰؑ کی شکل میں کوہ طور پر چڑھ چکا اور کبھی آستین میں نور خداوندی کو چھپا لیا۔ کوہ طور پر یہ بیضا کے استعارے حضرت موسیٰؑ کی ذات و صفات کے استعارے بنتے ہیں۔ کبھی یوں بھی ہوا کہ اپنے ہی عزیز و اقارب نے مجھے صلیب پر چڑھا دیا۔ یہاں اشارہ حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کی جانب ہے۔ اس کے بعد وہ مرحلہ بھی آیا جب ایک بار پھر زمین سے پرواز کر کے آسمان کی جانب رخ کیا۔ اس مصرع میں اشارہ سفر معراج کی جانب بھی ہے۔ اس شعر میں پیغمبر آخر الزماںؑ کے غار میں پوشیدہ ہونے کے واقعہ کے ساتھ اس امر کی نشاندہی بھی کہ حضورؑ کے ساتھ ہی نبوت ختم ہو گئی یعنی یہ کہ وہ آخری نبیؑ تھے۔

⑨ سے (13) معنی: تگلیں، زیر تگلیں۔

مطلب: انسان ان اشعار میں یوں گویا ہوتا ہے کہ سرور کائنات کے بعد ہندوستان میں خالق حقیقی کے پیغام کی ترسیل کے لیے کرشن اور مہاتما بدھ جیسے او تاروں کا روپ و ہار لیا۔ اور کبھی یونان کی سرزمین پر سقراط جیسے جرات مند اور سچ بولنے والے فلسفی کی شکل اختیار کر لی۔ ہندوستان میں جب مہاتما بدھ کی حیثیت سے وہاں کے باشندوں نے میری صدا پر لبیک نہ کہا تو پھر میں نے جاپان اور چین جا کر وہاں کے لوگوں کو اپنی تعلیم سے آراستہ کیا۔

کبھی میں نے ایک سائنسدان کی حیثیت سے اس امر کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کائنات کا وجود مادہ کے ذریعے عمل میں آیا اور روح کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریان لوگوں کے نظریات کی نفی کرتا ہے جو مذہب اور دین پر عقیدہ رکھتے تھے۔ اس کے بعد صورت حال یہ پیدا ہوئی کہ تعقل پرست اور مذہب پرستین رکھنے والے لوگوں میں جنگ و جدل کا بازار ایسا گرم ہوا جس میں لا تعدا لوگوں کے خون سے زمین سرخ ہو گئی۔ پھر یوں بھی ہوا کہ میں نے ستارہ شناسی اور اس کی حقیقت کے ادراک کے لیے نہ جانے کتنی راتوں تک بیدار رہ کر ریاضت کی۔

14- سے 18 معنی: مظاہر پرست: قدرت کے مظاہر کو پہنچنے والی۔

مطلب: برہمنکس نے جب زمین کی گردش کا انکشاف کیا تو مسیحی پادریوں نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ اس

لے اکثر مذاہب کی طرح عیسائی بھی اس عقیدے کے حامل تھے کہ زمین ساکن ہے لیکن برنکس نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کر دکھایا کہ زمین ساکن نہیں بلکہ متحرک ہے۔ پھر جب اس نظریے کی مخالفت میں تلواریں نکل آئیں پھر بھی برنکس نے مزید تحقیقات جاری رکھیں اور وہ اس نوع کی مخالفت کے رو بہ رو ڈٹ گیا۔

انسان کہتا ہے کہ اس کے بعد میں نے بحیثیت سائنس دان اپنی دانش و جستجو سے یہ راز آشکار کیا کہ اشیا جو فضا میں موجود ہیں وہ اوپر کی طرف جانے کی بجائے زمین کی طرف ہی کیوں راغب ہوتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ دنیا کو مزید خوبصورت بنانے کے لیے میں نے شعاعوں اور برق سے سبق حاصل کر کے بجلی پیدا کی جو ہر طرف روشنی کا ذریعہ بنی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے فہم و ادراک سے میں نے ساری دنیا کو تسخیر کر لیا لیکن یہ راز نہ پاس کا کہ ہستی کیا شے ہے؟ لیکن میری ظاہر دست آنکھ جب حقیقت کو پانے کے قابل ہو سکی تو پتہ چلا کہ حسن ازل اور حقیقت زندگی تو خود میرے دل کے اندر مقام کیے ہوئے ہے۔

ترانہ ہندی

039

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
پریت وہ سب سے اونچا، ہمسایہ آسماں کا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
اے آب رود گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیز رکھنا
یونان و مصر و روم سب مٹ گئے جہاں سے
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹنی نہیں ہماری
اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا



یہ ترانہ اقبال نے اس وقت لکھا تھا جب وہ ایک وطن پرست انسان کے مانند متحدہ ہندوستان کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتے تھے۔ ایک محب وطن شاعر کی حیثیت سے ان کا ذہن ان اشعار میں ہر نوع کے اختلافات اور تعصبات سے پاک نظر آتا ہے۔ ان کے ذہن میں بنیادی مسئلہ اس وقت صرف اور صرف انگریز کی غلامی کا تھا چنانچہ ان اشعار میں بھی کہیں کہیں اس طرف اشارے ملتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔
معنی: پریت: پہاڑ۔ رشک جتناں: جنت سے بڑھ کر خوبصورت۔ آب رود گنگا: گنگا کے دریا کا پانی۔ دور زمانے کی گردش۔

مطلب: ہندوستان ہمارا ایسا وطن ہے جو ساری دنیا سے اعلیٰ اور خوبصورت نظر آتا ہے۔ اگر اس کو پاکستان تصور کر لیا جائے تو ہماری حیثیت اس میں مقیم ان بلبلوں کی سی ہے جو خوشیوں کے نغمے گاتی رہتی

ہیں۔ اقبال دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ اگر ہم سفر میں یا کسی دوسرے ملک میں ہوں تو بھی دل میں وطن کی محبت موجزن رہتی ہے۔ چنانچہ پردیس میں رہتے ہوئے بھی ہم خون کو اپنے وطن میں ہی محسوس کرتے ہیں۔

یقیناً یہ کامل فخر حقیقت ہے کہ ہمالہ جیسا بلند پہاڑ جس کی چوٹیاں آسمانوں کو چھوتی رہتی ہیں وہ ہمارے محافظ اور پاسباں کی طرح سے استلوا ہے۔ ہزاروں ندی نالے وطن عزیز کے طول و عرض میں موجزن رہتے ہیں۔ جن کے سبب یہاں کی سرزمین ایسی سرسبز و شاداب رہتی ہے جو جنت کے لیے بھی باعث رشک ہے۔ اس شعر میں اقبال دریائے گنگا کو مخاطب کر کے استفسار کرتے ہیں کہ کیا تجھے وہ دن یاد ہے جب ہمارا قافلہ تیرے کنارے پر وارد ہوا تھا۔ واضح رہے کہ علامہ کے آباء و اجداد برہمن تھے اور ہزاروں سال قبل جنوبی ایشیا سے نقل وطن کر کے ہندوستان آئے تھے۔ ان کا اشارہ اسی واقعہ کی جانب ہے۔

اس شعر میں اقبال اپنے عہد کے مذہبی تعصبات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کوئی مذہب بھی آپس کی دشمنی نہیں سکھاتا بلکہ باہمی سلوک و اتحاد کی تلقین کرتا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہمارا وطن ہندوستان ہے اور ہم سب ہندی ہیں یعنی اس کے باشندے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی تم بڑی اور قدیم تہذیبیں جو یونان، مصر اور روم کا طرہ امتیاز تھیں وہ اشد اودمانہ سے بالا غربت کر رہ گئیں جب کہ آج بھی ہر طرح کے تغیر و انقلاب کے باوجود ہم ہندوؤں کا نام و نشان باقی ہے اور ہماری تہذیب ماضی کی طرح زندہ و پائندہ ہے۔ آخر ہم میں کوئی ایسی خصوصیت تو موجود ہے جس کے سبب ہمیں زوال نصیب نہیں ہوا جب کہ گروش دوراں صدیوں سے ہماری دشمن چلی آ رہی ہے۔ لہٰذا اس آخری شعر میں اقبال اپنی داخلی کیفیت کو اشارہ ثابیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں ہمارا کوئی بھی مخرم راز نہیں! تاہی اس درد سے آگاہ ہے جو ہمارے دل میں چھپا ہوا ہے۔

جگنو

040

جگنو کی روشنی ہے کاشانہ چمن میں
آیا ہے آسمان سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا؟
تکمرہ کوئی گرا ہے متاب کی قبا کا؟
حسن قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی
چھوٹے سے چاند میں ہے غلٹ بھی روشنی بھی
پردانہ اک پتنگا، جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب، یہ روشنی سراپا

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلیری دی!
پروانے کو تپش دی، جگنو کو روشنی دی

رنگیں نوا بنایا مرغان بے زبان کو گل کو زبان دے کر تعلیم خامشی دی
نظارہ شفق کی خوبی زوال میں تھی چکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی
رنگیں کیا سحر کو، باگی دامن کی صورت پستا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی
سایہ دیا شجر کو، پرواز دی ہوا کو پانی کو دی روانی، موجوں کو بے گلی دی
تھیں امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری

جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری

حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے انسان میں وہ سخن ہے، خفے میں وہ چمک ہے
یہ چاند آسمان کا شاعر کا دل ہے گویا واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں، درد نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چمک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی جگنو میں وہ چمک ہے، وہ پھول میں مک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو؟
ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشی ازل ہو

✽

اقبال کی یہ نظم اس بلند پایہ امجدی کی منظر ہے جس نے انہیں ایک بڑے شاعر ہونے کی فضیلت
بخشی۔ جگنو بظاہر ایک ننھا سا پرندہ ہے لیکن اقبال نے اس کے وجود کو خوبصورت امجدی کے حوالوں سے
جس مقام پر پہنچا دیا ہے اس کا اندازہ نظم پڑھنے سے ہی ممکن ہے۔ عملاً اس نظم کے تین حصے ہیں۔ فرماتے
ہیں:-

پہلا حصہ معنی: کاشانہ چمن: باغ کا صحن: سفیر: اپنی: نکتہ: بن: حسن قدیم: پرانا حسن۔

مطلب: جب کسی باغ میں جگنو اپنی روشنی سیت محو پرواز ہوتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ پھولوں کی
بزم بھی ہوئی ہے اور اس میں جگنو کا وجود ایک روشن شمع کی مانند ہے۔ لگتا ہے کہ یا تو آسمان سے اڑ کر کوئی
ستارہ یہاں پہنچا ہے جو چاند کی کوئی کرن جھنگا رہی ہے۔ یا ایسے کہ جس طرح سے دن کا کوئی سفیر رات کی
سلطنت میں وارد ہوا ہے۔ ہر چند کہ اپنے وطن میں اس کی کوئی حیثیت نہ تھی لیکن یہاں پہنچ کر اس کی
شخصیت چمک اٹھی ہے۔ اس شعر سے مراد یہ ہے کہ دن کے وقت جگنو کے پروں کی روشنی اپنے وجود کا
احساس نہیں کرا پاتی جب کہ رات کی تاریکی میں یہ اسے فروزاں کرنے میں مدد دیتی ہے۔

شب کے لمحات میں چمکتے ہوئے جگنو کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ چاند نے اگر قبائلی ہوئی ہے تو
اس کا کوئی بن ٹوٹ کر گر پڑا ہے۔ یا سورج نے اگر کوئی لباس پہنا ہوا ہے تو اس پر پڑا ہوا کوئی زرہ چمک رہا
ہے۔ دراصل یہ محض ایک ننھا سا پرندہ نہیں بلکہ یہ تو حسن قدیم کی ایک ایسی جھلک کے مانند ہے جسے
قدرت تنہائی سے نکال کر کسی انجمن میں لے آئی ہو۔

اقبال کہتے ہیں کہ یہ جگنو تو ایک چھوٹے سے چاند کے مانند ہے جس میں تاریکی بھی ہے اور روشنی
بھی! ایسا چاند جو اسی سبب کبھی گمن سے باہر نکل آتا ہے اور کبھی گمن میں چھپ جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ
جب جگنو محو پرواز ہوتا ہے تو اس کے ننھے ننھے پروں سے لئے بھر کو روشنی برآمد ہوتی ہے اور لئے بھر کے
لئے تاریکی پھیل جاتی ہے۔ ہر چند کہ پروانہ بھی ایک کیزا ہے اور جگنو بھی ایک حقیر سا کیزا ہے لیکن

صورت یہ ہے کہ پروانے کو روشنی کی طلب ہوتی ہے جب کو جگنو سراپا روشنی ہے۔

دوسرا حصہ معنی: رنگیں نوا: سرلی آواز۔

مطلب: ان اشعار میں پروانے اور جگنو کے وجود کے حوالے سے مختلف اشیاء کی فطرت کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ امر واقع یہ ہے کہ قدرت نے دنیا میں ہر شے کو کوئی نہ کوئی خصوصیت عطا کی ہے فرق بس اتنا ہے کہ پروانے کو حرارت بخشی گئی ہے اور جگنو کو روشنی سے نوازا گیا ہے۔ اسی طرح بعض بے زبان پرندوں کو دل موہ لینے والے انداز میں نغمگی کا عمل سکھایا اس کے برعکس پھولوں کو پتوں کی شکل میں زبان عطا کر کے خاموش رہنے کی تعلیم عطا فرمائی۔

اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ شفق کا نظارہ ہمیں یوں اچھا لگتا ہے کہ اس کی مدت محض چند لمحات تک محدود ہے اور اس کی جو مختصر زندگی ہے وہی اس کا حسن ہے پھر سحر کے لمحات کو بھی اتنا خوبصورت پیراہن عطا کیا کہ اسے ایک دلہن سے تشبیہ دی جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ طلوع سحر کا منظر سرفخی لیے ہوئے ہوتا ہے اسی لیے اگر اس کو دلہن کو سرف جوڑے سے تعبیر کیا جائے تو مناسب ہو گا اور اس لباس پر شبنم کے قطرے کو آری تصور کر لیا گیا ہے۔

یہی نہیں قدرت نے درختوں کو سایہ عطا کیا اور ہوا کو فضا میں اڑنا سکھایا جب کہ پانی کو روانی بخشی اور موجوں کو اضطراب و تڑپ سے نوازا۔ ان سب حقائق کے باوجود اس امتیاز میں ایک خصوصی بات بھی ہے کہ جگنو کے لیے وہی وقت دن کی حیثیت رکھتا ہے جس کو ہم انسان رات سمجھتے ہیں۔

تیسرا حصہ معنی: کک: کک۔ ہنگاموں کا محل: شور و غوغا کا مقام۔

مطلب: اقبال پہلے دونوں حصوں کے اشعار کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ مختلف اشیاء کی جو امتیازی خصوصیات بیان کی گئی ہیں ان پر اگر سری نظر ڈالی جائے تو اس امر کا اندازہ لگنے میں کوئی قباحت نہیں ہو گی کہ یہ اشیاء عملاً رب کائنات کے حسن کی کرشمہ سازی ہیں۔ فرق بس اسی قدر ہے کہ انسان کو بولنا سکھایا ہے تو غنچے کو چمکنا! اسی طرح چاند اور شاعر کے دل میں بھی کوئی نمایاں فرق نہیں کہ چاند کی روشنی اور شاعر کے دل کی کک عملاً ایک ہی چیز ہیں۔ یہ تو محض ایک ایسا دھوکا ہے جو گفتگو کے انداز سے پیدا ہوا۔ اس ضمن میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مختلف اشیاء کے جو مطالب و معانی وضع کر لیے گئے ہیں وہی عام انسان کو غلط فہمی میں مبتلا کرتے ہیں۔ بصورت دیگر نغمہ جو ہے وہ عملاً بلبل کی خوشبو ہے۔ اور خوشبو پھول کی چمک سے مشابہ ہے۔ گویا بلبل کے نغمے کی وہی حیثیت ہے جو پھول کی خوشبو کی ہے۔

یہ نظم بغور دیکھا جائے تو وحدت الوجود کے فلسفے کی بنیاد بنتی ہے۔ جو آخری دو اشعار میں تو بالکل واضح ہو کر سامنے آ گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ رب کائنات کی ذات اور اس کا راز بیک وقت مختلف اشیاء میں ظاہر ہو کر عام نظروں سے چھپ گیا ہے ورنہ بغور دیکھا جائے تو جو حقیقت جگنو میں چمک اور روشنی بن کر نمایاں ہوتی ہے وہی حقیقت پھول کی خوشبو سے بھی ظاہر ہوتی ہے چنانچہ اس حوالے سے جب ہر شے میں رب ذوالجلال کا نور اور اس کا حسن چھپا ہوا ہے تو پھر اختلاف و التراق میں پڑ کر نئے جھگڑے کس لیے پیدا کیے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے مختلف اشیاء کے تقابلی کرداروں کے حوالے سے ایک بڑے مسئلے کا حل پیش کیا ہے۔

صبح کا ستارہ

041

لطف ہسانگے شمس و قمر کو چھوڑوں
میرے حق میں تو نہیں تاروں کی بہتی اچھی
آسمان کیا، عدم آباد وطن ہے میرا
میری قسمت میں ہے ہر روز کا مرنا جینا
نہ یہ خدمت، نہ یہ عزت، نہ یہ رفعت اچھی

میری قدرت میں جو ہوتا، تو نہ اختر بننا
قمر، دریا میں چمکتا ہوا گوہر بننا

واں بھی موجوں کی کشاکش سے جو دل گھبراتا
ہے چمکنے میں مزا حسن کا زیور بن کر
ایک پتھر کے جو ٹکڑے کا نصیب جاگا
ایسی چیزوں کا مگر دہر میں ہے کام شکست
زندگی وہ ہے کہ جو ہو نہ شناسائے اجل
ہے یہ انجام اگر زینت عالم ہو کر

کیوں نہ گر جاؤں کسی پھول پہ شبنم ہو کر؟

کسی پیشانی کے انشاں کے ستاروں میں رہوں
انک بن کر سر مڑگاں سے انک جاؤں میں
کسی مظلوم کی آہوں کے شراروں میں رہوں
کیوں نہ اس یوی کی آنکھوں سے ٹپک جاؤں

میں

جس کا شوہر ہو رواں ہو کے زرد میں مستور
یاس و امید کا نظارہ جو دکھلاتی ہو
جس کو شوہر کی رضا تاب شکیبائی دے
زرد رخصت کی گھڑی عارض ٹکڑوں ہو جائے
لاکھ وہ ضبط کرے پر میں ٹپک ہی جاؤں
ساغر دیدہ پر غم سے چمک ہی جاؤں

خاک میں مل کے حیات ابدی پا جاؤں
عشق کا سوز زمانے کو دکھاتا جاؤں

*

پہلا حصہ معنی: صبحی: شراب جو صبح کے وقت پی جاتی ہے۔ قہر دریا: گہرائی۔

مطلب: علامہ اقبال کی یہ نظم عملاتین حصوں پر مشتمل ہے۔ تینوں حصوں میں ”صبح کا ستارہ“ عالم یاس میں یوں گویا ہوتا ہے کہ اب تو یہ جی چاہتا ہے کہ سورج اور چاند کی قربت سے دست کش ہو جاؤں اور اپنے طلوع ہونے سے آمد صبح کا جو پیغام دیتا ہوں اس ذمہ داری سے بھی جان چھڑا لوں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آسمان پر جو ستاروں کی بہتی قائم ہے اس میں رہائش کسی طرح مناسب نہیں اس کے برعکس

یہ جو بلندی ہے اس کی نسبت زمین کی پستی میرے لیے زیادہ مناسب ہے۔ میرا وطن آسمان نہیں بلکہ وہ جہان فانی ہے جہاں بعد فنا ہر شخص کا پہنچنا مقدر ہے۔ میری کیفیت تو یہ ہے آمد صبح کے ساتھ ہی اپنی عمر طبعی تمام کر کے راہی ملک عدم ہو جاتا ہوں۔

ہر چند جینا اور مرنا میرا مقدر بن کر رہ گیا ہے یعنی ہر روز طلوع ہوتا ہوں اور دن نکلنے ہی فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہوں۔ اس نوع کی ذمہ داری، عزت اور بلندی آخر کس کام کی کہ تھوڑی دیر چمک کر اپنے وجود سے آشنا کرایا اور بس! ایسی روشنی سے تو بخدا تاریکی ہی برتر ہے۔ ستارہ صبح کتا ہے کہ اگر میرے میں کچھ ہو تا تو ستارہ بننے کی بجائے سمندر کی تہ میں موتی بن کر رہتا زیادہ پسند کرتا۔

دوسرا حصہ معنی: زیب گلو: گلے کی زینت۔ سریانوں نے قصیر: قصیر کی ملکہ۔ خاتم: انگوٹھی۔ گہرائے گرا نمایا: جیتی موتی۔

مطلب: اگر سمندر کی تہ میں بھی موجوں کے پھکولوں سے دل گھبراتا تو سمندر کو خیر آباد کہہ کر کسی حسین کے گلے کی زینت بن جاتا۔ اس لیے کہ آسمان کی بلندی پر چمکنے میں وہ لطف نہیں جو کسی حسین کے زبور کی چمک میں ہوتا ہے یا کسی شہنشاہ کی ملکہ کے تاج کی آرائش بننے میں ممکن ہے۔ اس لیے کہ وہ جو دیکھنے میں ایک معمولی پتھر تھا لیکن اس کا نصیب جاگتا حضرت سلیمان کی انگوٹھی کا ہمینہ بن گیا۔

لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس نوع کی اشیاء بالعموم دنیا میں شکست و ریخت سے دوچار ہو کر رہتی ہیں۔ چنانچہ بیش قیمت اور نایاب قسم کے موتی کا انجام بھی بالا خریرہ ریزہ ہوتا ہے۔ بے شک حقیقی زندگی تو وہ ہے جو موت سے آشنا ہو۔ وہ جینا تو لا حاصل ہے جس کا انجام موت ہو۔ اگر کائنات کی زینت بننے کے باوجود انجام بالا خر فنا ہونا ہی ہے تو کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ شعبن کی طرح پھول پر قربان ہو جاؤں۔

تیسرا حصہ معنی: میدان و غا: لڑائی کا میدان۔ عارض گلگوں: پھولوں جیسے رخسار۔

مطلب: میں تو خود کو اس امر کا اہل سمجھتا ہوں کہ کسی حسین کے ماتھے کی افشاں کا روپ و حارلوں یا پھر کسی مظلوم کی آنکھوں میں منتقل ہو جاؤں۔ بعد کے اشعار میں کہا گیا ہے کہ میں کیوں نہ اس بیوی کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک پڑوں جس کا شوہر زردہ پن کر عازم جنگہ ہوا چاہتا ہے کہ حب وطن کا تقاضا ہی یہ ہے۔ اس لیے وفادار بیوی امید و نیم کا شکار ہو اور اس کی خاموشی داخلی جذبات کی ترجمانی کر رہی ہو۔ شوہر سے فرقت اور جدائی کے باوجود وہ مجسم صبر بنی ہوئی ہو۔

بیوی کا پھول جیسا سرخ و سفید چہرہ شوہر کی جدائی کے غم سے زرد ہو جائے لیکن یہ بھی ہو کہ جدائی کا غم اس کے حسن کی کشش کو دوبالا کر دے۔ وہ کتنا ہی ضبط کرے اس کے باوجود میں آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑوں۔ اس لیے خاک میں مل کر حیات ابدی حاصل کر لوں کہ سوز عشق کا حاصل ہی یہی ہے اور یہی حقیقت، میں سارے زمانے پر آشکار کرنے کا خواہاں ہوں۔

ہندوستانی بچوں کا قومی گیت

042

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا . ناک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

تآریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
میرا وطن وہی ہے جس نے مجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
وہاںوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے پھر تاب دیکے جس نے چکائے کھکشاں سے
نولے تھے جو ستارے فارس کے آسمان سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے
میرا وطن وہی ہے نوحؑ نبی کا آ کر ٹھہرا جہاں سفینا
بندے کلیمؑ جس کے پریت جہاں کے سینا
رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

*

چار بند پر مشتمل یہ گیت علامہ اقبال نے ایک قوم پرست شاعر کی حیثیت سے اس صدی کے اداس
میں لکھا تھا جس میں ہندوستانی بچوں کی جانب سے اپنے وطن سے محبت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ”بانگ درا“
کی نظمیں چونکہ اقبال کے ابتدائی کلام کی آئینہ دار ہیں اس وقت ہندوستان میں فرقہ پرستی کی لعنت تو
بہر حال موجود تھی اس کے باوجود تعصبات کی وہ فضا نہ تھی جو بعد میں پیدا ہوئی اور جس کے سبب
قائد اعظمؒ، علامہ اقبال اور دوسرے مسلمان رہنماؤں کی جانب سے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا گیا چنانچہ اس
گیت کو اسی عہد کے ناظر میں دیکھا جائے جس میں یہ لکھا گیا۔

پہلا بند معنی: چشتی: حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجیری۔ نانک: سکھ مذہب کے بانی۔

مطلب: ہندوستانی بچے اپنے وطن کی محبت میں سرشار ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ خواجہ معین الدین چشتی
اجیری نے جس سرزمین پر رب ذوالجلال کا پیغام لوگوں کو سنایا، جہاں سکھ مذہب کے بانی گورو نانک نے
خدا کی وحدانیت کا درس دیا، مغل اگرچہ پہلے پہل ہندوستان میں محض اس لیے آئے تھے کہ اس کو فتح کر
کے اپنا تسلط جمالیں لیکن یہ زمین انہیں اسی قدر پسند آئی کہ یہیں پر رچ بس گئے۔ یہی نہیں بلکہ وہ لوگ
جو عارضی طور پر ہندوستان آئے تھے اس کی خوبصورتی اور عظمت کو دیکھ کر انہوں نے مستقل طور پر اسے
اپنا وطن بنالیا چنانچہ یہی وہ سرزمین ہے جو ہمارا وطن ہے اور ہمیں اس پر فخر بھی ہے۔

دوسرا بند معنی: زر: سونا۔

مطلب: ہندوستان کے باشندوں نے علم و حکمت کے وہ جوہر دکھائے جو یونان کے فلاسفوں کو بھی حیرت
زدہ کر گئے۔ صرف یونان ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام ملکوں کو ہمیں سے علم و ہنر کی دولت عطا ہوئی۔ سچ تو یہ
ہے کہ اس سرزمین کی مٹی کو بھی قدرت نے سونا بنادیا تھا مراد یہ کہ یہ مٹی اس قدر زرخیز تھی جس کی
پیداوار نے مغلوں کو بے حد مالدار اور خوشحال کر دیا چنانچہ یہی سرزمین ہمارا وطن ہے۔

تیسرا بند معنی: نولے تھے جو ستارے: مراد ہے پاری قوم۔

مطلب: ایران سے آنے والے امراء اہل حکمت و دانش اور ہنرمند لوگ ہندوستان میں آکر رچ بس گئے تو انہوں نے وہ شہرت و عزت پائی کہ ان کے علم و حکمت کی روشنی دور دور تک جا پہنچی۔ جہاں کرشن نے وحدت کا درس لوگوں کو دیا اور پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے جہاں سے ایک طرح کی ٹھنڈی ہوا کی آمد کو محسوس کیا وہی سرزمین ہند میرا وطن بھی ہے۔

چوتھا بند معنی: سفینا: کشتی۔

مطلب: وہ سرزمین جہاں کا ہر شخص حضرت موسیٰؑ جیسی عظمت کا حامل ہے اور جہاں کا ہر پہاڑ کوہ طور کی حیثیت رکھتا ہے (ان مصرعوں کو شعری غلو سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے) حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جہاں آکر ٹھہری تھی اور جس سوزمین کی رفعت آسمان کی ہم پایہ ہے یہاں پر زندگی گزارنا جنت میں گذر بسر کرنے کے مترادف ہے وہی سرزمین ہندوستان میرا وطن ہے۔

نیا سوال

043

سچ کہہ دوں اے برہمن! اگر تو برا نہ مانے تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
ایہوں سے بیز رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تک آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا واعظ کا وعظ چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے خاک وطن کا معجزو ہر ذرہ دیوتا ہے
آغیرت کے پروے اک بار پھر اٹھا دیں پتھروں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی آ اک نیا سوال اس دیں میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ دامن آسمان سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گامیں منتر وہ بیٹھے بیٹھے سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
فکرتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

*

پہلا بند معنی: صنم کدوں: بت خانہ، مندر۔

مطلب: اقبال کی اس نظم اور بعض دوسری نظموں کے مطالعے سے ہی اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی سطح پر ہی ان کا تخلیقی جوہر نئے خیالات اور اجتہاد سے ہم آہنگ تھا۔ زیر تشریح نظم میں اقبال برہمن سے مکالمہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر تو برا نہ مانے تو میں حقیقت کا اظہار کر دوں ہر چند یہ حقیقت قدرے تلخ ثابت ہوگی۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ تو جن بتوں کی پرستش کرتا ہے وہ انتہائی فرسودہ ہو چکے ہیں اور عہد نو میں ان کی حیثیت بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ انہی بتوں کی پرستش نے تجھے اپنے جیسے انسانوں سے عداوت رکھنا سکھایا۔ اے برہمن محض تو ہی اس لعنت میں مبتلا نہیں بلکہ واعظ بھی اسی

نومیت کی تفرقہ بازی اور جنگ و جدل میں مصروف ہے۔ اسی لیے میں نے اس صورت حال سے تنگ آکر کعبہ و ہتخانہ دونوں کو چھوڑ دیا ہے نہ اب میں واعظ کی بات سنتا ہوں نہ ہی تیرے اشلوک سننے پر آمادہ ہوں۔ اے برہمن! دراصل تیرا عقیدہ محض یہ ہے کہ پتھر کی ان صورتوں میں (جن کی تو پرستش کرتا ہے) خدا کا وجود پوشیدہ ہے جب کہ میں اپنے وطن کی خاک کے ہر ذرے کو دیوتا تصور کرتا ہوں۔

دوسرا ہند۔ معنی: غیر ہند؛ غیر ہونا، پگاندہ ہونا۔ نقش دوئی: دو ہونے کا نشان۔ تیر تھوں: ہندوؤں کا مقدس مقام۔ کلس: گنبد کے اوپر کی کٹنی۔ شکتی: طاقت۔ شانتی: تسلی۔ باسیوں: بیٹے والے۔

مطلب: اے برہمن! آہم دونوں مل کر ایک بار پھر فراق اور تفرقہ بازی کا خاتمہ کر دیں اور اہل وطن جو باہمی نفرت اور ففاق کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں ان کے مابین اتحاد و یگانگت کا جذبہ پیدا کر کے ایک بار پھر گلے ملا دیں۔ اسی ففاق کے سبب دلوں کی بستیاں ویران ہو چکی ہیں۔ آآن میں ایک نئے سوالہ کی بنیاد رکھ دیں۔ یہ سوالہ ساری دنیا کی عبادت گاہوں سے مرتبے میں بلند ہو۔ اس سوالہ میں سب محبت و آشتی کے نغمات گائیں اور تمام اہل ہند میں محبت و آشتی کی فضا پیدا کر دیں۔ امن و قوت کا تصور ایسے گیتوں میں پوشیدہ ہے جو صلح، آشتی اور محبت و یگانگت سے عبارت ہیں۔

داغ

044

عظمت غالب ہے، اک مدت سے پیوند زمیں
توڑ ڈالی موت نے غمت میں جینائے امیر
آج لیکن ہمنوا! سارا چمن ماتم میں ہے
بلبل دلی نے باندھا اس چمن میں آشیان
چل بسا داغ آہ! میت اس کی زیب ووش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

اب کہاں وہ بانکپن! وہ شوخی طرز بیاں
تھی زبان داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
اب صبا سے کون پوچھے گا سکوت گل کا راز؟
تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں

آکھ طائر کی نشیں پر رہی پرواز میں
اور دکھلائیں گے مضمون کی ہمیں باریکیاں
آپنے فکر نکلتے آرا کی قلم پیاہیاں
تخی دوراں کے نقشے کھینچ کر رلوائیں گے
یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے
اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبل شیراز بھی
سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحب اعجاز بھی
اٹھیں گے آزر ہزاروں شعر کے ہتھکنے سے
میں پلائیں گے نئے ساقی نئے پیانے سے
ہوں گی اے خواب جوانی! تیری تعبیریں بہت
کسی جائیں گی کتاب دل کی تعبیریں بہت

ہو ہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟
 اٹھ گیا ٹانگ 'گلن' مارے گا دل پر تیر کون؟
 اشک کے دانے زمین شعر میں ہوتا ہوں میں تو بھی رواے خاک دلی! داغ کو روتا ہوں میں
 اے جہان آباد اے سرمایہ بزم خن! ہو گیا پھر آج پامال خزاں تیرا چمن
 وہ گل رنگیں ترا رخصت مثال ہو ہوا! آہ! خالی داغ سے کاشانہ اردو ہوا
 تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں وہ مہ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں
 اٹھ گئے ساقی جو تھے 'میخانہ خالی رہ گیا
 یادگار بزم دہلی ایک حالی رہ گیا

*

عملی سطح پر یہ نظم ایک مرثیے کی حیثیت رکھتی ہے جو اقبال نے اپنے استاد اور صاحب طرز شاعر
 نواب میرزا خاں داغ کے سانحہ ارتحال پر لکھا تھا۔ اقبال نے اس مرثیے میں جہاں اپنے جذبات کا اظہار
 کیا ہے وہاں داغ کی شاعری اور اسلوب پر ایک ناقدانہ نظر بھی ڈالی ہے۔ اس اعتبار سے داغ کے بارے
 میں اقبال کی ایک بے حد اہم اور قابل ذکر نظم ہے۔ فرماتے ہیں۔

پہلا حصہ معنی: پوہند زمیں: خاک میں دفن۔ ممدی مجروح: مرزا غالب کا شاگرد۔ مینائے امیر: امیر
 یونانی کی سراجی۔ زیب دوش: کندھوں کی سجاوٹ۔

مطلب: میرزا اسد اللہ خاں غالب تو ایک مدت ہوئی وفات پا چکے۔ اس کے باوجود ان کی شاعرانہ عظمت
 ابھی تک زندہ و باقی ہے۔ اسی طرح میرزا غالب کے ایک اہم شاگرد جن کا تعلق دہلی سے تھا وہ بھی اللہ کو
 پیارے ہو چکے۔ اسی طرح موت کا سٹنڈل فرشتہ میر تقی میر کی روح کو بھی چاٹ گیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ
 آج بھی ان کی شاعری کا کیف و سرور باقی ہے۔ لیکن آج نواب میرزا داغ کی وفات حسرت آیات کے
 سبب چمن شاعری ماتم کردہ بنا ہوا ہے۔ اس لیے کہ ان کی شخصیت بزم شاعری میں ایک روشن شمع کی
 حیثیت رکھتی تھی جو بجھ کر رہ گئی ہے۔ داغ کا وجود تو ایسا تھا جو باغوں میں چمکتے ہوئے بلبل کا ہوتا ہے۔ دہلی
 کا یہ صاحب اسلوب شاعر افسوس کہ اسی قبرستان میں پہنچ گیا جہاں دوسرے بڑے شعراء دفن تھے۔ حیف
 و رحیف کہ استاد داغ بھی چل بے اور ہم لوگ ان کی میت کو کاندھوں پر اٹھا کر مرحوم کی آخری قیام گاہ
 تک پہنچا آئے ہیں۔ ج تو یہ ہے کہ دلی کے یہ آخری صاحب طرز و اسلوب شاعر تھے جو وفات پا کر آج ہمیشہ
 کے لیے خاموش ہو گئے۔

دوسرا حصہ معنی: کافور پیری: کافور کی طرح بڑھاپے میں سفید بال۔ نشیمن: گھونسلہ۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ نواب مرزا داغ کی وفات کے بعد اب نہ تو شاعری میں بانکہن رہا نہ طرز بیان
 کی شوخی رہی۔ صنفی کے عالم میں بھی وہ عالم شباب کی زندہ اور پر جوش شاعری کرتے تھے۔ یعنی ان کے
 کلام میں وہی شوخی اور آوازیگی تھی جو عہد جوانی کی تخلیقات کا حصہ ہے۔ داغ تو ایسے قادر الکلام شاعر تھے
 کہ ان کی خیال افروز تخلیقات کی آرزو ہر شعر کہنے والے کے دل میں ہے کہ ہم بھی اس معیار کے شعر
 کہہ سکتے۔ جو باتیں عام لوگ اپنے دل میں رکھتے تھے وہ داغ کی شاعری میں نمایاں ہو کر بالکل سامنے آ جاتی

تھیں۔ وہ تو ایسے تخلیق کار تھے پھولوں کی خامشی میں جو راز پوشیدہ ہے اس کے بارے میں باد صبا سے استفسار کیا کرتے تھے۔ اسی طرح بلبل جس طرح باغوں میں نالہ و فغاں کرتی ہے اس کا پس منظر مرزا داغ کے سوا اور کس پر منکشف ہو سکے گا؟ وہ تو ایسے شاعر تھے جو اپنی تخلیقات میں حقیقتوں کے اسرار و رموز سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے۔ اگر انہیں ایک پرندہ تصور کر لیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ پرواز کے دوران بھی نظر اپنے نشیمن پر رہتی تھی۔ مراد یہ ہے کہ شاعری میں بھی داغ ہمیشہ اپنے گرد و پیش اور حقائق کو مد نظر رکھتے تھے۔

تیسرا حصہ معنی : نکتہ آرا : باریک باتیں کرنے والا۔ فلک پیمائیاں : آسمان تک اڑائیں۔ ساحر : جادوگر۔ آزر : حضرت ابراہیم کے والد کا نام۔

مطلب : یہ درست ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں ایسے شاعر اور بھی پیدا ہوں گے جن کی شاعرانہ فکر کی باریکیاں اہل ذوق کے مشاہدے میں آئیں گی۔ ان کی فکر میں بے شک بلندی بھی ہوگی اور ندرت بھی۔ یہ لوگ اپنے عہد کے آشوب اور نامساعد حالات کا تذکرہ کر کے ہمیں افسردہ بھی کریں گے۔ اس کے علاوہ ان کے خیال میں جو ایک نئی دنیا آباد ہے۔ اس کا منظر نامہ بھی حسب استطاعت پیش کریں گے۔ بے شک اس دنیا میں آئندہ بھی حافظ شیرازی جیسے بلند پایہ شاعر جنم لیں گے۔ جنہیں بلاشبہ صاحب اعجاز شاعر قرار دیا جائے گا۔ اگر بزم شعر کو ایک ہتھکانہ تصور کر لیا جائے تو اس میں آزر جیسے کئی صاحب فن بہت تراش بھی پیدا ہوں گے۔ اگر اس بزم کو ایک میکدہ سمجھ لیا جائے تو کئی نئے ساتی اپنے پیانوؤں سے پینے والوں کو مدہوش کریں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آئندہ آنے والے شعراء اپنے اپنے انداز میں کتاب دل کی تفسیر پیش کریں گے اور جوانی کو اگر خواب سمجھ لیا جائے تو یہی لوگ اس کی تعبیریں بھی کریں گے۔ تاہم دیکھنا یہ ہے کہ عشق و محبت کا حقیقی منظر نامہ بھی کوئی پیش کر سکے گا؟ داغ ہی بلا شک و شبہ ایسے تیر انداز کی حیثیت رکھتے تھے جن کا نشانہ دیکھا جائے تو براہ راست دل ہی ہوتا تھا۔ مراد یہ ہے کہ نواب میرزا داغ کی شاعری براہ راست دل پر جس طرح سے اثر انداز ہوتی تھی یہ خصوصیت کسی دوسرے شاعر میں ممکن نہیں۔

چوتھا حصہ معنی : نظم کے اس حصے میں فی الواقع یہ مرفیہ اپنے پورے کلائمکس پر نظر آتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں استاد کی وفات کا سانحہ ایسا دل خراش ہے کہ اس کے رد عمل کے طور پر اشعار میں اپنے آنسو کاشت کر رہا ہوں یعنی آنکھوں سے برآمد ہونے والے آنسو اشعار کی شکل میں دھل رہے ہیں چنانچہ میری طرح اے دلی کی خاک تو بھی اس غم میں آنسو بہا کہ تیری سرزمین تو داغ کا وطن عزیز تھی۔ اے دہلی! تو جو اہل سخن کے لیے عظیم سرمایے کی حیثیت رکھتی ہے۔ کس قدر الم انگیز ہے حقیقت ہے کہ مرزا داغ کی رحلت سے تیرا یہ بھرا ہوا جہن پامال اور دیران ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ تو ایک رنگین پھول تھا جو خوشبو کی مانند اڑ گیا۔ کہنے دکھ کی بات ہے کہ اے کاشانہ اردو (دہلی) تو آج داغ سے محروم ہو گیا۔ تاہم شاید میرزا داغ نے اتنی کشش تیری خاک میں محسوس نہ کی کہ دکن کی خاک ان کی آخری قیام گاہ بنی۔ واضح رہے کہ داغ رہنے والے دہلی کے تھے جب کہ ان کی وفات دکن میں ہوئی۔ اس شعر میں اقبال نے اسی امر کی نشاندہی کی ہے۔ اس بند کے آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ دلی کے تمام اہم اور قابل ذکر شاعر تو رخصت ہو چکے اب تو صرف الطاف حسین حالی رہ گئے ہیں جن کو اس محفل کی یادگار کہا جاسکتا ہے۔

مطلب: یہاں اقبال کہتے ہیں کہ موت اس قدر سنگدل واقع ہوئی کہ انسانی خواہشات کی راہ میں ہمیشہ حائل رہتی ہے کہ اس کا تیر تو تاریکی میں ہی اپنے برف کو نشانہ بناتا ہے لیکن اس کے خلاف شکایت بھی تو لیوں پر نہیں آسکتی کہ خزاں کے بغیر گلشن کی قدر و قیمت کا اندازہ ممکن نہیں۔ قدرت کا یہ قانون یکسانیت کا حامل ہے کہ پھول کی خوشبو کا اڑنا اور پھول توڑنے والے کی موت کا انداز قریب قریب ایک جیسا ہی ہے۔

ابر

045

انہی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سرین کا
نہاں ہوا جو رخ مر زیر دامن ابر ہوائے سرد بھی آئی سوار تو سن ابر
گرج کا شور نہیں ہے، خوش ہے یہ گھٹا عجیب میکدہ بے خروش ہے یہ گھٹا
چن میں حکم نشاط مدام لائی ہے قبائے گل میں گھر ٹانگنے کو آئی ہے
جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے اٹھے زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے اٹھے
ہوا کے زور سے ابھرا، بڑھا، اڑا بادل انہی وہ اور گھٹا، لولا برس پڑا بادل
عجیب خیمہ ہے کسار کے نماںوں کا
یہیں قیام ہو دادی میں پھرنے والوں کا

*

معنی: پہاڑ سرین کا: پہاڑ کی ایک چوٹی کا نام۔ نشاط مدام: ہمیشہ کی خوشی۔ مہر کی گرمی: سورج کی گرمی۔

مطلب: مشرق کی سمت سے سیاہ بادلوں کی یلغار ہو رہی ہے۔ اس کے سبب سرین پہاڑیوں نظر آتا ہے جیسے کسی دیو نے کالا لباس پہن رکھا ہو۔ واضح رہے کہ سرین پہاڑ ایبٹ آباد کے قریب واقع ہے اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ علامہ نے یہ اشعار ایبٹ آباد میں ہی تخلیق کیے تھے۔ بادلوں کے سبب سورج چھپ گیا ہے اور سرد ہوا کے جھونکے بھی انہی کے ساتھ برآمد ہوئے ہیں۔ لیکن ان بادلوں میں کوئی گھن گرج نہیں بلکہ خامشی طاری ہے یہ منظر تو ایک ایسے شراب خانے کا ہے جہاں خلاف معمول ہر جانب سناٹا ہو۔ یہ بادل اگر برسے تو باغ کو سرسبز اور شاداب کر جائیں گے اور نئے نئے پھول کھل سکیں گے۔

جو پھول سورج کی حدت سے مرجھانے لگے تھے وہ ان بادلوں کی سرد ہواؤں کے باعث از سر نو تروتازہ نظر آنے لگے ہیں۔ پہلے محسوس ہوتا تھا کہ یہ مرجھائے ہوئے پھول خاک پر گر کر اپنا وجود کھو بیٹھیں گے لیکن آمد ابر نے ان میں زندگی کی لہر ڈا دی ہے۔ تیز ہوا کے سبب بادل اڑنے لگے اور آخر کار ان سے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ جس طرح پہاڑوں کے دامن میں اشجار اور پودے اپنا مسکن بنائے ہوئے ہیں، جی چاہتا ہے کہ ایسے خواب آور موسم میں ان سیاحوں کا بھی مستقل بسیرا ہو جائے جو یہاں سیر و تفریح کے لیے آئے ہوئے ہیں۔

ایک پرندہ اور جگنو

046

شام ایک مرغِ نغمہ پیرا کسی شنی پہ بیٹھا گا رہا تھا
 چمکتی چیز اک دیکھی زمیں پر اڑا طائر اسے جگنو سمجھ کر
 کہا جگنو نے او مرغِ نوا ریز نہ کر بے کس پہ منقار ہوس تیز
 تجھے جس نے چمک، گل کو مک دی اسی اللہ نے مجھ کو چمک دی
 لباس نور میں مستور ہوں میں چنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں
 چمک تیری بہشت گوش اگر ہے چمک میری بھی فردوس نظر ہے
 پروں کو میرے قدرت نے ضیا دی تجھے اس نے صدائے دلربا دی
 تری منقار کو گانا سکھایا مجھے گزار کی مشعل بنایا
 چمک بخشی مجھے، آواز تجھ کو دیا ہے سوز مجھ کو، ساز تجھ کو
 مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز
 قیام بزم ہستی ہے انہیں سے ظہور اوج و پستی ہے انہیں سے
 ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی اسی سے ہے بہار اس بوستان کی

*

زیر تشریح نظم عملاً ”جیو اور جینے دو“ کے اصول پر مبنی اس نظم میں دو کردار ہیں۔ ایک پرندہ اور دو سرا جگنو! اقبال نے پرندے کے رویے پر جگنو کا جو رد عمل ہے اس کی زبانی اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

① سے ③ معنی: نغمہ پیرا: گانے والا۔ نوا ریز: راگ برسانے والا، چہجانے والا۔ منقار ہوس: لالچ کی چوٹی۔

مطلب: ایک پرندہ شام کے وقت کسی درخت پر بیٹھا ہوا چہچہا رہا تھا کہ اس کی نظر زمین کی طرف مچی جہاں اس نے کسی چمکتی ہوئی چیز کو دیکھا۔ پرندے کو یقین تھا کہ یہ چمک جگنو کی ہی ہو سکتی ہے چنانچہ درخت سے اڑ کر وہ اس مقام کی جانب آیا کہ جگنو کو ہڑپ کر جائے۔ اس لمحے جگنو نے پرندے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تو بے شک ایسا پرندہ ہے جو اپنے نغموں سے چمن میں بہار کا سا سماں پیدا کرتا ہے لیکن کسی کمزور اور ناتواں جگنو پر یوں چہچہاتا شعاع نہیں ہونا چاہیے۔

④ سے ⑧ معنی: بہشت گوش: کانوں کی جنت یعنی دلکش۔ فردوس نظر: بہت خوبصورت۔ منقار: چوٹی۔

مطلب: اے پرندے! میری بات غور سے سن کہ جس خدا نے چمکنا سکھایا اور پھولوں کو مک دی اسی خدا نے مجھے بھی روشنی عطا کی ہے۔ میرا لباس تو نور ہی نور ہے یعنی قدرت خداوندی سے میرا جسم سر تپا روشنی سے مزین ہے اور عملاً دنیا میں جو کیڑے مکوڑے ہیں ان میں میں کوہ طور کی حیثیت کا حامل ہوں

یعنی کوہ طور پر حضرت موسیٰ کو جو روشنی دکھائی دی تھی میں بھی اسی کی مانند ہوں۔ تیری چمک اور نغمے اگر دل موہ لینے والے ہیں تو میری چمک بھی نگاہوں کو بھلی لگتی ہے۔ قدرت نے میرے پردوں میں روشنی کے دیئے جلا دیئے ہیں۔ اسی طرح تجھے بھی اس مالک دو جہاں نے دل آویز نغمگی عطا کی ہے۔ چنانچہ اگر تجھے گانا سکھایا گیا ہے تو اس حقیقت کو بھی جان لے کہ میرا وجود اس گلزار میں ایک شعل کی مانند ہے۔

⑨ سے (12) معنی :-

مطلب: اے پرندے! اس رب ذوالجلال نے اگر مجھے روشنی بخشی ہے تو تجھے بے شک خوش الحانی عطا کی ہے۔ بالفاظِ دیگر مجھے غمِ عشق میں جتنا مقدر کیا ہے اور تجھے نغمگی سے نوازا ہے۔ اس حقیقت کو بھی جان لے کہ اگر میں سوز ہوں اور تیری حیثیت ساز کے مانند ہے تو سوز اور ساز دونوں ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہوتے۔ کہ یہ دونوں عناصر تو اس کائنات میں ازل سے ہم آہنگ رہے ہیں۔

اے پرندے! یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لے کہ سوز اور ساز یعنی درد اور نغمگی دونوں ہی ایسے عناصر ہیں جن سے زندگی کا وجود قائم و دائم ہے۔ اور انہی سے انسان کے مراتب میں عروج و زوال کا اندازہ ہوتا ہے۔ لہذا اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ باہمی اتحاد و اتفاق کے طفیل ہی یہ دنیا قائم ہے اور انہی کے سبب یہاں رونق رہتی ہے۔ سو تجھے اگر اپنی زندگی عزیز ہے تو مجھے بھی جینے دے اسی میں دونوں کا بھلا ہے۔

بچہ اور شمع

047

کیسی حیرانی ہے یہ اے طفلک پر دانہ خو
یہ مری آغوش میں بیٹھے ہوئے جنبش ہے کیا
شمع کے شعلوں کو گھڑیوں دیکھتا رہتا ہے تو
روشنی سے کیا بغل گیری ہے حیرا مدعا؟
اس نظارے سے ترا ننھا سا دل حیران ہے
کسی دیکھی ہوئی شے کی مگر پہچان ہے

شمع اک شعلہ ہے لیکن تو سراپا نور ہے
دست قدرت نے اسے کیا جانے کیوں عیاں کیا
تجھ کو خاک تیرہ کے فانوس میں پنہاں کیا
نور تیرا چھپ گیا زیرِ نقاب آگہی
زندگانی جس کو کہتے ہیں فراموشی ہے یہ

خواب ہے، غفلت ہے، سرمستی ہے، بہوشی ہے یہ
محفل قدرت ہے، اک دریا ہے پایاں حسن
حسن کو ہستیاں کی میت ناک خاموشی میں ہے
آسمان صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ
عظمتِ درینہ کے منتے ہوئے آثار میں
ساکنانِ سخنِ گلشن کی ہم آوازی میں ہے
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن
مہر کی ضوِ مستری، شب کی سیاہ پوشی میں ہے
شام کی غلٹ، شفق کی گلِ فروشی میں ہے یہ
طفلک نا آشنا کی کوششِ گفتار میں
نہنے نہنے طائروں کی آشیاں سازی میں ہے

چشمہ کسار میں، دریا کی آزادی میں حسن شرمیں، صحرائیں، ویرانے میں، آبادی میں حسن! روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس در نہ اس صحرائیں کیوں تلاں ہے یہ مثل جس؟ حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بیتاب ہے زندگی اس کی مثال مایہ بے آب ہے

✱

اقبال کی شاعری کی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے گرد و پیش کے چھوٹے چھوٹے معاملات سے بڑے بڑے نتائج اخذ کیے۔ یوں ان کی تخلیقات میں کسی نہ کسی سطح پر فکر کی رد و جزن نظر آتی ہے۔ ذرا تشریح نظم میں بھی ان کی دوسری تخلیقات کے مانند کچھ ایسی ہی صورت حال کا احساس ہوتا ہے۔ یہ نظم چار حصوں پر مشتمل ہے جن میں ان کا مکالمہ ایک ننھے بچے سے ہوتا ہے جو شمع کی روشنی کو اپنے مخصوص انداز میں دیکھ رہا ہے۔ یہ مشاہدہ اقبال کے لیے ایک تخلیقی تجربے میں ڈھل جاتا ہے۔ ان کی اس نظم کو اسی حوالے سے دیکھا جانا چاہیے۔

پہلا حصہ معنی: پروانہ خود پروانے جیسی خصلت والا۔ گھڑیوں: پہروں تک۔

مطلب: اقبال ننھے بچے سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تجھ میں بھی پروانے کی سی فطرت موجود ہے جو شمع پر اپنی جان نثار کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تو بھی سامنے رکھی ہوئی شمع کو مسلسل حیرت کے انداز میں تنک رہا ہے۔ تو میری نگاہوں میں بیٹھا ہوا مسلسل حرکت کر رہا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے شمع سے ہم آغوش ہونے کا خواہاں ہے۔ شمع کا نظارہ تیرے لیے حیرانی کا سبب بنا ہوا ہے اور تو اس سے یوں متحیر ہو کر رہ گیا ہے۔ جیسے پہلے یہ نظارہ تیرا دیکھا ہوا ہو اور اب اسے از سر نو شناخت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

دوسرا حصہ معنی: عریاں، برہنہ۔ خاک تیرہ: سیاہ مٹی۔

مطلب: اے ننھے بچے! میرے نزدیک تو شمع محض ایک شعلہ کی حیثیت رکھتی ہے جب کہ تو سر تا پا نور کے مانند ہے۔ فرق محض اسی قدر ہے کہ شمع کی روشنی تو صاف نظر آتی ہے جب کہ تجھ میں نور کی جو وضو موجود ہے وہ چھپی ہوئی اور ہر کس و ناکس اس کا نظارہ نہیں کر سکتا۔ نہ جانے قدرت نے شمع کی روشنی کو کیوں عریاں کر دیا ہے اور تیرے نور کو محض تیرے جسم تک محدود کر کے عام نظروں سے اوچھل کر دیا ہے۔ بے شک تیرا نور فطری ادراک کے پردے میں چھپا ہوا ہے اور احساس و ادراک کے پردے میں چھپا ہوا ہے اور احساس و ادراک کا یہی پردہ دیدہ وینا کے لیے ایک طرح کے غبار کی مانند بن گیا ہے۔ دراصل زندگی کی حقیقت فہم و ادراک میں نہیں بلکہ خود کو بھول جانے کے عمل میں ہے۔ زندگی تو ایک خواب، سرمستی اور اپنے وجود سے بیگانہ ہونے کا نام ہے۔

تیسرا حصہ معنی: بے پایاں، بے کنارہ۔ ضو گستری: روشنی پھیلاتا۔ طفلک نا آشنا: بچہ۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ یہ جو عالم بہت و بود ہے وہ حسن و خوبصورتی کے ایسے سمندر کی حیثیت کا حامل ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ لیکن اس کو دیکھنے کے لیے چشم مینا ضروری ہے کہ اس صفت کے حامل فرد نوپائی کی ایک بوند میں بھی حسن کا طوفان نظر آئے گا۔ یعنی حسن ہی حسن چاروں جانب بکھرا ہوا ہے۔

دیکھو تو سہی! حسن ان پہاڑوں میں بھی ہے جن کی چوٹیاں ہیستناک خاموشی کی منظر ہیں۔ یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ سورج بھی اسی وقت روشنی دیتا ہے جب رات کی سیاہی اپنا وجود سمیٹ لیتی ہے۔ صبح کے لمحات میں جب آسمان نور اور روشنی کے ساتھ نظر آتا ہے تو یہ بھی حسن کا ایک منظر ہے اسی شفق کا نظارہ اور شام کے لمحات میں وارو ہونے والی تاریکی کو بھی حسن سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

حسن تو ماضی کی عظمتوں کے ان آثار میں بھی موجود ہے جو اب مٹتے جا رہے ہیں اور وہ بچہ جو بولنے کی سہی کرتا ہے اسے بھی حسن کے ایک منظر سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ باغوں میں یک آواز ہو کر جو پرندے چہچہاتے ہیں اور یہی ننھے ننھے پرندے جس طرح اپنے گھونسلے بناتے ہیں اس عمل میں بھی حسن موجود ہے۔ حسن تو پہاڑوں سے برآمد ہونے والے چشموں اور تیز رو دریاؤں کے علاوہ شروں، صحراؤں، ویرانوں اور پھر آبادی میں غرض ہر جگہ حسن ہی حسن بکھرا ہوا ہے۔ ہر جانب حسن کی اس فراوانی کے باوجود انسانی روح کو نہ جانے کیوں کسی گم ہو جانے والی چیز کی تلاش ہے ورنہ وہ صحراؤں میں اس طرح سے سرگرداں و پریشاں کیوں رہتی۔ انسانی روح حیرت ہے کہ حسن کے اس عام جلوے میں بھی پریشاں نظر آتی ہے۔ اس کا وجود تو ایک ایسی پھمکی کی طرح ہے جسے پانی سے باہر نکال کر پھینک دیا گیا ہو۔

کنار راوی

048

سکوت شام میں محو سرود ہے راوی نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی
پیام سجدہ کا یہ زیر و بم ہوا مجھ کو جہاں تمام سواد حرم ہوا مجھ کو

سر کنارہ آب رواں کھڑا ہوں میں

خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

شراب سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامن شام لیے ہے پیر فلک دست رعشہ دار میں جام

عدم کو قافلہ روز تیز گام چلا شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا

کھڑے ہیں دور وہ عظمت فزائے خدائی منار خواب گم شہسوار چغتائی

فسانہ شتم انقلاب ہے یہ محل کوئی زمان سلف کی کتاب ہے یہ محل

مقام کیا ہے، سرود خاموش ہے گویا

شجر یہ انجمن ہے خروش ہے گویا

رواں ہے سینہ دریا، اک سفینہ تیز ہوا ہے موج سے ملان جس کا گرم ستیز

سبک روی میں ہے شکل نگاہ یہ کشتی نکل کے حلقہ حد نظر سے دور مٹی

جواز زندگی آدمی رواں ہے یونہی ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی

فلکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا

نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

✽

پہلا حصہ معنی: محو سرود: نکلنے میں نکلن۔ زیر و بم: نیچا، اونچا۔ سواد حرم: کعبہ کے آس پاس کی

زمین۔

مطلب: اس نظم کا منظر نامہ دریاے راوی کا کنارہ ہے۔ اس مقام پر کھڑے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ ہر جانب شام کا سکوت طاری ہے۔ لیکن دریاے راوی کی موجوں کا شور و فغمی کا آئینہ دار ہے۔ اس لمحے جو کیفیت میرے دل کی ہے اس کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ دریا کی موجوں کا زیر و بم میرے لیے تو سجدے کا پیغام بن گیا ہے۔ میں تو اس عالم جذب میں ہوں کہ ساری دنیا مجھے خانہ کعبہ اور اس کے گرد و پیش سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ یہ درست ہے کہ میں بستے ہوئے اس دریا کے کنارے پر کھڑا ہوں تاہم اپنے خیالات میں اس قدر گمن ہوں کہ یہ بھی نہیں جانتا کہاں کھڑا ہوں۔

دوسرا حصہ معنی: دوست روضہ دار: کانپا ہوا ہاتھ۔ عظمت فزائے تنہائی: تنہائی کی عظمت بڑھانے والے۔ خواب گہ: سونے کی جگہ مراد مزار۔ شمسوار چغتائی: مراد جمالی تیر بادشاہ۔

مطلب: ان لمحات میں شفق کی سرخی شراب کی مانند شام کے واسن کو رنگین کر گئی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قرن باقرن سے گردش میں رہنے والے بوڑھے آسمان کے روضہ ہاتھ میں شراب کا یہ جام آگیا ہے۔ دن کا قافلہ عدم کی جانب تیز رفتاری کے ساتھ رواں دواں ہے۔ مراد یہ ہے کہ آمد شام کے ساتھ دن ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اس لمحے جو شفق پھولی ہوئی ہے اس کے لیے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اس کی نوعیت تو سورج کے پھولوں کی طرح ہے۔ یعنی سورج کا سفر ختم ہو گیا ہے۔

اس منظر نامے میں شمشادہ جمالی کے مقبرے کے مینار اپنی عظمت و شان کے ساتھ اس کج تنہائی میں ایستادہ ہیں۔ یہی وہ مقبرہ ہے جہاں شمشادہ جمالی کی خند سویا ہوا ہے۔ یہ مقبرہ دیکھا جائے تو انقلابات زمانہ اور ان کے ظلم و ستم کا مظہر ہے یہی نہیں بلکہ اسے زمانہ ماضی کی تاریخ سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ مقبرہ تو حقیقت میں ایک خاموش نفی کی طرح ہے اور یہاں جو درخت موجود ہیں وہ ایسی محفل کی طرح ہیں جہاں کسی ہنگامے کا عمل دخل نہ ہو۔

تیسرا حصہ معنی: سفینہ: کشتی۔ سبک روی: تیز رفتاری۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ ساتھ دریا میں ایک تیز رفتاری کی نظر آ رہی ہے جس کا ملاح لہروں اور تند و تیز موجوں سے بچاتا اسے منزل مقصود کی جانب لیے جا رہا ہے۔ انسانی نگاہ کی رفتار جس قدر تیز ہے اسی رفتار سے آگے بڑھتی ہوئی یہ کشتی بالا خرنگاہوں سے اونچھل ہو جاتی ہے۔

دریاے راوی کے کنارے اور اس کے گرد و پیش کا مشاہدہ کرتے ہوئے اقبال اسے انسانی وجود سے یوں مربوط کرتے ہیں کہ جس طرح یہ کشتی دریاے راوی میں تیز رفتاری کے ساتھ رواں دواں ہے بالکل یہی کیفیت انسان کی ہے کہ اپنی طبعی عمر تک پہنچنے کے بعد بھی ہر چند کہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تاہم فنا نہیں ہوتا۔ مراد یہ کہ اس کی روح بے شک غائب ہو جاتی ہے تاہم وہ مرتا نہیں بلکہ ایک طرح کے منظر سے پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ بے شک یہ ایک بڑے تخلیق کار کا کمال ہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کے بطن سے بعض ایسی مطلق حقیقتیں برآمد کرتا ہے جن تک کسی دوسرے کی رسائی بلا شک و شبہ نہیں ہوتی چنانچہ یہی امر اقبال کی عظمت اور بزرگی کا بین ثبوت ہے۔

النجائے مسافر

049

(بہ درگاہ حضرت محبوبؒ الہی، دہلی)

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
نہاں ہے تیری محبت میں رنگ محبوبی
اگر سیاہ دلم، داغ لالہ زار توام
وگر کشادہ جبینم، گل بہار توام

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثل نکتہ گل
چلی ہے لے کے وطن کے نگارخانے سے
نظر سے ابر کرم پر درخت صحرا ہوں
فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں
مقام، ہمسفروں سے ہو اس قدر آگے
مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
دلوں کو چاک کرے مثل شانہ جس کا اثر
بنایا تھا جسے چن چن کے خار دُخس میں نے
پھر آ رکھوں قدم مادر و پدر پہ جبین
وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کھلی
دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمین!
وہ میرا یوسف ثانی، وہ شمع محفل عشق
جلا کے جس کی محبت نے دفتر من و تو
ریاض دہر میں مانند گل رہے خنداں
تکلف ہو کے کھلی دل کی پھول ہو جائے
یہ النجائے مسافر قبول ہو جائے

*

اقبال کی اس الم کا پس منظر یہ ہے کہ یورپ روانگی سے قبل وہ دہلی تشریف لے گئے جہاں انہوں نے حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر حاضری دی۔ چنانچہ یہ اشعار انہی کو مخاطب کر کے کہے گئے ہیں۔ اس حقیقت سے ہم سب آگاہ ہیں کہ اقبال ان صوفیاء کرام اور اولیاء عظام کا بیش احترام کرتے تھے جو فی الواقع اپنے مراتب اور درجات کے اعتبار سے قربت خداوندی کے اہل تھے۔ چنانچہ یہ نظم النجائے مسافر

لیے میں کمی گئی ہے۔ فرماتے ہیں۔

پہلا حصہ معنی: نظام مہر: سورج کا نظام۔ گل بہار توام: تیری بہار کا پھول ہوں۔

مطلب: اے عالی مرتبت! (نظام الدین اولیاء) بے شک تو اتنا عظمت والا ہے کہ فرشتے بھی تیرا نام ادب و احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔ اس لیے کہ تیرا دربار بھی بڑی عظمتوں کا حامل ہے جہاں سے ہر کہہ و مہ کو فیض حاصل ہوتا ہے۔ جو حاملان عشق حقیقی ہیں ان کا وجود تیری کشش کے سبب بڑی اہمیت رکھتا ہے اور جس طرح آفتاب طلوع ہونے پر ساری کائنات کو روشنی عطا کرتا ہے اسی طرح تیری شخصیت بھی روشنی پھیلانے کا سبب ہے۔ آج تیری بارگاہ میں حاضری دی ہے تو یوں لگتا ہے کہ دل و دماغ کو روشنی حاصل ہو گئی ہے۔ اس لیے کہ میرے نزدیک حضرت عیسیٰ اور حضرت خضر علیہ السلام سے بھی تیرا مقام بلند ہے۔ تو نے رب ذوالجلال سے ایسی لونگائی ہے کہ اس نے بھی تجھے اپنے محبوب ہونے کا مرتبہ عطا کیا چونکہ تو رب العزت کا محبوب ہے اس لیے تیری شان بھی بلند ہے اور اسی باعث تو واجب الاحترام بھی ہے۔ لہذا اگر میں بد نصیب اور سیاہ قلب ہوں تو تیرے باغ میں موجود والے کے پھول کے داغ کی مانند ہوں اور اگر خوش بخت ہوں تو تیرے چمن میں لمباتے ہوئے پھول کی مانند ہوں مراد یہ ہے کہ میں جیسا بھی ہوں تیرا ہی مقتد ہوں۔

دوسرا حصہ معنی: نکت گل: پھول کی خوشبو۔ فلک نشیں: آسمان کی بلندی۔ نردہاں: بیڑی۔ خار و خس: ٹکاس پھوس۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ اے محبوب الہی! کہ جس طرح چمن سے خوشبو رخصت ہوتی ہے اسی طرح میں اپنے وطن کو الواح کہہ رہا ہوں۔ وطن سے دوری میرے صبر کا بے شک امتحان ہے جس میں اپنے آپ کو میں نے خوبی ڈال لیا ہے۔ یہ تحصیل علم کا شوق ہی ہے جو مجھے اپنے خوبصورت وطن سے دور بلاد غیر میں لے جا رہا ہے۔

اے محبوب الہی! میرا وجود تو صحرا میں استلواہ ایک ایسے خودرو شجر کی طرح ہے جس کی نظر ہمیشہ ابر کرم پر ہوتی ہے اور جسے کسی نوع کی غور و پروا نہشت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرا وجود اس عہد میں ایک ایسے فرد کی مانند ہے جس کی نگاہ ہمیشہ آسمان کی بلندی کی جانب ہوتی ہے تاہم تیری ایسی دعا کا طالب ہوں جس کے سبب مجھے وہ راستہ مل جائے جو منزل تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہو سکے۔

میرا مقام دوسرے لوگوں سے اس قدر آگے ہو کہ وہ اس مقام کو منزل مقصود سے تعبیر کر سکیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ میں اپنے قلم سے جو تحریر بھی لکھوں وہ کسی کی دل گرنگی کا سبب نہ بنے اور نا ہی خود مجھ کو اس بھری پری دنیا میں کسی سے شکایت ہو۔ تیری جناب سے مجھے اپنی فریاد میں وہ اثر حاصل ہو جائے جو دلوں کو برتا کر رکھ دے۔ میں نے جس محنت و کاوش سے اپنا گھر بنایا تھا خدا کرے وطن واپسی پر میں اسے اسی طرح آباد و کامراں دیکھ سکوں۔

اقبال فرماتے ہیں کہ جب میں یورپ سے تحصیل علوم کے بعد واپس وطن آؤں تو اپنے باپ اور ماں کے قدموں پر اپنی پیشانی رکھ سکوں کہ انہی کے طفیل مجھے محبت و شفقت کے راز بائے درون پر وہ کا علم حاصل ہوا ہے۔ بعد کے تین اشعار میں اقبال اپنے استاد مولوی میر حسن کے لیے دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ »حضرت علی مرتضیٰ کے خاندان کا وہ چراغ جس کا گھر میرے نزدیک کعبہ کے مانند ہے اس کی عنایت

و قد ردانی نے مجھے علم و فضل کے جواہر سے آراستہ کیا۔ ان کے لیے دعاگو ہوں کہ وطن واپسی پر اپنے استاد کو خوش و خرم اور خوشحال دیکھوں۔

اس نغم کے باقی چار اشعار میں سے تین اشعار میں اقبال اپنے برادر بزرگ شیخ عطا محمد کے لیے دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرا بھائی مجھے حضرت یوسفؑ کی مانند عزیز ہے اس لیے کہ وہ مجھ سے عشق کی حد تک چاہت رکھتا ہے اور جس کی محبت میرے لیے ہمیشہ سکون قلب کا باعث رہی ہے جس نے میری پرورش کے دوران اپنے لیے عیش و آرام کو حرام سمجھا۔ وہ مجھے بے شک جان و دل سے زیادہ عزیز ہے۔ میری دعا ہے کہ میرا یہ بھائی اس دنیا میں ہمیشہ خوش و خرم رہے۔ آخری شعر میں اقبال یوں دعا کرتے ہیں کہ میرے دل کی کلی کھل کر پھول بن جائے اور مسافرت کے دوران دعائیہ انداز میں جو التجائیں کی ہیں اسے محبوب الہی! تیرے توسط سے ان کی پذیرائی ہو۔



پیشکش: مجلس اقبال

نشر و توزیع: محمد اسلم باقر

غزلیات (حصہ اول)

اس حصے میں اقبال کی محض تیرہ غزلیں شامل ہیں جن کا تعلق ابتدائی دور کی شاعری یعنی 1904ء تک ہے۔ اقبال نے بعد میں جو غزلیں کہیں وہ ”بانگ درا“ اور دوسرے مجموعوں میں اسی ترتیب کے ساتھ شامل ہیں۔

050
گلزار ہست و بود نہ بیگانہ دار دیکھ ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
آیا ہے تو جہاں میں مثال شرار دیکھ دم دے نہ جائے ہستی ناپائدار دیکھ
مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ
کھولی ہیں ذوق دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہگذر میں نقش کف پائے یار دیکھ

چار اشعار پر مشتمل علامہ اقبال کی یہ غزل حصہ اول کی ان تیرہ غزلوں میں سے پہلی غزل ہے جو علامہ کے ابتدائی کلام سے تعلق رکھتی ہے۔ حصہ اول کی ان غزلیات کے بارے میں اسی قدر کہنا کافی ہو گا کہ یہ غزلیں اقبال کی بعد کی غزلوں سے اسی طرح مختلف ہیں جس طرح کہ بال جبریل اور ضرب کلیم کی شاعری ”بانگ درا“ سے مختلف ہے چنانچہ زیر تشریح غزل کے مطلع میں اقبال فرماتے ہیں۔

① معنی: گلزار ہست و بود دنیا کے باغ۔

مطلب: کہ فنا و بقا سے مربوط دنیا کو اے باشعور انسان اجنبیوں اور بیگانوں کے انداز میں نہ دیکھ! یہ تو ایک ایسا عالم رنگ بو ہے جسے بار بار دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس دنیا کے جملہ عناصر پر غور و خوض ہی لطف و مسرت کا سبب بن سکتا ہے۔

② معنی: شرار: مراد ناپائدار ہستی۔

مطلب: غزل کے دوسرے شعر میں بھی انسان کو مخاطب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ دنیا میں تیرا وجود ایک ایسی چنگاری کے مانند ہے جس کی زندگی انتہائی مختصر ہوتی ہے بے شک تیری زندگی ہی ہمت کم ہے ایسا نہ ہو کہ یہ زندگی تجھے فریب دے جائے اور تو اپنے حقیقی مقاصد کی تکمیل سے محروم رہے۔

③ مطلب: یہ شعر پہلے دو اشعار سے خاصا مختلف ہے۔ اس میں اقبال اپنے محبوب کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بے شک میں تیرے التفات و توجہ کے قابل نہیں۔ پھر بھی میرے شوق اور انتظار کی کیفیت ایسی نہیں کہ بے اعتنائی برتی جاسکے۔

④ مطلب: اس امر میں شک کی گنجائش نہیں۔ جلوہ محبوب کا نظارہ کرنے کے مذاق و شوق نے تیری آنکھیں کھلی رکھیں ہیں چنانچہ اگر اب مجھے ہر گلی کو بچے میں نقش کف پائے یار نظر آجائے تو پھر کوئی حیرت کی بات نہیں۔

(2)

051 نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
 تمہارے پیار نے سب راز کھولا خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
 بھری بزم میں اپنے عاشق کو تازا تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
 تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی؟
 کھینچے خود بخود جانب طور موسیٰ کشش تیری اے شوق دیدار کیا تھی
 کیسے ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
 فسون تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

*

① معنی: تکرار: اصرار۔ عار کیا تھی: کیا مضائقہ تھا۔

مطلب: اس غزل کے مطلع میں محبوب کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ میری دعوت پر بے شک تو نہ آتا
 نہ ہی ہمیں اس پر کسی بحث و تہیص کی ضرورت تھی تاہم دل رکھنے کے لیے محض وعدہ ہی کر لیتا تو اس میں
 کیا قیامت ہوتی۔

② مطلب: اس شعر میں اپنے محبوب سے عاشق کہتا ہے کہ میں نے تو تمام معاملات عشق کو دوسروں
 سے پوشیدہ رکھا تھا اگر اس راز پر سے پردہ اٹھا تو اس کا ذمہ دار تیرا قاصد ہے۔ اس ضمن میں مجھے کسی
 طرح بھی خطا کار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ اس شعر میں ”بندے اور سرکار“ کی رعایت قائل ذکر ہے۔

③ معنی: تازا: پہچان لیا۔

مطلب: اے محبوب! تو نے تو بھری محفل میں سب کو نظر انداز کر کے صرف اور صرف اپنے عاشق کو ہی
 تازا لیا بے شک تیری آنکھیں مستی اور سرشاری کے باوجود بہت ہوشیار ثابت ہوئیں۔ عاشق کو تازے کا
 عمل اس حقیقت کا مظہر ہے۔

④ مطلب: اس شعر میں عاشق اپنے محبوب کے پاس جانے والے قاصد سے استفسار کرتا ہے۔ بے
 شک تیرے کہنے کے مطابق اس نے میری دعوت کے بارے میں تامل سے تو کام لیا مگر اتنا ضرور بتا دے کہ
 اس کے انکار کا انداز کیا تھا۔ تاکہ حقیقت حال کا اندازہ کیا جاسکے۔

⑤ مطلب: اس شعر میں اقبال خداوند تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ
 جانے کس جذبے کے تحت کوہ طور کی جانب کھینچے چلے گئے۔ شاید یہ تیرا جلوہ دیکھنے کی کشش ہی تھی کہ
 انجام دعا و عاقبت سے بے نیاز ہو کر برق طور کی پروا بھی نہ کی۔

⑥ معنی: فسون: جادو۔

مطلب: اے اقبال! اتنا بتا دے کہ تیری گفتگو میں کونسا حیر پوشیدہ تھا کہ محبوب کی بزم میں اب ہر لمحے
 تیرا ذکر خیر ہوتا رہتا ہے۔ مراد یہ ہو سکتی ہے کہ اقبال کی شعری صلاحیتوں سے ان کا محبوب اس قدر متاثر

ہے کہ ہر لمحے اس کی بزم میں ان کی شاعری کا چرچا ہی ہوتا رہتا ہے۔

(3)

052

عجب واعظ کی دینداری ہے یا ربؐ عداوت ہے اسے سارے جہاں سے
کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انسان کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے؟
وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے! چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے
ہم اپنی دردمندی کا فسانہ سنا کرتے ہیں اپنے رازداں سے
بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آواز ازاں سے

*

① مطلب: واعظ جو بزم خود نیکی و پارسائی اور اخوت و مساوات کا دعویٰ دیتا رہتا ہے جب کہ اس کا ذاتی کردار قطعی مختلف ہے۔ اس کے قول و فعل میں تضادات کا یہ عالم ہے کہ ہر نوع کی دینداری کے دعووں کے باوجود عملاً اسے اپنے سوا سارے جہاں کے لوگوں سے عداوت ہے بالفاظ دیگر اس کے دل میں نفرت کے سوا اور کچھ نہیں۔

② مطلب: آج کی دنیا میں بے شک عقلی اور ذہنی سطح پر انسان بے حد ترقی کر چکا ہے۔ بڑے بڑے سائنسدانوں اور موجدوں نے حیرت انگیز انکشافات اور ایجادات کی ہیں تاہم اب تک اس حقیقت کو کوئی بھی نہیں جان سکا کہ یہ جو انسان دنیا میں آتا ہے کہاں سے آتا ہے اور آخر کار جاتا کہاں ہے؟ یعنی تمام تر ذہنی اور شعوری ارتقاء کے باوجود انسان کی حقیقت ابھی تک پوشیدہ ہے۔

③ مطلب: یہ نظام قدرت ہے کہ شب کی سیاہی بھی اسی قوت کی ودیعت کردہ ہے جس نے ستاروں کو روشنی عطا کی ہے۔ یعنی یہ رب ذوالجلال کے احکام کا کرشمہ ہے کہ تاروں کو روشنی بھی انہی کے تحت ملتی ہے اور رات کو تاریکی بھی وہیں سے فراہم ہوتی ہے۔

④ مطلب: ہم اس قدر دردمند واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے رازدار لوگ ہی اس ہمدردانہ رویے کا احوال بیان کرتے ہیں جو ہمارا دوسروں کے ساتھ رہا ہے جب کہ ہم اسے فراموش کر چکے ہوتے ہیں۔
⑤ معنی: چالیں: مکاریاں۔

مطلب: اس شعر میں اقبال واعظ پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اس قدر چالاک و عیار شخص ہے کہ اذان کی آواز سنتے ہی کانپنے لگ جاتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا یہ عمل محض دوسروں کو مناظر کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

(4)

053

لاؤں وہ جتنے کہیں سے آشیانے کے لیے بگلیاں بیتاب ہوں جن کو جلانے کے لیے
 وائے ناکامی فلک نے تاک کر توڑا اسے میں نے جس ڈالی کو تاڑا آشیانے کے لیے
 آنکھ مل جاتی ہے ہفتاد و در ملت سے تری ایک پیمانہ ترا سارے زمانے کے لیے
 دل میں کوئی اس طرح کی آرزو پیدا کروں لوٹ جائے آسمان میرے مٹانے کے لیے
 جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چمن کے تو آ ہی نکلتے گی کوئی بگلی جلانے کے لیے
 پاس تھا ناکامی صیاد کا اسے ہم صفر ورنہ میں اور اڑے آتا ایک دانے کے لیے؟
 اس چمن میں مرغ دل گائے نہ آزادی کا گیت
 آہ! یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لیے

*

① مطلب: اس غزل کا مطلع اگر کلاسیکی روایت کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس میں کوئی ندرت
 نظر نہیں آتی لیکن اقبال کی تخلیقی اوج کے حوالے سے جب اس کا جائزہ لیا جائے تو بقول اقبال اپنے گھر کی
 تعمیر کے لیے ایسے افراد کو جمع کر رہا ہوں جو نہت اور پامردی کے ساتھ ان عناصر کے خلاف صف آرا
 ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں جو اس گھر کی تخریب کے درپے ہیں۔ دوسرے شعر میں وہ کہتے ہیں کہ میری
 محرومی کا یہ عالم ہے کہ میں نے اپنا آشیانہ بنانے کے لیے جس شاخ کا انتخاب کیا تھا فلک کج رفتار نے اسی
 شاخ کو مشق ستم بنایا۔

اس شعر میں اقبال افراد کی وسعت قلبی کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اگر ہم سب مذاہب کو ایک ہی
 نظر سے دیکھیں تو اختلاف اور تفرقہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس غزل کا چوتھا شعر بھی معنوی سطح پر مطلع
 کے مماثل ہے اس لیے اس کی تشریح بھی پہلے شعر کے مانند ہوگی۔ یہ عجیب بات ہے کہ غزل کا اگلا یعنی
 پانچواں شعر قد رے کی مضموم لیے ہوئے ہے جو مطلع اور چوتھے شعر کا ہے۔
 معنی: ہم صفر: ہم آواز: ہم نوا۔

مطلب: دراصل یہ پوری غزل ہی کلاسیکی روایت سے ہم آہنگ ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے اشعار میں
 جو مضامین باندھے گئے ہیں وہ بھی روایتی ہیں۔ چھٹے شعر میں اقبال اپنے کسی دوست کو مخاطب کر کے کہتے
 ہیں کہ فی الوقات مجھے اپنے دشمن کی ناکامی کا پاس تھا ورنہ کسی پرندے کی طرح میں محض ایک دانے کی
 خاطر اپنی آزادی سے کیوں محروم ہوتا۔ آخری شعر میں کہا گیا ہے کہ میرے وطن کی حالت زار ایسی ہے
 کہ یہاں آزادی کے ترانے الاپنا بے معنی سی بات ہے۔

(5)

054

کیا کہوں اپنے چمن سے میں جدا کیونکر ہوا؟ اور اسیر حلقہ دام ہوا کیونکر ہوا؟

جائے حیرت ہے برا سارے زمانے کا ہوں میں
کچھ دکھانے دیکھنے کا تھا تقاضا طور پر
ہے طلب بے مدعا ہونے کی بھی اک مدعا
دیکھنے والے یہاں بھی دیکھ لیتے ہیں تجھے
حسن کامل ہی نہ ہو اس بے حجابی کا سبب
موت کا نسخہ ابھی باقی ہے اے درد فراق
تو نے دیکھا ہے کبھی اے دیدہٴ عبرت کہ گل
پریش اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری
میرے مننے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی
کیا بتاؤں ان کا میرا سامنا کیونکر ہوا؟



① معنی: حلقہٴ دام: حرص کے جال میں پھنسا ہوا۔

مطلب: زیر تشریح غزل کے مطلع میں اقبال حضرت آدمؑ کے حوالے سے جنت سے نکلے جانے والے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کا حقیقی وطن تو جنت ہی تھا لیکن وہاں سے جس طرح اسے نکالا گیا اس کے بارے میں حقائق کا اظہار میرے لیے ممکن نہیں۔ چنانچہ یہ بھی بتانا ممکن نہیں کہ زمین پر پہنچ کر انسان حرص و ہوس کے چنگل میں کیسے پھنس گیا۔

② غزل کے دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ جب سارا زمانہ انسان کو برا سمجھ کر حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے تو یہ مقام حیرت ہے کہ رب العزت نے اسے اشرف المخلوقات کا خطاب کیوں عطا کیا۔

③ اس شعر میں واقعہ طور کی طرف اشارہ کر کے کہا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر خداوند عزوجل سے اس کا جلوہ دکھانے کا جو تقاضا کیا تھا اور کہا تھا ”وہ اونی“ یعنی اے خدا اپنا جلوہ دکھا دے! تو خدا کی جانب سے اپنے پیغمبرؐ کو جواب ملا تھا کہ ”لن تو انی“ اے موسیٰ! تو میرا جلوہ دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتا چنانچہ ہوا بھی یہی کہ حضرت موسیٰؑ کے اصرار پر خدا نے اپنا جلوہ دکھایا تو وہ اس کی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہو گئے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ جلوہ دیکھنے اور دکھانے کا معاملہ کس طرح سے طے ہوا اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔

④ قلب انسان ہمیشہ آرزوؤں اور تمنا کا مسکن رہا ہے تاہم اگر انسان اس امر کا خواہاں ہو کہ اس کا دل ہر آرزو اور تمنا سے بے نیاز ہو جائے تو یہ امر کی آرزو اور تمنا کے مترادف ہے۔ اس صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ قلب انسان آرزوؤں اور تمناؤں سے خالی ہو جائے۔

⑤ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ جو نیک بندے معرفت الہی کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ تو دنیا میں بھی خدا کا جلوہ کسی نہ کسی طور دیکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ خدا نے قیامت کے روز اپنا جلوہ دکھانے کا جو وعدہ کیا ہے یقیناً صبر آزما ہونے کے ساتھ فہم انسانی سے بالاتر ہے۔

⑥ اس کائنات کے پیدا کرنے والے نے ہزار پردوں میں خود کو چھپانے کے باوجود اپنی صفات کے حوالے سے ظاہر اور نمایاں کر دیا۔ اس کا سبب یہی ہے کہ وہ حسن کامل ہے اور حسن کامل پردوں میں چھپا

نہیں رہ سکتا۔

⑦ محبوب سے ہجر و فراق کا مداوا بے شک میرے چارہ گر کے نزدیک کچھ نہ ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ موت اس کا حقیقی مداوا ہے۔ مراد یہ ہے کہ موت کے ساتھ ہی ہجر و فراق کا مسئلہ بھی ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

⑧ اقبال اس شعر میں کہتے ہیں کہ دیدہٴ عبرت سے دیکھا جائے تو اس پر کوئی حیرت نہیں ہوگی کہ پھول پیدا تو مٹی سے ہوتا ہے اس کے باوجود اس کی پتیاں خوش نما رنگوں کی حامل ہوتی ہیں۔ یعنی انسان کی محبت کتنی ہی بری ہو اس میں اچھا بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

⑨ اقبال کہتے ہیں کہ یہ جو انسان کے گناہ و ثواب کا معاملہ ہے تو اس کا مقصد اس کی رسوائی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے جب کہ خدا عظیم و بصیر ہوتے ہوئے اس امر سے پوری طرح آگاہی رکھتا تھا کہ انسان سے جملہ گناہ و ثواب کیسے اور کیوں سرزد ہوئے۔

⑩ اپنے محبوب سے ملاقات کے لمحات کا اندازہ تو دیکھنے سے ہی ہو سکتا ہے کہ میں اس پر کس طرح سے مرنا۔ یہ کیفیت زبان سے بیان کرنا ممکن نہیں۔

(6)

055

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بہتی کے یارب! رہنے والے ہیں
ملان درد میں بھی درد کی لذت پہ مرنا ہوا
جو تھے جہانوں میں کانٹے نوک سوزن سے نکالے ہیں
بھلا پہلا رہے یا رب جن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں
رلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی
نرالا عشق ہے میرا نرالے میرے نالے ہیں
نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نفیس سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں
نہیں بیگانی اچھی رفیق راہ منزل سے
ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں
امید حور نے سب کچھ سکھ رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں
مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ درد انگیز نالے ہیں

*

① اس غزل کے مطلع میں اقبال کہتے ہیں کہ یہ جو حاملان عشق و محبت ہیں اپنی وضع قطع کے اعتبار سے انہوں نے خود کو باقی دنیا کے لوگوں سے الگ تھلک کیا ہوا ہے ان کو دیکھنے پر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ نہ جانے یہ لوگ کس دنیا کے باشندے ہیں؟ کہ ان کے طور طریقے تو دوسروں سے قطعی طور پر مختلف نظر آتے ہیں۔

② معنی: نوک سوزن: سوئی کی نوک۔

مطلب: اپنے دکھ درد کے علاج کے دوران میں اس لذت کو نظر انداز نہیں کر سکتا جو درد میں ہوتی ہے۔ اسی سبب اپنے پاؤں کے آبلوں میں سے کانٹے نکالنے ہوں تو اس کے لیے بھی سوئی کا استعمال کرنا

ہوں جس سے تکلیف تو بے شک ہوتی ہے لیکن اس میں بھی یک گونہ لذت کا احساس ہوتا ہے۔

③ اے خدائے ذوالجلال! تجھ سے بس اتنی دعا ہے کہ میری آرزوؤں اور تمناؤں کو پھلا پھولا رکھ! اس لیے کہ ان کی پرورش کے لیے میں نے اپنا خون دیا ہے۔

④ راتوں میں جب میں ستاروں کو سنائے کے عالم میں خاموش دیکھتا ہوں تو یہ صورت حال میرے لیے دل شکنی اور آہ و زاری کا سبب بن جاتی ہے۔ میرے نزدیک ستاروں کی یہ خاموشی کسی دکھ کے سبب ہے کی وجہ ہے کہ میری سوچ دوسرے لوگوں سے مختلف ہے کہ اظہار عشق میں میں بھی ہائے دئے کرنے کی بجائے خاموشی کا قائل ہوں۔

⑤ معنی: خانماں برباد! اجڑے گھر والا۔

مطلب: حقیقت یہ ہے کہ میری تباہی میں کسی دوسرے کا ہاتھ نہیں۔ اس کے برعکس میں نے تو خود ہی اپنے آپ کو تباہ و برباد کیا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اپنے لیے سینکڑوں ٹھکانے بنائے اور بعد میں خود ہی ان کو نذر آتش کر دیا۔ یہ بربادی تو خود لذتیت کی منظر ہے۔

⑥ غزل کے اس شعر میں اقبال انسان کی عرفانی کے اختصار کی نشاندہی کرتے ہوئے اسے ایک چنگاری کے مانند قرار دیتے ہیں کہ جس طرح آگ کی ایک چنگاری لمبے بھر کے لیے اپنے وجود کا احساس دلا کر پھر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے اسی طرح انسانی زندگی بھی ہے۔ مصرعہ اولیٰ میں وہ چنگاری کو خطاب کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں کہ جب ہم انسان اور توکیاں خصوصیت کے حامل ہیں تو تیرے لیے یہ لازم نہیں کہ ہم سے بیگانگی کا اظہار کرے۔ تیری اور ہم انسانوں کی عمر قریب قریب یکساں ہی ہے۔

⑦ اقبال یہاں کہتے ہیں کہ یہ حضرت داعی جو بظاہر سیدھے سادے اور بھولے بھالے نظر آتے ہیں عملاً یہ بڑے چالاک اور کانیاں ہیں ان کے ذہن میں تو ہر لمحے جنت کی خوروں کا تصور رقصاں رہتا ہے اور خوروں کے اس تصور نے ہی عملی سطح پر انہیں دنیاوی مسائل کے بارے میں بہت کچھ سکھادیا ہے۔ ان کی یہ جو خاموشی ہے وہ ایک طوفان کی سی حیثیت رکھتی ہے۔

⑧ غزل کے مقطع میں اقبال خود کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے اشعار مجھ کو اتنے پیارے اور جان و دل سے زیادہ عزیز کیوں نہ ہوں اس لیے کہ یہ تو میرے دل شکست کے درد انگیز غزلوں کی مانند ہیں یعنی مجھ پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کا اظہار اپنے اشعار میں کر کے دل کی بھڑاس نکال لیتا ہوں یہی وجہ ہے کہ میں اپنے اشعار کو بے حد عزیز رکھتا ہوں۔

(7)

056

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی ہو دیکھنا تو دیدہ دل وا کرے کوئی
منصور کو ہوا لب گویا، پیام موت اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی
ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی
میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے حسن دیکھے مجھے کہ تجھ کو، تماشا کرے کوئی
عذر آفرین جرم محبت ہے حسن دوست عشر میں عذر تازہ نہ پیدا کرے کوئی

چھٹی نہیں ہے یہ نگہ شوق، ہم نشیں! پھر اور کس طرح انہیں دیکھا کرے کوئی
اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی
نظارے کو یہ جنبش مرغاں بھی بار ہے زرخ کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی
کھل جائیں کیا مزے ہیں تمنائے شوق میں
دو چار دن جو میری تمنا کرے کوئی

*

① معنی: دا کرے: بکولے۔

مطلب: زیر تشریح مطلع میں اقبال کہتے ہیں کہ اس عالم کون و مکاں پر نظر ڈالنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا
اس مقصد کے لیے تو لازم ہے کہ اس نگاہ سے دیکھا جائے جو باطن میں بھی اتر جاتی ہے۔ مراد یہ کہ دنیا پر
محض نگاہ غلط انداز ڈالنے کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ اسے گہری تجزیاتی نگاہ سے دیکھنا ضروری ہے۔

② منصور حلاج نے اپنی زبان سے انا الحق کا نعوباند کر کے معرفت خداوندی کی انتہا کر دی لیکن یہ نعوب
جو ایک طرح سے عشق کا دعویٰ تھا اس کے لیے موت کا پیغام بن گیا۔ سننے والوں نے اسی نعوبے کی بنا
پرے منصور کو سولی پر چڑھا دیا۔ ایسی صورت میں کسی کے عشق کا دعویٰ موت سے ہمکنار ہونے کے
مترادف نہیں تو بھلا اور کیا ہے؟

③ یہ شعر بھی مفہوم کے اعتبار سے مطلع سے ملتا جلتا ہے۔ یہاں اقبال کہتے ہیں کہ حقیقت مطلق تک
رسائی کی خواہش ہے تو پھر اسے ظاہری آنکھ سے دیکھنے کی بجائے باطن کی نگاہ سے دیکھو کہ اپنے مقصود کی
معرفت کا یہی ایک طریقہ ہے۔

④ اے میرے محبوب! جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو اس کی حدیں عشق کی انتہا سے جا ملتی ہیں
اور تیرے حسن کی کیفیت بھی یہی ہے۔ اب تو یہ بتا کہ ان دو انتہاؤں کے پیش نظر دیکھنے والا مجھے دیکھے کہ
تیرا نظارہ کرے۔ اسکے لیے تو یہ صورت حال تذبذب کا باعث بن جاتی ہے۔

⑤ معنی: عذر آفرین: بہانہ پیدا کرنے والا۔

مطلب: رب ذوالجلال کے جلوے کا تصور یہاں اس دنیا میں میرے عشق کے جذبے میں مزید شدت
پیدا کر رہا ہے لیکن خدشہ اس امر کا ہے کہ روز قیامت بھی وہ اپنی رونمائی کے ضمن میں کوئی اور عذر نہ
تراش لے ہر چند کہ خدا نے اس امر کا وعدہ کر رکھا ہے۔

⑥ محبت کی نظر سے اپنے محبوب کو کتنا بھی چھپ کر دیکھا جائے یہ نظر چھپ نہیں سکتی فوراً پہچان لی
جاتی ہے۔ اس صورت میں اے میرے ہم نشیں! تو ہی بتا کہ میں اور کس انداز سے اپنے محبوب کو دیکھوں
کہ کسی اور پر میری محبت کا راز افشاء نہ ہو سکے۔

⑦ اس غزل کا یہ شعر انتہائی خوبصورت ہے جس میں اقبال اپنے انداز میں کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ
نے خدا سے کوہ طور پر جلوہ دکھانے کی ضد کیا سمجھ کر کہ جب کہ ان میں اتنی قوت برداشت نہ تھی ورنہ
جلوہ دیکھتے ہی بے ہوش کیوں ہوتے۔ مراد یہ کہ جلوہ خداوندی کا دیکھنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ نہ
جانے حضرت موسیٰؑ نے اس کے لیے اصرار کیوں کیا؟

⑧ معنی: جنبش شرکاء: پلکوں کا ہلنا۔

مطلب: حسن کے نظارے کے لیے تو پلک جھپکتا بھی بارے کم نہیں۔ اس کے لیے لازم ہے کہ نرگس کے پھول کے مانند سلسل ایک جانب ہی نگاہ رکھی جائے۔ چشم نرگس کا حوالہ اسی طور پر آتا ہے۔

⑨ معنی: کھل جائیں: منکشف ہوں۔ ظاہر ہوں۔

مطلب: میرا محبوب اگر میری طرح سے دو چار دن میرے عشق میں مبتلا رہنے کی زحمت گوارا کرے تو اس پر عشق میں جو مرے آتے ہیں وہ اس پر منکشف ہو جائیں۔

(8)

057

کوں کیا آرزوئے بیدی مجھ کو کہاں تک ہے
وہ مہکشی ہوں فردغ سے خود گلزار بن جاؤں
چمن افروز ہے صیاد میری خوشنوائی تک
وہ مشت خاک ہوں، فیض پریشانی سے صحرا ہوں
جس ہوں، نالہ خوابیدہ ہے میرے ہر رگ و پے میں
سکون دلی سے سلمان کشود کار پیدا کر
چمن زار محبت میں خموشی موت ہے بلبل
جوانی ہے تو ذوق دید بھی، لطف تمنا بھی

زمانے بھر میں رسوا ہوں مگر اے وائے نادانی

سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے رازداں تک ہے

*

① معنی: آرزوئے بیدی: دل دینے کا شوق۔ زیاں: نقصان۔

مطلب: میرے لیے اس امر کا انکشاف ناممکنات میں سے ہے کہ میرے دل میں مبتلائے عشق ہونے کی کتنی آرزو ہے۔ یوں بھی یہ حقیقت ہے کہ میں نے زندگی میں بیش خسارے کا سودا ہی کیا ہے۔ یہ خسارہ خواہ عشق میں ہو خواہ عام معاملات میں! بہر حال یہ خسارہ ہی میری تقدیر کا بنیادی عنصر ہے۔

② میں تو اس نوع کا شراب نوش ہوں کہ جس کا چہرہ نشے کی زیادتی کے سبب خود مانند گلاب سرخ ہو جاتا ہے۔ میرا نامریاں ساقی جب شراب پلا کر مجھے مدہوش کر دیتا ہے تو میں خود اپنی ذات میں اس قدر محو ہو جاتا ہوں کہ مجھے پھولوں اور گلزار کی طرف دیکھنے کی حاجت ہی نہیں ہوتی۔

③ معنی: چمن افروز: باغ کو رونق دینے والا۔

مطلب: زیر تشریح شعر میں اقبال ان آلام و مصائب کی نشاندہی کرتے ہیں جن سے انسان دوچار رہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں چمن میں خوش الحانی سے نغمے گاتا رہوں گا صیاد میری ناک میں رہے گا اور پھر موقع ملے ہی مجھے پابند قفس کر دے گا۔ اسی طرح بجلی بھی اسی وقت تک بیتاب و مضطرب رہے گی جب

تک کہ وہ میرا آشیانہ جلا کر خاک نہ کر دے۔

④ میں ایک ایسی ہشت خاک کی مانند ہوں کہ منتشر ہو جاؤں تو صحرا بن جاؤں اور جہاں تک میری وسعت کا سوال ہے تو یوں سمجھ لو کہ زمین سے آسمان تک اجاڑے ہوئے ہوں اس شعر میں انسان کی جملہ صلاحیتوں کی ایک طرح سے نشاندہی کی ہے۔

⑤ معنی: رخیل: کوچ۔

مطلب: میں قافلے کی ایک ایسی گھٹی کے مانند ہوں جس کی نس میں ایک خاموش فریاد چھپی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ ابھی میرا قافلہ (قوم) منتشر اور افتراق کا شکار ہے تو مجھے بھی خامشی اختیار کرنا پڑی ہے جو ہی میرا قافلہ منظم ہو کر اپنی منزل کی جانب گامزن ہوا میں بھی متحرک ہو جاؤں گا۔

⑥ معنی: کسود کار: مطلب حاصل کرنا۔

مطلب: اقبال اس شعر میں اہل قافلہ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اگر تم مسائل سے عمدہ برآ ہو کر اپنے لیے سہولتیں اور آسانیاں فراہم کرنے کے خواہاں ہو تو اس امر کی ضرورت ہے کہ اطمینان قلب حاصل کر لو کہ پانی میں گرداب یعنی بھنور اسی وقت تک بڑے رہتے ہیں جب تک کہ وہ رواں دواں رہتا ہے اور جوں ہی اس کی روانی ختم ہوئی اور وہ ایک مقام پر ٹھہر گیا تو بھنور پڑنا بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مشکلات بھی انسانی زندگی میں اس وقت تک برقرار رہتی ہیں جب تک وہ منتشر ہو لہذا سکون قلب کے حصول کی خاطر یہ امر ناگزیر ہے کہ اختصار اور افتراق کا خاتمہ کیا جائے۔

⑦ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ عشق و محبت میں فحشی موت کے مترادف ہے اس کو زندہ رکھنا ہے تو پھر نالہ و فریاد بھی ناگزیر ہے کہ یہی عشق و محبت کی بنیادی رسم ہے۔

⑧ انسان جب تک عالم شباب کا حامل ہوتا ہے تو محبوب کے دیکھنے کا لطف اور اس کے حصول کی تمنا بھی برقرار رہتی ہے اور جب شباب ہی رخصت ہو جائے تو اس نوع کے جذبے فطری طور پر دم توڑ دیتے ہیں۔

⑨ غزل کے اس آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ میں دنیا بھر میں بدنام اور رسوا ہو چکا ہوں مگر یہ احمقانہ سوچ میرے ذہن پر حاوی ہے کہ میرے عشق کی داستان محض میرے رازدوں کے سوا اور کسی کو بھی معلوم نہیں جب کہ اس کا انکشاف سارے زمانے پر ہو چکا ہے۔

(9)

058

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں، زمینوں میں
حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی
اگر کچھ آشنا ہوتا مذاق جب سائی اے
کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں؟
وہ نکلے میرے ظلمت خانہ دل کے کینوں میں
مکان نکلا ہمارے خانہ دل کے کینوں میں
تو سب آستان کعبہ جا ملتا جبینوں میں
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محل نشینوں میں
مگر گھڑیاں ابدائی کی گزرتی ہیں مینوں میں
میںے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں

مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
چھپایا حسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے
جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس ان کی
تمنا درد دل کی ہو تو خدمت کر فقیروں کی
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ترستی ہے نگاہ نارسا جس کے نظارے کو
کسی ایسے شر سے پھونک اپنے خرمن دل کو
محبت کے لیے دل ڈھونڈھ کوئی ٹوٹنے والا
سرپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق
پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے ما عولنا پر
نمایاں ہو کے دکھلا دے کبھی ان کو جمال اپنا
خوش اسے دل! بھری محفل میں چلا نا نہیں اچھا
برا سمجھوں انہیں؟ مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ چمنوں میں

① معنی: قلت خانہ: اند میرا گھر۔

مطلب: آثارہ اشعار پر مشتمل یہ غزل اقبال کی طویل غزلوں میں سے ایک ہے۔ اس کے مطلع میں وہ
کہتے ہیں کہ خدائے وحدہ لا شریک تک رسائی حاصل کرنے کے لیے میں زمینوں اور آسمانوں کو کھگانا رہا
جب کہ ذرا گمراہی سے دیکھا تو وہ میرے دل میں ہی موجود تھا۔ اس لمحے مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ
خدا تو انسان کے دل میں ہی رہتا ہے تاہم اس حقیقت کے ادراک کے لئے معرفت کا شعور بنیادی شرط
ہے۔

② اس شعر کا مفہوم بھی کم و بیش پہلے شعر سے ملتا جلتا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ جب مجھے اس امر سے
آگاہی ہوئی کہ میری حقیقت کیا ہے تو اس امر کا علم بھی ہوا کہ اللہ تعالیٰ تو خود میرے دل میں موجود ہے۔
مراد یہ ہے کہ رب ذوالجلال کو پانے کے لیے اپنی حقیقت تک رسائی بھی ناگزیر ہے۔

③ معنی: جبہ سائی: سجدہ کرنا۔

مطلب: اس شعر میں کہا گیا ہے کہ خانہ کعبہ کا وہ پتھر جس کی جانب رخ کر کے ہم سجدہ ریز ہوتے ہیں اگر
اس میں بھی یہ جذبہ اور ذوق موجود ہوتا تو متحرک ہو کر خود ہماری پیشانیوں سے ہم آہنگ ہو جاتا۔
④ اس شعر میں مجنوں کو مخاطب کر کے اقبال استفسار کرتے ہیں کہ اتنا تادے کہ محض عشق میں گم
رہنے کے سوا کبھی تو نے اپنی ذات میں بھی جھانک کر دیکھا ہے اس لیے کہ میرے نزدیک تو تو بھی اسی طرح
پردے میں چھپا ہوا ہے جس طرح کہ تیری محبوبہ لیلیٰ محفل نشین تھی۔ مراد یہ ہے کہ کوئی شخص بھی اس
وقت تک خود کو نہیں پہچان سکتا جب تک کہ وہ اپنی ذات سے باہر نکل کر خود کو نہ دیکھے۔

⑤ اس شعر میں اقبال محبوب سے وصل اور فرقت کے معاملات کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب محبوب سے وصال یعنی ملاپ کے مواقع عاشق کو حاصل ہوں تو میں نے بھی پر لگا کر چند لمحوں میں اڑ جاتے ہیں جب کہ اس سے جدائی کے چند لمحات بھی میں یوں پر محیط دکھائی دیتے ہیں۔

⑥ اے ملاج! جب ڈوبنا ہی میرا مقدر تھا تو سمندر میں کودنے سے بھلا تو مجھے کس طرح روک سکے گا۔ اس لیے کہ ڈوبنے والے تو کشی میں بیٹھے بٹھائے بھی ڈوب جاتے ہیں۔

⑦ رب ذوالجلال نے بے شک اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ کو کوہ طور پر اپنا جلوہ دکھانے سے گریز کیا بلکہ اس کا وجود تو دنیا کی ہر خوبصورت چیز میں پوشیدہ ہے مراد یہ ہے کہ جن لوگوں میں معرفت الہی کی صلاحیت موجود ہے وہ تو اس کا جلوہ ہر حسین شے میں دیکھنے کے اہل ہوتے ہیں۔

⑧ اے رب ذوالجلال! یہ تو بتا کہ اہل دل کے سینوں میں وہ کون سی قوت پوشیدہ ہو سکتی ہے جو اپنی ایک پھونک سے بجھی ہوئی شمع کو پھر سے روشن کر سکتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ان لوگوں میں تو نے ایسی کون سی صلاحیت پیدا کی ہے جو ناممکن کو ممکن بنانے کی اہل ہوتی ہے۔

⑨ اگر تجھے جذبہ عشق کے حصول کی تمنا ہے تو پھر ادھر ادھر بھٹکنے کی بجائے ان درویشوں کے پاس جا جو ہر شے سے بے نیاز ہو کر عبادت خداوندی کے علاوہ عام انسانوں کے کام آتے رہتے ہیں۔ یہ جان لے کہ جذبہ عشق ایسا جوہر ہے جو کسی بادشاہ کے خزانے میں نہیں مل سکتا کہ یہ خزانے تو محض ہوس کی آماجگاہ ہیں۔

⑩ معنی: خرقہ پوشوں، گدڑی پہنے والے یعنی درویش۔

مطلب: ان گدڑی پوش لوگوں کے بارے میں تحقیق و تجسس بے معنی بات ہے۔ اے شخص! اگر تجھے ان سے کچھ عقیدت و محبت ہے تو یہ راز خود ہی تجھ پر منکشف ہو جائے گا کہ یہ لوگ تو معجز نما ہیں اور اپنی آستینوں میں معجزے چھپائے بیٹھے ہوتے ہیں۔

(11) یہ شعر بھی دوسری شعر کا ایک طرح سے تسلسل ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وہ آنکھیں جن کی حقیقت تک رسائی نہیں وہ ان گدڑی پوشوں کے نظارے کو ترستی رہیں گی حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہی خلوت نشین گدڑی والے بزرگوں سے ہی اس دنیا کی رونق قائم ہے۔ ان کے بغیر تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

(12) معنی: خوشہ چمنوں، خوشے پننے والے یعنی فیض حاصل کرنے والے۔

مطلب: اقبال اس شعر میں یوں گویا ہیں کہ اے میرے حبیب تو اس کائنات کی حقیقت جاننے کا خواہاں ہے تو تو اپنے خرمن دل کو ایسی چنگاری سے پھونک دے کہ آفتاب کو بھی تجھ پر رشک آئے اور وہ بھی تیرے خوشہ چمنوں میں شمار ہو سکے۔ مراد یہ ہے کہ کائنات کا احوال جاننے کے لیے اس علم کی روشنی حاصل کر جو آفتاب کے لیے بھی رشک کا سبب بن جائے۔

(13) اگر تجھے طلب عشق ہے تو وہ حساس دل تلاش کر جو غلغلے کا آئینہ دار ہو کہ عشق و محبت تو ایسی حقیقتیں ہیں جو انتہائی نازک اور حساس عوامل سے ہم آہنگ ہو سکیں۔ مراد یہ کہ عشق ہر کہ و مہ کے بس کا روگ نہیں۔ یہ تو ایسے دل میں جگہ پاسکتا ہے جو نازک آئینوں کی مانند ہوتے ہیں۔

(14) معنی: ماسر فلنا: اشارہ ہے کہ ہم نے تجھے اس طرح نہیں پہچانا جس طرح پہچاننے کا حق تھا۔

مطلب: اے دل! یہ تو بتا کہ اس دنیا کے خوبصورت لوگوں میں کیا کوئی ایسا حسین وجود بھی ہے جو ان خوبصورتیوں کو دیکھ کر خود بھی سرپا حسن میں ڈھل جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسا وجود تعجلی حیثیت کا حامل ہی ہو سکتا ہے۔

(15) زیرِ تشریح غزل میں یہ شعر علامہ نعتیہ ہے جس میں حضور سرور کائنات ﷺ کے اس ارشاد کی جانب اشارہ ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہم نے خدائے بزرگ و برتر کو پہچانا تو ضرور! تاہم اس طرح سے نہیں پہچانا جیسا کہ اس کا حق تھا۔ چنانچہ سرکارِ دو عالم کا یہ عجز خالقِ حقیقی کو بہت بھایا اور اس نے حضور ﷺ کا مقام و مرتبہ دنیا بھر کے خوبصورت لوگوں سے بڑھا دیا اور ان کے مراتب مزید بلند کر دیئے۔

(16) یہ نعتیہ شعر بھی پہلے شعر کا تسلسل ہے جس میں اقبال حضور سرور کائنات ﷺ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ دنیا بھر کے فلسفی اور دانشور ایک عرصے سے آپ کی ذات والا صفات اور مراتب کے حوالے سے تذبذب میں مبتلا ہیں۔ یہ ان پر کرم ہو گا اگر حضور خود ہی ان کو اپنا جلوہ دکھادیں تو ساری صورت حال ان کی سمجھ میں آجائے گی۔

(17) اقبال یہاں کہتے ہیں کہ اے دلِ نامبور! تجھے تو اپنے محبوب سے حقیقی عشق کا دعویٰ ہے اس کے باوجود تو بھری محفل میں نالہ و فریاد کر رہا ہے۔ حالانکہ جو لوگ عشق و محبت کے دعویدار ہوتے ہیں انہیں اس حقیقت کا اور اک بھی یقیناً ہوتا ہے کہ محبت کے جو قرینے ہیں ان میں اوب و احترامِ اولین قرینہ ہے۔

(18) اس غزل کے مقطع میں اقبال یوں گویا ہیں کہ جو لوگ میرے نکتہ چیں اور ناندہ ہیں ان کو میں کس طرح برا کہہ سکتا ہوں جب کہ میں تو خود اپنی ذات کے نکتہ چینوں اور ناندہوں میں سے ہوں۔

(10)
059

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
م ہو نہ ہو وعدہ بے حجابی کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں
یہ جنت مبارک رہے زامدوں کو کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں
ذرا سا تو دل ہوں، مگر شوخ اتنا دی لن ترانی سنا چاہتا ہوں
کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہل محفل چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں

*

① معنی: عشق کی انتہا، انتہائی محبت۔ سادگی: بھولا پن۔

مطلب: اس غزل کے مطلع میں محبوب سے مخاطب ہو کر شاعر کہتا ہے کہ میں تیرے عشق کے ان انتہائی مراحل تک رسائی حاصل کرنے کا خواہاں ہوں جن سے آگے اور کچھ نہیں ہے لیکن یہ خواہش

میری سادگی کے علاوہ بظاہر کچھ اور نظر نہیں آتی۔

② معنی: وعدہ بے حجابی: بے نقاب ہونے کا وعدہ۔ صبر آزما: صبر آزما۔

مطلب: میرے نزدیک ظلم و ستم اور وعدے و وعید ایک ہی نوعیت کے ہیں کہ عشق و محبت میں یہی کچھ ہوتا ہے اور اسی قسم کی توقعات رکھی جانی چاہئیں!

③ ہمشت کا تصور تو زاہدوں کو ہی مبارک ہو کہ ان کا زہد و تقویٰ اسی مقصد کا حامل ہوتا ہے جب کہ میرے تو اپنے محبوب سے ملاقات ہی کافی ہے۔ یہ ملاقات ہی میرے لیے جنت سے کم نہیں۔

④ معنی: لہن ترانی: تو مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔

مطلب: ہر چند کہ میرا دل مختصر سا ہے لیکن اس میں جو تمنا موجزن ہے وہ یہی کہ اپنے محبوب سے بار بار ملاقات کے وعدے و وعید اور پھر ان سے انکار کا تذکرہ سنوں۔

⑤ اے دنیا والو! میں تو اب صرف چند گھڑی کا مسلمان ہوں۔ میری کیفیت تو صبح کے چراغ کی مانند ہے جو کسی لمحے بھی بجھ سکتا ہے۔

⑥ معنی: راز کی بات: معشوق کی مرہانی کا تذکرہ۔

مطلب: غزل کے اس آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ میں تو اس قدر منہ پھٹ واقع ہوا ہوں کہ جو باتیں دوسروں سے چھپا کر رکھنے کی ہوتی ہیں ان کو بھی بھری بزم میں منکشف کر دیا یقیناً یہ عمل ایک جرم کے مترادف ہے۔ مجھے اس کی سزا ملے تو بے شک میں یہ سزا بھگتنے کو ہر طرح سے تیار ہوں۔

(11)

060

کشاہ دست کرم جب وہ بے نیاز کرے
مٹا کے عرش پر رکھا ہے تو نے اے واعظ
مری نگاہ میں وہ رند ہی نہیں ساقی
ہم گمشدہ دل وہ یہ ساز ہے ایسا
کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑنا ہے
خجل میں سنو اللہ کہاں سے آتا ہے
تمیز لالہ و گل سے ہے نالہ بلبل
غور زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو
نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے
جو ہوشیاری و مستی میں امتیاز کرے
جو ہو شکستہ تو پیدا نوائے راز کرے
جو بے عمل پہ بھی برکت وہ بے نیاز کرے
یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے
جہاں میں دانہ کوئی چشم امتیاز کرے
کہ بدنگان خدا پر زباں دراز کرے
ہوا ہو ایسی کہ ہندوستان سے اے اقبال
اڑا کے مجھ کو غبار وہ جہاز کرے

*

① معنی: بے نیاز: مراد ہے خدا۔ نیاز مند: انسان، بندہ۔

مطلب: اس غزل کے مطلع میں کہا گیا ہے کہ خدائے عز و جل جب انسان پر کرم نوازی کرتا ہے تو وہ جو

بے شک مجبور اور کسی دامن ہے اس انسان کو تو اس کرم نوازی پر غرور ناز ہونا چاہیے۔

② معنی: احتراز پر بیہزکرتا۔

مطلب: اقبال نے اس شعر میں واعظ کو مخاطب کرتے ہوئے ایک نازک مسئلے کو بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں چھیڑا ہے۔ ان کے مطابق واعظ اپنی تقریروں میں بار بار اس امر کا اعادہ کرتا ہے کہ خدائے تعالیٰ آسمان پر مقیم ہے۔ اقبال اس مفروضے پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ خدایٰ کیا جو اپنی مخلوق سے احتراز کرتے ہوئے اتنی دور جا بیٹھا ہے حالانکہ اس کائنات کو پیدا کرنے والا خدا تو وہ ہے جو صرف آسمان پر ہی نہیں ہر جگہ موجود ہے۔ اقبال کے بقول واعظوں نے تو خدا کے وجود کو بھی محدود کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ انراں کی تنگ نظری کے سوا اور کیا ہے؟

③ اس شعر میں لگایا ہے کہ میرے نزدیک وہ بادلہ نوش صحیح معنوں میں بادلہ نوش نہیں ہو سکتا جو ہوش اور ہستی کی کیفیتوں میں تیز کرنے کا اہل ہو۔ مراد یہ ہے کہ حقیقی بادلہ نوش وہی شخص ہے جو ہر لمحے مست و سرشار رہے حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھی فراموش کر دے اور سب کچھ بھول جائے۔

④ اسے انسان تجربے کے لیے لازم ہے کہ ہر لمحے مستعد اور دل کی آواز کی طرف متوجہ رہے کہ جب یہ حلقے کے عمل سے گزرتا ہے تو پھر اسرار حیات مشکف ہونے لگتے ہیں۔

⑤ کوئی حضرت واعظ سے یہ پوچھنے کی زحمت گوارا کرے کہ اگر رب العزت کسی گناہ گار پر کرم نوازی کرتا ہے تو حضرت ایہ فرمائیے کہ اس میں آپ کا نقصان کیا ہے؟ مراد یہ کہ واعظان کرام کا طرز عمل تو یہی ہے کہ وہ لوگوں کو جرم و گناہ کے حوالے سے اپنی تقریروں میں خوفزدہ کرتے رہتے ہیں جب کہ خدا رحیم بھی ہے کریم بھی۔

⑥ اقبال اس شعر میں خالق کائنات سے استفسار کرتے ہیں کہ شعرو سخن میں جو سوز پیدا ہوتا ہے اس کے محرکات کیا ہیں؟ اس لیے کہ سوز تو ایسی حقیقت ہے جو انسان تو انسان پتھر کو بھی پگھلا کر رکھ دیتا ہے۔

⑦ بلبل کو گلاب کے پھول سے تو عشق ہے اور ملا لے کے پھول سے بے تعلق رہتی ہے۔ گلاب کے مرجھانے پر اسی لیے وہ اداس ہو جاتی ہے چنانچہ اگر وہ دوسرے پھولوں کو بھی گلاب کی مانند چاہے تو پھر اس کو نالہ و فریاد کی ضرورت نہ ہوگی مراد یہ کہ اس نوع کا امتیازی سلوک مناسب نہیں ہوتا۔

⑧ معنی: زباں دراز: برا بھلا کہتا۔

مطلب: یہ عبادت و زہد کا غور ہے جو حضرت واعظ کو دوسرے بندگان خدا کے خلاف زبان دراز کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

⑨ غزل کے مقطع میں اقبال اس تمنا کا اظہار کرتے ہیں کہ کوئی ہو ایسی آئے جو مجھے ہندوستان سے اڑا کر دینے کی طرف لے جائے! مراد یہ ہے کہ خدا کرے وہ سعادت نصیب ہو کہ ہندوستان سے دینے کے لیے عازم سفر ہوں۔

میں جہی تک تھا کہ تیری جلوہ پیرائی نہ تھی جو نمود حق سے مٹ جاتا ہے، وہ باطل ہوں میں
 علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن گوہر بدست وائے محرومی! خرف چھین لب ساحل ہوں میں
 ہے مری ذلت ہی کچھ میری شرافت کی دلیل جس کی غفلت کو ملک روتے ہیں وہ غافل ہوں میں
 بزم ہستی! اپنی آرائش پہ تو نازاں نہ ہو تو تو اک تصویر ہے محفل کی اور محفل ہوں میں
 دھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو
 آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں



① معنی: ظالم ہوں میں، جاہل ہوں: قرآن پاک میں ہے کہ انسان ظالم اور جاہل ہے۔

مطلب: زیر تشریح غزل کے مطلع میں اقبال کہتے ہیں کہ اپنے دشمن کی ہرزیاوتی کو نظر انداز کر کے میں
 خود اپنی ذات پر ایک طرح سے جبر کر رہا ہوں۔ اس کے باوجود اس امر کا طعنہ دیا جاتا ہے کہ میں ظالم اور
 جاہل ہوں۔ مراد یہ ہے کہ میری رواداری کا عالم یہ ہے کہ اپنے دشمن کی ہرزیاوتی کو نظر انداز کر کے خود
 اپنی ذات کو ہی ہدف بنائے ہوئے ہوں۔ اس پر بھی یہ الزام تراشی کہ میں ظالم بھی ہوں اور جاہل بھی! یہ
 رویہ میرے کرم فرماؤں کا کس قدر افسوس ناک اور باعث شرم ہے۔

② اس شعر میں اقبال حق تعالیٰ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرا وجود ان لمحات تک ہی برقرار
 تھا جب تک کہ تو نے اپنا جلوہ نہیں دکھایا تھا۔ دراصل میری ذات تو ایسے باطل کی طرح ہے جو سچائی کے
 نمودار ہوتے ہی غائب ہو جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ میں نے جلوۂ خداوندی کا ادراک حاصل ہوتے ہی خود کو
 اس میں ایسے جذب کر لیا جیسے حقیقت کے نمودار ہوتے ہی جھوٹ غائب ہو جاتا ہے۔

③ معنی: غوطہ زن: مراد ہے طالبان علم۔ گوہر بدست: موتی لے کر۔ خرف: چننا۔

مطلب: اگر علم کو ایک دریا تصور کر لیا جائے تو اہل طلب اس دریا میں غوطہ لگا کر جب سطح پر برآمد
 ہوئے تو وہ علم سے مالا مال تھے۔ اس کے برعکس میری کیفیت یہ تھی کہ میں اس دریا کے کنارے کھڑا کنگر
 چننا رہا۔ مراد یہ کہ میں نے حصول علم کے لیے کوئی تک و دونہ کی چنانچہ یہ فطری امر ہے کہ اس دولت سے
 محروم رہا۔

④ اس شعر میں اقبال نے حضرت آدمؑ کے جنت سے نکلنے کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ
 تدبیر عملاً میری شرافت کی دلیل بن گئی کہ اپنی غفلت کے سبب جب مجھے جنت سے نکلنے کا حکم دیا گیا تو
 اس حکم پر فرستے بھی گریاں کنناں ہوئے تھے۔

⑤ اے دنیا! نہ جانے کس لیے تجھے اپنی آرائش و زیبائش پر اس قدر فخر و غور ہے حالانکہ حقیقت یہ
 ہے کہ تو جس محفل کا پر تو ہے وہ محفل میں ہی تو ہوں۔ مراد یہ ہے کہ انسان کا وجود ہی دراصل دنیا کی
 آرائش و زیبائش کا سبب ہے۔ انسان نہ ہو تو یہ دنیا ایک ویرانہ بن کر رہ جائے۔

⑥ غزل کے مطلع میں اقبال خود شناسی کے عمل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں تو خود ہی
 اپنے وجود کی تلاش میں سرگرداں ہوں حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ میں تو خود ہی مسافر اور خود ہی منزل
 ہوں۔ شعر اپنی معنویت کے اعتبار سے انسانی وجود کے لیے اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ اگر انسان

خود شناس ہو تو وہی سب کچھ ہوتا ہے۔

(13)

062

بجنوں نے شر چھوڑا، تو صحرا بھی چھوڑ دے
واعظ! کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد
تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خود کشی
مانند خامہ تیری زباں پر ہے حرف غیر
لطف کلام کیا جو نہ ہو دل میں درد عشق
شبنم کی طرح پھولوں پہ رو، اور چمن سے چل
ہے عاشقی میں رسم الگ سب سے بیٹھنا
سوداگری نہیں، یہ عبادت خدا کی ہے
اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
جینا وہ کیا جو ہو نفس غیر پر مدار
شونی سی ہے سوال کمر میں اے کلیم
نظارے کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے
رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے
بیگانہ شے پہ نازش بیجا بھی چھوڑ دے
بہل نہیں ہے تو، تو تڑپنا بھی چھوڑ دے
اس باغ میں قیام کا سودا بھی چھوڑ دے
ہتھلہ بھی، حرم بھی، کلیسا بھی چھوڑ دے
اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے
شہرت کی زندگی کا بھروسہ بھی چھوڑ دے
شرط رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے
واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

*

① اس غزل کے مطلع میں اقبال کہتے ہیں کہ اگر بجنوں نے اپنی محبوبہ لیلیٰ کے عشق میں شر کو چھوڑ کر صحرا میں ڈیرہ بنالیا تھا تو یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ لطف تو جب آتا کہ وہ شر کی طرح صحرا کو بھی ترک کر دیتا۔ پھر اگر اسے رب ذوالجلال کا جلوہ دیکھنے کی خواہش تھی تو پھر لیلیٰ کے تصور سے بھی دستبردار ہونا ضروری تھا۔ مراد یہ ہے کہ دنیوی عشق کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے عشق کی آرزو ہے تو اس خالق کائنات سے کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔

② اس شعر میں وہ واعظ کو خطاب کرتے ہوئے یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ اگر ترک علاق ہی تیرا کمال ہے اور اسی حوالے سے تو دنیا کو چوڑنے پر مصر ہے تو پھر عقبیٰ کے تصور کو بھی چھوڑ دے کہ خالق کائنات تک رسائی تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اپنی تمام خواہشات اور تمناؤں کو ترک کر کے اس سے ملے۔

③ :معنی: تقلید، پیروی کرنا۔

مطلب: اس شعر میں کہا گیا ہے کہ کسی دوسرے کی تقلید اور پیروی سے تو بہتر یہی ہے کہ انسان خود کشی کر لے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ منزل تک پہنچنے کے لیے اپنا راستہ بھی تلاش کیے جائے اور وہاں تک رہنمائی کے لیے حضرت خضر کی امداد کا تصور بھی ترک کر دیا جائے کہ اسی صورت میں انسان اپنی ذاتی ہر وجہ کے ذریعے منزل تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

④ معنی: خامہ: قلم۔

مطلب: زیر تشریح شعر میں اقبال قلم کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ قلم سے علم و حکمت کی کیسی کیسی باتیں رقم ہوتی ہیں لیکن یہ کمال دیکھا جائے تو قلم کا نہیں بلکہ اس لکھنے والے کا ہے جو اس قلم کے ذریعے دانش و حکمت کے جواہر نکھیرتا ہے۔ قلم تو محض اظہار کا ایک ذریعہ ہے لہذا اگر انسان زندگی میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ اس کے لیے خود جدوجہد کرے۔ دوسروں کے عمل کی تقلید پھر اس پر فخر و مباہات تو بے معنی بات ہے۔ یہ رویہ کبھی بھی اپنانا نہیں چاہیے اسی عمل میں انسان سرخرو کی حاصل کرتا ہے۔

⑤ اگر دل میں عشق کا درد موجود نہیں تو شعر و سخن میں بھی سوز اور حقیقت کے رنگ نہیں بھرے جا سکتے۔ اس کی مثال یوں ہو سکتی ہے کہ وہی شخص تکلیف اور درد کے باعث ترہتا ہے جو فی الواقع زخموں سے نڈھال ہو۔ دراصل اس شعر میں اقبال کہتا ہے چاہتے ہیں کہ تخلیقی عمل کو لکھنے والے کے خیالات و جذبات کا ترجمان ہونا چاہیے۔ اسی کے سبب تحریروں میں حقیقت کا رنگ بھرا جا سکتا ہے۔

⑥ زیر تشریح شعر ترک دنیا کے حوالے سے کہا گیا ہے۔ اس میں اقبال کہتے ہیں کہ دنیا میں قیام انسان کے لیے ایک عارضی حیثیت کا حامل ہے۔ بالاخر چند روزہ زندگی کے بعد جب موت کو گلے ہی لگانا ہے تو پھر اے انسان شبنم کی پیروی کر کہ وہ چند لمحوں تک پھولوں پر آنسو بہا کر باغ سے اڑ جاتی ہے۔ تو بھی اسی طرز عمل اختیار کر لے۔ اور اس چند روزہ زندگی کا جنون چھوڑ دے۔

⑦ عشق و عاشقی کی رسم تو یہی ہے کہ ہر شے کو ترک کر کے انسان گوشہ تنہائی اختیار کر لے۔ لہذا تو بھی اسی طرز عمل کی پیروی کرتے ہوئے ہتھخانہ، کعبہ اور کلیسا سب کو چھوڑ کر اپنی دنیا انگ بسا اور خالق حقیقی سے لو لگا لے۔

⑧ رب ذوالجلال کی عبادت تو مصمم قلب سے کی جانی چاہیے۔ اس عمل کے لیے محض جزا کو پیش نظر رکھنا خلوص دل سے عبادت کے متالی ہے۔ بلکہ بالفاظِ دیگر یہ تو ایک طرح سے سوداگری کے مترادف ہے۔ یوں بھی عبادت سوداگری نہیں ہوتی۔ اگر دل میں خلوص ہو تو پھر جزاء اور انعام کا تصور بے معنی شے بن جاتا ہے۔

⑨ معنی: پاسان عقل:

مطلب: یہ امر بڑی حد تک مناسب ہے کہ مسئلہ کوئی بھی ہو اس کو بروئے کار لانے کے عمل میں دل اور عقل کے مابین رابطہ برقرار رہے اس کے باوجود کبھی کبھی یہ بھی مناسب ہوتا ہے کہ عقل کی بجائے محض اس جذبے کے تحت کام کیا جائے جس کا تعلق محض دل سے ہو۔

⑩ ایسی زندگی قطعی طور پر بے معنی ہوتی جس کا انحصار دوسروں پر ہو۔ چونکہ شہرت کا تعلق بھی دوسروں کی امداد و سرپرستی سے ہے اس لیے شہرت کی تمنا ترک کر کے اپنے لیے راستہ خود ہی بنانا چاہیے۔

(11) حضرت موسیٰؑ نے جلوۂ خداوندی کے لیے جو بار بار تقاضا کیا تو ان کا یہ عمل محض شوخی ہی نہیں بلکہ سوئے ادب کے مترادف تھا۔ حق تعالیٰ کی رضا کا پاس تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ جو چاہے اس کے رو برو سر خم کر دیا جائے۔

(12) معنی: مے کے جواز میں شراب پینے کو جائز قرار دینا۔

مطلب: زیر تشریح غزل کے مطلع سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہاں بھی حسب معمول اقبال واعظوں کے کردار سے بری طرح تالاں ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ شخص شراب نوشی کے جواز میں کوئی ثبوت بھی لے آئے تو میں اس کی مخالفت کرتے ہوئے شراب پینا ترک کر دوں گا۔ بقول ان کے واعظ کا کردار تو بس یہ ہے۔

بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آواز ازاں سے



حصہ دوم

(1905ء سے 1908ء تک)

063-1

”بانگ درا“ کے حصے میں اقبال کی وہ تخلیقات شامل ہیں جو 1905ء سے 1908ء تک تین سال کے دوران منصفہ شہود پر آئیں۔ اس حصے کی منظومات میں بھی زیادہ تر کلاسیکی رنگ غالب ہے۔ تاہم بیشتر مقامات پر اقبال کا لہجہ ان کی بعد کی شاعری سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

محبت

063-2

عروس شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے
 قمر اپنے لباس نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
 ابھی امکاں کے غلت غالت سے ابھری ہی تھی دنیا
 کمال نظم ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
 سنا ہے عالم بالا میں کوئی کیسیاگر تھا
 لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اسیر کا نسخہ
 نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیسیاگر کی
 بوجھ تسبیح خوانی کے بمانے عرش کی جانب
 پھرایا فکر اجزا نے اسے میدان امکاں میں
 چمک تارے سے مانگی چاند سے داغ جگر مانگا
 ترپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی
 ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی
 پھر ان اجزا کو گھولا چشمہ حیاں کے پانی میں
 موس نے یہ پانی ہستی نوخیز پر چھڑکا
 ہوئی جنبش عیاں زردوں نے لطف خواب کو چھوڑا

خرام ناز پایا آفتابوں نے، ستاروں نے

چمک غنوں نے پائی، داغ پائے لالہ زاروں نے

*

① اقبال کی یہ نظم اگرچہ ان کی ابتدائی تخلیقات میں سے ایک ہے۔ تاہم فورم کے اعتبار سے اسے اردو کی بہترین نظموں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس نظم میں اقبال نے تخیلی اور تصوراتی سطح پر محبت کے جذبے کی تشکیل کے لیے بعض اجزائے ترکیبی کو یکجا کیا ہے اور ان کے مرکب کو محبت کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ پوری نظم کا مرکزی محور صورت ابھری سے مزین ہے۔ فرماتے ہیں۔

① سے ④ معنی: عروس شب: رات کی دلہن۔ لذت رم: بھاگنے کی لذت۔ لباس نو: مراد ہے نئی نئی صورت۔ آئین مسلم: فطرت کا قانون۔ امکاں: اصطلاحی معنی ممکن۔ چشم خاتم: انگوٹھی کی آنکھ۔

مطلب: جب خالق ہر دو جہاں نے کائنات کو تخلیق کیا تو اس کے ابتدائی لمحات میں جملہ موجودات کی کیفیات ارو صورت حال یہ تھی کہ شب کی دلہن کی زلفیں ہیچ و خم سے محروم تھیں۔ آسمان پر ستاروں کی گردش اور ان کے اپنی منزل کی طرف گامزن ہونے کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔ چاند کو فطرت نے جو نیا لبابہ فراہم کیا تھا اس میں وہ اجنبی سا محسوس ہوتا تھا۔ وہ بھی ہمہ وقت گردش کے طے شدہ اصولوں سے آگاہی نہ رکھتا تھا۔ اس عالم رنگ و بو کا نیا نیا آغاز ہوا تھا اور اس کے جملہ عناصر ان تقاضوں سے محروم تھے۔ جا کا

تعلق زندگی سے ہے۔ یہ کائنات جو اب پایہ تکمیل کو پہنچ کر ہماری نظروں کے سامنے ہے ابھی اس کی نئی نئی ابتدا ہوئی تھی۔

⑤ سے ⑧ معنی: عرش کے بائے بکنا یہ ہے یعنی محبت پاکیزہ چیز ہے۔ اکسیر کا نسخہ: وہ مرکب جس کے نکتے سے دھات سونا بن جائے۔ اسم اعظم: اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا اور حیرت انگیز نام۔ میدان امکاں: ساری کائنات۔ زلف برہم: مراد ہے رات کی سیاہی۔

مطلب: قرین قیاس یہ ہے کہ ان لمحات میں آسمان پر ایک ایسے کیماگر کا وجود پایا جاتا تھا۔ اس کیماگر کو مٹی سے سونا بنانے پر قدرت حاصل تھی اور جس کے پاؤں کی دھول جہنم کے جام سے بھی زیادہ مصفا تھی۔ نئی الوافہ یہ کیماگر سوائے آدم کے اور کوئی نہ تھا۔ ان دنوں عرش معلیٰ کے کسی گوشے میں اکسیر کا ایک ایسا نسخہ آویزاں تھا جس کو فرشتے ہر لمحے اس انسان کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن یہ کیماگر یعنی انسان ہر لمحے اس نسخے کی تاک میں رہتا تھا کہ کب فرشتوں کی آنکھ جھپکے اور وہ اس نسخے کو لے اڑے۔ اس لیے کہ یہ انسان تو اس نسخے کو اسم اعظم سے بھی زیادہ اہم اور قیمتی تصور کرتا تھا۔ ایک روز بالا خروہ ایک حمد باری تعالیٰ کے بہانے عرش کی جانب بڑھا اور بڑی چالاکدستی کے ساتھ فرشتوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہ نسخہ حاصل کر لیا یوں بالا خروہ اپنی سعی و عہد کے سبب اس کی دلی مراد برآئی۔

⑨ سے (12) معنی: چشمہ حیوان: وہ فرضی چشمہ جس کا پانی پی کر موت نہیں آتی۔

مطلب: نسخے کے حصول کے بعد اب انسان کو اس کے اجزاء کی فراہمی کے لیے سرگرواں ہونا تھا۔ لیکن جو فرد بارگاہ خداوندی کا محرم ہو اس کی نگاہوں سے کوئی شے بھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ اس نے اس نسخے کے اجزاء کی ترکیبی کی تلاش میں ساری دنیا کو کھنگال ڈالا اور بالا خروہ اس سروردی کا صلہ کامیابی کی صورت میں حاصل ہو گیا چنانچہ اس نے ستاروں سے تھوڑی سی چمک حاصل کی چاند میں جو داغ ہے اس کا ایک جزو اور تھوڑی سی رات کی سیاہی بھی جمع کر لی۔

ان عناصر کی فراہمی کے بعد اس کیماگر یعنی انسان نے دیگر اجزاء کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دیں اور بجلی کی تڑپ کا کچھ حصہ حاصل کرنے کے لیے بعد حوروں کی پاکیزگی اور حضرت عیسیٰ کے انفاس کی حرارت بھی حاصل کر لی۔ اس کے بعد بھی اس نے نسخے کی تکمیل کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں بالا خروہ خداوند عزوجل کی بے نیازی کے علاوہ فرشتوں کا عجز و انکسار اور شیمن کی خاکساری کے حصول میں بھی کامیاب ہو گیا۔

(13 سے 16) اس نایاب اور گراں قدر نسخے کی تکمیل کے لیے اس کے اجزاء کی ترکیبی کی فراہمی کوئی آسان کام نہ تھا لیکن انسان نے اپنی ہمت اور حکمت و دانش کے طفیل اس عقدہ لا ینحل کو حل کر کے ہی دم لیا۔ اب معاملہ صرف اسی قدر رہ گیا تھا کہ اجزاء کی ترکیبی کے حصول کے بعد نسخے کی تکمیل کی جائے۔ چنانچہ تمام اشیاء کو یکجا کر کے اس نے آب حیات میں گھول دیا اور اس مرکب کا نام محبت رکھا۔

نسخے کی تکمیل کے بعد اس مرکب کو انسان نے ان لمحات میں موجود کائنات کی ہر شے پر چھڑکا اور یوں ساری زندگی حرکت میں آگئی۔ تمام خوابیدہ ذرات بیدار ہو گئے اور اٹھ اٹھ کر اپنے ہم نفسوں سے باہم گلے ملنے لگے۔ اس مرکب کے چھینٹوں کا اثر یہ ہوا کہ آفتاب نے اپنی گردش کا آغاز کر دیا اور ستارے بھی

منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ بانوں میں غنچے چنگ کر پھول بن گئے اور لالے کو اس کا داغ حاصل ہو گیا۔ مراد یہ ہے کہ یہ محبت کا جذبہ ہی ہے جس کے طفیل کائنات کی ہر شے متحرک ہے اور اس میں زندگی کی لہر دوڑ رہی ہے۔

حقیقت حسن

064

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
جہاں میں کیوں نے مجھے تو نے لازوال کیا
شب دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی
فلک پہ عام ہوئی اختر سحر نے سنی
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

① سے ④ معنی: تصویر خانہ: مراد دنیا۔ عدم کا فسانہ: یعنی دنیا کی کوئی حقیقت نہیں۔ اختر سحر: صبح کا آرا۔

مطلب: اقبال نے اس نظم میں حسن کی حقیقت اور اس کے اسرار پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ اس حقیقت سے آگاہی بقول ان کے ہر زندہ شے کے لیے ایک الیے کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرماتے ہیں حسن نے ایک روز خدائے ذوالجلال سے استفسار کیا کہ ہر شے پر قدرت رکھنے کے باوجود تو نے مجھے لافانی کیوں نہیں بنایا۔ تو خدا نے جواب دیا کہ یہ دنیا ہی میں نے ناپائیدار بنائی ہے۔ یہاں وہی شے خوبصورت اور حسین ہو گی جس کی زندگی مختصر ہو۔ زندگی تو تغیر اور تبدیلیوں کا نام ہے سو ہر زوال پذیر شے حسن سے عبارت ہے۔

④ سے ⑦ جس لمحے حسن اور خدا کے مابین یہ مکالمہ ہو رہا تھا تو چاند بھی کیسی قریب سے سب کچھ سن رہا تھا چنانچہ اس نے فوری طور پر یہ راز ہائے درون پردہ جو اس پر آشکار ہوئے تھے ستاروں تک پہنچائے۔ جس کے سبب پورے آسمان پر یہ مکالمہ عام ہو گیا۔ صبح کے ستارے نے سحر کو اور سحر نے ساری بات شبہم کو بتائی۔ یوں جو آسمان کا راز تھا وہ زمین کے باسیوں پر بھی منکشف ہو گیا۔ چنانچہ جس لمحے شبہم نے پھولوں کو حقیقت حسن سے آگاہ کیا تو وہ آبدیدہ ہو گئے اور کلی کا ننھا سا دل بھی اس کو سن کر پارہ پارہ ہو گیا۔ یہی نہیں کہ بلکہ اس کو سن کر موسم بہار بھی روتا ہوا چمن سے رخصت ہو گیا اور شباب بھی غم زدگی کے عالم میں منزل فنا کی جانب گامزن ہو گیا۔

پیام

065

عشق نے کر دیا تجھے ذوق تپش سے آشنا
 شان کرم پہ ہے مدار عشق گرہ کشائی کا
 صورت شمع نور کی ملتی نہیں قبا اسے
 تارے میں وہ، قمر میں وہ، جلوہ گرہ سحر میں وہ
 عشق بلند بال ہے رسم و رہ نیاز سے
 پیر مغال فرنگ کی سے کا نشاط ہے اثر
 بزم کو مثل شمع بزم حاصل سوز و ساز دے
 دیر و حرم کی قید کیا! جس کو وہ بے نیاز دے
 جس کو خدا نہ دہر میں گریہ جانگداز دے
 چشم نظارہ میں نہ تو سرمہ امتیاز دے
 حسن ہے مست ناز اگر تو بھی جواب ناز دے
 اس میں وہ کیف غم نہیں، مجھ کو تو خانہ ساز دے
 تجھ کو خبر نہیں ہے کیا؟ بزم کمن بدل گئی
 اب نہ خدا کے واسطے ان کو سے مجاز دے

*

① معنی: ذوق تپش: تڑپنے کی لذت۔

مطلب: اقبال کی یہ زیر تشریح اپنی ہیئت اور موضوعات کے حوالے سے زیادہ اہم نہیں اس لیے کہ اس نظم میں بھی انہوں نے ان مسائل کو سابقہ انداز میں دہرایا ہے جن کا تذکرہ وہ اپنی متعدد نظموں میں کر چکے ہیں۔ بہر حال وہ آغاز اس طرح کرتے ہیں کہ اے ہم نشیں! عشق نے تجھے سوز سے نوازا ہے لیکن تیری انفرادیت یہ ہونی چاہیے۔ شمع محفل کی طرح اپنے عہد کو روشنی عطا کر! مراد یہ کہ سوز عشق میں خود بٹلا ہونا کافی نہیں بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کیفیت سے دوسرے بھی استفادہ کر سکیں۔

② معنی: دیر و حرم: بیت خانہ اور مسجد۔

مطلب: عشق کو اگر مشکلات کا حل تصور کر لیا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ دولت رحمت خداوندی کی دین ہے۔ اس ضمن میں دیر و حرم کی پابندی نہیں بلکہ اسے تو وہی بے نیاز عطا کرتا ہے۔

③ شمع کو اگر شمع کی صورت میں نور کا لباس ملا ہے تو اس کی وجہ شمع کا جلنا ہے مراد یہ کہ کوئی بھی بلند مرتبہ تکلیف اٹھائے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

④ معنی: سرمہ امتیاز: امتیاز کا سرمہ۔

مطلب: ستارے، چاند اور طلوع سحر میں رب ذوالجلال کا جلوہ موجود ہے اس کے لیے کسی امتیاز کی ضرورت نہیں۔ دیکھنے والے کو اپنے رویے میں توازن پیدا کرنا چاہیے۔

⑤ معنی: رسم و رہ نیاز: عاجزی یا غلامی کا طریقہ۔

مطلب: عشق انسان کو عاجزی اور انکساری نہیں سکھاتا چنانچہ اگر حسن ناز و انداز، فخر و غرور کا حامل ہے تو اس کا جواب بھی اسی کے انداز میں دے۔

⑥ معنی: پیر مغال: مراد ہے بیخانہ کا مالک۔ نشاط: خوشی۔

مطلب: اے ساتی! یہ تسلیم کہ انگریزی تہذیب بظاہر مسرت و انبساط عطا کرتی ہے لیکن یہ امر ضروری

ہے کہ اب اپنی قومی تہذیب سے آشنا کر۔
 ⑦ اے ساتی! تجھ کو شاید اس امر کا ادراک نہیں کہ قدیم تہذیب بڑی حد تک تبدیل ہو چکی ہے لہذا ہمیں ظاہری باتوں کی بجائے جملہ حقائق سے پوری طرح آشنا کر۔

سوامی رام تیرتھ

066

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ جناب تو پہلے گوہر تھا، بنا اب گوہر نایاب تو
 آہ! کھولا کس ادا سے تو نے راز رنگ و بو میں ابھی تک ہوں اسیر امتیاز رنگ و بو
 مٹ کے غوغا زندگی کا شورش محشر بنا یہ شرارہ مجھ کے آتش خانہ آذر بنا
 نفی ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا لا کے دریا میں نماں موتی ہے لا اللہ کا
 چشم نایاب سے مخفی معنی انجام ہے تخم غنی جس دم تڑپ، سیما سیم خام ہے
 توڑ دیتا ہے بت ہستی کو ابراہیم عشق
 ہوش کا دارو ہے گویا مستی تنہم عشق

*

① سوامی رام تیرتھ، جن کا اصل نام تیرتھ رام تھا۔ علامہ اقبال کے سیا لکوٹی احباب میں سے تھے۔ حصول علم کے بعد وہ مشن ہائی سکول سیا لکوٹ میں پڑھاتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد مشن کالج لاہور میں آ گئے۔ چند سال بعد وہ ویدانت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ملازمت ترک کر دی۔ اس کے بعد ہفتوں دریائے راوی کے کنارے ریاضت الہی میں مصروف رہتے۔ بعد میں وہ دریائے گنگا میں ڈوب کر راوی ملک عدم ہوئے۔ اقبال کو ان کی موت کی خبر ملی تو زیر تشریح اشعار کہے۔ ملاحظہ ہوں۔

① معنی: ہم بغل، واصل۔ دریا: مراد ہے خدا۔ قطرۂ: مراد ہے انسان۔ گوہر: مراد ہے روح۔ غوغا: شور وغل۔ شورش محشر: قیامت کا ہنگامہ۔ لا: مراد اپنی اور کائنات کی نفی۔ تنہم: جنت کی ایک سرکام۔

مطلب: اے میرے ہمد و مونس! تو موت کے لیے کس قدر مضطرب تھا کہ دریا میں ڈوب کر جان دے دی۔ زندگی میں تو بے شک تو ایک موتی کی مانند تھا جب کہ موت کے بعد تو گوہر نایاب کی صورت اختیار کر گیا یعنی خالق حقیقی سے جا ملا۔ اپنے پردۂ وجود کو ختم کر کے تو نے اس کائنات کی حقیقت کو آشکار کر دیا جب کہ میں ابھی تک اس معیض میں اسیر رنگ و بو ہوں۔ اے یار ہمیشہ! تیری زندگی کا شور و غوغا اختتام پذیر ہوا تو عملاً قیامت کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بالفاظِ دیگر تیری زندگی کی چنگاری سے آذر کا آتشکدہ روشن ہو گیا۔ مراد یہ کہ اس طرح وفات پانے سے تیری اہمیت میں بے حد حساب اضافہ ہو گیا۔ جو شخص معرفت حق سے آگاہ ہو جاتا ہے اسے یہ باور کرنے میں تاخیر نہیں ہوتی کہ نفی کے بعد ہی اثبات کا مرحلہ آتا ہے۔ اپنے وجود کو مٹانے سے ہی رب ذوالجلال کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔ نایابا آنکھ کس طرح سے حقائق کے نتائج کا اندازہ کر سکتی ہے۔ اس کی مثال پارے کی مانند ہے کہ اس میں متحرک اور اضطراب ختم ہو جائے تو پارے کی بجائے محض کچی چاندی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ ماننا پڑے گا کہ یہ جذبہ عشق ہی ہے جو ہوش و خرد کے طلسم کو ختم کر کے انسان کو حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔

طلبہ علی گڑھ کالج کے نام

067

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
 طائرِ زیرِ دام کے نالے تو سن چکے ہو تم
 آتی تھی کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکون
 جذبِ حرم سے ہے فروغِ انجمنِ حجاز کا
 موت ہے عیشِ جاوداں، ذوقِ طلب اگر نہ ہو
 شمعِ سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا سزا!
 بادہ ہے نیمِ رس ابھی، شوق ہے نارسا ابھی
 رہنے دو خم کے سر پہ تم خشتِ کلیسا ابھی

*

① معنی: اوروں: دوسروں مراد اہلِ دانش۔ پیام: مراد عشق کا پیام۔

مطلب: اس نظم میں اقبال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں دوسرے شاعر، ادیب اور سیاسی رہنما تمہیں جو نصیحتیں کرتے رہے ہیں امرِ واقعہ یہ ہے کہ میرا پیغام ان سے قطعی مختلف ہے۔ اس لیے کہ میرے دل میں عشقِ حقیقی کا پیدا کردہ درد موجزن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا انداز بیان بھی دوسروں سے مختلف ہے۔

② قبل ازیں تم لوگ دراصل ایسے لوگوں کی باتیں سنتے رہے تھے جو ذہنی طور پر بھی انگریز کے غلام تھے۔ جب کہ میں تو ذہنی اور سیاسی بنیاد پر خود کو ہر طرح سے آزاد و خود مختار تصور کرتا ہوں چنانچہ تم سے جو کہتا ہے وہ ایک آزاد شاعر کے طور پر کہتا ہے۔

③ معنی: رازِ حیات: زندگی کی اصلیت۔ مورِ ناتواں: کمزور چیونٹی۔

مطلب: پہاڑ تو اپنی جگہ پر قائم و مجدد رہتا ہے اور وہ اسی کیفیت میں سکون و اطمینان محسوس کرتا ہے اس کے برعکس ایک انسانی کمزور چیونٹی کا رویہ پہاڑ سے بالکل مختلف ہے۔ وہ ہر لمحے حرکت میں رہتی ہے اس کے نزدیک حرکت ہی سکونِ قلب کا سبب بن سکتی ہے۔

④ معنی: جذبِ حرم: مراد ہے عشقِ رسول ﷺ۔ فروغ: آب و تاب۔ انجمنِ حجاز: ملتِ اسلامیہ۔

مطلب: اے عزیزِ طلباء! میری بات غور سے سنو کہ ملتِ مسلمہ کا تمام تردد و تاروا احترامِ کعبہ کی محبت اور عشق کے سبب ہے۔ اسی جذبے کے سبب یہ امر واضح ہو سکے گا کہ دوسری قوموں اور مذاہب کے مقابلے میں ملتِ اسلامیہ کا نظام کس قدر مختلف اور منفرد ہے۔ اقبال کہتا ہے چاہتے ہیں کہ تمہارا تعلق چونکہ اسلام سے ہے اس لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ اسی کی پیروی کی جائے۔ اور دوسرے ادیان کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کے باوجود خود اپنی راہ پر گامزن رہا جائے۔

⑤ یہ بھی جان لو کہ انسان کو مستقل "عیش و آرام کی زندگی میسر ہو اور آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی آرزو نہ ہو تو ایسی جلد و سکت زندگی موت سے بھی بدتر ہے۔ شراب کے پیالے کی گردش اور انسان کی گردش میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جام شراب کی گردش محض چند ہاتھوں تک محدود ہوتی ہے جب کہ انسان اسی نوع کی جدوجہد سے زندگی میں بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے۔

⑥ معنی: سوز، بمعنی عشق۔ نمکدہ نمود: مراد دنیا ہے۔

مطلب: شمع جو شب بھر جلتی رہی صبحدم بجھتے بجھتے زبان حال سے یہ پیغام دے گئی کہ زندگی کا ارتقاء اسی حقیقت میں مضمر ہے کہ انسان تمام عمر جدوجہد کرے خواہ اس کے لیے کتنے ہی دکھ اٹھانے پڑیں۔

⑦ معنی: بنارسا ابھی: ابھی پختگی پیدا نہیں ہوئی۔

مطلب: سرسید احمد خاں کے نظریات سے اتفاق کرتے ہوئے اقبال طلبہ سے کہتے ہیں کہ ابھی تمہیں اپنا مقصد حیات حاصل کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرنی چاہیے اور اس وقت تک انگریز سے تصادم ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب تک کہ ہر اعتبار سے تمہاری صفوں میں استحکام پیدا نہ ہو جائے۔

اختر صبح

068

ستارہ صبح کا روتا تھا اور یہ کہتا تھا! ملی نگاہ، مگر فرصت نظر نہ ملی
 ہوئی ہے زندہ دم آفتاب سے ہر شے اماں مجھی کو نہ دامن سحر نہ ملی!
 بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی
 نفس حجاب کا، تابندگی شرارے کی
 کہا یہ میں نے کہ اے زیور جنین سحر غم فنا ہے تجھے؟ مگنبد فلک سے اتر
 ٹپک بلندی گردوں سے ہمو شبہم مرے ریاض سخن کی فضا ہے جاں پرور
 میں باغباں ہوں محبت بہار ہے اس کی
 بنا مثال ابد پاسدار ہے اس کی

*

پہلا بند معنی: ستارہ صبح: صبح کا ستارہ جس کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے۔ بساط: حیثیت۔

مطلب: "بانگ درا" کی یہ مختصر نظم محض دو بند پر مشتمل ہے جس میں اقبال ستارہ صبح سے مکالمہ کرتے ہیں۔ اولین بند میں ستارہ صبح اپنی رو واد بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ خالق کائنات نے بے شک مجھے زندگی اور چمکنے کی صلاحیت تو عطا کی لیکن زندگی کے ان لمحات کو اس قدر محدود کر دیا کہ مناظر فطرت کا پوری طرح جائزہ لے سکوں۔ اس لیے کہ میرے طلوع ہونے کے محض چند لمحات کے بعد سورج اپنی تیز کرنوں کے ساتھ برآمد ہوا جس کے نتیجے میں میرا وجود دھندلا کر رہ گیا۔ ثابت ہوا کہ میری حیثیت بس اتنی ہی ہے جیسے کہ ہوا کسی پانی کے بلبلے میں مقید ہو یا ایک پنکھاری جو لمبے بھر کے لیے چمکے اور پھر بجھ کر رہ جائے۔

دوسرا بند معنی: زیور جبین سحر: صبح کی دہن کے ماتھے کا زیور۔ بنا: بنیاد۔

مطلب: اس بند میں اقبال ستارہ صبح کی شکایت کے جواب میں اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں بے شک تو صبح کی پیشانی پر جمو مگر کے مانند ہے اور طلوع آفتاب کے سبب تجھے اپنے فنا ہونے کا غم بھی ہے سو میرا مشورہ یہ ہے کہ آسمان سے نیچے اتر اور قطرہٴ شبنم کی طرح میرے باغِ سخن میں ٹپک پڑ کہ یہاں کی فضا بڑی پرسکون اور زندگی آمیز ہے۔ جان لے کہ میری شاعری روح میں بالیدگی پیدا کرنے کی موجب ہے۔ میں ایک ایسے باغبان کی مانند ہوں اور محبت کا جذبہ میری شاعری میں بہار کی حیثیت کا حامل ہے۔ جان لے کہ میرے گلستانِ سخن کو زوال نہیں اس کے برعکس اس کا وجود بیشکلی کا حامل ہے۔

حسن و عشق

069

جس طرح ذوقی ہے کشتی سیمیں قمر نور خورشید کے طوفان میں ہنگام سحر
جیسے ہو جاتا ہے گرم نور کا لے کر آئینہ چاندنی رات میں ستاب کا ہرنگ کنول
جلوہ طور میں جیسے یہ بیضائے کلیم موجہ گمت گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے سیل محبت میں یونہی دل میرا
تو جو محفل ہے تو ہنگامہ محفل ہوں میں حسن کی برق ہے تو عشق کا حاصل ہوں میں
تو سحر ہے تو مرے اشک ہیں شبنم تیری شام غربت ہوں اگر میں تو شفق تو میری
مرے دل میں تری زلفوں کی پریشانی ہے تری تصویر سے پیدا مری حیرانی ہے
حسن کامل ہے ترا عشق ہے کامل میرا
ہے مرے باغِ سخن کے لیے تو باد بہار میرے چنابِ تنخیل کو دیا تو نے قرار
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں
حسن سے عشق کی فطرت کو تحریک کمال تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نمال
قافلہ ہو گیا آسودہ منزل میرا

*

یہ نظم علامتین بند پر مشتمل ہے اس کے مفہوم تک رسائی کے لیے اس حقیقت کا ادراک لازم ہے کہ اقبال اپنے جذبہٴ عشق کے حوالے سے ان اشعار میں اپنے محبوب سے مکالمہ کرتے ہوئے حسن و عشق کی نفسیات کو واضح کرتے ہیں۔ حسب معمول اس نظم کو بھی انہوں نے خوبصورت امیجز کے ذریعے سنوارا ہے اور ایسے استعارے بھی وضع کیے ہیں جو اس عمدہ شاعری میں نئی جہت سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ نظم کے اولین بند میں اقبال یوں گویا ہوئے ہیں۔

پہلا بند معنی: کشتی سیمیں قمر: چاند کی چاندنی کی کشتی یعنی چاند۔ نور خورشید: سورج کی روشنی۔ ید بیضائے ہاتھ کی سفیدی۔ شمیم: خوشبو۔

مطلب: اے میرے محبوب! جس طرح طلوعِ سحر کے ہنگام سورج کی تیز روشنی میں چاند کی نسبتاً کم روشنی مدغم ہو کر رہ جاتی ہے، یا جیسے چاندنی رات میں کنول کا پھول اس کے ہم رنگ ہونے کے باعث

نظروں سے ادھل جاتا ہے یا جس طرح کوہ طور پر نور خداوندی کی وضو سے حضرت موسیٰؑ کا سفیدی مائل ہاتھ ایک طرح سے ناپید ہو جاتا ہے یا پھر جیسے طلوعِ سحر کے وقت گلستان میں پھولوں کی اجتماعی خوشبو ایک چھوٹے سے پھول کی انفرادی خوشبو کو اپنے واسن میں پیٹ لیتی ہے بالکل اسی طرح تیری محبت اور عشق میں میرے دل کا عالم ہے مراد یہ کہ میں اپنے وجود کو تیرے وجود میں ضم کر چکا ہوں۔

دوسرا بند مطلب: اے میرے محبوب! اگر تجھے ایک محفل تصور کر لیا جائے تو اس محفل کی رونق یقیناً میرے دم سے ہے۔ اگر تجھے بجلی سمجھ لیا جائے تو میری ذات ایک لپ یا بلب کی مانند ہے جو اس بجلی سے جلتا رہتا ہے۔ اگر تجھے صبح کا وقت سمجھ لیا جائے تو میرے آنسو اس لمحے تیرے لیے شبنم کی مانند ہوں گے۔ اس عالم غربت میں اگر میں شام کی حیثیت رکھتا ہوں تو تیرا وجود عملاً عشق کی طرح سے ہے۔ تیری منتشر زلفوں کی طرح میرا دل بھی مضطرب و پریشان رہتا ہے اور جب تیری تصویر کو دیکھتا ہوں تو اس میں بھی مجھے اپنی ہی کیفیت نظر آتی ہے۔ چنانچہ اگر تو اپنے حسن کو کامل سمجھتا ہے تو جان لے کہ میرا عشق بھی کامل ہے۔

تیسرا بند مطلب: اے محبوب! میری شاعری کے گلستان میں تیرا وجود موسمِ بہار کی ہوا کے مانند ہے۔ میرے تخیل میں جو بے چینی اور اضطراب تھا تیرے سبب اس میں ٹھنڈاؤ اور توازن پیدا ہوا۔ جب سے تیرا عشق میرے دل میں جاں گزین ہوا ہے اس دم سے میرے فن میں بھی نئی تخلیقی صلاحیتیں رونما ہونے لگی ہیں۔ مجھے اس حقیقت کا ادراک بھی ہوا کہ حسن کے بغیر عشق کی تکمیل کا کوئی امکان نہیں ہوتا تیرے سبب ہی میری آرزوؤں اور امیدوں کو فروغ ملا چنانچہ تجھے پاتے ہی میرا قافلہ منزل تک رسائی میں کامیاب ہو گیا۔

..... کی گود میں بلی دیکھ کر

070

رمز آغاز محبت کی بتا دی کس نے؟
نہلی آنکھوں سے نکلتی ہے زکات کیسی
کبھی اُٹھتی ہے، کبھی لیٹ کے سو جاتی ہے
نور آگاہی سے روشن تری پہچان ہے کیا؟
چڑھ ہے یا غصہ ہے یا پیار کا انداز ہے یہ؟
گر گیا پھول جو بیٹے کا تو ماریں گے تجھے
آہ! کیا تو بھی اسی چیز کی سودائی ہے؟
صورتِ دل ہے یہ ہر چیز کے باطن میں کیس
روح خورشید ہے، خونِ رگ متاب ہے عشق
نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی
کیس سلمانِ مسرت؟ کیس سازِ غم ہے!
کیس مگوہر ہے کیس اشک؟ کیس شبنم ہے

تجھ کو دزدیدہ نگاہی یہ سکھا دی کس نے؟
ہر ادا سے تری پیدا ہے محبت کیسی
دیکھتی ہے کبھی ان کو، کبھی شرابی ہے
آنکھ تیری صفتِ آئینہ حیران ہے کیا؟
مارتی ہے انہیں پونہچوں سے، عجب ناز ہے یہ
شوخی تو ہو گی، تو گودی سے اتاریں گے تجھے
کیا تجسس ہے تجھے؟ کس کی تمنائی ہے؟
خاص ازان سے کچھ حسن کا احساس نہیں
شیشہ و ہر نبی مانند نے تاب ہے عشق!
دل ہر ذرہ میں پوشیدہ کھک ہے اس کی
کیس سلمانِ مسرت؟ کیس سازِ غم ہے!
کیس مگوہر ہے کیس اشک؟ کیس شبنم ہے

*

زیر تشریح لقم کا مرکزی کردار اگرچہ بظاہر ایک بلی ہے لیکن اگر اس کے اشعار کو گہرائی میں جا کر اور لقم کے عنوان کو پیش نظر رکھ کر دیکھا جائے تو اقبال نے بالواسطہ طور پر یہاں اپنی محبوبہ کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ یہ لقم عطیہ فیضی کے بارے میں کہی گئی ہے۔

① معنی: دزدیدہ نگاہی: چوری چوری آنکھوں سے دیکھنا۔ ذکاوت: عظمندی۔ صفت آئندہ: آئندہ کی طرح۔

مطلب: اے بلی یہ تو جتنا تو جس طرح میری جانب کن انکھوں سے دیکھ رہی ہے نظارے کے اس انداز کی تربیت تجھے کس نے دی ہے یہ عمل تو آغاز محبت سے عبارت ہے۔ یوں بھی تیری ہر حرکت اور اداسے محبت کا اظہار ہو رہا ہے۔ تیری نیلی آنکھوں سے جس ذہانت کا اظہار ہو رہا ہے اس سے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آتی کہ تیرے دل میں کیا ہے۔ کبھی تو اپنی مالکہ کی جانب دیکھتی ہے اور کبھی شرمیلی نظروں سے میری طرف دیکھتی ہے۔ کسی لمحے گود میں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور کبھی یوں آنکھیں موند لیتی ہے جیسے محو خواب ہو۔

اے پیاری بلی! تیری آنکھیں تو آئینے کی طرح حیرت کا منظر پیش کر رہی ہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تو پس پردہ حقیقت سے پوری طرح سے آگاہی رکھتی ہے۔ اور مختلف انداز سے جس جذبے کا اظہار بھی کر رہی ہے۔ ناز و انداز کے اظہار کے تو نے یہ عجب طریقے سیکھے ہیں کہ کبھی اپنی مالکہ پر بچے آزماتی ہے کبھی خاموشی اختیار کر لیتی ہے۔ پتہ نہیں چلتا کہ یہ نفرت اور غصہ ہے یا محبت کا کوئی انداز! شاید تجھے معلوم نہیں کہ اس طرح کی شوخ ادائیں زیادہ دکھائے گی تو تیری مالکہ تجھے اپنی گود سے اتار پھینکے گی اور اگر اس کے سینے پر انکا بھول کر گیا تو تجھے اس کی سزا ملے گی۔

⑦ سے (11): معنی: تجسس: تلاش۔ دہر: دنیا۔

مطلب: نہ جانے تجھ کس شے کا تجسس ہے اور کس جذب کی تلاش ہے اور تیرے دل میں کوئی آرزو پوشیدہ ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ تو بھی میری طرح اس فرد کی شیدا کی ہے۔ جو میری محبوبہ ہے۔ لگتا ہے تیرے دماغ میں بھی جنون عشق کا سودا سایا ہوا ہے۔ تیرے رویے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عشق کا جذبہ صرف انسان کی ذات تک محدود نہیں بلکہ حیوانوں کو بھی ودیعت کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ ہر جاندار کے سینے میں دل موجود ہے اور جذبہ عشق کا مسکن دل ہی تو ہوتا ہے۔

میں اس حقیقت کا انکشاف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دل کو اگر بیانا نہ تصور کر لیا جائے تو جذبہ عشق اس پیانے میں شراب کے مانند ہے۔ عشق تو سورج کی روح کی مانند ہے اور چاند کی کرنوں سے بھی عبارت ہے۔ مٹی کے ہرزے میں دیکھا جائے تو عشق کی کک پوشیدہ ہے۔ یہ تو ایسا نور ہے جس کی جھلک ہر شے میں موجود ہے لیکن یہ اپنی متضاد خصوصیتوں میں کہیں مسرت کا سبب ہے کہیں غم و اندوہ کا! کہیں موتی ہے، کہیں آنسو اور کہیں شبنم ہے۔

071

کلی

جب دکھاتی ہے سحر عارض رنگیں اپنا کھول دیتی ہے کلی سینہ زریں اپنا
جلوہ آشام ہے یہ صبح کے میٹھے میں زندگی اس کی ہے خورشید کے پیمانے میں
سانے مر کے دل چر کے رکھ دیتی ہے
کس قدر سینہ شکافی کے مزے لیتی ہے
میرے خورشید! کبھی تو بھی اٹھا اپنی نقاب ہر نظارہ تڑپتی ہے نگاہ بے تاب
تیرے جلوہ کا نشین ہو مرے سینے میں عکس آباد ہو تیرا مرے آئینے میں
زندگی ہو ترا نظارہ مرے دل کے لیے روشنی ہو تری گوارہ مرے دل کے لیے
زہرہ زہرہ ہو مرا پھر طرب اندوز حیات ہو عیاں جو ہر اندیشہ میں پھر سوز حیات
اپنے خورشید کا نظارہ کروں دور سے میں صفت غنچہ ہم آغوش رہوں نور سے میں
جان مضطرب کی حقیقت کو نمایاں کر دوں
دل کے پوشیدہ خیالوں کو بھی عیاں کر دوں

*

پہلا حصہ: معنی: عارض: چہرہ۔ سینہ زریں: کلی کے اندر زرد رنگ کا مادہ 'مراد سنہرا۔ جلوہ آشام: مراد طالب جلوہ۔ سینہ شکافی: سینے کا کھلنا یا آناگی۔

مطلب: اس نظم میں کہا گیا کہ جس لمحے سحر اپنا عارض رنگیں دکھاتی ہے یعنی شب کے خاتمے پر صبح کا
چمکیلا روپ ظاہر ہوتا ہے تو اس روپ کو جذب کرنے کے لیے غنچہ چمکتا ہے اور پھول بن جاتا ہے۔ دیکھا
جائے تو یہ غنچہ صبح کے وقت حقیقی معنوں میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے اور طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنوں
سے اپنا دامن بھر لیتا ہے۔ یہ غنچہ سورج کے دروہ اپنا دل چہرے کے اس طرح سے رکھ دیتا ہے کہ عملاً سورج
کی کرنوں کے طفیل وہ سینہ شکافی کا لطف بھی اٹھاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ایک کلی علی الصبح طلوع آفتاب کے
لمحات میں چمک کر سورج کی کرنوں سے حقیقی معنوں میں یوں لطف اندوز ہوتی ہے کہ انبساط و مسرت سے
پھول بن جاتی ہے۔

دوسرا حصہ: معنی: جو ہر اندیشہ: قوت فکر۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال سورج کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کبھی تو بھی اپنی حقیقت سے مجھے
آگاہ کر کہ میری بیتاب نظرس تیرے نظارے کو تڑپتی رہتی ہیں۔ میری آرزو ہے کہ تو میرے سینے کے اندر
جلوہ افروز ہو جائے اور میرے دل کے آئینے میں تیرا عکس موجزن ہو جائے۔ تیرا نظارہ میرے دل کے لیے
روشنی کی مانند ہو اور یہی روشنی میرے دل کے لیے گوارہ بن جائے۔ اس صورت میں میری زندگی مسرت و
انبساط کی حامل ہو سکے گی تاکہ میری فکر اور سوچ کے ذریعے زندگی کا سوز عطا ہو۔ تو بے شک مجھ سے دور
چمکتا ہے پھر بھی میں تیرا نظارہ کرنے کا خواہاں ہوں اور غنچہ کی مانند تیری روشنی سے استفادہ کر سکوں۔ اس
صورت میں اپنی مضطرب زندگی کے حقائق و دوسروں پر نمایاں کر دوں گا اور جو خیالات میرے دل میں
پوشیدہ ہیں وہ بھی سامنے آجائیں گے۔

چاند اور تارے

072

ڈرتے ڈرتے دمِ سحر سے تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا چلنا چلنا
بیابان ہے اس جہاں کی ہر شے کہتے ہیں نئے سکون نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کش سفر سب تارے انسان شجر حجر سب
ہو گا کبھی ختم یہ سفر کیا؟
منزل کبھی آئے گی نظر کیا؟
کنے لگا چاند ہم نشینو! اے مزرع شب کے خوشہ چمنو!
جنش سے ہے زندگی جہاں کی یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہب زمانہ کھا کھا کے طلب کا آزیانہ
اس رو میں مقام بے محل ہے پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں! جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق انتہا حسن

*

اس نظم کے عملاً دو حصے ہیں جن میں ستاروں اور چاند کے مابین ایک مکالمہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ نظم ان انگریزی نظموں سے بڑی حد تک مماثلت رکھتی ہے جو فطرت کے مظاہر سے ہم آہنگ ہیں۔ زیر تشریح نظم کے ابتدائی حصے میں ستارے چاند سے یوں استفسار کرتے ہیں۔

پہلا حصہ: معنی: بیابان ہے، یعنی متحرک ہے۔

مطلب: طلوعِ سحر کے خدشے کے پیش نظر ستارے چاند سے پوچھتے ہیں کہ یہ تو بتا کہ ہم جو چمک چمک کر تھک چکے ہیں اس کے باوجود آسمان کے نظاروں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا کام تو صبح و شام گردش میں ہی رہتا ہے اور یہ سلسلہ نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔

اے چاند! اتنا بتا دے کہ اس عالم رنگ و بو کی ہر شے تغیر سے کیوں دوچار ہے۔ ان کے اضطراب میں کیوں نہیں آتی جسے سکون کما جاتا ہے۔ یہاں اس کو آنکھیں ترستی ہیں۔ یہاں تو ہر جانب سب لوگ سفر میں مبتلا رہتے ہیں۔ ہماری بات تو الگ رہی یہ انسان درخت اور پتھر سب ہی سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے رہتے ہیں۔ آخر اتنا تو ہمیں پتہ چلے کہ یہ سفر کبھی اور کسی مرحلے پر جا کر ختم بھی ہو گا اور کبھی ہم اپنی منزل مقصود کو بھی دیکھ سکیں گے یا نہیں! مراد یہ ہے کہ ستاروں کے الفاظ میں اس کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے کسی کو بھی سکون حاصل نہیں! سفر جاری ہے اور منزل ناپید!

دوسرا حصہ: معنی: مزرع شب: رات کی کھیتی۔ اشہب زمانہ: زمانے کا گمراہ۔ خرام کا حسن: یعنی

جدوجہد کا نتیجہ۔

مطلب: ان اشعار میں چاند جو بڑی خامشی کے ساتھ ستاروں کی باتیں سن رہا تھا یوں گویا ہوا کہ اے ہم نشینو! بے شک تم نے رات کی کھیتی سے فیض حاصل تو کیا لیکن میری بات غور سے سنو! کہ اس کائنات کا وجود تغیر اور حرکت میں ہی پوشیدہ ہے کہ یہی اس جہان کا قدیم اصول ہے۔ اس زمانے کو اگر گھوڑے سے تشبیہ دی جائے تو یوں سمجھو کہ گھوڑا خواہش کے چابک کھا کھا کر دوڑتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ضرورت عملاً زمانے کو حرکت میں رکھتی ہے۔ یہی اصول ازل سے چلا آ رہا ہے۔

چنانچہ منزل تک پہنچنے کے لیے جو مسافت مقرر ہے اس میں ٹھہرنے کا عمل بے موقعہ اور قطعی نامناسب ہے۔ اس لیے کہ کسی مقام پر ٹھہرے تو یوں سمجھ لو کہ مارے گئے۔ یعنی دوران سفر کہیں رکنا موت سے ہم کنار ہونے کے مترادف ہے۔ جو لوگ عازم سفر اور حرکت میں رہتے ہیں اور منزل کا تعین کر لیتے ہیں وہ ہمیشہ کامیاب و کامران رہتے ہیں اس کے برعکس جو مسافر راہ میں دم لینے کے لیے رک گئے انہیں عقب سے آنے والے روند کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ چنانچہ حرکت اور روانی ہی ہر شے کو بہاتی سنوارتی ہے۔ اسی عمل کو حسن سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ کائنات کی جملہ اشیا عشق کی بدولت حرکت میں رہتی ہیں اور آخر میں سنور کر حسن کا روپ و حار لیتی ہیں۔

وصال

073

جبتو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے

خوبی قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے

خود تڑپتا تھا، چمن والوں کو تڑپاتا تھا میں تجھ کو جب رنگیں نوا پاتا تھا، شرپاتا تھا میں

میرے پہلو میں دل مضطر نہ تھا، سیما تھا ارتکاب جرم الفت کے لیے بیتاب تھا

تا مرادی محفل گل میں مری مشور تھی! صبح میری آئینہ وار شب دبجور تھی

از نفس در سینہ خون گشتہ نشتر واشتم

زیر خاموشی نہاں غوغائے محشر واشتم

اب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں اہل گلشن پر گراں میری غزل خوانی نہیں

عشق کی گرمی سے شعلے بن گئے چھالے مرے کھیلے ہیں بھیلوں کے ساتھ اب نالے مرے

غائر الفت سے یہ خاک یہ آئینہ ہے اور آئینے میں عکس ہمدم دیرینہ ہے

قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی دل کے لٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی

ضو سے اس خورشید کی اختر مرا تابندہ ہے چاندنی جس کے غبار راہ سے شرمندہ ہے

ایک نظر کر دی و آداب فنا آموختی

اے خنک روزے کہ خاشاک مرا واسوختی

*

پہلا حصہ ① سے ⑤ معنی: گل: بھول۔ مراد محبوب۔ بلبل: مراد ہمدم دوست۔ سینہ خوں

گشتہ: خون سے لبریز سبز۔ غوغائے محشر: قیامت کا شور۔

مطلب: اس نظم میں اقبال پھول کی رعایت سے بلبل کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح تو پھول کے لیے مضطرب اور بے چین رہتا ہے اپنے محبوب و مطلوب کے لیے میں بھی اسی طرح مضطرب رہا ہوں۔ یہ میرے مقدر کی خوبی ہے کہ اب میرا مطلوب مجھے مل گیا ہے۔ اس کے بجز میں تو میں خود بھی تڑپتا رہتا تھا اور اپنے اشعار کے ذریعے دوسروں کو بھی مضطرب اور بے چین رکھتا تھا۔ محبوب کے وصال سے قبل میرے پہلو میں دل کی کیفیت پارے کے مانند تھی جو ہر لمحے تڑپتا رہتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ میرا دل ہمیشہ اپنے محبوب سے ملنے کے لیے بھڑا رہتا تھا۔ ان دنوں احباب میں میری نامرادی کا چرچا عام تھا۔ یہاں تک کہ میری صبح بھی اندھیری رات کے مانند تھی۔ ان لمحات میں میرے خون شدہ سینے میں سانس کی آدورفت اس نوعیت کی تھی جیسے کوئی نشتہ چلا رہا ہو۔ جب کہ میری خاموشی میں قیامت کے ہنگامے پوشیدہ تھے۔

زیر تشریح نظم کی تفصیل میں جانے سے قبل اس امر کی واضح طور پر نشاندہی کر دی گئی تھی بلبل جو پھول پر اپنی جان بچاؤ کرنے پر آمادہ رہتی ہے جب اس کی جدائی کے کرب سے آشنا ہونے سے اس کا ملاپ پھول سے ہوتا تو کس کی کیفیت سے دوچار ہوتی ہے۔ اقبال نے بھی اسی مماثلت سے اپنے محبوب کے فراق کے بعد وصال کی کیفیت کا خوبصورت انداز میں اظہار کیا ہے۔

دوسرا حصہ: معنی: غازہ: پاؤں۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال یوں گویا ہوتے ہیں کہ محبوب سے وصال کے بعد میرے آثار میں اضطراب و انتشار کی کیفیت ختم ہو گئی ہے جس کے نتیجے میں میرے اشعار میں وہ ثقافتی اور مسرت کا اظہار ہو رہا ہے کہ میرے احباب ماضی کی طرح پریشان ہونے کے برعکس ان اشعار سے بڑی حد تک لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ عشق کی حرارت سے میرے آبلوں میں حرارت پیدا ہو گئی ہے اور میرے نالے اب بھلیوں سے کھل رہے ہیں یعنی ان میں بجلی کی سی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ محبت کے جذبے نے میرے آئینہ دل میں چمک پیدا کر دی ہے جس میں محبوب کا عکس نمایاں ہو رہا ہے۔ عشق کی قید میں گرفتار ہوا تو میرے دلی جذبات کو حقیقی آزادی حاصل ہو گئی۔ میں نے اپنے دلی جذبات اپنے محبوب پر بھجوا کر دیئے تو یوں محسوس ہوا کہ میرا دیرین دل صحیح معنوں میں آباد ہو رہا ہے۔ یہ وصال ایک ایسے خورشید کی مانند ہے جو میرے جذبات کے ستاروں کو روشنی اور تابندگی عطا کر رہا ہے اور جس کی راہ میں سرگرداں غبار کے سبب خود روشنی بھی شمرساہو رہی ہے۔ آخری شعر فارسی زبان میں ہے جس میں محبوب سے مخاطب ہو کر اقبال کہتے ہیں کہ تو نے مجھ پر ایک نظر زوال کر عشق میں فنا ہونے کا طریقہ سکھا دیا ہے وہ لمحات خوب تھے۔ جب تیرے عشق نے میرے جسم کے خاشاک کو جلا کر خاک کر دیا تھا۔

سلیم

074

جس کی نمود دیکھی چشم ستارہ میں نے خورشید میں، قرمیں، تاروں کی انجمن میں

صوفی نے جس کو دل کے ظلمت کدہ میں پایا شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانگھن میں
جس کی چمک ہے پیدا جس کی ملک ہویدا شبنم کے موتیوں میں پھولوں کے پیرہن میں
صحرا کو ہے بایا جس نے سکوت بن کر ہنگامہ جس کے دم سے کاشانہ چمن میں
ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا
آنکھوں میں ہے سلیمی! تیری کمال اس کا

*

معنی: نمود: ظہور۔ چشم ستارہ میں: باہر فلکیات۔ ظلمت کدہ: اندھیری جگہ۔ پیرہن: کریم لباس۔
مطلب: یہ مختصری نظم اگرچہ محض پانچ اشعار پر مشتمل ہے اس کے باوجود گوناگوں خوبیوں کی حامل
ہے۔ نظم کی مرکزی کردار سلیمی بظاہر علامہ اقبال کی پسندیدہ خاتون ہے یا محبوبہ! اس کے بارے میں وثوق
کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن نظم کے اشعار میں باری تعالیٰ کی جو خصوصیات کائنات کے جملہ عناصر
میں نظر آتی ہیں وہ ان کے بقول سلیمی کی نیلی آنکھوں میں محفوظ ہیں۔
چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ وہ خالق کائنات جس کا جلوہ ستاروں کا نظارہ کرنے والی آنکھوں نے دیکھا۔
سورج، چاند اور تاروں کے جھمکنے میں غور سے دیکھیں تو وہی نظر آتا ہے۔ جس کو صوفی نے اپنے دل
کے ظلمت کدے میں پایا۔ اس کے علاوہ شاعر اس کے نور کو فطرت کے بانگھن میں محسوس کرتا ہے۔
وہ باری تعالیٰ جس کا جلوہ شبنم کے قطروں میں اور جس کی خوشبو پھولوں میں موجود ہے وہی جس نے
عالم سکوت میں صحرا میں اپنی ہستی بسائی ہوئی ہے اور جس کے وجود کے باعث کائنات میں ہمہ وقت ہنگامہ
اور رونق برقرار رہتی ہے۔ بے شک وہی ہے جس کا حسن دنیا کی ہر شے میں موجود ہے لیکن اسے سلیمی
تیری خوبصورت آنکھوں میں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے تمام کمالات کے ساتھ جلوہ فگن ہے۔
مراو یہ کہ جلوہ خداوندی کا مشاہدہ کرنا ہے تو پھر اسے پورے کمالات کے ساتھ سلیمی کی خوبصورت
آنکھوں میں دیکھنا چاہیے۔

عاشق ہرجائی

075-1

①

ہے عجب مجموعہ اعداؤ اے اقبال! تو
تیرے ہنگاموں سے اے دیوانہ رقص نوا!
ہم نشیں تاروں کا ہے تو رفعت پرواز سے
عین خنفلے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز
مثل بوئے گل لباس رنگ سے عریاں ہے تو
جانب منزل رواں بے نقش پا مانند موج
رواق ہنگامہ محفل بھی ہے، تما بھی ہے
زینت گلشن بھی ہے، آرائش صحرا بھی ہے
اے زمیں فرسا قدم تیرا فلک چٹا بھی ہے
کچھ ترے مسلک میں رنگ مشرب مینا بھی ہے
ہے تو حکمت آفریں، لیکن تجھے سودا بھی ہے
اور پھر افتادہ مثل ساحل دریا بھی ہے

حسن نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لیے
تیری ہستی کا ہے آئینِ تفسیر پر مدار
ہے سینوں میں وفا نا آشنا تیرا خطاب
اے لکون کیش! تو مشہور بھی، رسوا بھی ہے
لے کے آیا ہے جہاں میں عادت سیماں تو
تیری بیٹابی کے صدقے، ہے عجیب بیٹاب تو

(2)

075-2

عشق کی آشفگی نے کر دیا صحرا جسے
ہیں ہزاروں اس کے پہلو، رنگ ہر پہلو کا اور
دل نہیں شاعر کا، ہے کیفیتوں کی رستخیز
آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے
گو حسین تازہ ہے ہر لحظہ مقصود نظر
بے نیازی سے ہے پیدا میری فطرت کا نیاز
موجب تسکین تماشائے شرارِ جنتو
ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے نموش
جنتو کل کی لیے پھرتی ہے اجزا میں مجھے
زندگی الفت کی درد انجامیوں سے ہے مری
چ اگر پوچھے تو افلاس تخیل ہے وفا
فیض ساقی شبنم آسا، طرف دل دریا طلب
میچکو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
محفل ہستی میں جب ایسا تنگ جلوہ تھا حسن
دور بیابان طلب پیوستہ می کو شیم ما
موج بحریم و گلست خویش بردو شیم ما

*

زیر تشریح نظم ”عاشق ہرجائی“ خود علامہ اقبال کی اپنی شخصیت سے متعلق ہے جس میں علی الترتیب
دس اور پندرہ اشعار شامل ہیں۔ نظم کی تشریح سے قبل اس کے عنوان کے بارے میں یہ بتانا ضروری ہے
کہ ہرجائی عام طور پر برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس اعتبار سے اس عنوان کا مفہوم ”بے وفا
عاشق“ ہونا چاہیے۔ جب کہ یہاں اس لفظ کی بعض دوسری جہات بھی سامنے آتی ہیں جن کے تحت اس
کے معنی ہیں ہر جگہ موجود رہنے والا، ہر ایک سے تعلق رکھنے والا اور ایک ایسا شخص جو کسی ایک مقام سے
وابستہ نہ رہ سکے۔ اب نظم کے اولین حصے کے اشعار کی طرف آئیے۔

پہلا حصہ: ① سے ⑩ معنی: مجموعہ اصداد: ایسے اوصاف کا مجموعہ جو ایک دوسرے کی ضد
ہوں۔ زمیں فرسا: زمین پر چلنے پھرنے والا۔ مانند موج: لہر کی طرح۔ نفیض: گونا گونا گونی۔ جس میں فرسا: پیشانی
مچکنے والی۔ تلون کیش: دم شخص جو اپنے انداز بدلتا رہے۔

مطلب: اس بند کے اشعار سے بظاہر یہ تاثر ملتا ہے کہ کوئی اور شخص اقبال سے اس کی ذات اور ان کی خصوصیت کے بارے میں استفسار کر رہا ہے لیکن خیال یہی ہے کہ نظم کے پہلے حصے میں اقبال خود ہی اپنے آپ سے مکالمہ کر رہے ہیں جب کہ دوسرے حصے میں ان استفسارات کے جواب دیتے ہیں جو پہلے حصے میں اٹھائے گئے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ اے اقبال! یوں محسوس ہوتا ہے کہ تو متضاد صفات کا حامل ہے۔ کبھی تو پوری محفل کی رونق تیرے دم سے ہے اور کبھی تنہائی کا شکار نظر آتا ہے۔ تیرے نعروں نے وہ ہنگامے برپا کیے ہیں جن کے سبب خواہ گلستان ہو خواہ صحرا دونوں میں ہمارا آئی ہوئی ہے۔ تیرے تخیل کی بلندی نے عملاً تجھے فلک پر درخشندہ ستاروں کا ہم پلہ بنا دیا ہے۔ ہر چند کہ تیری بود و باش تو زمین پر ہی اس کے باوجود آسمانوں تک بھی تیری رسائی ہے۔ تو شراب پیتا ہے اور اسی عالم میں حیرت ہے کہ خالق حقیقی کے حضور سجدہ ریز بھی ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تیرے مسلک میں شراب حرام نہیں بلکہ حلال ہے۔

جس طرح پھول کی خوشبو کسی رنگ اور لباس کی محتاج نہیں کچھ ایسی ہی کیفیت تیری بھی ہے۔ اگرچہ تیرا وجود حکمت و دانش سے بہرہ ور ہے۔ اس کے باوجود تیری شخصیت میں کچھ جنوں کے آثار بھی ہیں جس طرح پانی کی لہر اپنا کوئی نشان چھوڑے بغیر رواں دواں رہتی ہے اسی طرح تو بھی منزل کی طرف رواں ہے لیکن تمام تر حرکت کے باوجود دریا کے کنارے ایک ہی مقام پر ٹھہرا ہوا بھی ہے۔

تیری فطرت کے لیے حسن نسوانی بجلی کی مانند کشش انگیز ہے۔ اس کے باوجود اس حسن کے لیے تیرے دل میں بے نیازی کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے جو کسی روائتی عاشق کے رویے سے قطعی مختلف ہے۔ تیری زندگی کا انحصار عملی سطح پر تغیر اور انقلاب سے ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص کسی ایک مقام اور آستانے سے وابستہ نہیں ہو سکتا۔ حیوان کی بزم میں تجھے ایک ایسے فرد کی مانند گروانا جاتا ہے جو وفا سے نا آشنا ہوتا ہو۔ یہی نہیں بلکہ تجھے بے وفا کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔ تجھ میں مستقل مزاجی نام کو نہیں۔ اسی باعث تو ہر جگہ بدنام اور رسوا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ تو اس عالم رنگ و بو میں پارے کی سی صفات لے کر آیا ہے۔ تیری مضطرب کیفیت کے قربان جائیے! بے شک تو عجب بے چین اور بے تاب انسان واقع ہوا ہے۔

دوسرا حصہ: ① سے ⑦ معنی: آشفلی: پریشانی۔ رستخیز: قیامت۔ شرار جستہ: تڑپ کر اچھلنے والی چنگاری۔

مطلب: جیسا کہ اس نظم کے ابتدائی حصے میں بتایا گیا ہے کہ دوسرے حصے میں اقبال ان استفسارات کا جواب دیتے ہیں جو پہلے حصے میں موجود ہیں۔ فرماتے ہیں کہ عشق کی آشفہ سری نے میری شخصیت کو دیران و برباد کر کے رکھ دیا ہے اور سچ پوچھنے کو زیر لباس جو جسم چھپا ہوا ہے وہ گوشت پوست کا نہیں بلکہ مٹی کا ہے۔ میرے دل کے اسی طرح بے شمار پہلو ہیں اور ہر پہلو کا رنگ ایک ترشے ہوئے ہیرے کے رنگوں کی مانند ہیں کہ یہ رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

دیکھا جائے تو شاعر کا دل عملاً دل نہیں ہوتا بلکہ یہ تو ایک طرح سے جذبات و احساسات کے ہنگاموں کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ اے بے خبر! تجھے کیا پتہ کہ اس سینے میں کیا ہے؟ دل یا کوئی اور شے! کہ یہ سکون سے بالکل بے گانہ ہے۔ میری ہر کیفیت میں ایک نئے جلوے کی آرزو پوشیدہ ہے۔ یہی باعث ہے کہ میرا دل

بے چین رہتا ہے۔ یہی بے چینی میرا سکون برباد کیے ہوئے ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ میرے پیش نظر عام طور پر ایک نیا منظر حسن ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود یہ امر بھی واضح ہے کہ میں نے ہمیشہ حسن سے جو پیمانہ وفا باندھا ہوتا ہے وہ ہمیشہ مستحکم ہوتا ہے۔

یہ بھی سن لو کہ میرے حوالے سے جس شے کو بے نیازی کہا جاتا ہے وہی تو میری فطرت میں عجز و انکسار کی آئینہ دار ہے۔ جس طرح صاحبِ تجسس اردو سوز و ساز کی آئینہ دار ہوتی ہے میرے دل کا عالم بھی ایسا ہی ہے۔ لمحے بھر کے لیے لودینے والی چنگاری کا نظارہ میرے لیے کسی طور پر بھی سکون کا سبب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ میرا دل تو بجلی کی صلاحیتوں سے پوری طرح آگاہ ہے جو کسی بھی شے کو خاکستر بنا دینے کی قدرت رکھتی ہے۔

⑧ سے (15) معنی : درد انجامیوں : وہ کیفیت جس کی انتہا درد ہے۔ افلاس تخیل : خیال کی ناداری۔ شبنم آسا : شبنم کی مانند۔ تنک جلوہ : خفیف جھلک دکھانے والا۔

مطلب : اس شعر میں اقبال یوں گویا ہوتے ہیں کہ میں اس مکمل جلوے کے دیکھنے کا متمنی ہوں جس کو دیکھنے کے بعد عشق کا ہر تقاضا پورا ہو جائے۔ باری تعالیٰ کے جلوے کی تلاش و جستجو مجھے دنیا کی مختلف اشیاء میں جھانکنے کی طرف مائل کرتی ہے اور جس طرح حسن کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہوتی بالکل یہی کیفیت میرے دل کے درد کی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس درد کا کوئی علاج نہیں۔

چونکہ میری پوری زندگی محبت کی ناکامیوں کے درد سے عبارت ہے اس لیے یہ امر قطعی حیرت انگیز نہیں ہونا چاہیے کہ میں اپنے عشق کو وفا کی پابندیوں میں محصور نہ کروں۔ اس امر کی وضاحت وہ زیرِ تشریح شعر میں یوں کرتے ہیں کہ حقیقت تو یہ ہے کہ وفا عملی سطح پر تخیل کے افلاس کا دوسرا نام ہے اور میرا تخیل چونکہ مفلس نہیں اس لیے میں اپنے دل میں ہر لمحے ایک نیا بنگامہ ہمارا رکھتا ہوں۔

میرا دل تو اس قدر وسیع الطرف ہے کہ اس میں دریا بھی ساکتے ہیں جب کہ میرا ساقی جو شراب دے رہا ہے اس کی مقدار نہایت معمولی سی ہے جب کہ میں تو ایک ازلی پیاسا ہوں۔ یوں لگتا ہے میرے پیروں تلے آگ کا سمندر ہے۔ دراصل میری تخلیق کے باعث دیکھا جائے باری تعالیٰ نے خود ہی اپنا نقاد پیدا کر لیا ہے۔ میں تو فی الواقع ایک ایسی تصویر ہوں جسے اپنے مصور سے گلا ہے کہ جب اس دنیا میں حسن کا جلوہ آتا ہی محدود تھا تو پھر مجھے وہ فکر و تخیل کیوں دے جن کی پرواز کی کوئی حد نہیں ہے۔ میں تو تلاش و جستجو کے صحرائ میں مسلسل جدوجہد میں مصروف ہوں اور سمندر کی موجوں کی طرح اپنی ٹکست کا سامان خود اپنے کانڈھوں پر اٹھائے پھرتا ہوں۔

کوشش ناتمام

076

فرقت آفتاب میں کھاتی ہے بیچ و تاب صبح
چشمِ شفق ہے خوں فشاں اخترِ شام کے لیے
رہتی ہے فیس روز کو لہنی شام کی ہوس
اخترِ صبح مضطرب تابِ دوام کے لیے
کہتا تھا قطب آسمان قافلہ نجوم سے
مہربو! میں ترس گیا لطفِ خرام کے لیے

سوتوں کو ندیوں کا شوق بحر کاندیوں کو عشق! موج بحر کو تپش ماہ تمام کے لیے
 حسن ازل کہ پردہ لالہ و گل میں ہے نہاں کہتے ہیں بے قرار ہے جلوہ عام کے لیے
 راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے
 زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

*

یہ مختصر نظم محض چھ اشعار پر مشتمل ہے۔ تاہم اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اقبال نے اپنی مخصوص
 انجیری استعمال کرتے ہوئے موجودات اور ان کی نفسیاتی کیفیت کے بارے میں بعض رازہائے سرستہ
 کھولے ہیں جن سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر شے تلاش و جستجو اور حرکت و عشق کے سبب زندہ
 ہے۔

معنی: فرقت آفتاب: سورج کی جدائی۔ خوں فشاں: خون روتی ہے۔ تاب دوام: بیش کی چمک۔
 لطف خرام: چلنے کا مزہ۔ خجستہ گام: مبارک قدم والا۔

مطلب: چنانچہ زیر تشریح اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ سحر آفتاب عالمناپ کی جدائی میں بے چین و
 مضطرب رہتی ہے اور چشم شفق ستارہ شام کے فراق میں خون کے آنسو بہاتی ہے۔ اگر دن کے وقت کو
 مجنوں اور شام کو لیلیٰ تصور کر لیا جائے تو یہ مجنوں اپنی لیلیٰ کو پانے کا خواہاں رہتا ہے۔ جب کہ ستارہ صبح جو
 تھوڑی دیر کے لیے چمکتا ہے بیش زندہ رہنے اور چمکنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔

قطب ستارہ و آسمان پر ایک ہی مقام پر چمکتا رہتا ہے۔ زبان حال سے دوسرے ستاروں سے کہتا ہے
 کہ میں تو کھڑے کھڑے ٹھک گیا ہوں اور چلنے کا لطف حاصل کرنے کے لیے بری طرح سے ترس رہا
 ہوں۔ جیسے ندیوں تک پہنچنے اور ندیاں سمندر میں شامل ہونے کے عشق میں جھلا رہتی ہیں جب کہ سمندر
 کی موجیں چودھویں رات کے چاند کی منتظر رہتی ہیں۔ حسن ازل جو لالہ و گل اور دوسرے مظاہر فطرت
 میں پوشیدہ ہے۔ سنا ہے کہ اپنا جلوہ دکھانے کے لیے مضطرب ہیں۔ اس صورت حال میں اگر کوئی رازہائے
 زندگی سے آشنا ہونا چاہے تو حضرت خضر سے رجوع کرے۔ وہ یہی جواب دیں گے کہ زندگی کا راز تلاش و
 جستجو اور حرکت و عشق میں مضمر ہے۔

نوائے غم

077

زندگانی ہے مری مثل رباب خاموش جس کی ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش
 بربط کون و مکان جس کی خموشی یہ غار جس کے ہر تار میں ہیں سیکڑوں نغموں کے مزار
 محشرستان نوا کا ہے امیں جس کا سکوت اور منت کش ہنگامہ نہیں جس کا سکوت
 آہ! امید محبت کی بر آئی نہ کبھی!
 چوٹ مضرب کی اس ساز نے کھائی نہ کبھی
 سر آئی ہے نیم چمن طور کبھی! سمت گردوں سے ہوائے نفس حور کبھی

چھڑا ہستہ سے دیتی ہے مرا تارِ حیات جس سے ہوتی ہے رہا روح گرفتارِ حیات
نغمہ یاس کی دھیمی سی صدا اٹھتی ہے اشک کے قافلے کو بانگِ دریا اٹھتی ہے
جس طرح رفعتِ شبنم ہے مذاقِ رم سے
میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے



پہلا بند معنی: رباب: سارنگی کی قسم کا ایک ساز۔ بربط: ایک ساز۔ محشرستان: نفوس کی قیامت گاہ۔
منت کش: احسان مند۔ مضرب: ساز بجانے کا آلہ۔

مطلب: دوبند کی اس مختصر نظم میں اقبال اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری زندگی اس
رباب کے مانند ہے جو بظاہر خاموش ہے لیکن جس کے تاروں میں ہر انداز کے نغمے پوشیدہ ہیں اور جس کی
خاموشی پر کائنات کا وہ ساز بھی تار ہے جس کا ہر سرول ہنگی کا آئینہ دار ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس ساز کی
خوشی بھی ایسی نواؤں کی مظہر ہے جو اہل دل کے سینے میں حشر ہوا کر دیتی ہیں اور جن کی خاموشی کسی ہنگامے
کی آئینہ دار نہیں ہے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ میں نے محبت کی جو آرزو کی وہ کبھی شرمندہء محکمل نہ ہو سکی
اور میرے قلب پر کبھی اس جذبے نے کوئی زخم نہیں لگایا۔

دوسرا بند معنی: بانگِ دریا: قافلہ کی ٹھنی کی آواز۔ مذاقِ رم: اڑ جانے کا ذوق۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ محبت کے جذبے سے محرومی کے باوجود کبھی کبھی طور سینا سے
عشقِ حقیقی کی ایک لہر میرے دل کے دروازے تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح آسمان کی جانب سے حوروں
کے انفاس کی معطر ہوا کی جھٹکے تک رسائی ہو جاتی ہے۔ یہ سب مل کر قدرے آہستگی کے ساتھ میری زندگی
کے تار چھیڑ دیتی ہیں جس کے سبب زندگی کے دامن میں گرفتارِ روح آزاد ہو جاتی ہے۔ اس لمحے غم و اندوہ
میں ڈوبی ہوئی ایک دھیمی سی آواز بلند ہوتی ہے۔ اس آواز کو سن کر میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے
ہیں۔

چنانچہ دیکھا جائے تو جس طرح شبنم کے مرتبے کی بلندی سزاوارِ حرکت سے وابستہ ہے اسی طرح
مایوسی اور ناعرادی میری فطرت کے لیے ہمیشہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

عشرتِ امروز

078

نہ کھنچ نقشہ کیفیت شرابِ طہور نہ مجھ سے کہہ کہ اجل ہے پیامِ عیش و سرور
پری کو شیشہ الفاظ میں اتار نہ تو فراقِ حور میں ہو غم سے ہمکنار نہ تو
بیانِ حور نہ کر، ذکرِ سلسبیل نہ کر مجھے فریفتہ ساقیِ جمیل نہ کر
شباب کے لیے موزوں ترا پیامِ نہیں مقامِ امن ہے جنت، مجھے کلامِ نہیں
وہ عیش، عیش نہیں جس کا انتظار رہے شبابِ آہ! کہاں تک امیدوار رہے

وہ حسن کیا کہ جو محتاج چشم بینا ہو نمود کے لیے منت پذیر فروا ہو
 عجیب چیز ہے احساس زندگانی کا
 عقیدہ ”عشرت امروز“ ہے جوانی کا

•

معنی : شراب طہور : پاک شراب جو بہشت میں ملے گی۔ فراق حور : حور کی جدائی۔ سلسبیل : بہشت کی ایک نہر۔

مطلب : سات اشعار پر مشتمل اس مختصر نظم میں واعظ کو خطاب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ تو میرے سامنے حیات بعد ممات کا جو نقشہ پیش کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ موت تو فی الواقع عیش و عشرت کا پیغام ہے۔ اس کے ساتھ ہی تو مجھے شراب طہور کا جھانسہ بھی دے رہا ہے کہ جنت میں پینے پلانے پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ اور یہ کہ شراب طہور میں وہ نشہ ہے جو دوسری شرابوں میں نہیں۔

سوائے واعظ ! میں تجھ سے واضح طور پر یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ جنت کی حور کے تصور اور اس کی جدائی میں خود کو مایوسی کے کرب میں گرفتار نہ کر ! ساتھ ہی دوسروں کے لیے اس پری کو لفاعلی شیشے میں نہ اتار ! اے واعظ ! مجھے اس خیالی اور تصوراتی حسین و جمیل ساتی کے تذکرے میں نہ الجھا۔ نہ میرے روبرو حوروں کا تذکرہ کر۔ نا ہی جنت میں موجود اس نہر کا جسے سلسبیل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

بے شک مجھے اس خیال سے اختلاف نہیں کہ جنت میں ہر طرح سے امن و امان ہو گا اور دنیا کی طرح ہنگامے نہیں ہوں گے لیکن اے واعظ ! تیری یہ خوش کلامیاں عالم شباب کے لیے ناقابل التفات ہیں کہ جوانی کے نزدیک وہ عیش کوئی حیثیت نہیں رکھتا جس کے لیے موت کے بعد تک کا انتظار کرنا پڑے۔ شباب کا عقیدہ تو یہ ہے کہ عیش و عشرت وہی ہے جو انسان کو آج حاصل ہو۔ شباب آخر کتنے عرصے تک حور و شراب اور ساتی کا انتظار کر سکتا ہے اس کے لیے تو عیش و عشرت وہی ہے جو اسے کسی انتظار کے بغیر حاصل ہو جائے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے واعظ ! یہ تو بتا کہ اس حسن کی حیثیت کیا ہے جو کسی دیکھنے والی آنکھ کا محتاج ہو اور اپنے وجود کے اظہار کی خاطر مستقبل کا احسان اٹھانے پر مجبور ہو۔ جب کہ میں تو اس حسن کا قائل ہوں جس کو آج میری نگاہیں دیکھ رہی ہوں۔

زندگانی کا احساس تو اس مفروضے سے قطعی مختلف ہے جس کا اظہار اے واعظ تو ہمارے روبرو ہزار بار کر چکا ہے اس لیے کہ میرے نزدیک تو شباب اس عقیدے کا حامل ہے کہ جو کچھ ملتا ہے آج مل جائے کل کا انتظار کون کرے۔

ان اشعار میں بظاہر اقبال نے حیات بعد ممات کے عقیدے کی نفی کی ہے۔ جنت حور و غلمان اور شراب طہور کے بارے میں واعظ کو طفر کا نشانہ بنایا ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسے فرد کے جذبات کا اظہار کیا ہے کہ جو عالم شباب میں ہے۔ اس کا نقطہ نظر واعظ سے خیالات سے کسی طور پر بھی ہم آہنگ نہیں۔ وہ تو زندگی میں اس امر کا قائل ہے کہ عالم شباب میں ہی حقیقی لطف سے ہمکنار ہوا جاسکتا ہے۔

انسان

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے
انسان کو راز جو بتایا! راز اس کی نگاہ سے چھپایا
ذوق آگہی کا کھلا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے؟
گرم خرام موج دریا دریا سوئے بحر جاہ پیا
باہل کو ہوا ازا ری ہے شانوں پہ اٹھائے لا ری ہے
تارے مست شراب تقدیر زندان فلک میں پابہ زنجیر
خوشید وہ عابد سحر خیز لالے والا پیام "برخیز"
مغرب کی پہاڑیوں میں چھپ کر پتا ہے ہے شوق کا ساغر
لذت کمر وجود مر شے سرمست سے نمود ہر شے
کوئی نہیں غمگسار انسان!
کیا تلخ ہے روزگار انسان!



معنی: راز جو: بھید تلاش کرنے والا۔ گرم خرام: پٹے میں گن۔ جاہ پیا: جا رہا ہے۔ پابہ زنجیر: پاؤں میں زنجیر پئی ہوئی ہے۔ لذت گیر: مزے لینا۔

مطلب: اقبال کی شاعری اور ان کے تصورات میں یہ امر ایک طرح سے بنیادی حیثیت کا حامل نظر آتا ہے کہ وہ بے شمار مقامات پر رب ذوالجلال سے گلہ مند نظر آتے ہیں لیکن اس گلہ مندی میں ایک طرح سے اپنائیت کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ اس رویے کو تصوف کے حوالے سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ ہر حال یہ مقام اس موضوع پر کسی تفصیلی بحث کا نہیں۔ اسی حوالے سے زیر تشریح نظم بھی دیکھیے جس میں قدرت سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

اے خدائے عز و جل! اس سے زیادہ انسان پر ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کو کائنات کے اسرار و رموز سے واقفیت کے لیے اس میں تحقیق و جستجو کا مادہ پیدا کیا دوسری طرف کائنات کے تمام اسرار کو بھی پردہ غیب میں رکھا۔ اب جو میں ان بھیدوں کو جاننے کے لیے مضطرب ہوں اس کے باوجود یہ بھید مجھ پر نہیں کھلتے تو مجھے اپنی جستجو کی ابتداء اور انجام پر حیرانی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ یہ کائنات تو ایک طرح سے شیشے کا گھر ہے جس میں وہی کچھ نظر آتا ہے جو اس کے سامنے ہو! یہی وجہ ہے کہ کائنات کے تمام راز انسان کی حیرانی کا سبب ہیں۔

بظاہر کائنات کے مناظر اور ان کی صورت حال یہ ہے کہ دریا کی لہریں تیز رفتاری کے ساتھ محو سفر ہیں اور دریا جو ہے وہ اسی رفتار سے سمندر کی جانب گامزن ہے۔ فضاء میں موجود بادلوں کو ہوا اڑا کر بلندی پر لاری ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے انہیں اس نے اپنے شانوں پر اٹھایا ہوا ہے۔ آسمان پر ستارے اس انداز

سے روشن ہیں جو ازل سے ان کے لیے مقدر ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آسمان ایک قید خانہ ہے جس میں ستاروں کو قید کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ اور ان کے پاؤں میں زنجیریں پڑی ہوئی ہیں۔

سورج جو علی الصبح ایک طرح سے کسی عبادت گزار کی طرح طلوع ہوتا ہے اور تمام عالم موجودات کے لیے مصروف کار ہونے کا پیغام لاتا ہے اس کا مقدر یہ ہے کہ شام کو مغرب کی پناہوں میں چھپ کر شفق کے جام سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ مراویہ کہ غروب آفتاب کے بعد مغرب سے شفق نمودار ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہر شے اپنے وجود سے لطف اندوز ہو رہی ہے اور مسرور سرشار ہو کر خود کو ظاہر کرنے کے عمل میں ہے۔

ان تمام حقائق کے پیش نظر کائنات میں صرف انسان ہی ایسی شے ہے جس کا کوئی ہمدرد و همگسار نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شب و روز کس قدر تلخ واقع ہوئے ہیں۔

جلوۂ حسن

080

جلوۂ حسن کہ ہے جس سے تمنا بے تاب
ابدی بنتا ہے یہ عالم فانی جس سے
جو سکھاتا ہے ہمیں سر بہ گریباں ہونا
دور ہو جاتی ہے اور اک کی غای جس سے
پالتا ہے جسے آغوش تخیل میں شباب
ایک افسانہ رنگیں ہے جوانی جس سے
منظر عالم حاضر سے گریزاں ہونا
عقل کرتی ہے تاثر کی غلای جس سے
آہ موجود بھی وہ حسن کیسے ہے کہ نہیں؟
خاتم دہر میں یا رب وہ رنگیں ہے کہ نہیں؟

*

معنی: سر بہ گریباں: گریباں میں سر ڈالنا۔ اور اک: عقل۔

مطلب: یہ مختصر سی نظم محض پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں علامہ اقبال کے مختلف عناصر میں جلوۂ حسن کی موجودگی کے حوالے سے ایک ایسا نتیجہ اخذ کرتے ہیں جو بڑی حد تک تذبذب اور تضاد کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ ہر چند کہ بعض عناصر میں اس کے وجود کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اس کے باوجود وہ کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچتے۔ اقبال کہتے ہیں۔

جلوۂ حسن جو ہماری آرزوؤں اور خواہشات کو مضطرب رکھتا ہے جس کی پرورش کی زے داری جوانی نے اپنے تخیل کی آغوش میں لی ہوئی ہے اور جس کے سبب یہ عالم فانی ابدی حیثیت اختیار کیے ہوئے نظر آتا ہے اور جس کے نام سے شباب بذات خود ایک رنگین افسانے کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے یہی جلوۂ حسن جو ہمیں مختلف مسائل کے بارے میں غور و فکر کرنا سکھاتا ہے اور جس کے سبب ہم اپنے حال اور اس کے مسائل سے کٹ کر رہ جاتے ہیں اور جو ہماری سوجھ بوجھ اور عقل کی خامیوں کو دور کرتا ہے اور جس کی وجہ سے عقل و خرد عملاً تاثر و احساسات کے تابع ہو کر رہ جاتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اسی جلوۂ حسن کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچ رہا ہوں کہ کیا وہ حسن موجود بھی ہے یا نہیں؟ اور اگر دنیا کو انگوٹھی اور جلوۂ حسن کو نگینہ تصور کر لیا جائے تو انگوٹھی میں یہ نگینہ موجود بھی ہے یا نہیں۔

081

ایک شام

(دریائے نیکر ہائیڈل برگ) کے کنارے پر

خاموش ہے چاندنی قمر کی شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
 وادی کے نوا فردش خاموش کسار کے سبز پوش خاموش
 فطرت بیہوش ہو گئی ہے آغوش میں شب کے سو گئی ہے
 کچھ ایسا سکوت کا فسون ہے نیکر کا خرام بھی سکون ہے
 تاروں کا خموش کارواں ہے یہ قافلہ بے درا رواں ہے
 خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا قدرت ہے مراقبے میں گویا
 اے دل! تو بھی خموش ہو جا
 آغوش میں غم کو لے کے سو جا

*

یہ نظم اقبال نے جرمنی میں ان دنوں لکھی جب وہ 1907ء میں وہاں فلسفے کے مضمون میں بی ایچ ڈی کرنے گئے تھے۔ میونخ سے وہ ہائیڈل برگ چند روز کے لیے یوں گئے کہ وہاں کے کتب خانے سے استفادہ کر سکیں۔ دریائے نیکر بھی ہائیڈل برگ کے گرد و نواح میں بہتا ہے۔ اسی دریا کے کنارے پر بیٹھ کر اقبال نے یہ اشعار کہے۔

معنی: نوا فروش: نغمے گانے والے یعنی پرندے۔ سبز پوش: مراد درخت۔ بے درا: بھٹی کے آواز کے بغیر۔ مراقبے: گیان و حیان۔

مطلب: فرماتے ہیں کہ عجب منظر ہے۔ چاند کی چاندنی خاموش ہے اور دریا کے کنارے جو درخت استلذہ ہیں ان کی شاخیں بھی ساکن و ساکت ہیں۔ اس وادی کے تمام چرند پرند اور سانے پہاڑوں پر اگے ہوئے تمام سرسبز و شاداب پودے بھی اس طرح خاموشی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں جیسے تمام مظاہر فطرت اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکے ہوں۔ فطرت شاید مدہوش ہو کر رات کی گود میں سو رہی ہے۔

اس خاموشی کا جاوود کچھ ایسے چل رہا ہے کہ دریائے نیکر کا بہتا ہوا رواں دواں پانی بھی خاموش نظر آتا ہے۔ آسمان پر ستاروں کا قافلہ انتہائی خاموشی کے ساتھ رواں دواں ہے اور کسی شور و شغب کے بغیر اپنی منزل کی جانب گامزن ہے۔ اس وادی کے پہاڑ، صحرا اور دریا اس طرح سے خاموش نظر آتے ہیں کہ ان کی خاموشی سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے فطرت نہایت انہماک کے ساتھ گیان و حیان اور غور و فکر میں مصروف ہے۔ اس صورت حال میں اقبال اپنے دل کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ یہاں کہ جملہ عناصر کی طرح تو بھی خاموش ہو جا اور غم کی آغوش میں سو جا۔

تنہائی

082

تنہائی شب میں ہے حزیں کیا؟ انجم نہیں تیرے ہنسیں کیا؟
 یہ رفعت آسمان خاموش خوابیدہ زمیں، جہان خاموش
 یہ چاند، نہ دشت و در، یہ کسار فطرت ہے تمام نسرین زار
 موتی خوش رنگ پیارے پیارے یعنی ترے آنسوؤں کے تارے
 کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل!
 قدرت تری ہم نفس ہے اے دل!

*

معنی: حزیں: غمگین۔ نسرین زار: موتی کے پھولوں کا باغ۔

مطلب: معلوم ہوتا ہے کہ ”بانگ درا“ میں اس دور کی جو نظمیں ہیں اقبال نے بیشتر مناظر فطرت کے حوالے سے تخلیق کی ہیں۔ ان میں کہیں کہیں ان کے فکر و فلسفے کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے تاہم نظموں کی بنیادی خصوصیت ان کی ایجری ہے۔ زیر تشریح نظم ”تنہائی“ کو بھی انہی معروضات کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے۔ یہ نظم بھی محض پانچ اشعار پر مشتمل ہے جن میں اقبال یوں گویا ہوتے ہیں۔

اے انسان! شب کی اس تنہائی میں تو خود کو کیوں ملوں و افسردہ محسوس کر رہا ہے۔ تو نظر اٹھا کر دیکھتا نہیں کہ ستارے بھی تیرے ہم نشین ہیں۔ تو ذرا غور کرے تو یہ حقیقت تجھ پر واضح ہو جائے گی کہ اتنا بلند ہونے کے باوجود آسمان بھی خاموش اور پرسکوت ہے اور یہ زمین تو اس طرح سے خاموش ہے جیسے سوئی ہوئی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ پوری دنیا میں سناٹا ہے اور شور و شغب سے خالی ہے۔

اے انسان! ان مظاہر فطرت پر نظر ڈال کہ ان میں چاند، صحرا اور پہاڑ سب کچھ شامل ہیں ان کے باعث یہ کائنات پھولوں سے مزین ہے اور گلستان بنی ہوئی ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ جو خوش رنگ، خوبصورت اور پیارے پیارے موتی ہیں وہ تیرے آنسوؤں کی مانند ہیں۔ اے انسان! یہ تو بتا کہ ان نعمتوں کے ہوتے ہوئے بھلا تجھے اور کس شے کی تمنا اور ہوس ہے۔ جب کہ ساری فطرت اور تمام مناظر فطرت تیرے جذبات سے ہم آہنگ ہو کر تیرے رفیق بن چکے ہیں۔

پیام عشق

083

میں غزنوی سومات دل کا ہوں تو سراپا لیا ز ہو جا
 تمام سامان ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا
 جہاں کا فرض قدیم ہے تو ادا مثال نماز ہو جا
 وغیرہ کل ہے اگرچہ میں تو اور دامن دراز ہو جا
 جہاں میں مانند شمع سوزاں میان محفل گداز ہو جا

سن اے طلبکار درد پہلو! میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا
 نہیں ہے وابستہ زیر گردوں، کمال شان سکندری سے
 غرض ہے پیکار زندہ سے کمال پائے ہلال تیرا
 نہ نہ قامت شعار کبھی اسی سے قائم ہے شان تیری
 گئے وہ ایام، اب زمانہ نہیں ہے صحرا نور دیوں کا

وجود افراد کا مجازی ہے، ہستی قوم ہے حقیقی۔ نذا ہو ملت پہ، یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آزری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ مجاز ہو جا

✱

سات اشعار پر مشتمل اقبال کی یہ نظم عملی سطح پر ایک ایسے پیغام کی حیثیت رکھتی ہے جو ابتدائی ایام
میں ان کے فکر و فلسفے کا نمائندہ رہا۔ یہ سرپیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ ”بانگ درا“ اقبال کا اولین شعری
مجموعہ ہے جو ان کی شاعری کے ابتدائی حصے پر مشتمل ہے۔ زیر تشریح نظم میں اقبال اپنے ہم عصر لوگوں کو
پیغام دیتے ہیں۔

① سے ⑦ معنی: غزنوی: سلطان محمود غزنوی۔ ایاز: سلطان محمود کا مشہور غلام۔ پیکار زندگی: زندگی
میں جدوجہد۔ قناعت شعار: قناعت پسند۔ و فور کل: پھولوں کی بہتات۔ دامن وراز: بے دامن۔ صحرا
نوردیوں: بیاباں میں گھومتا۔ آتش زن: آگ لگانے والا۔ فرقہ ساز: فرقے بنانے والا۔

مطلب: اے میرے ہم عصر انسان! اگر تو عشق حقیقی کا طلبگار ہے تو میری طرح محبوب کی شخصیت کو
عزیز رکھتے ہوئے تو بھی یہی رویہ اختیار کر۔ اگر دل کو سومات کامندر تسلیم کر لیا جائے تو میری شخصیت
محمود غزنوی کے مماثل ہے جس نے اس مندر کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا جب کہ تجھے ایاز کا روپ دھار کر غرور
اکسار کا وہی رویہ اختیار کر لیتا چاہیے جو ایاز کا خاصہ تھا۔ یہ جان لے کہ کائنات میں حصول عروج و کمال
کے لیے سکندر اعظم جیسے فرمانروا کی شان و شوکت ضروری نہیں ہوتی۔ سکندر نے بے شک وہ تاریخی
آئینہ ایجاد اور نصب کیا جو بعد میں تاریخ کا حصہ بن گیا لیکن جان لے کہ تیرے سینے میں بھی ایسے کمالات
چھپے ہوئے ہیں تو اگر ان کو ظاہر کر دے تو تجھے بھی لوگ سکندر اعظم سے کم مرتبہ کا اہل نہیں سمجھیں گے۔
مسلسل جدوجہد زندگی میں عروج و کمال حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے بے شک تیری شخصیت
ابھی پہلی رات کے چاند کی سی ہے تاہم مسلسل جدوجہد کے ذریعے یہ امر ناممکن نہیں کہ تو بدر کمال بن
جائے یعنی انتہائی عروج و کمال حاصل کر لے۔ تجھے تو باری تعالیٰ نے ہزاروں برس قبل دنیا میں اپنے
مقاصد کی تکمیل کے لیے بھیجا تھا۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے اسی طرح نماز کی ادائیگی کے لیے مخصوص
ضابطوں پر عمل ضروری ہوتا ہے۔ یہ امر بھی ذہن نشین کر لے کہ کبھی کبھی قناعت کا شعرا بھی حالات سے
ہم آہنگ نہیں ہوتا اگر خداوند ذوالجلال اپنی نعمتوں میں مزید وسعت پیدا کرتا ہے تو تیری طلب کا دامن
بھی دراز ہو جانا چاہیے۔ بصورت دیگر تیرا رویہ کفران نعمت سے تعبیر کیا جائے گا۔

وہ دور تو کبھی کا ختم ہو چکا جب قیس کی طرح عشق میں لوگ صحرا نوردی اختیار کر لیتے تھے اور اپنے
شر کے علاوہ گھر اور عزیز و اقارب سے بھی بے نیاز ہو جاتے تھے اب تو یہ امر لازم ہے کہ شمع کی طرح
محفل کو روشنی عطا کر۔ اس شعر میں اقبال نے عملاً رہبانیت کی نفی کرتے ہوئے کہا ہے کہ اب تو لوگوں
کے درمیان وہ کربن ملک و ملت کے لیے جدوجہد کرنا لازمی امر ہے۔

زیر تشریح شعر میں اقبال ایک اہم نکتہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا میں فرد کی زندگی تو مجازی اور
غیر حقیقی ہوتی ہے جو ناقابل اعتبار ہے۔ کوئی بھی تو یہ نہیں جانتا کہ وہ کب تک زندہ رہے گا۔ جب کہ فرد
کے بالمقابل قوم کا وجود حقیقی ہوتا ہے۔ افراد مٹ جاتے ہیں لیکن قومیں زندہ رہتی ہیں چنانچہ یہ امر لازم

ہے کہ ذاتی نفع نقصان سے بے نیاز ہو کر قوم کی تعمیر کے لیے جدوجہد کی جائے۔
 نظم کے اس آخری شعر میں اقبال اپنے عہد میں ہندی مسلمانوں کی فرقہ پرستی کو آزاری اور بت
 تراشی کے علاوہ بت پرستی سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ ان لوگوں کا یہ رویہ افسوسناک ہے لہذا بہتر
 یہی ہے کہ اس نوع کی بت پرستی سے دامن بچا کر مدینہ کی راہ اختیار کی جائے اور وہیں زندگی گزاری
 جائے۔

فراق

084

تلاش گوشہ عزلت میں پھر رہا ہوں میں یہاں پہاڑ کے دامن میں آچھا ہوں میں
 شکستہ گیت میں چشموں کے دلبری ہے کمال دعائے طفلک گفتار آزما کی مثال
 ہے تخت لعل شفق پر جلوس آخر شام بہشت دیدہ دینا ہے حسن منظر شام
 سکوت شام جدا کی ہوا بہانہ مجھے کسی کی یاد نے سکھلا دیا ترانہ مجھے
 یہ کیفیت ہے مری جان ناٹکیبا کی! مری مثال ہے طفل صغیر تنہا کی
 اندھیری رات میں کرتا ہے وہ سرود آغاز صدا کو اپنی سمجھتا ہے غیر کی آواز
 یونہیں میں دل کو پیام ٹھیک دیتا ہوں شب فراق کو گویا فریب دیتا ہوں

*

پہلا بند معنی: طفلک گفتار آزما: وہ بچہ جو بولنے کی مشق کر رہا ہو۔ تحت لعل شفق: شفق کا لعل جزا
 ہو تحت۔ بہشت دیدہ دینا: دیکھنے والی آنکھ کے لیے بہشت۔

مطلب: اقبال کی یہ نظم دو بند پر مشتمل ہے جن میں سات اشعار ہیں۔ ان اشعار میں وہ محبوب سے ہجر
 و فراق کے لمحات میں اپنی نفسیاتی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری بے چینی اور اضطراب کا یہ
 عالم ہے کہ ایسے مقام پر جہاں تمنائی نصیب ہو سکے اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں چنانچہ اسی تلاش
 کے سبب مجھے ایک پہاڑ کے دامن میں پناہ لینا نصیب ہوا ہے۔ یعنی تمنائی کی تلاش پہاڑ کے دامن تک
 لے آئی ہے۔

یہاں پہاڑ سے نکلنے والے چشموں کی روانی سے اپنے نئے پھوٹ رہے ہیں جو دلکشی اور محبوبیت کے
 حامل ہیں۔ یہ نغمات اس بچے کی آواز کے مانند ہے جو اپنی توہلی زبان میں بولنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اقبال کہتے ہیں کہ اس لمحے پہاڑ کے دامن سے بوقت شام سورج غروب ہونے کے عمل میں ہے اور
 اس کے سبب جو شفق پھوٹی ہے اس کے پس منظر میں شام کا ستارہ اپنی پناہ گاہ سے برآمد ہو رہا ہے۔ میں
 دیکھ رہا ہوں کہ یہ خوبصورت منظر بہشت کے مناظر کی طرح حسن و جمال سے ہم آہنگ ہے۔ محبوب کے
 ہجر و فراق میں شام کے وقت کا سکوت اور تمنائی میرے لیے ایک بہانہ ثابت ہو رہے ہیں کہ اپنے محبوب کی
 یاد میں نغمے گاؤں۔

دوسرا بند معنی: سرود: راگ میت۔

مطلب: پہلے بند میں محبوب کے جبر و فراق کے سبب جو کیفیت پیدا ہوئی ہے اس کے تسلسل میں دوسرے بند کے اشعار میں اقبال اسی کیفیت کو دوسرے انداز میں اعادہ کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں کہ

میری مضطرب بے چین اور بے صبر روح کی حالت محبوب کی جدائی میں اس ننھے بچے کی مانند ہے جو کچھ بولنے کی کوشش میں غول غاں کرتا رہتا ہے اور اس سے جو آہنگ پیدا ہوتا ہے اس کو کسی دوسرے شخص کی آواز سمجھ کر مسرت و خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کلکاریاں مارتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اس تنہائی میں میں بھی اس ننھے بچے کی طرح اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا ہوں اور ننھے گاگا کہ جبر و فراق کی رات کو فریب دینے کی سعی میں ہمہ تن مصروف ہوں۔

مراد یہ ہے کہ محبوب سے جدائی اور فراق کی گھڑیاں ایک عاشق کے لیے اس قدر کرب آمیز اور جانگسمل ہوتی ہیں کہ وہ تمام ہنگامہ باز ہو کر ترک کر کے کوئی ایسا گوشہ تنہائی تلاش کرتا ہے جہاں فراق کے اس کرب سے نجات حاصل ہو سکے وہاں وہ اپنی دھن میں اسی طرح جبر و فراق کے نغے گا کر خود کو اس طرح سے فریب دیتا ہے جیسے ایک ننھا بچہ اپنی غول غاں کو دوسرے کی آواز جان کر خوش ہوتا ہے۔

عبد القادر کے نام

085

انھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
ایک فریاد ہے مانند سپند اپنی بسات
اہل محفل ک دکھا دیں اثر صیقل عشق
جلوۂ یوسف گم گشتہ دکھا کر ان کو
اس چمن کو سبق آئین نمو کا دے کر
رخت جاں بکدۂ چمن سے اٹھالیں اپنا
دیکھ! میثرب میں ہوا ناکہ لیلیٰ بیکار
بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز
گرم رکھتا تھا ہمیں سردی مغرب میں جو داغ
شمع کی طرح جہیں بزم کہ عالم میں
ہر چہ در دل گذرد وقف زباں دارد شمع
کافقن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع

زیر تشریح نظم سے اس امر کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اقبال نے یہ اشعار خط کی صورت میں اپنے بہترین اور جگہری دوست سر عبد القادر کے نام لکھ کر بھیجے تھے۔ اقبال اور سر عبد القادر خیالات و نظریات میں قدر ہم آہنگ نظر آتے کہ علامہ کی شاعری کا ایک بڑا حصہ سر عبد القادر کی زیر

ادارت مشہور زمانہ جریدے مخزن میں ہی شائع ہوا۔ اس امر کی شہادت میں مخزن کی فائلوں اور علامہ کی بعض دوسری تحریروں سے ہوتا ہے۔

معنی: افق خاور: شرق۔ شعلہ نوائی: ایسے نئے گانا جن سے شعلے نکلیں۔ اثر صیقل عشق: سچے عشق کی جلا کا اثر۔ تپش آمادہ: تڑپنے کے لیے تیار۔ آئینہ نمو: بھلنے پھولنے کا قانون۔ سعدی و سلمیٰ: عرب لڑکیوں کے نام۔ درول گذر: جودل پر گزرتی ہے۔

مطلب: چنانچہ سر عبد القادر سے مکالمہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ یہ خطہ مشرق جو ہمیشہ علم و فضل کا گہوارہ رہا ہے اور جس سے فہم و دانش کی روشنی ہمیشہ طلوع ہوتی ہے وہاں پر ظلمت، تاریکی اور جہالت نے اپنا تسلط جمالیا ہے۔ ان حالات میں ہم پر لازم ہے کہ اپنی جدوجہد اور تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے اس ظلمت اور جہالت کو فکر و احساس کی روشنی سے منور کر دیں۔ ہم میں اظہار کی قوت تو موجود ہے۔ یہی قوت قوم و ملت کی فرسودہ بساط کو تہہ و بالا کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اسی طور پر اس انتخاب کی بنیاد ڈالی جا سکتی ہے۔

اگر ہم ملت کو یہ باور کرا دیں کہ عشق حقیقی کو ہی تکمیل مقاصد کے لیے بروئے کار لایا جائے اور حالات کا مقابلہ سچے جذبے اور تڑپ سے کیا جائے تو ہمارے حال کی یگینی مستقبل کی خوش حالی اور بہتری میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اپنی قوم کو درخشاں ماضی کی جھلک دکھا کر اس کے افراد کے قلوب میں وہی جذبہ اور تڑپ پیدا کر دیں جو یوسفؑ کو دیکھ کر زلیخا کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ مراد یہ کہ حصول مدعا کا تصور بھی انسان کے لیے عمل ارتقاء کا موجب ہو سکتا ہے۔

قوم کو ترقی کے لیے اس طرح آمادہ کریں کہ وہ جدوجہد کر کے انتہائی عروج پر پہنچ جائے۔ اب تک تو ہم دوسروں کی تہذیب کے شیدائی رہے ہیں اور انہی کی نقل کرتے رہے ہیں لیکن اب یہ ضروری ہو گیا کہ ملت کو اپنی تہذیب اور انداز کی طرف راغب کریں۔ افسوسناک امر تو یہ ہے کہ اب تو مدینے میں یعنی اسلامی دنیا میں بھی وہ صلاحیت باقی نہیں رہی کہ دوسروں کو متاثر اور گردیدہ کر سکے لہذا یہ ضروری ہو گیا ہے کہ انہیں ایسی نئی روایت سے آگاہ کیا جائے جو ہماری بنیادی تہذیب اور انداز سے ہم آہنگ ہو۔

اے میرے رفیق! اب تو صورت حال یہ ہے کہ لوگوں کو عام نشے سے مدہوش نہیں کیا جاسکتا بلکہ اب تو ایسے نشے کی ضرورت ہے جو انتہائی جدید اور تیز ہو۔ ایسا نشہ جو آلات سے نوشی کو پکھلا کر رکھ دے۔ یورپ کے دوران قیام ہم ملت اسلامیہ کی تنظیم اور عروج کے لیے جو منصوبے بنایا کرتے تھے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اب ان منصوبوں کو ان کی تفصیلات کے ساتھ افراد ملت کے دلوں میں خنقل کر دیں۔ بالکل شمع کی طرح کہ شمع خود بھی جلتی ہے اور اپنی روشنی سے بزم کو منور بھی کر دیتی ہے۔ ہمیں بھی شمع کی روش اختیار کرتے ہوئے اپنی فکر و محسوسات کو اپنی تخلیقات کے ذریعے لوگوں تک پہنچانا چاہیے۔

086

صقلیہ (جزیرہ سلی)

رو لے اب دل کھول کر اے دیدہ خونتاب بار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
اک جہان تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
مردہ عالم زندہ جن کی شورش قم سے ہوا
غفلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے

آہ! اے سلی! سمندر کی ہے تجھ سے آمد
زیب تیرے خال سے رخسار دریا کو رہے
ہو سبک چشم مسافر پر ترا منظر مدام
تو کبھی اس قوم کی

تہذیب کا گوارہ تھا
حسن عالم سوز جس کا آتش نظارہ تھا

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
آسمان نے دولت غرناطہ جب برباد کی

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
جن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستان؟
درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں

رنگ تصویر کمن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایام سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستان لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا

*

ہسپانیہ کا مشہور جزیرہ صقلیہ جسے سلی کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ خلفائے عثمانیہ کے عہد میں بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ وہ دور تھا جب پورا ہسپانیہ مسلمانوں کے زیر نگیں تھا۔ اقبال جب بحری جہاز کے ذریعے یورپ سے ہندوستان واپس آ رہے تھے تو ان کا جہاز صقلیہ کے جزیرے سے بھی گزرا۔ ماضی کی شاندار تاریخ کے حوالے سے اس دم ان کے ذہن پر جو تاثرات مرتب ہوئے ان کا اظہار اس نظم میں کیا گیا ہے۔

پہلا حصہ معنی: خونتابہ بار: خون برسانے والی۔ عصر کمن: پرانا زمانہ۔ تیغ ناصبور: بے مبر کوار۔

مطلب: سترہ اشعار پر مشتمل یہ نظم عملاتین حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اقبال پہلے حصے کے اشعار میں کہتے ہیں کہ وہ سامنے عرب مسلمانوں کی شان و شوکت اور تہذیب کا مزار نظر آ رہا ہے۔ اس کے باقیات کو دیدہٴ عبرت نگاہ سے دیکھ اور پھر خون کے آنسو بہا لے! کبھی یہ جزیرہ ان عرب صحرائیوں کے اقتدار کا مظہر ہوا کرتا تھا جن کے لیے سمندر ایک تماشے کی حیثیت رکھتا تھا۔ جن کے خوف سے بڑے بڑے شہنشاہوں کے درباروں میں لرزہ آ جاتا تھا۔ اور جن کی کمروں میں بجلیاں پوشیدہ تھیں۔ جو دشمنوں کو خاک و خون میں ملا کر رکھ دیتی تھیں۔

ان مجاہدین کا وجود فرسودہ روایات کا خاتمہ کر کے ایک نئی تہذیب کو جنم دینے کا سبب بنا کرتا تھا۔ ان کی کمروں نے ماضی کی فرسودہ روایات کو فنا کر کے رکھ دیا تھا۔ جن کے نعروں سے اس وقت کے مردہ عہد میں جان پڑ گئی تھی اور وہاں کے باہی توہمات کی دنیا سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لینے لگے تھے۔ وہی عرب جن کے نعروں اب تک فضا میں گونج رہے ہیں کیا ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے؟

دوسرا حصہ: معنی: بحرِ پیا: سمندر میں سفر کرنے والا۔ سبک: پر لطف رہے۔

مطلب: زیر تشریح نظم کے ان اشعار میں اقبال ”جزیرہٴ سسلی“ کو مخاطب کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے ہیں کہ! بیشک اے سسلی! سمندر کا وقار اور عظمت تیرے ہی دم سے ہے اگر اس سمندر کو پانی کا ایک صحرائے بیکراں تصور کر لیا جائے تو تیرا وجود اس صحرائے بیکرے میں بھگے ہوئے جہازوں اور مسافروں کے لیے ایک رہنما کی حیثیت کا حامل ہے۔ اے سسلی! تیرا وجود تو اس ماحول میں ایک ایسے قل کے مانند ہے جو خوبصورت چہروں پر زیب و زینت کا باعث ہوتا ہے۔ رات کے لمحات میں تیری روشنیاں جہازرانوں کے لیے اطمینان اور رہنمائی کا سبب بنتی ہیں۔

اے سسلی! خدا کرے اس سمندر میں تیرا وجود ہمیشہ برقرار رہے اور اہل مسافرت کے لیے تو ہمیشہ رہنمائی کے فرائض انجام دیتا رہے اور سمندر کی بھری ہوئی موجیں ہمیشہ تیرے ساحل کی چٹانوں پر رقص کرتی رہیں۔

اے سسلی! یہ مت بھول کہ تو کبھی اس قوم کی تہذیب سے ہم آہنگ تھا جس کے طغٹنے سے ساری دنیا لرزتی تھی۔ مراد یہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے زیر تسلط تیری شان و شوکت انتہائی عروج پر رہی۔ آج وہ موجود نہیں پھر بھی تو دنیا کو اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔

تیسرا حصہ: معنی: نالہ کش: نوحہ کرنے والا۔ شیراز کا بلبل: شیخ سعدی۔ جہان آباد: دہلی کا دوسرا نام۔

مطلب: اے سسلی! میں جانتا ہوں کہ بغداد کی تباہی نے سعدی جیسے بلند پایہ شاعر کو خون کے آنسو بہانے پر مجبور کیا۔ داغ مرحوم دہلی کی تباہی پر نالہ کشاں ہوئے۔ جب غرناطہ کی سلطنت کا خاتمہ ہوا اور وہاں کی تہذیب کو گھن لگ گیا تو ابن بدروں اس لیے پر نالہ و فریاد کرتا رہا۔ یہ سارے غم اس عہد کے شعراء اور دانشوروں نے اپنے لیے مخصوص کر لیے جب کہ مجھے یعنی اقبال کو قدرت نے تیری تباہی کے دکھ سے نوازا ہے۔ اس لیے کہ میں ہی تیری عظمت و شان سے آگاہی رکھتا ہوں۔

چوتھا حصہ: معنی: آثار: کھنڈر۔

مطلب: نظم کے ان اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ اے سسلی! مجھے زبان حال سے اتنا بتادے کہ تیری برباد ہونے والی قدیم عمارتوں میں کن لوگوں کی داستانیں پوشیدہ ہیں۔ ہر چند کہ تیرا ساحل ساکت و خاموش ہے۔ اس کے باوجود یوں لگتا ہے جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنے کا خواہاں ہے۔ سو میں جو خود بھی سراپا درد کی حیثیت رکھتا ہوں اس سے اپنے دکھ اور کرب کا احوال بیان کر دے۔ یہ جان لے کہ جس قوم نے تجھے اپنی منزل قرار دے کر تیری شان و شوکت میں اضافہ کیا تھا میں بھی اسی قوم کا ایک فرد ہوں۔

اے جزیرہ سسلی! آج پھر مجھے ایام باضی کی داستانیں سنا دے اور یہ بتا دے کہ میرے اسلاف کی شان و شوکت کیسی تھی۔ بے شک ان داستانوں کو سن کر میں مضطرب ہو جاؤ گا تاہم اپنے وطن جا کر وہاں کے لوگوں کو بھی یہ داستانیں سناؤں گا اور جس طرح میں یہاں آنسو بہا رہا ہوں وہاں کے لوگ بھی اس انقلاب زمانہ پر خون کے آنسو روئیں گے۔



(حصہ دوم)

تحقیق کے مطابق حصہ دوم کی چھ غزلیں اقبال نے 1905ء سے 1907ء تک کے عرصے میں تخلیق کیں۔ انہی ایام میں انہوں نے جو نظمیں لکھیں ان کی تشریح گذشتہ صفحات میں کی جا چکی ہیں۔ یہاں اس امر کا ذکر غیر ضروری نہ ہو گا کہ حصہ اول کی تخلیقات کے مقابلے میں زیر تشریح غزلیں فکری سطح پر قدرے مختلف ہیں اور اقبال کی شاعری میں جو تبدیلی رونما ہوئی ان کی آئینہ دار ہیں۔

غزلیات

غزل ①

087

زندگی انسان کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں۔ دم ہوا کی موج ہے رم کے سوا کچھ بھی نہیں
گل جسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر شمع بولی، گریہ غم کے سوا کچھ بھی نہیں
راز ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو کھل گیا جس دم، تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں
زازان کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں؟

*

حصہ دوم میں علامہ اقبال کی زیر تشریح غزل محض چار اشعار پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ گذشتہ سطور میں بتایا گیا ہے کہ حصہ دوم کی نظموں اور غزلوں میں اقبال اپنی پہلی تخلیقات سے قدرے مختلف نظر آتے ہیں اور یہ ایک فطری امر ہے۔ اس لیے کہ ہر بزرگوار تخلیقی سطح پر ارتقاء کے عمل میں رہتا ہے۔ اس کے لیے کسی ایک مقام پر ٹھہر جانا ممکن نہیں ہوتا۔ لہذا اقبال کے آئندہ کلام کو بھی اسی حوالے سے دیکھا جانا چاہیے۔ زیر تشریح غزل کے مطلع میں وہ یوں گویا ہوئے ہیں کہ

① معالیٰ درم: بھانگنا۔

مطلب: کائنات میں حیات انسانی دیکھا جائے تو ایک سانس کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ کسی لمحے بھی اس جہان فانی سے رخصت ہو سکتا ہے۔ پھر یہ سانس بھی کیا ہے محض ہوا کی ایک لہر کے مانند۔ جو بیش رواں دواں رہتی ہے کبھی ایک سمت جاتی ہے اور کبھی دوسری سمت میں سرگرم سفر رہتی ہے۔ نتیجتاً ”یہ کس اور ست ہو گا کہ دنیا میں انسان کی زندگی ناپائیدار ہوتی ہے“

② پھول کے نزدیک زندگی محض مسکرانے کا دوسرا نام ہے۔ جب کہ شمع کے نزدیک اس کی حیثیت غم و اندوہ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

③ اقبال اس شعر میں کہتے ہیں کہ زندگی اس وقت ایک راز کی حیثیت رکھتی ہے جب تک کہ اس کے راز بائے درون پردہ سے کوئی آگاہی حاصل نہ کر لے لیکن جب اس پر یہ راز منکشف ہو جائیں تو پھر اصل حقیقت اس محرم راز کی بھی ہوتی ہے۔ اس کی کہ راز منکشف ہونے کے بعد اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔

④ معنی: زائران کعبہ: کعبہ کی زیارت کرنے والے۔ زمزم: کعبہ کے نزدیک ایک کنواں۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ جو لوگ حج یا عمرے کے لیے کعبہ تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور وطن واپسی پر بڑے فخر سے ہمراہ لائے جانے والے آب زمزم کو دو ستوں اور عزیزوں میں اس طرح تقسیم کرتے ہیں جیسے کہ یہاں اس سے بڑا دوسرا کوئی تحفہ نہ تھا حالانکہ وہاں سے لانے کے لیے تو حرارت ایمانی سے بڑھ کر دوسرا کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا۔

(2)

088

اسی قتل خجستہ ہے کو ذرا ی دیوانگی سکھا دے
ملا محبت کا سوز مجھکو تو بولے صبح ازل فرشتے
یہاں کہاں ہم نفس میسر یہ دیس نا آشنا ہے اے دل
زرا سارے جہاں سے اس کو عرب کے ہمارے بنایا
کہاں کا آتا کہاں کا جاتا فریب ہے امتیاز عقبنی
مدیر مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاق سخن نہیں ہے

*

① معنی : خجستہ ہے : مبارک قدم والی۔ سودائے بخیہ کاری : سینے کا خبط۔ سر پیر ہن : لباس کا خیال۔

مطلب : اقبال زیر تفتیح غزل کے پہلے شعر میں رب ذوالجلال سے درخواست کرتے ہیں کہ انسان کے لیے عقل و دانش بے شک باعث افتخار ہوتی ہیں تاہم جب تک اس میں جنون کی آمیزش نہ ہو تو تنہا عقل عضو معطل کی سی حیثیت رکھتی ہے کہ عقل کا رویہ تو اکثر جذبہ عشق کی نفی کے مصداق ہوتا ہے جو کسی طور بھی فطرت انسانی سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔

② جب مجھے اللہ تعالیٰ نے اس عالم رنگ و بو میں بھیجے ہوئے محبت کا سوز عطاء کیا تو فرشتوں کو اس نعمت پر حسد ہوا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ تیرا وجود تو کسی مقبرے پر روشن ہونے والے دیئے کی مانند ہے اور یہ دنیا ہمیشہ تیرے اس جذبے سے بیگانہ رہے گی۔

③ معنی : چرخ کسن : بوڑھا آسان۔

مطلب : اے دل ! جان لے کہ اس دنیا میں کسی کا کوئی مونس و مغوار نہیں ہے۔ اس کے باوجود تو کسی ایسے ہمدرد شخص کا خواہاں ہے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کو شش میں تجھے قطعی طور پر ناکامی ہوگی۔

④ اقبال نے اس شعر میں وطنیت کے تصور کی نفی کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہماری ملت دوسری اقوام کے مقابلے میں وطن اور اس کی وحدت کے تصور سے بے نیاز ہے اس کی انفرادیت بھی یہی ہے۔

⑤ یہ کہنا مبالغہ پر مبنی ہے کہ انسان عدم سے وجود میں آتا ہے اور پھر مرنے کے بعد عدم کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ تصور ایک دھوکے کی مانند ہے۔ بحیثیت مسلمان ہم تو کسی دوسرے مقام کو تو کیا عقبنی کو بھی اپنا وطن تصور نہیں کرتے اس لیے کہ ہم تو ہر شے میں موجود ہیں۔

⑥ معنی : مدیر مخزن : رسالہ "مخزن" کے ایڈیٹر۔

مطلب : مقطع میں اقبال یوں گویا ہیں کوئی سر عبد القادر (مدیر مخزن) کو میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ دنیا بھر کی قومیں اپنی جدوجہد کے ذریعے بے شک کارنامے انجام دے رہی ہیں اور ترقی کی راہ پر بھی گامزن ہیں لیکن

حقیقت یہ ہے کہ وہ عملاً تخلیقی جوہر کا اور اک نہیں رکھتے۔

(3)

089

مری خوشی نہیں ہے' گویا مزار ہے حرف آرزو کا
مگر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھ کو سامان آہرد کا
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں گس سرد کنار جو کا
الٹی تیرا جہان کیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا
جسے سمجھتے تھے جسم خاکی' غبار تھا کوئے آرزو کا
تک کہ نگارے کی تمنا ہے دل کو سودا ہے جنجو کا
تری نگاہوں میں ہے جسم شکست ہوتا مرے سوا کا
حقیقت گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی جیاں ہے رنگ دیو کا
بہر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جو کا
ذرا سا اک دل دیا ہے' وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا
یقین ہے مجھ کو گرے رگ گل سے قدر انسان کے لو کا
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے' انگھو کا؟

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے عثر اٹھے گا کھٹکو کا
ہو مون دریا لگی یہ کہنے سحر سے قائم ہے شان میری
نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنو رہے
کوئی دل ایسا نظر نہ آیا' نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا
کھلا یہ سر کر کہ زندگی اپنی تھی طلسم ہوس سراپا
اگر کوئی شے نہیں ہے نہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں؟
جہن میں کلجھ سے فچہ کھتا تھا' اتنا بیدار کیوں ہے انسان؟
ریاض ہستی کے ذرے ذرے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
تمام مضمون مرے پرانے' کلام میرا خطا سراپا
سپاس شریا ادب ہے ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھ کر
کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوک نشتر سے تو جو پیڑے
کیا ہے تخلیق کا زمانہ' نماز رات سفر انھائے

جو گھر سے اقبال دور ہوں میں تو ہوں نہ محروں عزیز میرے
مثال گوہر وطن کی فرقت کمال ہے میری آہرد کا

*

① سے ③ معنی: صدف نشینی: پی میں چمپا ہوا۔ کنار جو: ہندی کا کنار۔

مطلب: اقبال کی یہ غزل تیرہ اشعار پر مشتمل ہے جس کے مطلع میں وہ کہتے ہیں کہ بظاہر میں خاموش
ہوں اور میری یہ خاموشی ایک طرح سے آرزوؤں اور تمناؤں کے مقبرے کے مانند ہے تاہم زمانہ اس
حقیقت سے جلد ہی آگاہ ہو جائے گا۔ جب میری شاعری میاں ایک انقلاب برپا کر دے گی۔ دوسرے شعر
میں اقبال کہتے ہیں کہ زندگی کا حقیقی مفہوم ہر شے کی ضرورت اور تجربے کے مطابق متعین ہوتا ہے۔ دریا
کی موجوں کی شان و شوکت اگر ان کی رودانی میں مضمر ہے تو موتی پی پی میں بند رہ کر اپنی شناخت کا ضامن
بناتا ہے۔ تیسرے شعر میں اقبال یوں گویا ہوئے ہیں کہ کسی شے میں جو ہر قابل ہی نہ ہوں تو اس کی دیکھ
بہال اور تربیت سے کچھ فرق نہیں پڑتا اس کی ایک مثال ہندی کے کنارے استلواہ سرو کی ہے جو اپنی
فطرت کے مطابق نمی حاصل کر کے سرسبز و شاداب رہتا ہے جب کہ اس کا عکس ہمہ وقت پانی میں موجود
رہنے کے باوجود کسی قسم کی نشوونما کا متحمل نہیں ہوتا۔

④ سے ⑥ معنی: نگار خانہ ہے آرزو کا: آرزو کے نقش و نگار دکھائی دیتے ہیں۔ طلسم ہوس:
تمناؤں کا گور کہ وحدانہ۔

مطلب: اقبال زیر تشریح شعر میں رب ذوالجلال کو متوجہ کر کے کہتے ہیں کہ میں میاں جس شخص کو بھی

ملا ہوں اس کے دل میں خواہشات اور آرزوؤں کی ایک دنیا آباد پائی ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا کہ تیری یہ دنیا آرزوؤں اور خواہشات کا طلسم کہہ ہے۔ بعد از مہمت اس حقیقت کا ادراک نہیں کہ زندگی سراسر ایک طلسم کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ حتیٰ کہ عمر بھر جس جسم کو مٹی سے بنا ہوا تصور کرتے رہے وہ بھی فی الواقع آرزو اور خواہشات کی گرد کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ غزل کے چمپے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ انسان ہمیشہ کسی ایسی شے کی تلاش میں ہی سرگرواں رہتا ہے جو کہ اس کی نظروں سے چھپی ہوئی ہو اس لیے کہ دل اس شے کا نظارہ کرنا چاہتا ہے اس لیے اس کی تلاش و جستجو رہتی ہے۔ بلا شک و شبہ یہ شعر تلاشِ حق کے حوالے سے کہا گیا ہے۔

⑦ سے ⑨ معنی: ریاض ہستی، ہستی کا باغ۔

مطلب: اس شعر میں بقول اقبال جب باغ میں پھول توڑنے والے نے شاخ سے غنچے کو تراش لیا تو وہ زبانِ حال سے گویا ہوا کہ مجھے اتنا بتا دے کہ جب میں کھل کر پھول بن جاتا ہوں تو تو اسے میرے تنہم سے تعبیر کرتی ہے جب کہ یہ عمل تو فنا کی جانب ایک قدم ہے۔ زندگی کو اگر ایک باغ تصور کر لیا جائے تو اس باغ کے ہر ذرے سے محبت ہی محبت کا جلوہ نظر آئے گا۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے اے انسان! تو پھول کی حقیقت سے آگاہی حاصل کر کہ اس کی اہمیت اس وقت تک یہی ہے کہ اس میں رنگ اور خوشبو کا امتزاج برقرار ہے۔

اس شعر میں اقبال غالباً اپنے بعض نقادوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بے شک میری منظومات کے تمام مضامین قدامت سے ہم آہنگ ہیں اور میری شاعری بھی اغلاط سے پر ہے۔ اس کے باوجود اگر کسی نقاد کے لیے اس میں کوئی خوبی ہے تو یہ اس نقاد کی کم علمی کا ثبوت ہے۔

⑩ سے (13) معنی: محزون، غمگین۔

مطلب: اے خدائے بزرگ و برتر! یہ تیری کرم نوازی ہے کہ تو نے مجھے دل جیسی دولت عطا کی لیکن اتنے مختصر دل میں خواہشات کا جو طوفان موجزن ہے اگر تیرا پاس ادب نہ ہوتا تو میں اے کرم کی بجائے ستم سے تعبیر کرتا۔ اس شعر میں اقبال ایک سائنسی نظریے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کائنات میں موجود عناصر ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ اگر نوکِ نشتر سے پھول کو چھیرا جائے تو نصیبِ جہنم اس میں سے جو لعاب برآمد ہو گا وہ انسانی خون کے مانند ہو گا۔ اسی نکتے کو اقبال ایک اور مقام پر یوں بیان کرتے ہیں!

لو خورشید کا لپکے اگر ذرے کا دل چیریں

اس شعر میں کہا گیا ہے کہ اب نقابی اور دوسروں کی پیروی کرنے کا دور تو ختم ہوا اب خیالی دنیا پر اکتفا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دور تو حقیقت پر مبنی ہے اور جب انسان کو حقیقت کا ادراک ہو جائے تو پھر اس پر کسی قسم کی انگشت نمائی نہیں کی جاسکتی۔ غزل کے مقطع میں اقبال کہتے ہیں کہ اگر میں اپنے وطن سے دور ہوں یعنی بغرضِ تعلیم انگلستان میں ہوں تو میرے احباب اور عزیز و اقارب کو غمگین نہیں ہونا چاہیے کہ موتی کی قدر و قیمت پینے سے باہر نکل کر ہی معلوم ہوتی ہے۔ دیارِ غیر میں حصولِ تعلیم کے بعد میری عزت و توقیر

(4)

090

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں شرارے میں
 بلندی آسمانوں میں، زمینوں میں تری پستی
 شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلم کی
 جو ہے بیدار انسان میں وہ گمراہ نیند سوتا ہے
 مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرہ اٹکِ محبت نے
 نہیں جسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو
 سکون کا آئینہ رہتا اسے سامانِ ہستی ہے
 تڑپ کس دل کی یا رب چمپ کے آئینے ہے پارے میں
 صدائے لنِ ترانی سن کے اے اقبال میں چپ ہوں
 تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھِ فرقت کے مارے میں

*

① معنی: ہویدا، ظاہر۔ استعارے: چمپا کر بات کرنا۔ گریباں گیر: گریبان پکڑے۔ خسارے: گھماٹا۔
 پھونکا: جا دیا۔

مطلب: اس غزل میں مطلع میں کہا گیا ہے کہ اے باری تعالیٰ! تیرا جلوہ، بجلی، آگ اور اس کے شعلے میں
 پنسا ہے۔ اس کے علاوہ چاند، سورج اور ستاروں سے بھی تیری جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ ان آسمانوں کی
 بلندی اور زمین کی پستی بھی تیرے سبب ہی ہے۔ سمندر کی موجوں میں روانی اور ساحل کا ایک ہی مقام پر
 قیام تیرے ہی دم سے ہے۔ میرے مکالمے اور تخلیقی عمل پر اہل شریعت یعنی داعی و ملا جو تک معترض
 ہوتے ہیں اسی لیے میں اپنے دلی جذبات کا اظہار اب تشبیہات اور استعاروں میں کرنے لگا ہوں۔ ظاہر
 ہے کہ میرا یہ طرز عمل ان لوگوں کے لیے نارسائی کا حامل ہوتا ہے۔ اس لیے وہ خامشی اختیار کر جاتے
 ہیں۔ میں اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ ہوں کہ درخت، پھول، عام انسان، پتھر اور ستاروں میں وہ
 صلاحیت اور کیفیت موجود نہیں جو انسان میں ہیں۔ یعنی اول الذکر اشیا ہرچند کہ ایک سی حقیقت کی حامل
 ہیں۔ اس کے باوجود ان میں حیات و کائنات کے حوالے سے وہ شعور نہیں ہے جو کہ انسان میں موجود
 ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ مجھے تو محبت کی آگ نے جلا کر خاک کر ڈالا ہے۔ ہرچند کہ محبت کا جذبہ ایک منفی
 سی چنگاری کے مانند ہے۔ اس کے باوجود یہ چنگاری تو انسان کو جلا کر رکھ دیتی ہے۔ میں اس دنیا میں باری
 تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے جو نیکیاں کما رہا ہوں آخرت میں ان کا صلہ پانے کی تمنا بھی مجھ کو نہیں ہے۔
 اس لیے کہ میں تو ایسا سوڈا گر ہوں جو بالعموم نفع نقصان سے بے نیاز رہتا ہے۔

خدا یا! مجھے اتنا ہوا کہ پارہ جو اپنی فطرت کے تقاضے کے تحت ہر لمحے متحرک رہتا ہے اور ٹھہراؤ کا
 قائل نہیں اس میں تو نے کس دل کی تڑپ اور اضطراب بھر دیا ہے۔ مراد یہ کہ عشقِ محبوب میں جس
 طرح سے دل تڑپتا رہتا ہے۔ یہی کیفیت پارے کی بھی ہے۔ نہ جانے وہ کس کے فراق میں اس طرح
 مضطرب رہتا ہے۔

زیر تشریح غزل کے مقطع میں اقبال یوں گویا ہیں کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ”وہ اونسی“ یعنی اے خدا مجھے اپنا جلوہ دکھا دے تو جواب ملا تھا ”لن توانی“ موسیٰ! تم ہمارا جلوہ دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتے۔ اسی طرح ”لن توانی“ کے الفاظ سن کر میں خاموش ہوں۔ اس لیے کہ مجھے تو باری تعالیٰ کے مجرد فراق نے اس قدر مضطرب کر کے رکھ دیا ہے کہ اپنے محبوب حقیقی سے قطعی تقاضا نہیں کر سکتا کہ وہ مجھے اپنا جلوہ دکھا دے۔

زیر تشریح غزل کے کم و بیش تمام اشعار دیکھا جائے تو ایک مسلسل غزل کے ہیں جن میں سے کم و بیش ہر شعر میں خدائے عز و جل ایک مرکزی کردار کی حیثیت کا حامل نظر آتا ہے۔

⑤

.091

یوں تو اے بزمِ جہاں! دلکش تھے ہنگامے ترے اک ذرا افسردگی تیرے تماشاؤں میں تھی
پاگنی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک مدتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی
نرس قدر اے سہ! تجھے رسمِ حجاب آئی پسند پردہ انگور سے نکلی تو میناؤں میں تھی
حسن کی تاثیر پر غالب نہ آ سکتا تھا علم اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی

میں نے اے اقبال! یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث

بات جو ہندوستان کے ماہِ سیمائوں میں تھی!

*

① سے ⑤ معنی : آسودگی : آرام۔ حکمت : تلف۔ ماہِ سیمائوں : چاند جیسی پیشانی والے۔ مراد حسین۔

مطلب : مطلع کے بغیر محض پانچ اشعار پر یہ غزل مشتمل ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اے جہان رنگ و بو ہر چند کہ تیری فضا ہنگامہ خیزی اور عیش و مسرت سے بھرپور تھی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ان ہنگاموں میں غم و اندوہ بھی کسی حد تک شامل تھے۔ یہ صورت حال بلا شک و شبہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ دنیا ناپائیدار ہے۔ مسرتوں کے ساتھ یہاں غم و اندوہ بھی موجود رہتے ہیں جس سے دنیا کی حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو شخص حکمت و دانش کے صحراؤں میں پریشان و مضطرب رہا اور اس صحرا کی خاک چھانتا رہا بالآخر اسے محبت کے دامن میں مسرت و خوشی اور عملاً آسودگی و ستیاب ہو گئی۔

اس شعر میں اقبال شراب کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شراب عملی سطح پر ایک پردہ نشین شے ہے کہ اولاً انگور کے خوشوں میں چھپی رہتی ہے۔ بعد میں پینے اور صراحیوں کے دامن میں پناہ گزین ہو جاتی ہے۔ جب کہ پدمست شرابی اسے پینے اور مدہوش ہونے کے بعد شراب کا پردہ چاک کر دیتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ حسن کے ساتھ علم و دانش بھی اپنی اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔ لیکن حسن میں وہ تاثیر موجود ہے جس پر علم و دانش غالب نہیں آسکتے بلکہ ایک طرح سے اس کا پورا پورا روبرو رہتے ہیں اور اسی باعث دنیا بھر کے دانشور حسن کے مقابل نادانی سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

اقبال مقطع میں کہتے ہیں کہ یورپ کے دوران قیام وہ حسن اور تہذیب تلاش کرتا رہا جو ہندوستان کے خوبصورت اور خوب سیرت لوگوں میں موجود ہے۔

⑥

092

مثال پر تو اے، طوف جام کرتے ہیں
خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری
نیا جہاں کوئی اے شمع! دھونڈیے کہ یہاں
بجلی ہے ہم نفو! اس چمن میں خاموشی
غرض نشاط ہے شغل شراب سے جن کی
بھلا نبھے گی تری ہم سے کیوں کر اے واعظ
الٹی سحر ہے پیران خرقہ پوش میں کیا
میں ان کی محفل عشرت سے کانپ جاتا ہوں
ہرے رہو وطن مازنی کے میدانو!
جو بے نماز بھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں!

*

① سے ⑤ معنی: پر تو اے شراب کا بلوہ۔ ستم کش: ظلم سنا۔

مطلب: اس غزل کے مطلع میں کہا گیا ہے کہ جس طرح شراب کا عکس رقص کرتا محسوس ہوتا ہے اسی طرح ہم بھی جام شراب کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ یہ عمل ہر روز صبح و شام ہمارے لیے عبادت سے کم نہیں۔ مراد یہ ہے کہ صبح ہو یا شام! وقت کوئی بھی ہو ہمارے لیے مسلسل بے نوشی عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔

غزل کے دوسرے شعر میں حضرت موسیٰ سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے کہ آپ نے کوہ طور پر حق تعالیٰ سے جو گفتگو کی وہ کوئی کمال کی بات نہ تھی اس لیے کہ یہ کام تو درخت اور پتھروں سے عنایت خداوندی کے طفیل ممکن ہے۔ اے شمع! بہتر یہی ہے کہ کوئی دوسرا جہان تلاش کر۔ اس لیے کہ اس جہان کا ستم تو یہی ہے کہ رونے والے کو رونے بھی نہیں دیا جاتا۔ اگلے شعر میں اقبال نے اپنے عہد کی معاشرتی صورت حال کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ حرف شکایت زبان پر نہ لائیں۔ یہاں تو جبر کا یہ عالم ہے کہ اگر سچ بولیں تو اس کی سزا ملتی ہے اور سچ بولنے والے کو اس جرم میں پابند قفس کر دیا جاتا ہے۔ اس شعر میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ شراب کو محض سرمستی اور تفریح کے لیے پیتے ہیں وہ عملاً کم ظرف ہیں۔ اپنے اس عمل سے انہوں نے ایک حلال چیز کو حرام کر کے رکھ دیا ہے۔ تقریباً یہی مضمون میرزا غالب نے اپنے ایک شعر میں زیادہ خوبصورت انداز میں باندھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رویہ کو
اک گوند بے خودی مجھے دن رات چاہیے

⑥ سے ⑩ معنی: پیران خرقہ پوش، گدڑی پٹنے والے پیر۔ رام: گرویدہ بنانا۔ ویر: بیت خانہ۔

مطلب: اے واعظ! ہمارا اور تیرا بھلا اس لیے ممکن نہیں کہ ہم تو انسانوں سے محبت کرتے ہیں اور تو ان میں نفاق پیدا کر کے نفرت کے بیج بوتا ہے۔ اگلے شعر میں اقبال ان گدڑی پوش بزرگوں کے کردار کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اپنی حراکیز باتوں سے نوجوانوں کو مطیع کر لیتے ہیں۔

اس شعر کا مضمون ان عیاش لوگوں کی نشاندہی کرتا ہے جو عیش و نشاط کی خاطر اپنا مال و متاع اور گھر کا سکون بھی برباد کر دیتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ میں تو اس قماش کے تماشا بینوں کی محفل کے قصور سے ہی ڈر جاتا ہوں۔ اس لیے کہ ایسے لوگ اپنا سب کچھ تباہ کرنے کے علاوہ معاشرے کو بھی تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

اقبال نے یہ غزل اٹلی کے سفر کے دوران کہی ہے جو اس شعر سے ظاہر ہے۔ کہتے ہیں اے جوزف مازنی جیسے محب وطن اطالوی رہنما! تیرے یہ میدان ہمیشہ سرسبز و شاداب رہیں۔ تیرے ساحل کے قریب سے گزرتے ہوئے میں اپنے جہاز سے تیری عظمت کو سلام کرتا ہوں۔

مقطع میں اقبال کہتے ہیں کہ جب نماز نہ پڑھنے والوں کو کبھی نماز پڑھنے کا خیال آتا ہے تو وہ مجھے بت خانے سے امامت کے لیے طلب کر لیتے ہیں۔

مارچ 1907ء

093

سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہو گا
بنے گا سارا جہاں میکانہ ہر کوئی بادہ خوار ہو گا
برہنہ پائی وہی رہے گی، مگر نیا غار دار ہو گا
جو مدد معراہتوں سے باندھا تھا قیام پھر استوار ہو گا
سنا ہے یہ قدیموں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا
تو پیر میکانہ سن کے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے، خوار ہو گا
کھڑا ہے تم سمجھ رہے ہو وہ اب ذر کم عیار ہو گا
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا
ہزار موبوں کی ہو کشمکش، مگر یہ دنیا سے پار ہو گا
یہ جانتا ہے کہ اس دکھانے سے دل جلوں میں شمار ہو گا
یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہو گا
تو خشنے کسے کسے جگہ سے چہن کا یہ رازدار ہو گا

زمانہ آیا ہے بے جلابی کا، عام دیدار ہو گا
گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چمپ کے پیتے تھے پینے والے
کبھی جو آوارہ دہوں تھے، وہ بستیوں میں پھر آئیں گے
سنا دیا گوشِ مخمر کو نیاز کی غامضی نے آخر
اٹل کے صحرے جس نے روم کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں
دیوارِ مطلب کے اترنے والا، خدا کی ہستی دکھائی نہیں ہے
تساری تہذیب اپنے ہنجر سے تپ ہی خود بخشی کرے گی
سفید برگ محلِ بنا لے گا قافلہ مورِ ناؤں کا
چہن میں لال دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
جو ایک تھا اے انکا تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا
کما جو قمری سے میں نے اک، وہن سال کے تزلزل، بگل ہیں

خدا سے عاشق تو ہیں بڑا دوس، بڑوں میں بھرتے ہیں مار۔ مارے
یہ رسم بزم فنا ہے دل اگناہ ہے جنبشِ نظر بھی
میں غلت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے زمانہ کارواں کو
نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانہ ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
کس سر راگزار بیضا ستم کش انتظار ہو گا

*

سترہ اشعار پر مشتمل یہ ایک مسلسل غزل ہے جو اپنی ہیئت اور معنویت کے اعتبار سے نظم سے زیادہ
قرب ہے۔ اس غزل کی نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اقبال کا فکر و فلسفہ قدرے واضح شکل
میں سامنے آتا ہے۔ اس غزل میں اقبال کا انداز بھی قدرے جارحانہ ہے۔ اپنے عہد کی صورت حال کا
ذکر کرتے ہوئے یہاں انہوں نے مستقبل کی جانب بھی کچھ اشارے کیے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ
① سے ③ معنی: بے حجابی، چہرہ پر پردہ اٹھنا۔ آوارہ جنوں: دیوانگی کے جوش میں آوارہ پھرنا۔
برہنہ پائی: تنگ پاؤں۔

مطلب: کہ آج جس عہد میں ہم لوگ سانس لے رہے ہیں اس کی سیاسی اور معاشرتی کیفیت کا اندازہ
اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ وہ محبوب شخصیتیں جن کا بھرم ہی پر ہے سے قائم تھا وہ پردہ ترک کر کے عام
لوگوں میں اپنے حسن کا نظارہ کرنے پر آمادہ نظر آتی ہیں اور آنے والا وقت اس امر کی نشاندہی کرنے کو ہے
کہ بالا خرابی ایسا ہی ہو کر رہے گا۔ اور وہ راز کھل کر سامنے آجائے گا جو شرم و حیا کے سبب ابھی تک پردے
میں تھا۔

دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ اب وہ عہد ختم ہونے کو ہے جب کہ نئے نوشی بالعموم چھپ کر ہوتی
تھی۔ اب تو اس امر کا امکان نظر آ رہا ہے کہ سارا معاشرہ ایک شراب خانے کی شکل اختیار کرے گا اور
اس میں موجود ہر فرد بادلہ خواری کا عادی ہو جائے گا۔

وہ لوگ جو عشق و مستی کے عالم میں صحراؤں اور جنگلوں کی خاک چھان رہے تھے اب وہ پھر سے
بستیوں میں آئیں گے۔ ہر چند کہ وہ صحراؤں اور جنگلوں میں برہنہ پاتھے۔ یہاں بھی ان کی صورت حال
وہی رہے گی۔ فرق اس قدر ہے کہ یہ بستیاں ایک نئے خازن کے مانند ہوں گی۔

④ سے ⑤ معنی: گوشِ منتظر: انتظار میں لگے ہوئے کان۔ شیر: مراد ملت اسلامیہ۔

مطلب: اقبال اس شعر اور اس کے بعد کے شعر میں ایک نیا رخ اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آج
کے علاوہ آئندہ کے امکانات تو بظاہر وہی ہیں جن کا ذکر ابتدائی تین اشعار میں کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود
معروضی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کرنے والے لوگوں تک خاک مدینہ سے یہ پیام جانفزا
پہنچنے لگا ہے کہ حق تعالیٰ نے تم لوگوں کی بہبود و آسائش اور ارتقاء کے لیے جو وعدے کیے تھے بلا شک و شبہ
ان کی پوری کی جائے گی۔ اور وہ فرزندِ ان توحید جنہوں نے اپنی جرات اور آہنی عزم کے ذریعے روم کی
عظیم الشان سلطنت کو تہ و بالا کر دیا تھا فرشتوں کی زبانی یہ پیغام دیا گیا ہے کہ وہ فرزندِ ان توحید ایک بار پھر

اپنی منتشر صفوں کو استوار کر کے دشمن کا منہ پھیر دیں گے۔

⑥ معنی: منہ پھٹ: سچی بات بے باکی سے کرتا ہے۔

مطلب: اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ میرا دست گوئی کا چرچا جب لوگوں میں ہوا تو ان کے سر راونے کہا کہ ایسے منہ پھٹ لوگ اکثر خراب و خستہ ہی ہوا کرتے ہیں۔ سو اس شخص کا حشر بھی کچھ اسی طرح کا ہو گا۔

⑦ سے ⑧ معنی:۔۔۔

مطلب: غزل کے ان دونوں اشعار میں اقبال مغربی استعمارچیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ دنیا رب ذوالجلال نے پیدا کی ہے جب کہ تم اسے اپنے مفادات کی منڈی سمجھ بیٹھے ہو۔ اور جس کے کو تم کھرا سمجھ رہے ہو ذرا غور سے دیکھو کہ وہ تو کھوٹا سکہ ہے۔ یہ بھی جان لو کہ تمہاری وضع کردہ تہذیب ان ہتھیاروں سے خود ہی اپنے آپ کو تباہ کر لے گی جو تم نے دوسروں کو برباد کرنے کے لیے ایجاد کیے ہیں۔ جان لو کہ جس عمارت کی بنیاد کمزور ہوگی تو وہ عمارت بھی یقیناً ٹاپا سیدار ہوگی۔

⑨ معنی: سفینہ برگ گل: پھول کی پتی کو نشی بنالے۔ مورا ناتواں: کمزور بیویاں۔

مطلب: اس شعر میں اتحاد و یگانگت کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جس طرح منجھی منجھی بیویاں باہمی رفاقت کے ذریعے اپنی منزل تک جا پہنچتی ہیں اسی طرح سے مسلمان اتحاد و یگانگت پیدا کر کے معمولی ساز و سامان کے ساتھ طاقتور دشمن کے خلاف نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

⑩ اس شعر میں چمن، لالہ، کلی اور دل جیسے وہ استعارے ہیں جو اپنی معنویت کے لحاظ سے علی الترتیب دامن، خود غرض کروار، عوام اور بظاہر قوم پرستی کے حوالے سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جھوٹے رہنما عوام کے خیر خواہ بن کر پوری قوم کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

(11) فلسفہ وحدت الوجود کے حوالے سے کائنات اور اس کے تمام مظاہر کی بنیاد صرف رب ذوالجلال ہے۔ اس فلسفے کے ہمنوا ہونے کے ناطے اقبال کہتے ہیں کہ اہل دنیا نے تو خدا کے وجود کو بھی کئی نگہوں میں تقسیم کر دیا اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو خدا پر کون یقین کرے گا۔

(12) تغضلی سطح پر اس شعر میں اقبال قمری سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے جب قمری کو اس رمز سے آشنا کیا کہ کائنات کے تمام مظاہر جو آزاد تصور کیے جاتے ہیں۔ اس آزادی کے باوصف مقید ہیں تو جو عناصر اس مکالے کی سن گن لے رہے تھے، بول اٹھے کہ یہ شخص یقیناً ہمارے تمام راز ہائے درون پر وہ سے آگاہ معلوم ہوتا ہے۔

(13) خدا کے ہزاروں ایسے لوگ عاشق ہیں جو اس سے لو لگائے جنگلوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ انہوں نے باقی دنیا سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ طرز عمل نہ عشق الہی کا حامل ہے تا ہی حقوق العباد کے اصول سے ہم آہنگ ہے۔ میں تو خدا تک رسائی کے لیے خدا کے اس نیک اور پارسا بندے سے عشق کا قائل ہوں جو خدا کے بندوں سے محبت کرتا ہے۔

(14) اس شعر میں کہا گیا ہے زندگی میں تمام مصائب و مشکلات کو کوئی شکوہ کیے بغیر خندہ پیشانی سے قبول کر لینا چاہیے۔ اگر ان بے چینی اور اضطراب کا مظاہرہ کیا جائے تو یہ حوصلہ مندی اور بلند ہمتی کی

تو ہیں ہے۔

(15) معنی: ظلمت شب: رات کا اندھیرا۔ در ماندہ کارواں: چمڑا ہوا قافلہ۔

مطلب: ہر چند کہ میرا قافلہ منزل سے بھٹک گیا ہے لیکن میں اس تھکے ہوئے قافلے کو رستے کی تمام مشکلات کے باوجود اپنے ہمراہ لے کر منزل کی جانب عازم سفر ہوں گا۔ تاریک شب میں روشنی کے لیے میری آہیں چنگاریاں برسا سکیں گی اور میری ہر سانس شعلے اگلے گی۔ مراد یہ ہے کہ قوم راہ سے بھٹک چکی ہے۔ منزل کا کچھ اتنا پتہ نہیں۔ اس صورت میں اقبال کہتے ہیں کہ میں عزم و حوصلے کے ساتھ اس کی جانب منزل کی رہنمائی کروں گا۔

(16) معنی: غیر از نمود: نمود و نمائش کے سوا۔

مطلب: اگر اس دنیا میں تیری تخلیق کا مقصد زندگی کرنے اور نمود و نمائش کے سوا اور کچھ نہیں تو یہ بھی جان لے کہ جس طرح ایک شعلہ لمبے بھر کے لیے بھڑکتا ہے اور پھر بجھ کر رہ جاتا ہے اسی طرح تیری موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ مقصد یہ کہ دنیا میں حقیقی نمود و نمائش محض خدمت سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

(17) معنی: ستم کش انتظار: انتظار کے ظلم کی سختیاں۔

مطلب: غزل کے مقطع میں کہا گیا ہے کہ اقبال کا ٹھکانا کیا پوچھتے ہو۔ اس کی کیفیت پہلے کی مانند ہی ہے وہ تو کسی راہ گذر پر بیٹھا اپنے محبوب کا انتظار کر رہا ہو گا۔



094

بلاد اسلامیہ

اس حصے میں علامہ اقبال کی وہ طویل اور مختصر نظمیں شامل ہیں جو انہوں نے 1908ء کے بعد تخلیق کیں۔ یہ نظمیں مذہبی، سیاسی اور معاشرتی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ آخر میں علامہ کا کچھ طرفانہ کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس کلام میں وہ کسی حد تک اکبر الہ آبادی سے متاثر نظر آتے ہیں۔

سرزمینِ دلی کی مسجودِ دل غم دیدہ ہے ذرے زرے میں لو اسلاف کا خوابیدہ ہے
پاک اس اجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمیں
سوئے ہیں اس خاک میں خیرِ الائم کے تاجدار نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار
دل کو تڑپاتی ہے اب تک گری محفل کی یاد جل چکا حاصل، مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

ہے زیارت گاہِ مسلم گو جہان آباد بھی اس کرامت کا مگر حقدار ہے بغداد بھی
یہ چمن وہ ہے کہ تھا جس کے لیے سامانِ ناز لالہ صحرا، جسے کہتے ہیں تہذیبِ حجاز
خاک اس بستی کی ہو کیوں کر نہ ہمدوش ارم جس نے دیکھے جانشینانِ تہیبر کے قدم
جس کے غنچے تھے چمنِ سامان، وہ گلشن ہے یہی کائنات تھا جن سے روم، ان کا مدفن ہے یہی

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدہ مسلم کا نور ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طور
بجھ کے بزمِ ملت بیضا پریشاں کر گئی اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی
قبر اس تہذیب کی یہ سرزمینِ پاک ہے جس سے آج گلشنِ یورپ کی رگِ نمناک ہے

خطِ قسطنطنیہ، یعنی قیصر کا دیار ممدی امت کی سطوت کا نشانِ پایدار
صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمین بھی پاک ہے آستانِ مسندِ آرائے شہِ لولاک ہے
نکتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا تربتِ ایوبِ انصاریؑ سے آتی ہے صدا
اے مسلمان ملتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر سیکڑوں صدیوں کی کشت و خون کا حاصل ہے یہ شہر

وہ زمیں ہے تو، مگر اے خواب گاہِ مصطفیٰ اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
خاتمِ نبی میں تو تاباں ہے مانندِ تکیں جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی جانشینِ قیصر کے، وارثِ مسندِ جم کے ہوئے
نام لیا جس کے شاہنشاہِ عالم کے ہوئے بند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام
ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام فقط جاذبِ تاثر کی شعاعوں کا ہے تو
آؤ! یرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں، باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ خنجر بھی ہیں

زیرِ تشریحِ نظم ”بانگِ درا“ کے حصہ سوم کی اولین نظم ہے جو عملاً پانچ بند پر مشتمل ہے۔ اس امر کی

نشانہ ہی پہلے ہی کی جا چکی ہے کہ حصہ سوم کی تمام تخلیقات 1908ء کی ہیں اور ان میں اقبال کا وہ فکر و شعور گاہے گاہے نظر آتا ہے جس کے باعث اقبال اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر تسلیم کیے گئے۔ اس نظم میں انہوں نے دنیا بھر کے ان بڑے شہروں کی عظمت و رفتہ کی نشاندہی کی ہے جو ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی عظمت و شوکت کی آماجگاہ تھے۔ ملاحظہ ہو!

پہلا بند معنی: بلاد اسلامیہ: اس نظم میں دنیا کے پانچ اسلامی شہروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مسجد: مسجد کاہ۔ خیر الامم: بہترین امت۔

مطلب: اس بند میں اقبال ہندوستان کے اہم ترین شہروں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اس شہر عظیم کے لیے مسجد ریز ہوں کہ اس کے زوال کی کمائی دل کو شدید غم سے دوچار کیے ہوئے ہے۔ یہ وہی شہر ہے جس کے زورے زورے میں عظمت اسلاف کی داستانیں پوشیدہ ہیں۔ ہر چند کہ عظمت اسلام کی مظہر یہ سرزمین آج اجڑ چکی ہے تاہم اس سے جو یادیں وابستہ ہیں وہ بھلائے نہیں بھولتیں۔ دہلی کی خاک میں عالم اسلام کے وہ اعلیٰ مرتبت فرمانروا دفن ہیں جن کی حکومت پوری دنیا کے نظام کو مربوط رکھنے کا سبب بنی۔ ان فرمانرواؤں کے عہد میں جو اس شہر کی عظمت و شوکت تھی اس کے تصور سے ہی دل تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ ہر چند کہ یہ شان و شوکت اب قصہ ماضی بن چکی پھر بھی اس کی یاد دلوں میں باقی ہے۔

دوسرا بند معنی: زیارت گاہ مسلم: مسلمان بادشاہ دفن ہیں۔ کرامت: بزرگی۔ ارم: شہزاد کی بیانی ہوئی جنت۔

مطلب: زیر تفتیش میں اقبال بغداد کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بے شک دہلی اپنی جملہ خصوصیات کے سبب اہل اسلام کے لیے ایک زیارت گاہ کی حیثیت رکھتی تھی اس کے باوجود ہم اسلامی تاریخ کے اہم شہر بغداد کی عظمت و کرامت کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ بغداد وہ گلشن تھا جس پر کبھی سارا عالم اسلام فخر کرتا تھا۔ عربوں کی تہذیب نے اسی شہر نامہ ارم میں عروج و ارتقا کے مراحل طے کیے تھے۔ اس شہر کو خاک کو یوں بشت کی ہم منصب ہونے کی سعادت حاصل ہے کہ اس پر پیغمبر آخر الزماں کے پیرو کاروں اور جانشینوں کے قدم پڑتے رہے۔ یہی وہ شہر ہے جو اسلامی تدبیر و حکمت کا نشان تھا اور ہمیں پر وہ عظیم المرتبت تاجدار دفن ہیں جن کی ہیبت و سطوت سے سلطنت روم کے اولوالعزم فرمانروا بھی خوفزدہ رہا کرتے تھے۔

تیسرا بند معنی: قرطبہ: اندلس کا مشہور شہر۔ فروزاں: روشن۔ تاک گلشن: انجور۔

مطلب: دہلی اور بغداد کے علاوہ اندلس کا مشہور شہر قرطبہ بھی کسی زمانے میں عالم اسلام کی آنکھ کا تارا رہا ہے۔ خلافت عثمانیہ کے عہد میں یہ مشہور شہر اپنے علم و فضل اور شان و شوکت کے سبب بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس دور میں پوری تہذیب عملاً دم توڑ رہی تھی جب کہ قرطبہ ان کے لیے ایک ستارہ نور کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن جب خلافت عثمانیہ کو زوال ہوا تو اس شہر کی تہذیب بھی دم توڑ گئی جس کے باعث پوری ملت اسلامیہ کو شدید دھچکا پہنچا لیکن اس سے فائدہ یورپی تہذیب کو بھی پہنچا۔ قرطبہ کی سرزمین دیکھا جائے تو ملت اسلامیہ کی عظمت و شوکت کا قبرستان ہے جس کے باعث یورپی تہذیب کو زندگی ملی۔ مراد یہ کہ اہل یورپ نے قرطبہ میں انتہائی ترقی یافتہ اسلامی تہذیب سے پوری طرح استفادہ کیا۔

چوتھانہد معنی: خطہ قسطنطنیہ: مثانی سلطنت کا دار الحکومت۔ مہدی: ہدایت کرنے والا۔ سطوت: شان و شکوہ۔ شہ لولاک: حضرت رسول اکرم ﷺ۔

مطلب: اس بند میں اقبال دہلی، بغداد اور قرطبہ کے بعد ایک اور عظیم الشان شہر قسطنطنیہ کا ذکر کرتے ہیں جو سینکڑوں برس کی محاذ آرائی کے بعد قیصر روم سے سلطان محمد فاتح کے عہد میں تغیر کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اسی کے فتح کرنے والے سالاد کو جنت کی بشارت دی تھی۔ صحابی رسول مقبول ﷺ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا مزار بھی یہیں پر واقع ہے۔ قسطنطنیہ جو قیصر خاندان کے زیر تکلیف رہا وہ آخر کار سلطان محمد فاتح کی عظمت و شان کا آئینہ دار بن گیا۔

اقبال کہتے ہیں کہ یہ شہر بھی ہمارے لیے حجاز مقدس کی طرح محترم ہے اس لیے کہ یہ ایک مدت تک ان فرمانرواؤں کا مسکن رہا جنہیں حضور ﷺ کی جانشینی کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس خطے کی فضاء میں پھولوں کی خوشبو اور پاکیزگی رچی ہوئی ہے۔ یہاں صحابی رسول ﷺ حضرت ابوب انصاریؓ کا جو مزار واقع ہے یوں لگتا ہے اس سے آج بھی یہ آواز آرہی ہے کہ مسلمانو! اسنو! یہ عظیم المرتبت شہر ملت اسلامیہ کے قلب کی مانند ہے اس لیے کہ ہمارے عظیم المرتبت اسلاف نے اسے سینکڑوں برس کی نبرد آزمائی اور بے شمار جانوں کی قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا۔

پانچواں بند معنی: حج اکبر: حج دو ہیں۔ ایک حج اصغر، دوسرا حج اکبر۔ ولادت گاہ: پیدائش کی جگہ۔ ماوی: بنیاد کی جگہ۔ نقطہ جاذب: کھینچنے والا نقطہ۔

مطلب: اوپر کے اشعار میں اسلامی عظمت کے جن چار شہروں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کے بعد بلاد اسلامیہ کا باب، مدینہ منورہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا کہ جہاں پیغمبر آخر الزماں کی آخری آرام گاہ آج بھی مریخ خلافت بنی ہوئی ہے اور چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی ہر سال دنیا بھر سے آنے والے کروڑوں مسلمانوں کی زیارت گاہ بنی ہوئی ہے اس شہر بے مثال کی عظمت کا اندازہ اسی امر سے ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا مدفن مبارک اسی مقام پر موجود ہے۔

اقبال اس بند میں مدینہ منورہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تجھے یہ شرف حاصل ہے کہ تو ہمارے نبی ﷺ کی آخری آرام گاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے لیے تیرا نظارہ تو حرم کعبہ سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اگر کائنات کو ایک انگونٹھی سے تعبیر کر لیا جائے تو اس انگونٹھی میں تیرا وجود ایک گوہر تابدار کی مانند ہے۔ اسلام کی عظمت و تابندگی نے دیکھا جائے تو اسی مقام سے جنم لیا ہے۔

اے مقدس شہر! اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ اس شہنشاہ معظم کو تیرے دامن میں ہی راحت ملی جس کے دامن میں بلا شک و شبہ تمام اقوام عالم نے سکون محسوس کیا۔ مراد یہی ہے کہ آنحضرتؐ نے تیری ہی سرزمین کو اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر منتخب کیا۔ آنحضرتؐ کی شخصیت اس قدر عظیم تھی کہ دنیا بھر کے شہنشاہ ان کے پیروکار بن گئے اور پھر یہی لوگ قیصر اور جیشہ جیسے عظیم فرمانرواؤں کی جگہ لے سکے۔

ہر چند کہ اسلامی قومیت کا تصور کسی مخصوص خطے تک محدود نہیں پھر بھی اگر اسی حوالے سے دیکھا جائے تو بند و ایران اور شام کی بجائے مدینہ ہی وہ مقام ہے جو مسلمانوں کا مرکز نگاہ ہے۔ چنانچہ جب تک صبح عدم خشم کی طرح تیرا وجود باقی ہے ہم مسلمان بھی اسی طرح زندہ ہیں۔

ستارہ

095

قمر کا خوف کہ ہے خطرہ سحر تجھ کو مال حسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو!
 متاع نور کے لٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو؟ ہے کیا ہراس فنا صورت شرر تجھ کو!
 زمیں سے دور دیا آسمان نے گھر تجھ کو مثال ماہ اڑھائی قبائے زر تجھ کو
 غضب ہے پھر تری منہی سی جان ڈرتی ہے
 تمام رات تری کانپتے گزرتی ہے
 چمکنے والے مسافر! عجب یہ ہستی ہے جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی ہستی ہے
 اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادت مہر فنا کی نیند سے زندگی کی مستی ہے
 دواعِ غنجہ میں ہے راز آفرینش گل عدم، عدم ہے، کہ آئینہ وار ہستی ہے
 سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
 ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

*

اس نظم میں اقبال کا بنیادی تصور تغیر و انقلاب کے علاوہ مسئلہ جبر و قدر کی نشاندہی سے متعلق بھی ہے۔ یہ نظم محض آٹھ اشعار پر مشتمل ہے جن میں علامہ نے کمال فنی چابکدستی کے ساتھ اپنے نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے چنانچہ وہ ستارہ سے ہم کلام ہوتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

① سے ④ معنی: مال: انجام۔ ہراس: خوف۔

مطلب: اے ستارے! مجھے اتنا بتادے کہ کیا تو چاند کی روشنی سے خوفزدہ ہے یا پھر تجھے صبح ہونے کا خطرہ ہے کہ چاند کی روشنی میں تیری روشنی زائل ہو کر رہ جائے گی اسی طرح صبح عدم سورج کے طلوع ہونے کے سبب بھی تجھے کم و بیش اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ کہیں ایسا تو نہیں کہ تجھے اس حقیقت کا پتہ چل گیا ہے کہ حسن کا انجام آخر کیا ہوتا ہے؟ مراد یہ کہ ستارہ میں بھی ایک حسن ہوتا ہے اور زوال بلاخر حسن کا مقدر ہے سو اسی پس منظر میں یہ بات یہاں کہی گئی ہے۔

یا پھر ایسا تو نہیں کہ تجھے اپنے نور کی دولت کے لٹ جانے کا خطرہ ہے یا پھر یہ خیال تجھے کھائے جا رہا ہے کہ چنگاری کے مانند لمبے بھر میں اپنی روشنی سے محروم ہو جائے گا۔ اس انداز سے تجھے خوفزدہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ قدرت نے تجھے سج زمین سے کافی بلندی پر گھر عطا کیا ہے اور چاند جیسی روشنی بھی بخشی ہے اس کے باوجود حیرت یہ ہے کہ تجھ پر خوف طاری رہتا ہے اور تمام شب تو کانپتا رہتا ہے۔

⑤ سے ⑧ معنی: ولادت مہر: سورج کی پیدائش۔ راز آفرینش گل: پھول کی پیدائش کا راز۔ محال: ناممکن۔ ثبات ایک تغیر: یعنی ہمیشہ رہنے والا عمل ہے۔

مطلب: اے ستارہ تیری روشنی بجا! لیکن اس حقیقت کو فراموش نہ کر کہ یہ کائنات عجیب و غریب شے ہے۔ یہاں کی کیفیت تو یہ ہے کہ ایک شے کو عروج حاصل ہو تو زوال دوسری شے کا مقدر بن گیا۔ اس کی مثال کچھ یوں ہے کہ سورج کے طلوع ہوتے ہی لاکھوں ستارے اس کی تیز روشنی کے سبب ناپید ہو جاتے

ہیں۔ یوں سمجھ لے کہ جسے ہم فنا کے نام سے تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل زندگی کا ہی ایک دوسرا رخ ہے۔
 فتح کھل کر اپنی دیت کو بیٹھتا ہے اور بالا خرا یک ٹھٹھ پھول بجاتا ہے۔ بالفاظ دیگر غنچے کی موت عملاً پھول
 کی کی زندگی بن جاتی ہے۔ چنانچہ اس ساری صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا جائزہ لیا جائے تو
 یہ راز آشکار ہو کر سامنے آئے گا کہ ہم جسے موت کا نام دیتے ہیں وہ عملاً موت نہیں ہے اس کے برعکس
 زندگی کے اظہار کا نام ہے۔

سوائے ستارے! یہ جان لے کہ پوری کائنات میں کسی مرحلے پر بھی سکون و اطمینان کا حصول ممکن
 نہیں۔ ہاں اگر کسی چیز کو استقلال ہے تو اس کا نام تغیر اور تبدیلی کے سوا اور کچھ نہیں۔ مراد یہ ہے کہ اس
 کائنات کی بنیادی خصوصیت ہمہ وقت تغیر اور انقلاب ہے۔ اس نوع کی تبدیلیاں فطرت کے مظاہر کا
 بنیادی جزو ہیں۔

دو ستارے

096

آئے جو قراں میں دو ستارے کہنے لگا ایک دوسرے سے
 یہ وصل مدام ہو تو کیا خوب انجام خرام ہو تو کیا خوب
 تھوڑا سا جو مریاں فلک ہو
 ہم دونوں کی ایک ہی چمک ہو
 لیکن یہ وصال کی تمنا! پیغام فراق تھی سراپا
 گردش تاروں کا ہے مقدر ہر ایک کی راہ ہے مقرر
 ہے خواب ثابت آشنائی
 آئین جہاں کا ہے جدائی



پہلا بند معنی: قراں: برج۔

مطلب: اقبال نے معمول کے مطابق اپنی بیشتر نظموں میں زندگی کے چھوٹے بڑے مسائل کا ذکر کسی نہ
 کسی شے کے حوالے سے کیا ہے یہ نظم بھی اسی نوعیت کی حامل ہے جس میں دو ستاروں کے حوالے سے
 یہ امر واضح کیا ہے کہ جدائی اور فنا بلا خیر شے کا مقدر ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ نظم بھی سابقہ نظم
 سے ملتی جلتی ہے یعنی دو ستارے آسمان پر ایک برج میں یکجا ہوئے تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ ہماری یہ
 ملاقات مستقل حیثیت اختیار کر لے اور یہ گردش ختم ہو جائے تو کتنی اچھی بات ہو۔ اگر آسمان ہم پر
 قدرے مریاں ہو جائے اور ہماری روشنی یکجا ہو جائے تو ہماری قوت میں بھی اضافہ ہو سکتا ہے اور ہماری
 افادیت بھی زیادہ ممکن ہو سکتی ہے۔

دوسرا بند معنی: وصال: ملاپ۔ آئین: قانون۔

مطلب: لیکن ہوا یوں کہ دونوں ستاروں کے مابین مستقل وصال کی خواہش لمحے بھر میں فراق اور جدائی

کا پیغام بن کر رہ گئی۔ اس لیے کہ یہ امر تو ستاروں کا مقدر بن چکا ہے کہ ہر لمحے گردش کرتے رہیں اور مسافرت ان کا اڈھنا بچھونا ہو نیز یہ کہ اس گردش اور سفر میں ہر ستارے کا راستہ متعین ہے جس سے وہ کسی سرے پر بھی سر مو انحراف نہیں کر سکتا۔ کہ جدائی اور فنا ہر شے کا مقدر ہے۔

گورستان شاہی

097

آسمان بادل کا پنپنے خرقہ دیرینہ ہے کچھ مکدر سا جبین ماہ کا آئینہ ہے
چاندنی پھلکی ہے اس نظارۂ خاموش میں صبح صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں
کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی ربط قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی
باطن ہر ذرۂ عالم سراپا درد ہے

آہ! جولانگاہ عالمگیر یعنی وہ حصار دوش پر اپنے اٹھائے سیکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معور، اب سنان ہے یہ نمونی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے
اپنے سکان کسن کی خاک کا دل دادہ ہے
کوہ کے سر پر مثال پاساں استادہ ہے

ابر کے روزن سے وہ بالائے بام آسمان ناظر عالم ہے نجم سبز قام آسمان
خاکبازی وسعت دنیا کا ہے منظر اسے داستان ناکامی انساں کی ہے اذہر اسے
پے ازل سے یہ مسافر سوئے منزل جا رہا آسمان سے انقلابوں کا تماشا دیکھتا
گو سکوں ممکن نہیں عالم میں اختر کے لیے فاتحہ خوانی کو یہ ٹھہرا ہے دم بھر کے لیے
رنگ و آب زندگی سے گل بدامن ہے زمیں
سیکڑوں خوں گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے زمیں

خواہگم شاہوں کی ہے یہ منزل حسرت فزا دیدۂ عبرت! خراج اشک مہکلوں کر ادا
ہے تو گورستان مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے آہ! اک برگشتہ قسمت قوم کا سراپہ ہے
مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اس قدر جنبش مرگاہاں سے ہے چشم تماشا کو حذر
کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو اتر سکتی نہیں آئینہ تحریر میں

سوتے ہیں خاموش، آبادی کے ہنگاموں سے دور مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے نامبور
قبر کی عظمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبین مہتر فلک
کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مال جن کی تدبیر جہانبانی سے ڈرتا تھا زوال
رعب نفوری ہو دنیا میں، کہ شان قیصری نل نہیں سکتی غنیم موت کی یورش کبھی
بادشاہوں کی بھی کشت عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

شورش بزم طرب کیا! عود کی تقریر کیا دردمندان جہاں کا نالہ شبگیر کیا
عرصہ پیکار میں ہنگامہ شمشیر کیا خون کو گرمائے والا نعرۂ تکبیر کیا
اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں

سینہ دیراں میں جان رفتہ آ سکتی نہیں
روح مشت خاک میں زحمت کش پیدا ہے کوچہ گرد نے ہوا جس دم نفس، فریاد ہے
زندگی انسان کی ہے مانند مرغ خوش نوا شاخ پر بیٹھا کوئی دم، چھپایا، اڑ گیا
آہ! کیا آئے ریاض دہر میں ہم، کیا گئے زندگی کی شاخ سے پھولے، کھلے، مرجھا گئے
موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس سنگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

سلسلہ ہستی کا ہے اک بحر ناپیدا کنار اور اس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں مزار
اے ہوس! خون رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار یہ شرارے کا تبسم، یہ خس آتش سوار
چاند، جو صورت گر ہستی کا اک اعجاز ہے بنے سیمائی قبا محو خرام ناز ہے
جہنم بے انجم کی دہشتناک دعت میں مگر بیکسی اس کی کوئی دیکھے ذرا دقت مگر
اک ذرا سا ابر کا ٹکڑا ہے، جو متاب تھا
آخری آنسو ٹپک جانے میں ہو جس کی فنا

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار رنگبھائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بار
اس زیاں خانے میں کوئی ملت گردوں وقار رہ نہیں سکتی ابد تک بار دوش روزگار
اس قدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں دیکھتا بے اعتنائی سے ہے یہ منظر جہاں
ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار ذوق جدت سے ہے ترکیب مزاج روزگار
ہے نگین دہر کی زینت ہمیشہ نام نو
مادر کیتی رہی آ بستن اقوام نو!

ہے ہزاروں قاتلوں سے آشنا یہ رہ گزر چشم کوہ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور
معصوم بابل مٹ گئے، باقی نشان تک بھی نہیں دفتر ہستی میں ان کی داستاں تک بھی نہیں
آ دبایا مہر ایراں کو اجل کی شام نے عظمت یونان و روما لوٹ لی ایام نے
آہ! مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا

آسمان سے ابر آزاری اٹھا، برسا گیا
ہے رگ گل صبح کے اشکوں سے موتی کی لڑی کوئی سورج کی کرن شبنم میں ہے ابھی ہوئی
سینہ دریا شعاعوں کے لیے گوارہ ہے کس قدر پیارا لب جو مر کا نظارہ ہے
محو زینت ہے صنوبر، جو بہار آئینہ ہے غنچہ گل کے لیے باد بہار آئینہ ہے
نعرۂ زن رہتی ہے کوئلہ باغ کے کاشانہ میں چشم انسان سے نماں، پتوں کے عزلت خانہ میں
اور بلبل، مطرب رنگیں نوائے گلستاں جس کے دم سے زندہ ہے گویا ہوائے گلستاں

عشق کے ہنگاموں کی اڑتی ہوئی تصویر ہے
 باغ میں خاموش جلے گلستاں زادوں کے ہیں
 زندگی سے یہ پرانا خاکداں معمور ہے
 چٹیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح
 خامہ قدرت کی کیسی شوخ یہ تحریر ہے
 وادی کسار میں نعرے شاہ زادوں کے ہیں
 موت میں بھی زندگانی کی تڑپ مستور ہے
 دست طفل خفتہ سے رنگیں کھلونے جس طرح
 اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے
 ایک غم، یعنی غم ملت ہمیشہ تازہ ہے

دل ہمارے یاد عمد رفتہ سے خالی نہیں
 انگشتری کے بہانے ہیں یہ اجڑے بام و در
 دہر کو دیتے ہیں موتی دیدہ گریاں کے ہم
 ہیں ابھی صد ہا گھر اس ابر کی آغوش میں
 وادی گل خاک صحرا کو بنا سکتا ہے یہ
 ہو چکا گو قوم کی شان جلالی کا ظہور
 ہے گھر باقی ابھی شان جمالی کا ظہور

*

اقبال کی یہ طویل نظم ان دنوں کی یادگار تخلیق ہے جب بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں وہ حیدر آباد دکن کے دورے پر گئے۔ وہاں انہوں نے اور چیزوں کے علاوہ مقامی فرمانرواؤں کے مزار اور مقابر بھی دیکھے۔ انہی کے حوالے سے اس نظم کی تخلیق ہوئی جو خوبصورت ایجیری کی ایک درخشاں مثال ہے۔ یہ نظم بارہ بند پر مشتمل ہے۔

پہلا بند معنی: خرقہ دیرینہ: پرانی کدڑی۔ مکدر: کدورت والا یعنی میلا۔ حیرت فزا: حیرت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ مربوط: ساز۔ باطن ہر ذرہ: ہر ذرہ کا دل۔

مطلب: شاہی گورستان کا مظہر نامہ کچھ یوں ہے جیسے اس پر استلواہ آسمان نے کٹے پھٹے بادلوں کا بوسیدہ لباس پہن رکھا ہو۔ انہی بادلوں کے سبب چاند کی روشنی بھی مدھم بڑی ہوئی ہے۔ اس خاموش اور پرسکوت فضاء میں بادلوں کے سبب چاند اور تاروں کی روشنی بھی پھمکی پھمکی سی لگ رہی ہے۔ صبح صادق تو انجمنی شب کی آغوش میں ہی محو خواب ہے۔ یہاں جو درخت استلواہ ہیں وہ اس قدر خامشی اور سکوت کے عالم میں استلواہ ہیں کہ ان کی یہ خامشی دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ یہ خامشی دیکھا جائے تو فطرت کے کسی ساز موسیقی کی دھیمی سی لے ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس دنیا کا ہر ذرہ سر تپا باطنی درد اور کرب کا شکار ہے جب کہ یہ خامشی زندگی کے ہونٹوں پر ایک آہ سرد کی حیثیت رکھتی ہے۔

دوسرا بند معنی: جولا ننگاہ: تنگ و دو کا مقام۔ حصار: قلعہ۔ گورستان: قبرستان۔ سکان کسن: پرانے کین۔ استلواہ: کھڑا ہے۔

مطلب: اس بند کے اشعار میں اقبال گورستان شاہی کے قریب استلواہ اس عظیم الشان قلعہ کی نشاندہی کرتے ہیں جس کو فتح کرنے کے لیے 1687ء میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے گولکنڈہ کا

حاضر کیا تھا۔ اس قلعے کے گرد پیش کی زمین میدان جنگ بن گئی تھی۔ صدیوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے یہ قلعہ جو کبھی زندگی کی چل چل کا مظہر ہو گا آج اس پر اداسی چھائی ہوئی ہے۔ قلعہ کے چاروں اطراف پھیل ہوئی دیرانی فی الواقع یہاں کی گزری ہوئی زندگی کے قبرستان کی حیثیت رکھتی ہے۔ دیکھا جائے تو یہ قلعہ نہ صرف یہ کہ اپنے قدیم بایسوں کی خاک کا عاشق ہے بلکہ پہاڑ کے اوپر قبرستان کے محافظوں کی مانند ایستادہ ہے۔

تیسرا بند معنی: نجم: ستارہ۔ خاکبازی: مٹی سے کھیلتا۔ ازیر: حفظ: زبانی یاد۔

مطلب: ایک ستارہ جو آسمان کی بلند فضا میں چمک رہا ہے یوں لگتا ہے جیسے جھک جھک کر بادلوں کے سوراخوں میں سے جھانک رہا ہے دنیا کی وسعت کا نظارہ اس کے لیے ایک کھیل کی مانند ہے کہ اس کو تو انسانی ناکامیوں کی تمام داستانیں پوری طرح یاد ہیں۔ ہر چند کہ یہ ستارہ اپنی منزل کی جانب محو سفر ہے اس کے باوجود وہ آسمان کی بلندیوں سے ان انقلابات کا نظارہ بھی کر رہا ہے جو زمین پر برپا ہو رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس ستارے کا مقدر سفر ہے۔ چنانچہ اس کا کسی ایک مقام پر قیام ممکن نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ ایک لمحے کے لیے جو یہاں رک گیا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس قبرستان شاہی پر فاتحہ خوانی کر رہا ہے۔ یوں بھی یہ سرزمین زندگی کی چمک دمک کی مظہر ہونے کے علاوہ ایسے قبرستان کی حیثیت رکھتی ہے جس میں سینکڑوں تہذیبیں دفن ہیں۔

چوتھا بند معنی: حسرت فرا: حسرت بھرا۔

مطلب: کرب و غم میں اضافہ کرنے والی یہ سرزمین ایسے پر شکوہ حکمرانوں کی آرامگاہ ہے جس کا نظارہ ہی عبرتناک اور خون رلا دینے والا ہے مگر اسے خراج یوں ہی پیش کیا جاسکتا ہے اس لیے کہ یہ سرزمین لاکھ گورستان سہی! تاہم اس کا مرتبہ آسمان کے ہم پلہ ہے۔ یہ نہ بھول کہ یہ قبرستان اس قوم کا سرمایہ ہے جس کا مقدر بگڑ گیا ہے پھر بھی ان مقبروں کا شکوہ اس قدر حیرتناک ہے کہ ان پر نظر نہیں ٹھہرتی اور دیکھنے والا آنکھ جھپکانے کی جرات بھی نہیں کر سکتا۔

اقبال کہتے ہیں کہ گورستان شاہی کی یہ فضا ایک سرکردہ قوم کے ماضی کی ناکامی کی ایسی تصویر ہے جس سے ظاہر ہونے والے کرب کو محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس کرب کو فی الواقع احاطہ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔

پانچواں بند معنی: جہیں گستر: جہہ کرنے والا۔ غنیم موت: دشمن۔ یورش: حملہ۔ فغوری: بادشاہی۔

مطلب: وہ حکمران جن کو ان کی تشنہ تکمیل آرزوئیں اور خواہشات ہمیشہ مضطرب اور بے چین رکھا کرتی تھیں آج وہ آبادی سے کوسوں دور اس دیرانے میں خاموشی سے ابدی نیند سو رہے ہیں۔ جن کے چہرے سورج کی طرح روشن تھے اب وہ قبر کے اندھیروں سے دوچار ہیں۔ یہی وہ جلیل القدر فرمازداتھے جن کے دروازوں پر آسمان بھی سجدہ ریز ہوتا نظر آتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کے انداز حکومت سے زوال کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کیا ان شہنشاہوں کی عظمت کا یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ تماشہ شکوہ کے باوجود آج زمین ان کا اوڑھنا بچھوٹا ہے۔

چنانچہ اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ خواہ چین جیسی عظیم الشان سلطنت کے فرمانرواؤں کا رعب و دبدبہ ہو یا روم کے پرہیزگار شہنشاہوں کی شان و شوکت ہو۔ موت ایک ایسی دشمن ہے جس کا وار کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ چنانچہ یہ طے ہے کہ عام شخص ہو یا کوئی بادشاہ! اول و آخر قبر ہی اس کا آخری مسکن ہے اور کیسا ہی عظیم و پرہیزگار شخص ہو اس کی ابدی منزل قبر ہی ہے۔

چھٹا بند معنی: عود و برباد کی قسم کا ایک ساز۔ نالہ شبگیمو: رات کے وقت کی آہ و زاری۔

مطلب: چنانچہ یہ طے ہے کہ اس گورستان میں سونے والے بہادر اور اولوالعزم شہنشاہوں کو نہ تو عیش و عشرت کے ہنگامے ہی جگا سکتے ہیں نہ ساز و موسیقی کی صدائیں ہی بیدار کر سکتی ہیں۔ نہ ان مصیبت زدگان کی آہیں اور مٹھر کر سکتی ہیں ان بہادروں کو میدان جنگ میں تلوار زنی کے ہنگامے اور وہاں بلند ہونے والے تکبیر کے پر جوش نعرے بھی جگا نہیں سکتے۔ سچ تو یہ ہے ان ہمیشہ کے لیے خوابیدہ لوگوں کو اب نہ تو کوئی آواز ہی اٹھا سکتی ہے نہ ہی انہیں دوبارہ زندگی مل سکتی ہے۔

ساتواں بند معنی: زحمت کش بیدار: ظلم کا دکھ اٹھانے والی۔

مطلب: قبر کا عذاب تو ایسا ہے جسے جسم ہی نہیں بلکہ روح بھی برداشت کرنے پر مجبور ہے۔ جب بانسری میں سانس داخل ہوتا ہے تو یہی فریاد یا نغمے میں ڈھل جاتا ہے۔ اسی طرح حیات انسانی بھی ایک خوش الحان پرندے کی مانند ہے۔ پرندہ کسی شاخ پر بیٹھا، نغمے الاپے اور پھر اڑ گیا۔ ہم انسان! افسوس کہ اس دنیا میں شخص ایک پھول کی مانند آئے۔ شاخ سے نکلے، پھول بنے اور پھر مچھا کر رہ گئے۔ سو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ فقیر ہو یا امیر! کسی چھوٹے بڑے سے رعایت نہیں کرتی اس لیے کہ اس کی نظروں میں تو سب ہی برابر ہیں۔

آٹھواں بند معنی: خس آتش سوار: وہ تنکا جو آگ پر سوار ہو۔ سیمائی قبا: پارے کے رنگ کا لباس۔ محو خرام ناز: اپنی چال میں مست ہے۔

مطلب: زیر تشریح بند میں اقبال یوں گویا ہوتے ہیں کہ حیات انسانی ایک ایسے سمندر کی طرح ہے جس کا دوسرا کنارہ نہیں ہوتا لیکن سمندر کی طرح اس میں بھی بے شمار لہریں اور مد و جزر ہوتے ہیں جنہیں انسانی مقابلے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس دنیا میں زیادہ عرصے تک زندہ رہنے کی تمنا رکھنے والا ہمیشہ خون کے آنسو روتا ہے کہ یہ زندگی بلا شک و شبہ ناقابل اعتبار ہے۔ بنائیداری کے لحاظ سے اس زندگی کو محض چند لمحوں تک چمکنے والی چنگاری اور آگ کی لپیٹ میں آجانے والے ٹکے کے مماثل قرار دیا جاسکتا ہے۔

اور یہ آسمان پر جو چاند روشن ہے اسے زندگی کے حوالے سے رب ذوالجلال کا اعجاز قرار دیا جانا چاہیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ پارے جیسا سفید رنگ اور متحرک لباس اپنے آسمان کی وسعتوں میں اپنے سفر پر ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے۔ لیکن اس لمحے جب ستارے روپوش ہو جاتے ہیں تو آسمان کی دہشتناک فضا میں چاند کی بے مائیگی کا اندازہ کچھ اس طرح سے ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ایسا بادل نظر آتا ہے جس سے بارش کا آخری قطرہ بھی برس چکا ہو اور جو اپنی عمر طبعی کے مرحلے سے گزر چکا ہو۔

نواں بند معنی: زیاں خانے: نقصان کا گھر یعنی دنیا۔ گردوں و قار: آسمان جیسے رتبہ والا۔ بے اعتنائی: بے پروائی۔ ذوق جدت: نئی چیزیں پیدا کرنے کا شوق۔ آہستہ: حاملہ ہونا۔

طارِ دل کے لیے غم شہر پرواز ہے راز ہے انساں کا دل غم انکشاف راز ہے
غم نہیں غم روح کا اک نغمہ خاموش ہے

جو سرود بربط ہستی سے ہم آغوش ہے جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں
شام جس کی آشنائے نالہ "یا رب!" نہیں جس کا جام دل شکست غم سے ہے نا آشنا
ہاتھ جس کلچس کا ہے محفوظ نوک خمار سے عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے
کلفت غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

اے کہ نظم دھر کا اور اک ہے حاصل تجھے کیوں نہ آساں ہو غم و اندوہ کی منزل تجھے

ہے ابد کے نسخہ دیرینہ کی تمہید عشق عقل انسانی ہے فانی زندہ جاوید عشق
عشق کے خورشید سے شام اجل شرمندہ ہے عشق سوز زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے
رخصت محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر جوش الفت بھی دل عاشق سے کر جاتا سفر
عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں

ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی زندگانی ہے عدم تا آشنا محبوب کی

آتی ہے ندی جبین کوہ سے گاتی ہوئی آسمان کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئندہ روشن ہے اس کا صورت رخسار حور گر کے دادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور
نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے
جوئے سیلاب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی
ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے دو قدم پر پھر وہی جو مثل تار سیم ہے
ایک اصلیت میں ہے نہر روان زندگی گر کے رفعت سے ہجوم نوع انساں بن گئی

پہنچی عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم پستی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں
عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو
دامن دل بن گیا ہو رزم گاہ خیر و شر راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر
خضر ہمت ہو گیا آرزو سے گوشہ گیر فکر جب عاجز ہو اور خاموش آواز ضمیر
دادی ہستی میں کوئی ہمسفر تک بھی نہ ہو جاہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والوں کی جبین روشن ہے اس ظلمت میں جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں



اس نظم کا پس منظر یہ بتایا جاتا ہے کہ اقبال نے اسے قیام پاکستان سے قبل پنجاب کی مشہور شخصیت

مطلب: جملہ عناصر جن کا ذکر نظم کے پہلے اشعار میں کیا گیا ہے انہی کی طرح اقوام عالم کا وجود بھی کسی اعتبار کا حامل نہیں ہے۔ ان کا عروج ماضی کے حوالے سے ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ ہر قوم کا مقدر زوال سے عبارت رہا ہے۔ بالفاظِ وگر اس کائنات میں کوئی قوم کتنی ہی عظیم الشان اور بلند مرتبت ہو وہ بھی ابد تک قائم و دائم نہیں رہ سکتی اس کی تقدیر میں بالا خرقا ہونا ہی شامل ہے۔ اب تو یہ کائنات قوموں کے عروج و زوال کے متاعِ کر کی اس قدر عادی ہو چکی ہے کہ اس کو کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں اور اس منظر کو ہمیشہ بے اعتنائی سے دیکھتی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ کوئی بھی شے ایک ہی شکل میں اور ایک ہی انداز سے برقرار نہیں رہتی۔ زمانہ اتنا جدت پسند ہو چکا ہے کہ ہر روایت میں نت نئی تبدیلی کا خواہاں ہے۔ یہی سبب ہے کہ دنیا میں نئی نئی قومیں جنم لیتی رہتی ہیں اور عہد کا مزاج بدلتا رہتا ہے۔

دسواں بند معنی: کوہ نور: مشہور ہیرا۔ ابر آذاری: بہار کا بادل۔

مطلب: یہ کائنات ایک ایسی شاہراہ کے مانند ہے جہاں سے مختلف فرمانرواؤں اور عام انسانوں کے ہزار ہا قافلے گزرتے رہے ہیں اور تاریخی حیثیت کا حامل یہ کوہ نور ہیرا نہ جانے کتنے شہنشاہوں کے تاج کی زینت بن چکا ہے۔ آج مصر اور بائبل کی عظیم اور انتہائی قدیم تہذیبیں ہمیشہ کے لیے اس طرح مٹ کر رہ گئیں کہ ان کا نشان تک باقی نہیں ہے۔ تاہی ان کا کوئی نام لیا موجود ہے۔ ایران جیسے عظیم المرتبت شہنشاہِ فنا کے گھاٹ اتر گئے ان کی حکومتیں بھی تباہ و برباد ہو گئیں یہی ہمیں بلکہ وقت نے یونان اور روم جیسی اقوام کی عظمت و ہیبت کو بھی خاک میں ملا کر رکھ دیا۔

انہی تہذیبوں کی طرح مسلمانوں کی تہذیب بھی بالا خراس طرح حادثاتِ زمانہ کی شکار ہو کر رہ گئی جیسے کہ موسمِ بہار میں بادل پورے جوش و خروش کے ساتھ آتا ہے، برستا ہے اور پھر ناپید ہو جاتا ہے۔ یہی حال ملتِ اسلامیہ کی تہذیب کا ہے۔

گیارہواں بند معنی: مطرب: گانے والا۔ گلستاں زاداؤں: مراد درخت اور پودے۔ خاکداں: مٹی کا گھر یعنی دنیا۔ نشاطِ آباد: پیش و شادمانی کی ہستی۔

مطلب: اس پورے بند میں اقبال کی ایجری اور منظر نگاری انتہائی عروج پر ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ پھولوں پر صبح کے وقت شبنم کے قطرے اس انداز سے پڑے ہوئے ہیں کہ موتی کی لڑی کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ شبنم کے کسی قطرے میں سورج کی کرن الجھ کر رہ گئی ہے۔ سورج کی شعاعوں کے لیے سطحِ دریا ایک گہوارے کی مانند لگ رہی ہے اور اسی دریا کے کنارے پر ظلوعِ آفتاب کا منظر بڑا پیارا لگ رہا ہے۔

صنوبر کا درخت اس طرح سے اپنی آرائش میں مصروف ہے کہ ندی کا شفاف پانی اس کے لیے آئینہ بنا ہوا ہے۔ بالکل اسی طرح غنچے کے لیے بہار کی زندگی بخش ہوائیں آئینے کا کام دے رہی ہیں۔ باغ میں اپنے گھونسلے کے قریب کوئلہ نغمہ سرائی کر رہی ہے تاہم وہ پتوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی انسان کی آنکھ سے اوجھل ہے۔ اسی طرح بلبل بھی جو گلستاں کی فضاء کو اپنے خوبصورت نغموں سے رنگین بنائے ہوئے ہے جس کے سبب باغ میں آمدِ بہار کا احساس ہوتا ہے۔

یہ سارا منظر نامہ یوں لگتا ہے جیسے جذبہ عشق کی تصویر سے ہم آہنگ ہے۔ عملی سطح پر اس کو خاتمہ قدرت کے شوق تحریر سے عبارت قرار دیا جاسکتا ہے۔ رنگارنگ درخت باغ میں پرسکوت حالت میں المستعد ہیں اور پہاڑ کی وادیوں میں گزریوں کے نو عمر بچے کھیل کود اور نغمہ زنی میں مصروف ہیں۔ عملی سطح پر یہ اتنی قدیم دنیا قرنہا قرن گزر جانے کے باوجود زندگی کی رونقوں سے مامور ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ لوگ جو فنا کے گھاٹ ابھی کے اتر چکے ہیں ان کی موت میں بھی زندگی کی تڑپ چھپی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

موسم خزاں کے دوران ٹکفتہ پھولوں کی پتیاں اس طرح سے اڑا کر زمین پر گرتی ہیں جیسے سوئے ہوئے بچے کے ہاتھ سے کھلونے گر جائیں۔ ہرچند کہ اس دنیا میں بے اندازہ عیش و نشاط موجود ہے۔ اس کے باوجود ملت کی بربادی کا ایک ایسا غم ہے کہ جو ہمیشہ تازہ رہتا ہے۔

بار ہواں بند معنی: دیدہ گریاں: دیدہ گریاں کے موتی یعنی آنسو۔

مطلب: چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دل اپنے ماضی کی یادوں سے خالی نہیں ہو سکتے نای یہ امت اپنے عظیم المرتبت بادشاہوں کو فراموش کر سکتی ہے۔ یہ برباد شدہ بام و درنی الواقع ہماری انگلیاری کے لیے ہمانے بنے ہوئے ہیں ان کی مسلسل یاد سے ہی ہم ابھی تک اپنی سابقہ دانش و حکمت سے استفادہ کر رہے ہیں۔ اس کائنات کو بھی اپنے اس طرز علم سے درخشندگی عطا کر رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو ہم ایک گزرے ہوئے طوفان کے آخری بادل ہیں یعنی اپنے سلف کی غفلتوں کی آخری یادگار ہیں۔ ابھی تو ہمارے دامن میں بے شمار گوہر پوشیدہ ہیں اور ان خاموش سینوں میں بہت سی بجلیاں چھپی ہوئی ہیں۔ اب بھی ہم دشت و صحرا کو وادی گل میں تبدیل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور سوئے ہوئے کسانوں کو بیدار کر سکتے ہیں۔ ہرچند کہ ہماری شان و شوکت اور حکمرانی کا دور ختم ہو چکا ہے اس کے باوجود ادب، فنون اور تہذیبی ارتقا کا تصور باقی ہے۔

نمود صبح

098

ہو رہی ہے زیر و اماں اتق سے آشکار
پا چکا فرمت درود فصل انجم سے سپر
آسمان نے آمد خورشید کی پا کر خبر
شعلہ خورشید گویا حاصل اس کھیتی کا ہے
ہے رواں انجم سحر جیسے عبادت خانے سے
کیا سماں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی
مطلع خورشید میں مضمر ہے یوں مضمون صبح
ہے۔ ۲۔ دامان باد اختلاط انگیز صبح
جاگے کوئل کی آواں سے طائران نغمہ سنج
ہے ترنم ریز قانون سحر کا تار تار

معنی: دختر و شیرہ: کنواری بیٹی۔ درود فصل انجم: ستاروں کی فصل کاٹنا۔ کشت خاور: مشرق کا کمیت۔ گردوں: آسمان۔ شب زندہ دار: رات بھر جاگنے والا۔ اخلاط انگیز: میل جول پیدا کرنے والی۔ ترخم ریز: گانے والا 'الا اپنے والا۔ قانون: ایک قسم کا ساز۔

مطلب: زیر تشریح نظم میں اقبال نے غروب شب اور دن کے طلوع ہونے کے حوالے سے صبح کے وقت کا ذکر کیا ہے۔ پہلے شعر میں صبح کو رات اور دن کی کنواری بیٹی سے تعبیر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ رات ختم ہو رہی ہے اور افق کے دامن سے صبح نمودار ہو رہی ہے۔ آسمان پر جو درخشاں ستارے تھے وہ تمام شب اپنی ذمہ داری نبھا کر ڈوب چکے ہیں۔ اور مشرق کی جانب سے سورج طلوع ہو رہا ہے۔ آسمان کو جب آمد آفتاب کی خبر ملی تو اس نے تو شب کو رخصت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس عمل سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے ستاروں کی روشنی کو اب سورج کی تابندگی میں منتقل کر دیا ہے۔

صبح کا ستارہ اس لمحے اپنا سفر طے کر کے اس طرح منزل کی جانب روانہ ہو رہا ہے جیسے کوئی عبادت گزار ساری رات محو عبادت رہ کر سب سے آخر میں عبادت گاہ سے روانہ ہوا ہو۔ مراد یہ ہے کہ باقی ستارے تو پہلے ہی ڈوب گئے ہیں جب کہ صبح کا ستارہ سب سے آخر میں اپنا سفر ختم کر سکا ہے۔ اس لمحے افق سے جس طرح سورج کی کرنیں آہستہ آہستہ منعکس ہو رہی ہیں۔ ان کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ میان سے کوئی چمکدار کنوارا باہر نکال رہا ہے۔ سورج کے طلوع ہونے کے عمل میں صبح کا وجود یوں ظاہر ہو رہا ہے جیسے کہ بوتل سے شراب برآمد ہو رہی ہو۔ صبح دم جو خوشگوار ہوا چل رہی ہے اس میں اذان کی آواز اور مندروں کی گھنٹیوں کے نغمے یکجا ہو کر رہ گئے ہیں۔ کوئل کے نغموں سے تمام دوسرے پرندے بھی بیدار ہو گئے ہیں۔ غرض یہ کہ صبح اپنی تمام شان و شوکت کے ساتھ نمودار ہو گئی ہے۔

تضمین بر شعر انیسی شاملو

099

محبت میں ہے منزل سے بھی خوشتر جاوہ پیا کی
میر ہے جہاں درمان درد نا شکیبائی
زباں ہونے کو تھی منت پذیر تاب گویائی
شکایت تجھ سے ہے اے تارک آئین آبائی
کہ لیلیٰ میں تو ہیں اب تک وہی انداز لیلیائی
زمانے بھر میں رسوا ہے تری فطرت کی نازائی
کنشتی ساز، معور نواہائے کلیسائی
دل شوریدہ ہے لیکن صنم خانے کا سودائی
رہودی گوہرے از ما نثار دیگران کردی

بیش صورت باد سحر آوارہ رہتا ہوں
دل بیتاب جا پہنچا دیار پیر سنجہ میں
ابھی نا آشنائے لب تھا حرف آرزو میرا
یہ مرتد سے صدا آئی حرم کے رہنے والوں کو
ترا اے قیس! کیونکر ہو گیا سوز دروں لھنڈا؟
نہ ختم لا الہ تیری زمین شور سے پھوٹا
تجھے معلوم ہے غافل کہ تیری زندگی کیا ہے؟
ہوئی ہے تربیت آغوش بیت اللہ میں تیری
”وفا آموختی ازما“ بکار دیگران کردی

① سے ⑨ معنی: دیار پیر سنجہ: خواجہ معین الدین کی سرزمین اجیر شریف۔ درد نا شکیبائی: بے مبری کا دکھ۔ من: میر تاب گویائی: تقریر کی طاقت کا احسان اٹھانا۔ ختم: حج۔ کنشتی ساز: بیت خانہ کا ساز۔

نواہائے کلیسائی: گر بے کے نئے۔

مطلب: "انہسی شاملو" ایک ترک شاعر جس کا تعلق ایران سے تھا اقبال نے یہ اشعار اس کے ایک شعر کی تفسیر کے طور پر کہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میری کیفیت یہ ہے کہ جس طرح صبح کی ہوا سرگرداں رہتی ہے اسی طرح میں بھی بیشہ آوارہ پھرتا رہتا ہوں اس لئے کہ میرے نزدیک محبت کی انتہا تک پہنچنے سے کہیں بہتر سرگراں رہنا ہے چنانچہ اسی عالم میں پھرتا پھرتا حضرت معین الدین چشتی اجیری کے مزار پر پہنچ گیا۔ جہاں بے چینی اور اضطراب کا علاج میسر ہوتا ہے۔ وہاں پہنچ کر میں نے ابھی دعا کے لیے ہاتھ نہیں اٹھائے تھے نا ہی میں حرف مدعا زبان پر لایا تھا کہ قبر سے آواز آئی! کہ حرم کعبہ کو مسلمانوں سے یہ شکایت ہے کہ تم لوگ اپنے مذہبی عقائد کو ترک کر کے ان سے قطعی طور پر بے نیاز ہو گئے ہو۔

تم لوگ تو عشق حقیقی میں مجنوں کے مانند تھے کہ اس کے لیے لیلیٰ کا تصور ہی سب کچھ تھا چنانچہ دینی عقائد تو برقرار ہیں البتہ تم لوگ ہی ان کو نظر انداز کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ تمہارے دل تو بجز زمین کے مانند ہیں جہاں توحید کا بیج تو بویا گیا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا یہی وجہ ہے کہ تمہاری فطرت میں جو بانجھ پن موجود ہے اس کے سبب تم لوگ زمانے بھر میں رسوا ہو کر رہ گئے۔ تمہیں تو اس حقیقت کا علم بھی نہیں کہ تمہاری اصل زندگی کیا ہے۔ لگتا ہے کہ تمہارے ذلوں میں اسلام کی بجائے دوسرے مذاہب کے عقائد بار آور ہو رہے ہیں۔ ہر چند کہ تمہاری تربیت خدا کے گھر میں ہوئی ہے اس کے باوجود تمہارے دل بت خانوں کے شیدائی ہیں۔

تو نے وفا کا سبق تو ہم سے حاصل کیا لیکن اس وفا کو اغیار کے کام میں لایا۔ موتی ہم سے حاصل کیا قریان دوسروں پر کر دیا۔

فلسفہ غم

100

(میاں فضل حسین صاحب بیر سٹریٹ لاء لاہور کے نام)

گو سراپا کیف عشرت ہے شراب زندگی اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحاب زندگی
موج غم پر رقص کرتا ہے حباب زندگی ہے الم کا سورہ بھی جزو کتاب زندگی
ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ کھل ہی نہیں
جو خزاں نادیہ ہو بلبل وہ بلبل ہی نہیں
آرزو کے ذوق سے رنگیں ہے دل کی داستاں نغمہ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں
دیدہ دیتا میں داغ غم چراغ سینہ ہے روح کو سامان زینت آہ کا آئینہ ہے
حادثات غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینہ دل کے لیے گردِ طالع
غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطف خواب سے ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضرب سے

اور اپنے ہم جماعت سر فضل حسین کے والد کی وفات پر ایک مرنے کے طور پر کبھی تھی لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے ہر مرنے والے کا مریخ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ طویل نظم بیس اشعار پر چھ بند کی شکل میں ”بانگ درا“ کی اہم نظموں میں سے ایک ہے۔ فرماتے ہیں:

پہلا بند معنی: حساب: بادل۔ الم: رنج و غم۔ قرآن مجید کے پہلے پارہ کا نام۔ خزاں ناویدہ: جس نے خزاں نہ دیکھی ہو۔

مطلب: ہر چند کہ حیات انسانی سر تا پایکف و عشرت کے علاوہ مسرت و شادمانی کی متقاضی ہے اس کے باوجود اس میں غم و اندوہ اور آنسو بھی موجود ہیں۔ اگر غم و اندوہ کو ایک موج تصور کر لیا جائے اور زندگی کو حساب تو جان لوپائی کا یہ قطرہ موج غم پر رقص کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر زندگی کو ایک کتاب سے تعبیر کر لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ غم اس کتاب کا ایک اہم باب ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ کسی پھول میں ایک پتی بھی کم ہو جائے تو اسے مکمل پھول نہیں سمجھا جاسکتا۔ مزید برآں کسی بلبل کو خزاں سے واسطہ نہیں پڑا تو وہ بلبل کھلانے کی مستحق نہیں۔

دوسرا بند

عملی سطح پر انسانی دل کی داستان خواہشات اور تمناؤں کے خون سے رنگی ہوئی ہے یعنی انسانی خواہشات کی تکمیل ممکنات سے نہیں اسی طرح انسانی زندگی میں خوشی، غم کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اہل نظر کے لیے غموں کے داغ ان کے سینوں پر چراغوں کے مانند ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب دل سے آہ نکلتی ہے تو وہ درد کی ترنم کا سبب بن جاتی ہے۔ ایک طرح سے حادثات غم کے بغیر فطرت انسانی کو کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی نہیں بلکہ غم و ملال کی گرد دل کے آئینے پر غازہ کی مانند ہوتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ عالم شباب جو ہمیشہ کیف و سرمستی کے سبب ایک طرح محو خواب رہتا ہے اسے بیدار کرنے میں بھی غم کا بڑا عمل دخل ہے کہ یہ ساز اسی معزاب سے نغے پیدا کرتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں اگر دل کو ایک پرندہ تصور کر لیا جائے تو یہ غم کی کیفیت ہی ہے جو اس کی پرواز کے لیے پروں کا درجہ رکھتی ہے اور اگر انسان کے دل کو ایک راز سمجھ لیا جائے تو اس راز کا انکشاف غم کے باعث ہی ہوتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ غم کی کیفیت روح انسانی کے لیے ایک خاموش نغمے کی مانند ہے ایسا نغمہ جو سازوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے جو انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔

تیسرا بند معنی: انکشاف: راز: ہمیدہ کا کھانا۔

مطلب: جو شخص بوقت شام نالہ و فریاد نہیں کرتا اور شب کی تنہائی میں و فور درد کے سبب آنسو نہیں بہاتا جس کا دل غم کے سبب کھڑے کھڑے نہیں ہوا اور ساری عمر عیش و عشرت میں مصروف رہا۔ باغوں کے پھول توڑتے دقت جس کے ہاتھ ان کے کانٹوں سے محفوظ رہے اور جس کا عشق فرقت اور جدائی سے ہم کنار نہیں ہوا ہر چند کہ اس کے درد و شب غموں سے بے نیاز سہمی اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس کی نظروں سے زندگی کی تمام حقیقی پوشیدہ رہتی ہیں۔ چنانچہ اسے دوست! بے شک تجھے نظام کائنات سے پوری طرح آگاہی حاصل ہے اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ تیرے لیے غم و اندوہ سے عمدہ تر آہو نا زیادہ مشکل ثابت نہ ہو گا۔

چوتھا بند معنی: یا رب: خدا کا نام لینا یعنی فریاد کرنا۔ اشک کے کوکب: آنسوؤں کے تارے۔ نظم دہر کا اور اک: زمانے کے کاروبار سے آگاہی۔

مطلب: اس بند میں اقبال ایک دوسرے رخ سے اپنے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابدی سطح پر عشق انسانی بے شک ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے اس لیے کہ انسانی عقل و دانش تو فنا ہونے والی اشیاء میں سے ہیں۔ صرف جذبہ عشق ہی وہ جذبہ ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ یہی عشق ہے جو موت کی شکست کا باعث ہے لیکن یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ محبوب کی جدائی کا مقصد موت کے مترادف ہوتا ہے اور محبت کا جوش و جذبہ بھی محبت کرنے والے کے دل میں باقی نہیں رہتا تو اس پس منظر میں اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جانا چاہیے کہ اگر محبوب کی موت واقع ہو جائے تو اس کے سبب عشق تو فنا نہیں ہو جاتا بلکہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے یہ الگ بات ہے کہ اس لمحے عشق روح میں غم کی شکل میں محفوظ ہو جاتا ہے ختم نہیں ہوتا۔ اس طرح ماننا پڑے گا کہ جب تک عشق باقی ہے محبوب بھی باقی ہے گویا فنا ہونے کے باوجود محبوب زندہ رہتا ہے۔

پانچواں بند معنی: نغمہ دیرینہ: پرانی کتاب۔ عدم نا آشنا: جو عدم سے آشنا نہ ہو۔

مطلب: اس بند میں اقبال جو منظر نامہ پیش کرتے ہیں اس کے مطابق ایک ندی ہے جو پہاڑ کی چوٹی سے نغمے گاتی ہوئی رواں دواں ہے۔ یہی ندی بلند و بالا فضا میں محو پرواز پرندوں کو گانے کے لیے اکساتی ہے۔ اس ندی کا شفاف پانی ایک حور کے چہرے کی مانند مصفا ہے۔ وادی کی چٹانوں پر جس لمحے یہ پانی آئینے کی صورت میں گرتا ہے تو چور چور ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں پانی کے قطرے موتیوں کی مانند پیارے پیارے لگ رہے ہیں اور کبھی وہ ستاروں کی طرح نظر آتے ہیں۔

یہ ندی کی موتیں جو پارے کی مانند تھیں ریزہ ریزہ ہو کر منتشر ہو گئیں۔ جن سے ایسی بوندیں نمایاں ہو رہی ہیں جیسے کہ وہ کسی اضطراب اور بے چینی میں مبتلا ہوں۔ تاہم حقیقت یہ کہ ان قطروں کا انتشار عملی سطح پر باہمی ربط کا درس ہے اس لیے وہ قدم آگے بڑھنے کے بعد یہ قطرے مربوط ہو کر ایک بار پھر موجوں میں ڈھل جاتے ہیں اور انسانی ہجوم کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں کہ ان کی حقیقت ہی اصل میں یہی ہے۔ دراصل اس کائنات میں ہماری جدائی آئندہ باہمی ارتباط کی آئینہ دار ہے لیکن اس عارضی جدائی پر آنسو اس لیے بہاتے ہیں کہ ہم اسے مستقل سمجھ بیٹھے ہیں۔ گویا انسان جب فنا ہو کر ہم سے ہجرتا ہے تو عملی سطح پر یہ عارضی جدائی ہوتی ہے۔ اسی جدائی کے غم میں آنسو بہائے جاتے ہیں۔

چھٹا بند معنی: محصور: گمراہ ہوئی۔ رزم گاہ خیر و شر: نیکی اور بدی کا میدان جنگ۔ گوشہ گیر: تنہائی کے کوٹے میں بیٹھنے والا۔

مطلب: اس پوری نظم میں اقبال ”حیات بعد الممات“ کے فلسفے سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اسی باعث وہ آخری بند کے اشعار میں واضح طور پر اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بشر غم عشق دیکھا جائے تو جو لوگ موت سے ہم کنار ہو جاتے ہیں درحقیقت وہ فنا نہیں ہوتے اور روحانی سطح پر ہم سے جدا نہیں ہوتے۔ جس گمراہی انسانی عقل و دانش دنیاوی آلام و مصائب میں گمراہ جائے یا پھر جو انسانی تاریک رات میں چھپ جائے اور انسان بے بس ہو جائے قلب انسانی نیکی و بدی اور حق و باطل کی جنگ کا میدان بن کر رہ

جائے اور راہ کی تاریکیوں کے سبب منزل کی جانب سفر کرنا بھی دشوار ہو جائے۔ انسان اپنی جرات و ہمت اور حوصلے کے حوالے آرزوؤں اور تمناؤں سے کنارہ کش ہو جائے یہی نہیں بے بسی کا یہ عالم ہو کہ انسانی فکر اور ضمیر اپنی کارکردگی میں معطل ہو کر رہ جائیں اس کے علاوہ زندگی میں کوئی ہم خیال اور ہم سفر بھی باقی نہ رہے حتیٰ کہ تاریک شب میں رہنمائی کے لیے جتنوں کی محنتی روشنی تک موجود نہ ہو تو مرنے والوں کی پیشانیاں تاریکی میں اس طرح سے روشن ہو جاتی ہیں جس طرح کہ اندھیری رات میں تارے چمکتے ہیں اور ان کی روشنی مسافر کے لیے مشعل راہ کا کام دیتی ہے۔

پھول کا تحفہ عطا ہونے پر

101

وہ مست ناز جو گلشن میں جا نکلتی ہے کلی کلی کی زباں سے دعا نکلتی ہے
 اہلی پھولوں میں وہ انتخاب مجھ کو کرے! کلی سے رشک گل آفتاب مجھ کو کرے
 تجھے وہ شاخ سے توڑیں زہے نصیب ترے تڑپتے رہ گئے گلزار میں رقیب ترے
 اٹھا کے صدمہ فرقت وصال تک پہنچا تری حیات کا جو ہر کمال تک پہنچا
 مرا کنول کہ تصدق ہیں جس پہ اہل نظر مرے شباب کے گلشن کو ناز ہے جس پر
 کبھی یہ پھول ہم آغوش دعا نہ ہوا کسی کے دامن رنگیں سے آشنا نہ ہوا
 گلہفتہ کر نہ سکے گی کبھی بہار اسے
 فردہ رکھتا ہے گلچیں کا انتظار اسے

*

① سے ② اس نظم کے مطالعے سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے یہ نظم اپنی اس محبوبہ کے لیے لکھی تھی جس نے انہیں تحفہ کے طور پر پھول بھیجے تھے۔ یہ امر ہمیشہ سے صیغہ راز میں ہی رہا کہ ان کی یہ محبوبہ کون تھی؟ چنانچہ نظم کے پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ وہ اپنے ناز و انداز میں مست رہنے والی محبوبہ جب کبھی پھول توڑنے کے لیے باغ میں جا نکلتی ہے تو اس کے لیے وہاں موجود ہر کلی کے لبوں سے دعائیں نکلتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ اس امر کی تمنا کرتے ہوئے رب ذوالجلال سے دعا کرتی ہے کہ یہ دوسری کلیوں کو چھوڑ کر میرا انتخاب ہی کرے۔ اس صورت میں میرا وجود پھول تو الگ رہے سورج کے لیے بھی باعث رشک بن جاؤں۔

③ سے ④ اس شعر میں اقبال کلی سے براہ راست مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ یہ تیری خوش قسمتی ہے کہ میرا محبوب تجھے شاخ سے توڑ لیتا ہے۔ اس کے اس عمل پر باغ میں جو کلیاں تیری رقیب تھیں وہ یقیناً حسد کے مارے تڑپ کر رہ گئی ہوں گی۔ ہر چند کہ تجھے شاخ سے جدا کی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا لیکن میرے محبوب کے ہاتھوں کے لمس سے تیری عظمت انسانی کمال تک پہنچ گئی۔

⑤ سے ⑦ معنی: تصدق: قربان۔ ہم آغوش: بغل گیر۔ فردہ: غمگین۔

مطلب: اے کلی! اس حقیقت کو جان لے کہ میری محبوب بھی کنول کے پھول کی مانند ہے جس کو دیکھتے ہی ہر شخص اس کا والد و شیدا بن جاتا ہے اور میری جوانی پر یقیناً اس پر فخر کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کبھی

اس کی خواہش کی تکمیل نہیں ہو سکی تھی وہ کسی کے دامن رنگین سے اب تک ہم آغوش ہو سکا ہے۔
اس کتول کے پھول کو کبھی بہار یعنی خوشی راس نہ آسکے گی۔ وہ ہمیشہ کسی گلچیں کا خطرہ رہتا ہے۔

ترانہ ملی

102

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
تینوں کے سائے میں ہم بل کر جواں ہوئے ہیں
مغرب کی داویوں میں گونجی ازاں ہماری
باطل سے دبے والے اے آسمان نہیں ہم
اے گلستان اندلس! وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اے موج و جلہ! تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
اے ارض پاک! تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم
سلار کارواں ہے میر حجازِ اپنا
اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا
ہوتا ہے جاہ پیا پھر کارواں ہمارا



① سے ③ اقبال کہتے ہیں کہ چین، عرب اور ہندوستان یہ سب ہمارے ملک ہیں۔ ہم مسلمان ہیں اور سارا جہان ہمارے وطن کے مانند ہے۔ اس لیے کہ مسلمان اپنے عقیدے کے اعتبار سے کسی مخصوص خطہ زمین کو خود سے وابستہ نہیں سمجھتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال سارے جہان کو اپنا وطن شمار کرتے ہیں۔ ہمارے سینوں میں خدا کی وحدانیت کا تصور ایک امانت کی طرح محفوظ ہے اور اس وحدانیت کو کوئی ختم نہیں کر سکتا اس لیے ہمارا نام و نشان بھی کوئی نہیں مٹا سکتا۔ جن دنوں دنیا بھر میں کفر و الحاد پھیلا ہوا تھا اور ہر سمت بت خانے ہی بت خانے تھے اس وقت خدا کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیمؑ نے خدائے وحدت کی عبادت کے لیے اولین عمارت تعمیر کی جسے خانہ کعبہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ ہم مسلمان خانہ کعبہ کے محافظ ہیں اور یہ ہماری حفاظت کرتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے سبب ملت اسلامیہ میں نظم و ضبط اور وحدت کا تصور برقرار ہے۔ یہ نہ ہو تو ہم ریزہ ریزہ ہو کر رہ جاتے۔

④ سے ⑥ معنی: خنجر ہلال کا یعنی اسلامی جہاد جس کا نشان چاند تارا ہے۔

مطلب: یہ حقیقت ہے کہ ہم کمواریوں کے سائے میں بل کر عفوان شباب تک پہنچے اور اس امر سے کئے انکار ہو گا کہ ملت اسلامیہ کا سبز چم ہلال اور ستارے سے سجا ہوا ہے چونکہ ہلال بڑی حد تک خنجر سے مشابہ ہوتا ہے اس لیے اسے اقبال نے اسی سے تشبیہ دی ہے اور اسے اپنے قومی نشان سے تعبیر کیا ہے۔ ہر چند کہ مسلمان عساکر کا بنیادی مرکز عرب تھا اس کے باوجود ہم اپنی قوت اور ہمت کے فطری مغربی

ممالک پر یلغار کرتے رہے۔ یہاں ہماری اذانیں گونجتی رہیں۔ یوں یہ امر واقعہ ہے کہ ان علاقوں میں بھی ہمارے عساکر کی یلغار کے سامنے کوئی لشکر بھی نہ ٹھہر سکا اور ہم جو تھے وہ یورپی ممالک میں فتوحات حاصل کرتے رہے۔

⑦ سے ⑧ معنی: گلستان اندلس: ہسپانیہ کا ایک شر۔ وجہ: عراق کا مشہور دریا۔ ارض پاک: عرب، حجاز۔

مطلب: اس شعر میں اقبال آسمان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے فلک کج رفتار یہ جان لے کہ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو باطل سے خوف زدہ ہو کر رہ جائیں۔ اس ضمن میں تو اس امر سے بخوبی آگاہ ہے کہ تو ایک بار نہیں سو بار ہمارا امتحان کر چکا ہے۔ اس کے ثبوت میں اندلس اور وجہ کو ہماری جرات و حوصلے کی داستانیں پیش کی جاسکتی ہیں کہ یہاں کبھی مسلمان سلاطین کا اقتدار پورے عروج پر تھا۔ اور گرد و پیش کی وادیاں ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی زد میں ہوتے تھے۔

⑨ سے ⑩⑪⑫ معنی: جاوہ پیا: چلنے کے لیے تیار۔

مطلب: اے سرزمین حجاز! کیا تو اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ ہم نے تیری عزت و حرمت کے لیے ہمیشہ اپنی جانیں قربان کی ہیں اور آج بھی تیری رگوں میں ہمارا خون رواں دواں ہے۔ اے سرزمین حجاز! تو جانتی ہے کہ تیرا والی و آقا ہمارے قافلے کا سالار اول ہے یعنی حضور سرور کائنات ﷺ کی تعلیمات کی روشنی سے ہم رہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔ یہی نام عملاً اسم اعظم کی طرح ہے جو ہمارے بے چین اور مضطرب دلوں کو سکون و اطمینان سے ہم کنار کرتا ہے۔

نظم کے اس مقطع میں اقبال کہتے ہیں کہ میں نے جو یہ ملی ترانہ تخلیق کیا ہے وہ ایک ایسی تھکنی کی مانند ہے جو دوران سفر ہمیشہ رہنمائی کا سبب بنتی ہے۔ اس الارم کے ساتھ یوں سمجھ لیجیے کہ ہمارا قافلہ ایک بار پھر سے بڑی مستعدی اور نظم و نسق کے ساتھ اپنی منزل کی جانب سرگرم سفر ہو رہا ہے۔ دیکھا جائے تو زیر تشریح ملی ترانہ کے کم و بیش تمام اشعار شاعر کے اس جذبے کے مظہر ہیں جو ملت اسلامیہ کو سرگرد حثیت کی حامل بنانے کے لیے اس کے دل میں موجزن تھا۔

وطنیت

103

(یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے)

اس دور میں سے اور ہے جام اور ہے جم اور ساتی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے غارت گر کاشانہ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اہلام ترا دیں ہے تو مصطفوی ہے

نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے
ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی رہ بحر میں آزاد وطن صورت مابی
ہے ترک وطن سنت محبوب الہی دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے
اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے کمزور کا گھر ہوتا ہے عارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بنتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کتنی ہے اس سے

*

پہلا بند معنی: پیرامن لباس۔

مطلب: یہ نظم اس اعتبار سے خاصی اہم ہے کہ اس میں اقبال نے وطنیت کے حوالے سے واضح طور پر اپنا سیاسی نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ یہ نظم عملاً چار بند پر مشتمل ہے۔ فرماتے ہیں۔
یہ دور جس میں ہم زندہ ہیں وہ اپنی نئی روایات کے ساتھ برسر عمل ہے یعنی پرانی اقدار مٹ رہی ہیں اور نئی قدریں جنم لے رہی ہیں۔ تہذیب کے اجارہ دار رہنماؤں نے ایسی روش کو فروغ دیا ہے جو ظلم اور اتفاقات دونوں کیفیتوں سے ہم آہنگ ہے چنانچہ دوسری تہذیبوں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی اپنی تہذیب کو چھوڑ کر ایک نیا کعبہ بنالیا ہے یعنی ملت اسلامیہ نے اپنے تہذیب و کلچر کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کو اپنالیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جدید تہذیب کا مشہور بت تراش آزر اب نئے بت تراشنے میں لگن ہے۔ چنانچہ اس نے اب تک جو بت تراشنے ان میں سب سے بڑا اور بلند وبالا بت ”وطن“ کا ہے۔ اس بت کو جو لباس پہنایا ہے وہ مذہب اور عقیدے کے لیے کفن کی حیثیت رکھتا ہے یعنی وطن کی پرستش مذہب اور عقائد کے منافی ہے۔

دوسرا بند معنی: تہذیب نوی: نئی تہذیب۔ نظارہ دیرینہ: پرانا نظارہ۔

مطلب: نئی تہذیب سے وطنیت کا تصور عبارت ہے اور یہ ایسا تصور ہے جو آنحضرتؐ کے دین اور ان کی تعلیمات کی نفی کرتا ہے لیکن اے دین محمدیؐ کے پیروکار! توحید ایسی قوت ہے جس نے تجھے ہر مرتلے پر تقویت پہنچائی ہے۔ حیرا وطن کوئی مخصوص خطہ ارض نہیں بلکہ عملی سطح پر اسلام ہی تیرا وطن عزیز۔ تباہی تیری نسبت کسی اور شخصیت سے ہے بلکہ تو تو حضرت محمد مصطفیٰؐ کا پیروکار ہے چنانچہ تجھ پر لازم ہے کہ چودہ سال کی قدیم شان و شوکت اور جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے وطنیت کے تصور کو تباہ کر دے۔

تیسرا بند معنی: قید مقامی: زمین کے چھوٹے چھوٹے حصوں میں قید۔

مطلب: اقبال اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے ملت اسلامیہ کے پیروکاروں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے فرزند توحید! اس حقیقت کو جان لے کہ اگر کوئی ایک مخصوص خطہ ارض کا امیر اور قیدی ہو کر رہے

جائے تو اس کا منطقی نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اگر تو اس کائنات کو ایک سمندر کی مانند جان لے تو یہاں تیری بود و باش ایک مچھلی کی طرح ہونی چاہیے کہ مچھلی پانی کی حدود میں کسی ایک مقام پر نہیں ٹھہرتی۔ یہ تیری ذمہ داری ہے کہ نبوت کی صداقت کی گواہی دے یعنی فرمان محمدی کے مطابق وطن کے تصور کی نفی کرا یوں سیاسیات کے حوالے سے بے شک وطن کا تصور مختلف ہے لیکن ارشاد نبوی کے حوالے سے وطن ایک بے معنی شے ہے۔

چوتھا بند معنی: رقابت: دشمنی۔

مطلب: دنیا بھر کی قوموں کے مابین رقابت کا جذبہ وطنیت کے سبب ہی پیدا ہوا ہے۔ اسی کے سبب تجارت کا مقصد بھی دوسرے ممالک کو تسخیر کرنا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا برائی ہوگی کہ سیاست میں صداقت اور سچائی کا جذبہ اگر ناپید ہے تو اس کا باعث بھی وطنیت کا تصور ٹھہرتا ہے۔ جو لوگ اور قومیں کمزور ہوتی ہیں ان کو تباہ و برباد کرنے میں بھی اس تصور کا بڑا حصہ ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اس کے سبب مخلوق خداوندی مختلف قوموں میں بٹ کر رہ گئی ہے۔ اسلامی تصور قومیت کی جڑ کاٹنے کا باعث بھی یہی ہے۔

ایک حاجی مدینے کے راستے میں

104

قافلہ لوٹا گیا صحرا میں اور منزل ہے دور
ہم سفر میرے شکار دشمن رہزن ہوئے
اس بخاری نوجوان نے کس خوشی سے جان دی
خنجر رہزن اسے گویا ہلال عید تھا
خوف کہتا ہے کہ ”یثرب کی طرف تہانہ چل“
بے زیارت سوئے بیت اللہ پھر جاؤں گا کیا؟
خوف جاں رکھتا نہیں کچھ دشت پیائے حجاز
گو سلامت محل شامی کی ہمراہی میں ہے
آہ! یہ عقل زیاں اندیش کیا چلاک ہے
اور تاثر آدمی کا کس قدر بیباک ہے

*

① سے ④ معنی: دشمن، خنجر۔ زہر بھرا پیالہ۔

مطلب: علامہ نے یہ نظم ایک حاجی کے بیان کی روشنی میں کہی ہے جو حج بیت اللہ کے بعد زیارت کے لیے اپنے قافلے کے ہمراہ مکے سے مدینے جا رہا تھا۔ راستے میں رہزنوں نے نہ صرف یہ کہ اہل قافلہ کو لوٹ لیا بلکہ جن لوگوں نے مزاحمت کی ان کو قتل بھی کر دیا۔ چنانچہ اقبال یوں گویا ہوتے ہیں کہ رہزنوں نے صحرا میں قافلے کو لوٹ لیا ہے اور ابھی ہم منزل سے کوسوں دور ہیں۔ حاجی کہتا ہے کہ میرے کئی ہم سفر رہزنوں کی لکڑیوں کا نشانہ بن گئے اور ان کے خوف کے سبب جو لوگ بچ گئے تھے وہ واپس بیت اللہ کی

جانب روانہ ہو گئے۔ لیکن قافلے میں سے ایک بخاری نوجوان نے رہزنوں کے خلاف بڑی جرات و ہمت کے ساتھ نبرد آزمائی کی اور بالا خرشات کا رتبہ حاصل کر لیا۔ ظاہر ہے کہ شہادت موت نہیں بلکہ ابدی زندگی سے عبارت ہے۔ ایک رہزن کا خنجر اس بخاری نوجوان کے لیے ہلال عید کے مانند تھا۔ اس لمحے بھی اس کے لبوں پر مدینہ اور توحید کا نغمہ تھا۔

⑤ سے ⑨ معنی: مدفون میثرب: وہ پاک ذات جو مدینہ میں دفن ہے۔ مراد ہے حضرت رسول اکرم ﷺ۔ مکمل شامی: خلاف کعبہ لانے والا وہ قافلہ جو شام سے آتا تھا۔ جانکاہی: محنت۔

مطلب: حاجی کہتا ہے کہ ان رہزنوں کا خوف مجھے مدینے کی جانب تھما جانے سے روکتا ہے لیکن شوق زیارت کا تقاضا ہے کہ مسلمان ہونے کے ناطے اپنی منزل کی جانب بڑی جرات اور بیباکی سے اپنا سفر جاری رکھوں۔ اگر مدینے میں روضہ رسول مقبول کی زیارت کے بغیر ہی واپس مکہ چلا گیا تو ان لوگوں کو کیسے منہ دکھا سکوں گا جو عاشق رسول ہیں۔ یوں بھی دشت حجاز میں سفر کرنے والوں کو جان کا خوف نہیں ہوتا۔ مدینے میں حضور کی ہجرت میں بھی یہی راز پوشیدہ ہے۔ اگرچہ شامی مکمل کے ساتھ یہ سفر تحفظ کا احساس دلاتا ہے لیکن عشق کی لذت تو خطروں میں ہی چھپی ہوتی ہے۔ افسوس کہ عقل انسانی ہمیشہ خسارے کے انداز میں سوچتی ہے۔ جب کہ انسان کا جذبہ عشق نڈر اور بیباک ہوتا ہے۔

قطعہ

105

کل ایک شوریدہ خواب گاہ نئی پہ رو رو کے کہہ رہا تھا کہ مصر و ہندوستان کے مسلم بنائے ملت بنا رہے ہیں
یہ زائرانِ حرم مغرب ہزار دہرہ بنیں ہمارے نہیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تھکے سے آتشا رہے ہیں
غضب ہیں یہ ”مرشدانِ خود ہیں“ خدا تری قوم کو پہچائے بکاڑ کر تیرے مسلمانوں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں
نے گا اقبال کون ان کو یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

*

معنی: شوریدہ: دیوانہ۔ بنائے ملت: ملت کی بنیاد۔ مرشدانِ خود ہیں: صرف اپنی عزت اور منافع پر نظر رکھنے والے۔

مطلب: زیر تشریح قطعہ یوں تو محض چار اشعار پر مشتمل ہے تاہم ان اشعار میں اقبال نے ایک ایسا نکتہ بیان کیا ہے جس کو ان کی فکر کے حوالے سے ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ فرماتے ہیں:
کل ایک شوریدہ سر یعنی دیوانہ انسان مزار رسول مقبول پر کھڑا ہوا آہ و زاری کرتے ہوئے فریاد کر رہا تھا کہ حضور دیکھیے! یہ جو ہندوستان اور مصر کے مسلمان ہیں ان کا کردار اس قدر منفی ہے جو مسلم قومیت کی تباہی و بربادی کا باعث بن کر رہ گیا ہے۔ یہ مغربی تمدن و تمدن پر ایمان رکھنے والے لوگ ہمارے رہنما بننے کی کتنی بھی کوشش کریں وہ ہمارے وہبر اس لیے نہیں بن سکتے کہ آپ کی تعلیمات سے بے بہرہ ہیں۔

یہ لوگ تو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر خود ساختہ رہنما بنے بیٹھے ہیں۔ خداوند تعالیٰ قوم کو ان کے کردار

یہ لوگ تو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر خود ساختہ رہنما بنے بیٹھے ہیں۔ خداوند تعالیٰ قوم کو ان کے کردار سے بچائے کہ یہ لوگ مسلمانوں کو صحیح راہ سے بھٹکا کر محض اپنے وقار کو بلند کرنے میں سرگرداں ہیں۔ یہی لوگ تو آج ملت اسلامیہ کے زوال کا سبب بنے ہوئے ہیں۔

آخری شعر میں اقبال اپنے نظریات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب تو زمانہ بدل گیا ہے۔ تہذیب بدل گئی ہے اور تم ہو کہ اپنی شاعری کے حوالے سے پرانی باتیں دہرا رہے ہو۔ آج کے دور میں آخر کون ان باتوں کو سنے گا؟

شکوہ

اکتیس بند پر مشتمل ”شکوہ“ اقبال کی ان معرکہ الارا طویل نظموں سے بے حد اہم نظم ہے جسے اس صدی کی انتہائی مقبول تخلیق سے تعبیر کیا جائے گا تو بے جا نہ ہو گا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس نظم میں اقبال مکالمہ تو رب ذوالجلال سے کرتے ہیں لیکن ان کا لہجہ معمول سے بھی زیادہ تند و تیز ہے۔ ”شکوہ“ ہی وہ نظم ہے جس کے حوالے سے اقبال پر کفر کے فتوے بھی عائد کیے گئے اور بیسویں صدی کے آغاز میں اس کی اشاعت پر بھی خاصی لے دے ہوئی۔ یہاں تک کہ انہیں اپنے دفاع میں ”جواب شکوہ“ جیسی نظم بھی لکھنا پڑی۔ جس کا ذکر اگلے صفحات میں آئے گا۔ زیر تشریح نظم ”شکوہ“ فکری سطح پر ہی نہیں فنی اور تکنیکی بنیاد پر بھی ایک بلند پایہ نظم ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

کیوں یاک رہنوں سود فراموشی ہوں فکر نہ کرے کہوں مخموش ہوں

نارے بیل کے سنوں اور پتہ تن گوش ہوں ہم نوائیں بھی کی کل ہو گئے خاموش ہوں

جڑا آ زمری تاب سخن ہے مجھ کو

شکوہ اللہ سے حاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے سب شبہ تسلیم میں شور ہیں ہم قصہ درد سنتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

ساز خاموش ہیں فریاد سے شور ہیں ہم نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم

اے خدا! شکوہ اربابِ فاج بھی سن

خوارِ حاکم تھوڑا سا کلام بھی سن

تھی تو موجود ازل سے ہی فی اسے قدیم پھول تھاریں ہیں پر نہ پریشان تھی شمیم

شرط انصاف ہے صہا لطیف عسیم بوئے گل پھیتی کس طرح جو ہوتی نہ عسیم

ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی

ورنہ امت ترے محبوب کی دیوانی تھی؟

ہم سے پہلے تھا عجیب تر جہاں کا منظر
کہیں مسجود تھے تھے کھڑے کہیں مسجود شجر

خواب پر محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی اُن دیکھے خدا کو کیونکر

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوتِ بازوئے کسم نے کیا کام ترا

بس ہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی
ایل چیں چین میں ایران میں ساسانی بھی

اسی سوے میں آباد تھے یونانی بھی
اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی

پر ترے نام پہ تلوار اٹھاتی کس نے

بات جو بڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے

تھے ہیں ایکے سے کمر آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں

دیں اذانیں کبھی بویہ کے کلیساؤں میں
کبھی افیتے کے پتے ہوئے صحراؤں میں

شانِ انصوں میں نہ جیتی تھی جہاں داروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کے لیے
اور مرنے تھے ترے نام کی عظمت کے لیے
تھی کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لیے
سرکھ بھرتے تھے کیا دہریوں کی لت کے لیے؟

قوم اپنی جو زرو مال جہاں پر مرتی
بُت فروشی کے عوض بُت شکنی کیوں کرتی

مُل نہ سکتے تھے الرجناب میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میدان سے اٹھ جاتے تھے
تجھ سے کس شمع کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا جینیئے ہم تو پے لڑ جاتے تھے

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے

زخیرِ بربھی سے پیامِ نیا ہم نے

تو ہی کہہ دے کہ اٹھاڑا درخبر کس نے
شہرِ قصیر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے
کاٹ کر رکھ دیے نقار کے لشکر کس نے

کس نے ٹھنڈا کیا آتشِ کدہِ ایران کو؟

کس نے پھر زندہ کیا تذکرہِ یزداں کو؟

کون سی قوم فقط تیری طلبگار ہوئی
اور تیرے لیے زحمت کشں بیکار ہوئی
کس کی شمشیر جہاں لیر جہاں دار ہوئی
کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی

کس کی سیت کے صنم سے مئے رستے تھے
منہ کے بل کر کے ہوا اللہ احد کہتے تھے

آگیا عین لڑائی میں اگر وقت ناز
قبلہ ہو گئے میں بوسن آتی قوم حجاز
ایک ہی صف میں لکڑے سوائے محمود ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نوا
بندہ و صاحب محتاج و غنی ایک ہوتے

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے
محفل کو ن سماں میں سحر شام بھیجے
مے توحید کو لے کر صفت جام پھرے
اور سلوم ہے تجھ کو، کبھی ناکام پھرے
دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوٹے ہم نے
کوہ میں دشت میں لے کر ترا پیغام بھیجے

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوٹے ہم نے
بحرِ غلمات میں ڈرا دیے لھوٹے ہم نے

صفحہ دہرے بالکل کو بنایا ہم نے
نوع انسانِ غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے لعبے کو جبینوں کے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ فادار نہیں

ہم فادار نہیں تو دلدار نہیں!

امتیں اور بھی ہیں ان میں کلمہ بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں سب سے پندار بھی ہیں
ان میں کلمہ بھی ہیں غافل بھی ہیں شیار بھی ہیں
سیکڑوں میں کلمے نام سے سیرار بھی ہیں

جستیں ہیں بی اغیار کے کاشانوں پر

برق لرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

بُت صہنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان لگتے
ہے خوشی ان کو کہ سب کے نگہبان لگتے
منزلِ دہرے اونٹوں کے حدی خوان لگتے
اپنی بعلوں میں دباتے سوتے آن لگتے

خندِ زنِ لفر ہے احساسِ تجھے ہے کہ نہیں

اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

یہ شکایت نہیں ہیں ان کے غمزانے معمور
نہیں منسل میں جنصیات بھی کرنے کا شعور

قہر تو یہ ہے کہ کانبرا کو بدیں جو قصور
اور یہاں کے سماں کو فقط وعدہ حور

اب وہ الطاف نہیں ہم یہ عنایات نہیں

بات یہ کیسے کہ پہلی سہیارات نہیں

کیوں مسلمانوں میں ہے ولت دنیا نایاب
تیر قنڈرت تو ہے جس کی نہ حد ہے حساب

تو جو چاہے تو اٹھے سینہ صحرا سے حباب
رہبر و شہت ہے سیلی زدہ موج سراب

طعنِ اغیار ہے رسوائی ہے ناوار ہی ہے

کیا تے نام یہ مرنے کا عوض خوار ہی ہے

بنی غیار کی اب چاہنے والی دنیا
رہ گئی اپنے لیے ایک خیالی دنیا

ہم تو رخصت ہوئے اوکوں نے سنبھالی دنیا
پھر نہ کہنا ہوئی تو حیسے حرف الی دنیا

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں انام ہے

کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ ہے جام ہے

تیرھی محفل بھی لٹی چائے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی لٹیں صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلا بھی گئے
اے میٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

اے عشاق گئے وعدہ و نذر لے کر

اب انھیں ٹھونڈا چراغِ زیا لے کر

درویش بھی وہی قیس کا پہلو بھی وہی
نجد کے دشت و جبل میں مہم آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی حسن کا جادو بھی وہی
امت احمد مرسل بھی وہی، تو بھی وہی

پھر یہ از روئی غیب کیا معنی

اپنے شیداؤں پر یہ چشمِ غضب کیا معنی

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربی کو چھوڑا؟
بُت لاری پیشہ کیا، بُت شکنی کو چھوڑا؟
عشق کو، عشق کی اشفتہ سرفی چھوڑا؟
رسمِ سلمان و اویس قرنی کو چھوڑا؟

اگل تجسیر کی سینوں میں بیٹھتے ہیں

زندگی مثلِ بلالِ حبشی رکھتے ہیں

عشق کی خیر وہ پہلی سی اور ابھی نہ سی 192
جادو پیسا کی تسلیم و خیر ابھی نہ سی
مضطرب دل صفت قبلہ نہ ابھی نہ سی
اور پابند سی آئین نہ ابھی نہ سی

کبھی ہم کئے کبھی غیروں شے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہر جانی ہے

سربساراں یہ کیا دین کو کامل تو نے
اک لشکے میں سزاؤں کے لیے دل تو نے
آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے
پھونک دی گرمی خسار محض تو نے
آج کیوں سینے پہلے شہر آباد نہیں

ہم وہی سوختہ سماں ہیں تجھے یا نہیں؟

واورنجی بد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا
قیس دوانہ نظارہ محض نہ رہا
حوصلہ وہ نہ ہے ہم نہ رہے دل نہ رہا
گھر یہ اُجڑا ہے کہ تُو رونق محض نہ رہا

اے خوش آن روز کہ آئی بوجہ ناز آئی

بے حجب باز نہ سوئے محض بازاری

بادشہ غیر پیش میں لبِ جُبیٹے
سُنّتے ہیں حجابِ کلمفِ نعلِ کُلو کو بیٹھے

دو ہر سنگارِ گلزار سے یک سو بیٹھے
تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ حُجُو بیٹھے

اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خودِ افروزی دے

برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

قومِ آوارہ عنانِ تابے پھر سُوئے حجاز
لے اڑا بس بے پرو کو مذاقِ پرواز

مضطربِ باغ کے مرغِ غنچے میں ہوئے نیا
تُوڑا چھیر تو دے تَشَنُّہِ مضاربِ ہمساز

نغمے بیتاب ہیں تا روں سے نکلنے کے لیے

طوِ مضطر ہے اُسی اک میں جس نے کے لیے

مشکلیں اُمتِ مرغوم کی آساں کر دے
مُؤَبِّہِ یاد کو ہمدوشِ سیماں کر دے

جنسِ نایابِ محبت کو پھرازاں کر دے
ہند کے ویرِ شینوں کو سماں کر دے

جُجے خوں می جلد از حسرتِ دیرینہ ما

می تپد مالہ زبِ شکر کہ سینہ ما

نوبے کل لے گئی بریز چمن از چمن کیا قیامت کہ خود پھول ہیں غماز چمن!

عبدالستار سواٹوٹے قیاس از چمن اڑ گئے ڈالیوں سے زمر نہ پڑ از چمن

ایک بل ہے کہ ہے مجور غم ایک

اس کے سینے میں ہے نغموں کا قلاطم ایک

قمریاں شاخ صنوبر سے گریزاں بھی نہیں پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی نہیں

وہ پرانی روئیں باغ کی ویراں بھی جو ہیں ڈالیاں سپہرین برگ عیاں بھی نہیں

قید موسم سے طبیعت ہی آزاد اس کی

کاش گلشن میں صحبت کوئی فرما د اس کی!

لطف مرے میں ہے باقی نہ مزا بھینے میں کچھ مزا ہے تو یہی نوج بگر پنے میں

کتنے بتاب ہیں جو ہرے آئینے میں کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں

اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں

داغ جو سینے میں کھتے ہوں وہ لائے نہیں

جاگنے والے اسی بانگِ دُائے دل ہوں

چاکِ اسنِ بیلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں

پھر اسی بادۂ دیرینہ کے سایے دل ہوں

یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں

عجیبی سے تم تو کیا ہے تو حجازی ہے مری

نغمہ ہندی سے تم تو کیا ہے تو حجازی ہے مری!



سہلا بند معنی: زیاں کار: اپنا نقصان کرنے والا۔ سود فراموش: اپنے نفع سے غافل۔ فکر فردا: کل کی فکر۔ غم دوش: ماضی کا غم۔ نالے: رونا۔ ہمہ تن گوش: پوری طرح متوجہ۔ ہمنوا: دوست۔ جرات آموز: دلیری سکھانے والی۔ تاب سخن: قوت گفتار۔ خاکم بدہن: میرے منہ میں خاک۔

مطلب: نظم کا آغاز خاصے تند و تیز لہجے میں کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ زندگی میں نقصان اٹھاؤں اور فوائد حاصل نہ کروں۔ یہ بھی بے معنی بات ہے کہ عصر موجود کی فکر میں تو گھلتا رہوں اور مستقبل کی طرف دھیان نہ دوں۔ کیا یہ مضحکہ خیز امر نہیں ہے کہ بلبلوں کی نالہ و فریاد تک ہی خود کو محدود رکھوں اور اس کی بجائے کسی دوسری جانب ہی خود کو متوجہ رکھوں۔ رب ذوالجلال نے تو مجھے ایسی قوت گویائی عطا کی ہے جو بڑی جرات اور حاصلے کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ”خاکم بدہن“ میں اب اپنے پالنے والے سے ہی شکوہ و شکایت کر رہا ہوں۔

دوسرا بند معنی: شیوہ تسلیم: اطاعت کی عادت۔ ارباب وفا: اہل وفا و فادار لوگ۔ خوگر حمد: خدا کی تعریف کرنے کے عادی۔

مطلب: یہ امر حقیقت پر مبنی ہے کہ ہم پیغمبر اسلام کے پیروکار رضائے الہی کے مطابق زندگی گزارنے کے عمل میں خاصی شہرت رکھتے ہیں پھر بھی حالات نے اس قدر مجبور کر دیا ہے کہ اپنے درد کا قصہ بیان کرنا اب ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ بے شک ہماری ہستی ایک ساز خاموش کی مانند ہے کہ دل ہے کہ فریاد سے معمور ہے، چنانچہ اس صورت میں نالہ و فریاد لبوں تک آجائے تو اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے بلکہ یہ تو ایک طرح سے ہماری مجبوری ہے۔

چنانچہ اے رب ذہلجلال! ہم جو ہمیشہ تیری حمد و ثنا میں مصروف رہتے ہیں۔ اب انہی وفادار لوگوں سے تھوڑا سا شکوہ بھی سن لے کہ ہم جو ہمیشہ سے تیری حمد و توصیف کے عادی رہے ہیں اب ان سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے۔ کہ یہ ایک درد مند دل سے نکلی ہوئی ایسی آواز ہے جو حقیقت حال سے تعبیر کی جانی

تیسرا بند معنی: ازل: وہ زمانہ جس کی ابتداء نہیں۔ بوئے گل: پھول کی خوشبو۔ جمعیت خاطر:

مینان قلب۔ اے خدا! بے شک تیری ذات قدیم تو ازل سے ہی موجود ہے اس کے باوجود تیری ذات ایک ایسے پھول کی مانند تھی، ہوا نہ ہونے کے باعث جس کی خوشبو چمن میں پھیلنے کے امکانات نہ تھے۔ اے مہربان و کریم انصاف کا تقاضا تو اس سوچ میں مضمر ہے کہ اگر ہوا موجود نہ ہو تو پھول کی خوشبو باغ میں کسی طور بھی نہیں پھیل سکتی۔ یہ ملت اسلامیہ ہی تھی جس نے تیرا پیغام عام کیا۔ ہم اگر تیرا پیغام لے کر دنیا بھر میں مارے مارے پھرتے تھے تو یہ پریشانی اور سرگردانی ہمارے لیے وجہ تسلی تھی۔ ورنہ تیرے پیغمبرؐ کی یہ

امت دیوانی تو نہ تھی کہ در بدر پھرے۔ چوتھا بند معنی: معبود: جس کی عبادت کی جائے۔ خوگر: عادی۔

مطلب: ملت اسلامیہ سے قبل تو اے خدا! تیری دنیا کی عجیب و غریب کیفیت تھی۔ کہیں تو پتھروں کو اور کہیں لوگوں نے درختوں کو اپنا معبود بنایا ہوا تھا اور یہ لوگ انہی کی پرستش کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ان اشیا کو اپنا خالق سمجھنے کا عادی ہو چکا تھا جس کے وجود کو خود محسوس کر سکے۔ اس صورت میں

تجھے کون مانتا کہ جو ہمیشہ نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔

یہ حقیقت بھی تیرے علم میں ہے کہ ان دنوں کوئی شخص بھی تیرا نام لینے اور تیری عبادت کرنے کا قائل نہ تھا۔ یہ صرف اہل اسلام کی قوت ایمان اور قوت بازو ہی تھیں جن کے سبب کائنات کے گوشے گوشے میں تیرا نام عام ہو گیا اور ہر طرف تیری عبادت ہونے لگی۔

پانچواں بند معنی: سلجوق: سلجوقی خاندان۔ معمورے: آبادی۔ نصرانی: عیسائی۔

مطلب: اس بند میں اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے قبل اس دنیا میں ترکوں کا قبیلہ سلجوق بھی تھا اور توران کے طول و عرض میں تورانی بھی موجود تھے۔ چین جیسے وسیع و عریض ملک میں چینی باشندے بھی مقیم تھے اور ایران ساسانیوں کی شوکت و جلال کا مظہر تھا۔ پھر یہاں یونانی بھی رہتے تھے۔ اسی دنیا میں یہودی اور نصرانی بھی رہتے تھے۔ اس کے باوجود تیرے نام کے تحفظ کی خاطر یہ تو بتا تلوار کس نے اٹھائی اور تصور توحید سے بغاوت کرنے والوں کے خلاف مسلمانوں کے علاوہ کون نبرد آزما ہوا۔

چھٹا بند معنی: معرکہ آراؤں: جنگجو۔ کلیساؤں: گرجا۔ جہاند اروں: بادشاہ۔

مطلب: اے معبود حقیقی ہم مسلمان ہی تھے جو ساری دنیا میں تیرے مخالفین کے مقابل نبرد آزما رہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے کبھی ہم دشمن کے خلاف صحراؤں میں اور کبھی دریاؤں اور سمندروں میں جا کر صف آرا ہوئے۔ کبھی یورپی ممالک کو فتح کر کے وہاں کے کلیساؤں میں جا کر اذانیں دیں اور نغمہ توحید سنایا۔ اور کبھی افریقہ کے پتے ہوئے صحراؤں میں پہنچ کر آوازۂ حق بلند کیا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو بڑے بڑے شان و شوکت والے سلاطین کی عظمت مرعوب نہ کر سکتی تھی اس لیے ہم تو تلواروں کی چھاؤں میں کلمہ پڑھنے کی جرات اور حوصلہ رکھتے تھے۔

ساتواں بند معنی: تیغ زنی: تلوار چلانا۔ سر بکف: جان ہتھیلی پر رکھنا۔ بت شکنی: بت توڑنا۔

مطلب: اے خدائے ذوالجلال! ہم مسلمان تو اپنے حریفوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے جیا کرتے تھے اور تیرے نام کی عظمت کے لیے زندگی قربان کر دیتے تھے۔ جہاں تک ہماری تیغ زنی کا تعلق تھا وہ محض

اپنی حکومتوں کے تحفظ کی خاطر نہیں تھا۔ تاہی ہم دولت کے لیے دنیا بھر میں اپنا سر ہتھیلیوں پر لے کر پھرتے تھے۔ اگر ہماری قوم مال و دولت پر مرقی تو بت شکنی کیوں کرتی۔
آٹھواں بند معنی: سرکش: باغی۔

مطلب: ہم مسلمان تو وہ حوصلہ مند لوگ تھے جب میدان جنگ میں پہنچ گئے تو فتح حاصل کیے بغیر واپس نہ پلٹے۔ انسان تو انسان ہم تو وہاں شیروں کے پاؤں بھی اکھاڑ دیا کرتے تھے۔ اگر تیرے خلاف کوئی بغاوت پر آمادہ ہوتا تو ہم اس کے خلاف ڈٹ جاتے اور پھر تلوار تو الگ رہی ہم لوگ تو توپ کے مقابل بھی سینہ سپر ہو جاتے۔ اے مالک حقیقی! یہ بتا کہ ہمارے علاوہ توحید کا علم بلند اور کس نے کیا ہم تو تیرا یہ پیغام زیر خنجر بھی سنایا۔ آخری مصرع میں علامہ کا اشارہ نواسمہ رسول حضرت امام حسینؑ کی جانب ہے جنہوں نے میدان کربلا میں حق کی فتح کے لیے اپنا سر کٹوا دیا۔

نواں بند معنی: شہر قیصر: روم کی سلطنت۔ یزداں: نیکی کا خدا۔

مطلب: اے خدا اتنا بتا دے کہ یہودیوں کی مشہور بستی خیبر میں القدس کا دروازہ کس نے تنہا اکھاڑ پھینکا۔ ایک روایت کے مطابق یہ دروازہ اتنا وسیع و عریض اور مضبوط تھا کہ اسے کم و بیش سوا افراد مل کر بند کیا کرتے اور کھولا کرتے تھے۔ تاریخ اسلام کا یہ ایک اہم واقعہ ہے کہ شیر خدا حضرت علیؑ ابن ابی طالب نے جنگ خیبر کے دوران تنہا یہ دروازہ اکھاڑ پھینکا تھا۔ جس کے بعد لشکر اسلام نے باسانی اس انتہائی مضبوط قلعے کو تسخیر کر لیا۔ قیصر روم کے عظیم شہر قسطنطنیہ کو کس نے فتح کیا۔ وہ کون تھے جنہوں نے ایسے نافرمان لوگوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ جو مخلوق ہونے کے باوجود خالق بن بیٹھے تھے اور یہ بھی بتا دے کہ

کفاروں کے لشکروں کو کن لوگوں نے تباہی سے دوچار کیا۔ جس دور میں ایران میں آگ کی پرستش کی جاتی تھی اور وہاں کے لوگ اسی واسطے سے آتش پرست کہلاتے تھے ان کے آتشکدوں کو ہمیشہ کے لیے بجھا دینے والے کون لوگ تھے۔ چنانچہ اس عمل کے بعد ذکر توحید کو از سر نو کس نے زندہ کیا؟

دسواں بند معنی: زحمت کش پیکار: جنگ و جدل کی تکلیف۔ صنم: بت۔

مطلب: اے خدا! یہ بتا کہ ملت اسلامیہ کے علاوہ اور کون سی قوم تھی جس نے تجھ سے محبت کی اور تیری خاطر ہمیشہ میدان کارزار میں سرگرم عمل رہی۔ وہ کس قوم کی تلوار تھی جس نے ساری دنیا کو تسخیر کیا اور اس پر حکومت کی۔ کس کے نعرۂ تکبیر سے دنیا بیدار ہوئی اور نیک و بد کی تمیز سیکھی۔ وہ کون سی قوم تھی جس کے خوف سے بت بھی سمے ہوئے رہتے تھے اور ان کو سامنے پا کر سجدے میں گر جاتے اور تیری وحدانیت کا اقرار کر لیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوم مسلمانوں کے علاوہ کوئی اور نہ تھی۔

گیارہواں بند معنی: زمیں بوس: زمین کو بوسہ دینا مراد سجدہ کرنا۔ بندہ: غلام۔ غنی: دولت مند۔

مطلب: اے معبود حقیقی! تو اس امر سے یقیناً آگاہ ہے کہ میدان جنگ میں زبردست نبرد آزماؤں کے دوران تیری عبادت یعنی نماز کا وقت آگیا تو مسلمان عسا کرنے دشمن کی تلواروں کی پروا کیے بغیر خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے اپنی صفیں سیدھی کر لیں اور سجدہ ریز ہو گئے۔ اس دوران ان عسا کر میں بندہ و آقا کی تمیز مٹ گئی اور دوران نماز آقا و غلام، امیر اور غریب سب کا فرق ختم ہو گیا اور سب برابر ہو گئے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تیری سرکار میں پہنچ کر یہ سب لوگ ایک ہو گئے۔

بارہواں بند معنی: محفل کون و مکاں: مراد دنیا۔ بحر ظلمات: بحر اوقیانوس۔

مطلب: تجھے معلوم ہے کہ ایک عرصے تک مسلمان تیرا پیغام لے کر ہمہ وقت ساری دنیا میں پھرتے رہے اور ہر فرد کو دعوت توحید دیتے رہے۔ تیرا پیغام لے کر تو وہ پہاڑوں اور صحراؤں میں پھرتے رہے اور اس امر کا تو تجھے علم ہی ہے کہ اس عمل میں کبھی ناکام ہوئے نہ وہاں سے ناکام لوٹ کر آئے۔ اے آقا! تجھے علم ہے کہ صحرا تو الگ رہے ہم نے تو دریا بھی نہیں چھوڑے اور بحر اوقیانوس تک میں اپنے گھوڑے دوڑا دیئے۔

تیر ہواں بند معنی: باطل: کفر۔ جبینوں: ماتھا۔

مطلب: ہم مسلمانوں نے اپنی جدوجہد اور قربانیوں سے باطل کو مٹا کر سچائی کا بول بالا کر دیا۔ اور انسان کو دوسرے انسان کی غلامی سے نجات دلائی۔ تیرے کعبے سے بتوں کو نکال کر اپنی پیشانیوں سے آباد کیا۔ تیرا قرآن اپنے سینوں میں محفوظ کر کے رکھا۔ اس کے باوجود تجھے یہ گلا ہے کہ ہم تیرے وفادار بندے نہیں ہیں۔ مگر یہ جان لے کہ ہم وفادار نہیں تو تو نے ہماری کونسی دل دہی کی ہے؟ یعنی ہم مسلمانوں نے تو تیرے لیے ہر ممکن قربانی دی جب کہ تیرا سلوک نمایاں ہے۔

چودھواں بند معنی: کاشانوں: قیام گاہ۔

مطلب: اے خدا! بے شک اس دنیا میں ملت اسلامیہ کے علاوہ اور بھی کئی قومیں آباد ہیں۔ ان میں نیک لوگ بھی موجود ہیں اور گنہگار بھی! ایسے لوگ بھی ہیں جو انتہائی عجز و انکساری کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور ایسے افراد بھی موجود ہیں جو انتہائی مغرور و متکبر واقع ہوئے ہیں۔ ان میں کامل بھی ہیں ہوشیار بھی اور غفلت شعار بھی موجود ہیں۔ اور صد ہا ایسے لوگ ہیں جو تیرا نام لینا پسند نہیں کرتے اور تجھ سے کد رکھتے ہیں لیکن صورت یہ ہے کہ ہمارے دشمنوں پر تو تیری رحمت کا نزول ہوتا ہے لیکن ہم

مسلمانوں پر تو عذاب ہی نازل ہوتا رہتا ہے۔

پندرہواں بند معنی: منزل و ہجر: دنیا کی منزل۔ حدی خواں: ساریاں۔ خندہ زن: تسخر کرنے والا۔

مطلب: چنانچہ اب تو کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ ہمارے دشمن علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کا تو خاتمہ ہو گیا ان کو بڑی مسرت ہے کہ جو لوگ کعبہ کے نگہبان تھے وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ وہ لوگ جو قافلے میں اونٹنوں کے ساتھ نغے گاتے سفر کرتے تھے، چلے گئے۔ صرف یہی لوگ نہیں بلکہ اپنے ہمراہ قرآن کو بھی بغلوں میں دبائے روانہ ہو گئے۔ مراد یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کی زوال پذیری پر دوسرے حریف بغلیں بجا رہے ہیں کہ یہ قوم تو قرآن کو بھی بغلوں میں دبا کر لے گئی۔ تو جانتا ہے کہ کفار ہماری تضحیک پر آمادہ ہیں لیکن تجھے شاید اپنی توحید کا کچھ بھی پاس نہیں ہے۔

سولہواں بند معنی: معمور: بھرے ہوئے۔ شعور: تمیز۔ مدارات: تواضع۔

مطلب: یہ کوئی شکایت نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ تو نے ان لوگوں کو مال و دولت سے نوازا ہے اور ان کے خزانے بھر دیئے ہیں جنہیں کسی محفل میں بات کرنے کا شعور بھی نہیں ہے۔ افسوس محض اس بات کا ہے کہ کافروں کو تو اس دنیا میں ہی تو نے محلات اور لونڈیاں عطا کی ہیں جب کہ ہم مسلمانوں کو محض وعدہ حور پر ہی ٹر خا دیا ہے۔ اور وہ حوریں بھی بہشت میں داخل ہونے پر مشروط ہیں۔ آخر ہم سے کیا خطا ہو گئی جو پہلے کی طرح ہم تیرے لطف و کرم سے محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔

مطلب: یہ کوئی شکایت نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ تو نے ان لوگوں کو مال و دولت سے نوازا ہے اور ان کے خزانے بھردیئے ہیں جنہیں کسی محفل میں بات کرنے کا شعور بھی نہیں ہے۔ افسوس محض اس بات کا ہے کہ کافروں کو تو اس دنیا میں ہی تو نے محلات اور لونڈیاں عطا کی ہیں جب کہ ہم مسلمانوں کو محض وعدہ و وعید پر ہی رُخ دیا ہے۔ اور وہ حوریں بھی بہشت میں داخل ہونے پر مشروط ہیں۔ آخر ہم سے کیا خطا ہو گئی جو پہلے کی طرح ہم تیرے لطف و کرم سے محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔

ستر ہواں بند معنی: نایاب: غائب: مفقود۔ موج سراب: فریب نظر۔ طعن اغیار: غیروں کے طعنے۔ خواری: ذلت۔

مطلب: آخر مسلمانوں نے کون سا جرم کیا ہے کہ وہ دنیاوی دولت سے محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔ جب کہ تیرے اختیار میں تو اتنا کچھ ہے جس کی نہ کوئی حد ہے نہ حساب ہو سکتا ہے۔ تو اتنی قدرت رکھتا ہے کہ چاہے تو دشت و صحرا میں بھی سمندر کی مانند بلبلے رقصاں ہوں اور صحرا میں سفر کرنے والے مسافر کے سامنے تو چاہے تو سراب کی بجائے اتنا سیلاب آجائے کہ مسافر کو ڈوبنے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ ہم تو اغیار کے طعنوں سے بھی ہم کنار ہیں اور رسوائی و ناواری سے بھی دوچار ہیں۔ اتنا تو بتا دے کہ تجھ پر مرشنے کا صلہ کیا خوار و برباد ہونے میں ہی ملتا ہے۔

اتھار ہواں بند معنی: اغیار: بیع غیری۔

مطلب: ایک زمانہ تھا جب دنیا پر مسلمانوں کا تسلط تھا جب کہ یوں لگتا ہے کہ اب وہ غیر مسلموں کو پسند کرنے لگی ہے۔ ہمارے لیے تو بس ایک خیالی دنیا ہی رہ گئی ہے، ہم تو اس منظر سے ہٹ گئے۔ اب دوسروں نے دنیا پر اپنا قبضہ جمالیا ہے۔ اس صورت میں یہ گلہ نہ کرنا کہ دنیا سے توحید مٹ چکی ہے۔ ہم تو صرف اس لئے جی رہے ہیں کہ تیرا نام باقی رہے پر اتنا بتا دے کہ ساقی کے بغیر جام کی حقیقت کیا ہے؟

انیسواں بند معنی: وعدہ فردا: کل کا وعدہ۔ رخ زبا: خوب صورت چہرہ۔

مطلب: اسے مالک دوسرا! اب تو صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ تو نے جو محفل آراستہ کی تھی اس کا خاتمہ بھی ہو گیا اور تیرے چاہنے والے بھی رخصت ہو گئے۔ تیرے عشاق اس محفل میں شب بھی آہیں بھرتے تھے اور صبح کے وقت تالہ و فریاد کرتے تھے لیکن ان کے خاتمے پر اب یہ سب کچھ بھی ختم ہو کر رہ گیا۔ ان چاہنے والوں نے تجھے اپنا محبوب بنایا اور اس کا صلہ بھی حاصل کر لیا ان کا دور اس قدر مختصر رہا جیسے کوئی محفل میں آکے بیٹھتا ہو تو اس کو وہاں سے نکال دیا جائے۔ جو چاہنے والے تیرے جلووں کی تمنا لے کر آئے تھے انہیں تو تو نے وعدہ فردا پر ٹال دیا۔ اب ان کی واپسی مشکل ہے خواہ انہیں کسی طور پر بھی تلاش کیا جائے۔

بیسواں بند معنی: قیس: مجنوں کا اصلی نام۔ نجد: عرب کا ریگستانی علاقہ۔ دشت و جبل: جنگل و پہاڑ۔ غضب: غم۔

مطلب: اس بند میں اقبال کہتے ہیں کہ لیلیٰ کا درد بھی وہی ہے اور مجنوں کا پہلو بھی وہی ہے۔ صحرائے نجد میں آج بھی ماضی کی طرح ہرنا چڑیاں بھرتے بھرتے ہیں۔ چاہنے والے کا دل بھی پہلے جیسا ہے اور

حسن کا جادو بھی وہی ہے۔ جب کہ پیغمبر آخر الزماں کی امت بھی وہی ہے اور اے خدا تو بھی ہی ہے کہ جو تھا۔ اس کے باوجود مسلمانوں سے یہ ناراضگی کیسی ہے اور اپنے چاہنے والوں سے برا سلوک کیوں ہو رہا ہے۔

ایکسواں بند معنی: بت گری: بتوں کو پوجنا۔ اویس قرنی: ایک بزرگ جو حضرت محمد ﷺ سے بہت محبت کرتے تھے۔

مطلب: بس اتنا بتا دے کہ تیری عبادت چھوڑ دی یا حضور کی محبت سے روگردانی کی ہے۔ کیا ہم نے اسلاف کی بت شکنی کی روایت ترک کر کے بت تراشی شروع کر دی۔ کیا ہم نے عشق اور عشق کی آشفہ سری سے کنارہ کر لی۔ کیا ہم نے حضرت سلمان فارسیؓ اور اویس قرنیؓ کی روایات کو ترک کر دیا۔ اگر ایسا نہیں تو ہم سے برگشتگی کی کچھ توجہ ہونی چاہئے۔ جب کہ ہمارے سینوں میں آج بھی تکبیر کی آگ محفوظ ہے اور ہماری زندگی علیٰ سطح پر حضرت بلال حبشیؓ کی مانند ہے۔

باکسواں بند معنی: جادہ پیکائی: راستہ طے کرنا۔ قبلہ نما: کعبہ کی سمت۔ آئین وفا: وفا کا دستور۔ شناسائی: دوستی۔ ہرجائی: بے وفا۔

مطلب: ہر چند کہ ہم تیری چاہت میں پسلا والا انداز نہیں رکھتے تاہی ہم میں تیری خاطر تسلیم و رضا کی وہ خو ہے جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ یہ بھی درست کہ ہمارے دل قبلہ نما کی طرح مضطرب ہیں اور یہ کہ ہم پہلے پیسے وفادار بھی نہیں۔ تاہی ہم میں وفا کے آئین کی پابندی کا جذبہ پہلے کی طرح موجود ہے۔ اس کے باوجود خود تیرا طرز عمل یہ ہے کہ کبھی ہم سے کبھی دوسروں پر عنایت و مہربانی کرتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ بات ہر چند کہ کی نہیں! پھر بھی کسے بغیر نہیں رہا جاتا کہ تو بھی تو ہرجائی ہو گیا ہے۔

تیسواں بند معنی: سرفاران: ایک پہاڑی کا نام۔ آتش اندوز: جلتے کا وہ۔ شرر آباؤ: شعلوں سے آباد۔ سوختہ سماں: اپنا سب کچھ فنا کر دینے والا عاشق۔

مطلب: تو نے فاران کی چوٹی پر وین محمدی کی تکمیل کی۔ تو اتنا قادر ہے کہ ایک اشارے پر ہزار بالوگ تیرے گردیدہ ہو گئے۔ انسانی دلوں کو تو نے اپنے عشق سے مسخر کر لیا۔ اپنے جلوں سے ساری محفل میں حرارت پیدا کر دی۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ آج ہمارے سینوں میں عشق حقیقی کی چنگاری موجود نہیں جب کہ شاید تجھے یاد ہو کہ ہم نے تو تیری خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔

چوبیسواں بند معنی: وادی نجد: عرب کا ریگستانی علاقہ۔ شور سلاسل: زنجیروں کا شور۔ خوش آل روز: وہ دن کتنا مبارک ہو گا۔ بے حجابانہ: بے تکلف، بے تحشہ۔

مطلب: اب تو صورت احوال یہ ہے کہ نجد کے صحرا میں زنجیروں کا وہ شور نہیں رہا تاہی مجنوں لیلیٰ کے نظارے کا دیوانہ نظر آتا ہے۔ یعنی مسلمانوں میں نہ عشق حقیقی کا جذبہ باقی رہا تاہی جدوجہد کا حوصلہ۔ تاہی وہ جرات کردار رہی اور نہ وہ دل رہا جو عشق حقیقی کی حرارت سے مزین ہو۔ شاید ہمارا گھراتا برباد ہو چکا ہے کہ تو اب وہاں رونق افروز ہونا پسند نہیں کرتا۔

وہ دن کس قدر مبارک ہو گا کہ تو ہماری محفل میں پورے جلوں کے ساتھ رونق افروز ہو گا اور ہم تجھے حجاب سے باہر دکھ سکیں گے۔

چھیسواں بند معنی: یادہ کش: شرابی۔ لب: جو: ندی کے کنارے۔ جام: کھٹ: ہاتھ میں جام لیے۔
منتظر: حو: نذر: ستارے۔ فرمان: جگر سوزی: جگر کو جانے کا حکم۔

مطلب: جو لوگ اسے خدا! تیری تعلیمات کی نفی کرتے ہیں اور تیرے دین کو تباہ و برباد کرنے پر تلے بیٹھے ہوئے ہیں ان کو تو نے عیش و مسرت کے تمام سامان فراہم کیے ہوئے ہیں۔ وہ تو رقص و نغمہ کی محفلیں سجائے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں وہ اس قدر بدست اور مدہوش ہیں کہ باقی دنیا کن ہنگاموں سے دوچار ہے۔ وہ اس حقیقت سے قطعی بے نیاز ہو کر محو ناؤ نوش ہیں جب کہ تیرے چاہنے والے مسلمان تو خود کو تیری نعمتوں سے محروم سمجھنے لگے ہیں اور تیری عنایات کے اشاروں کے منتظر ہیں۔ سوائے خدا! اپنے چاہنے والوں میں پھر سے عمل کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دے تاکہ وہ پھر فعال ہو کر اس دنیا میں سرخرو ہو سکیں۔

چھیسواں بند معنی: قوم آوارہ: بھٹکی ہوئی قوم۔ عنال: تاب: گھوڑے کی لگام موڑنا۔

مطلب: ملت اسلامیہ ہر چند کہ آج منتشر اور بھٹکی ہوئی ہے تاہم اب اس نے ایک بار پھر اپنا رخ حجاز کی جانب کر لیا ہے تاکہ تیرے حبیب سے رہنمائی حاصل کر اور پھر سے ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ بے شک وہ ایک ایسے پرندے کی مانند ہے جو اپنے بال و پر سے محروم ہو چکا ہے۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس میں ابھی تک پر واز کرنے کا جذبہ ضرور موجود ہے۔ اس وقت عالم یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کا ایک ایک فرد بے چین و مضطرب ہے اور تیری رضا کا خواہاں ہے۔ اب صرف اس امر کی دیر ہے کہ تو ان کی جانب اپنی توجہ کا رخ پھیر دے۔ اس لیے کہ ہر شخص اب اس کے لیے بے چین ہے۔ تیری توجہ کے ساتھ ہی ہر معاملہ درست ہو جائے گا۔

ستائیسواں بند معنی: امت مرحوم: زوال پذیر مسلمان۔ مور بے مایہ: حقیر بیونی۔ جنس نایاب: کم یاب چیز۔ دیر نشینوں: مندر میں بیٹھے والے۔

مطلب: اصحاب کرم! تو نے اپنی جس امت کو ہمیشہ لطف و عنایات سے نوازا ہے۔ تو دیکھتا ہے کہ اب وہ کتنی مشکلات میں مبتلا ہے۔ لہذا اس کی مشکلیں آسان کر دے اور وہ قوم جو اس وقت انتشار و بے بضاعتی سے ہم آہنگ ہے اسے ایک بار پھر وہی شان و شوکت عطا کر جس کی وہ ہمیشہ سے مستحق رہی ہے۔ خدا یا! ملت مسلم کے ہر فرد کے دل سے محبت کا جذبہ جس طرح مفقود ہوا ہے انہیں پھر سے اس جذبے سے نواز دے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم جو ہندوستان میں بسنے والے محض نام کے مسلمان ہیں اور عملاً غیر مسلموں کی سی خصوصیات کے حامل بن کر رہ گئے ہیں تو ہمیں اپنے دین کی تعلیمات کو اپنانے کی تلقین عطا فرما۔ اب تو ہمارے دل سے آرزوؤں اور تمناؤں کا لوبہ نکلا ہے اور شہرتوں بھرے سینے میں نالے بیتاب ہو رہے ہیں۔

اٹھائیسواں بند معنی: غماز چین: چغلی کھانے والا۔ عمد گل: بہار کا موسم۔ زمزمہ پر واز چین: چین میں چھمانے والے پرندے۔

مطلب: حالت یہ ہو گئی ہے کہ ہماری منتشر حالت کے داخلی راز خود اپنوں کے ہاتھوں غیروں تک پہنچ گئے ہیں۔ اس سے زیادہ قیامت کیا ہوگی کہ ہم خود ہی اپنی جڑیں کھودنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیفیت یہ ہے کہ ملت مسلمہ میں تعمیر و ترقی کے ساتھ مسرتوں کا سماں بھی ختم ہو کر رہ گیا جو لوگ حقیقتاً طور پر رہنما، رہبر

کرتے تھے وہ بھی قوم سے بدظن ہو کر دل چھوڑ بیٹھے۔ اب تو صرف میں ہی تیار رہ گیا ہوں جو ہر نوع کی ملی بے حسی کے دوران بھی خاموشی اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ میرے سینے میں تو نالہ و فریاد کا طوفان بھرا ہے۔

انتیسواں بند معنی: قمریاں، فاختہ۔ صنوبر، درخت کا نام۔ روشیں: راستے۔ پیر بن برگ: چوں کا لباس۔

مطلب: یہ ضرور ہے کہ جو لوگ ملت کی بہتری کے خواہاں تھے وہ مایوسی کا شکار ہو کر پیچھے جا بیٹھے۔ ملت انتشار کا شکار ہو گئی ہماری قدیم روایات بھی ختم ہو گئیں۔ یوں سمجھیں کہ اب محض نام کے مسلمان ہی رہ گئے ہیں لیکن میں (اقبال) اس ساری تباہی سے مایوس نہیں۔ خدا کرے کوئی میری بات بھی سننے کا چارہ کرے۔

تیسواں بند معنی: جو ہر، چمک، دمک (مراد صافیتیں)۔

مطلب: اب تو نہ مرنے میں مزار رہا نہ جینے میں کوئی لطف باقی رہا۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہے کہ اپنے ہی جگر کا خون پیتا رہتا ہوں۔ اس صورت حال کے باوجود میرے سینے میں بے شمار دلولے تڑپ رہے ہیں اور یہی سینہ ہزار ہا جلوں کا مسکن بنا ہوا ہے۔ مگر حالت یہ ہے کہ میری قوم کا کوئی فرد بھی چشم بینا نہیں رکھتا جو اس کیفیت کا اندازہ کر سکے۔ یہ ممکن بھی کیسے ہو کہ کسی میں بھی مصائب کا سامنا کرنے کی قوت نہیں۔

اکتیسواں بند معنی: نوا، آواز، بانگ و را، قافلے کی گھنٹی کی آواز۔ بادۂ دیرینہ: پرانی شراب۔ لے: سر یعنی مضامین و مطالب۔

مطلب: اقبال اس آخری بند میں بڑی دلسوزی کے عالم میں کہتے ہیں کہ کاش میری فریاد سے ہی ملت کے لوگ اپنی پستی کا احساس کریں۔ اور میرے یہ نغمے ان کی بیداری کا سبب بن جائیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے روایتی عہد و فا کا بھی پاس کریں اور اپنی دیرینہ تعلیمات کو بروئے کار لانے کے لیے آمادہ ہو سکیں۔ یہ درست ہے کہ میرا تعلق عرب سے نہیں بلکہ ایک طرح سے عجم کے ساتھ ہے اس کے باوجود میرا مرکز نگاہ حجاز ہی تو ہے اسی طرح زبان ہندوستان کی صحیح اس میں نغمگی اور کیف تو مدینے ہی کا ہے۔

پیشکش: مجلس اقبال

نشر و توزیع: محمد اسلم باقر

چاند

107

اے چاند! حسن تیرا فطرت کی آبرو ہے طوفِ حرمِ خاکی تیری قدیم خو ہے
یہ داغ سا جو تیرے سینے میں ہے نمایاں عاشق ہے تو کسی کا؟ یہ داغ آرزو ہے؟
میں مضطرب زمیں پر بیتاب تو فلک پر تعجب کو بھی جستجو ہے مجھ کو بھی جستجو ہے
انساں ہے شمع جس کی محفل وہی ہے تیری
میں جس طرف رواں ہوں منزل وہی ہے تیری
تو ڈھونڈتا ہے جس کو تاروں کی خاموشی میں پوشیدہ ہے وہ شاید غوغائے زندگی میں
استادہ سرو میں ہے سبزہ میں سو رہا ہے بلبل میں نغمہ زن ہے خاموش ہے کلی میں
آ میں تجھ دکھاؤں رخسار روشن اس کا نہروں کے آئینے میں شبنم کی آرسی میں
صحرا و دشت و در میں کسار میں وہی ہے
انساں کے دل میں تیرے رخسار میں وہی ہے

*

یہاں اس امر کی نشاندہی ضروری ہے کہ زیر تشریح نظم ان پندرہ نظموں میں سے پہلی نظم ہے جو ”
بانگ درا“ میں ”شکوہ اور جواب شکوہ“ کے درمیان درج کی گئی ہیں۔ موخر الذکر دونوں طویل نظموں کے
مابین چونکہ ایک ربط اور تسلسل ہے نیز اپنے مزاج کے اعتبار سے بھی چونکہ ان میں بڑی حد تک یکسانیت
ہے لہذا یہاں دونوں کو یکجا کر دیا گیا ہے اور مذکورہ بالا پندرہ نظمیں اب جواب شکوہ کے بعد شامل کی جارہی
ہیں جب کہ ”چاند“ ان میں کی پہلی نظم ہے۔
”جواب شکوہ“ کی تشریح کرتے ہوئے نظم کے آغاز میں پہلے بھی اس صورت حال کی وضاحت کر دی
گئی ہے۔ ہر حال ”چاند“ اقبال کی آٹھ اشعار پر مشتمل نظم ہے جس میں علامہ نے اپنے مخصوص انداز
میں چاند سے مکالمہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

① سے ④ معنی: فطرت کی آبرو: کائنات کی عزت۔ حرمِ خاکی: مراد ہے دنیا۔ قدیم خو: پرانی
عادت۔

مطلب: اے چاند! اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے تیرا حسن اور کمال پر ہے اور یہ حسن عملاً ایسا
بلند مرتبہ ہے جس پر فطرتِ فخر و ناز کر سکتی ہے جب کہ زمین کے گرد چکر کاٹنا تیری پرانی عادت ہے۔
تیرے سینے پر جو داغ نظر آتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ تیرے سینے کا یہ داغ کسی کی چاہت اور آرزو کا
مظہر ہے اور یہ بھی کہ میری طرح تو بھی کسی کے عشق میں مبتلا ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ میں زمین کا باسی
ہونے کے ناطے میاں مضطرب اور بے چین ہوں اور تو چونکہ آسمان پر رہتا ہے اس لیے تو وہاں پر بے
چین اور مضطرب ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ تجھے بھی کسی کی تلاش ہے اور میں بھی کسی کو پا لینے کا
آرزو مند ہوں۔ لگتا ہے کہ انسان جس محفل کے لیے شمع کی حیثیت رکھتا ہے وہی تیری محفل ہے اور میں
جس جانب مازم سفر ہوں وہی تیری بھی منزل ہے۔

⑤ سے ⑧ معنی: استادہ سرو: سرو کی صورت میں کھڑا ہے۔

مطلب: اے چاند! یوں لگتا ہے کہ تو جس کو تاروں کے سکوت میں تلاش کر رہا ہے۔ وہ غالباً یہاں کرۂ ارض پر زندگی کے شور اور ہنگاموں میں چھپی ہوئی ہے اس امر کی توجیہ کچھ یوں ہے کہ وہ چیز کہیں سرو کے درخت میں مستلذہ ہے اور کہیں یہ سرسبز و شاداب بزمے میں موجود ہے۔

پھر یوں بھی ہے کہ کہیں اس شے کا وجود بلبل میں نغمے کی شکل میں جلوہ گر ہے جب کہ کلی کے بطن میں سکوت بن کر چھپا ہوا ہے۔ بلاشبہ یہ حسن ہی ہے۔ سوائے چاند! میرے پاس آنکھ میں تجھے اس حسن کے جلووں سے روشناس کراؤں۔ دیکھ تو سہی! یہ جلوہ ندیوں کے شفاف پانی میں بھی موجود ہے اور شبنم کے قطروں میں بھی نمایاں ہے۔

چنانچہ یہی نہیں بلکہ اس حسن کا جلوہ تو صحراؤں اور کساروں میں بھی پوری طرح سے موجود ہے۔ انسان کے دل میں بھی ہے اور تیرے چہرہ میں بھی یہی جلوہ نظر آتا ہے۔ اس نظم میں بنیادی تصور حسن ہے جسے اقبال نے بڑے خوبصورت انداز میں چاند کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

رات اور شاعر

108-1

رات

کیوں میری چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں
تاروں کے موتیوں کا شاید ہے جو ہری تو
یا تو مری جبین کا تارا گرا ہوا ہے
خاموش ہو گیا ہے تارِ رباب ہستی
دریا کی تہ میں چشم گرداب سو گئی ہے
ہستی زمیں کی کیسی ہنگامہ آفریں ہے
شاعر کا دل ہے لیکن نا آشنا سکوں سے
آزاد رہ گیا تو کیونکر مرے فسوں سے

شاعر

108-2

میں ترے چاند کی کھیتی میں گم رہتا ہوں
دن کی شورش میں نکلنے ہوئے شرما تے ہیں
مجھ میں فریاد جو پنہاں ہے سناؤں کس کو؟
برقِ ایمن مرے سینہ پہ پڑی روتی ہے!
صفتِ شمعِ لحدِ مردہ ہے محفلِ میری
چھپ کے انسانوں سے مانند سحر روتا ہوں
عزتِ شب میں مرے اشک ٹپک جاتے ہیں
تپشِ شوق کا نظارہ دکھاؤں کس کو؟
دیکھنے والی ہے جو آنکھ کماں سوتی ہے؟
آہ! اے رات بڑی دور ہے منزلِ میری

عہد حاضر کی ہوا راس نہیں ہے اس کو اپنے نقصان کا احساس نہیں ہے اس کو
ضبط پیغام محبت سے جو گھبراتا ہوں
تیرے تائبہ ستاروں کو سنا جاتا ہوں

*

رات

یہ نظم دو بنیادی کرداروں کے گرد گھومتی ہے جن میں کا ایک کردار تو ”رات“ ہے اور دوسرا ”شاعر“ اس اعتبار سے یہ نظم ہر دو کرداروں کے مابین مکالمے پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں رات دوسرے کردار ”شاعر“ سے بعض استفسارات کرتی ہے۔ دوسرے حصے میں ”شاعر“ اس کا جواب دیتا ہے۔ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں یہ تعمیلی گفتگو نظم کی ہے۔

① سے ③ معنی: مانند بو، خوشبو کی طرح۔ جیس: پیشانی۔

مطلب: ان اشعار میں ”رات“ یوں ”شاعر“ سے مکالمہ کرتی ہے۔ کہ اے شاعر! کیا وجہ ہے کہ تو میری چاندنی میں کیوں مضطرب اور پریشان پھر رہا ہے۔ تیری کیفیت تو ایک پھول کے مانند ہے جو خود تو ساکت رہتا ہے لیکن اس کی خوشبو آوارہ و پریشان رہتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تو آسمان پر جو ستارے موتی کی طرح چمک رہے ہیں۔ ان کا جو ہری یا پر کھنے والا ہے بالفاظ دیگر میری روشنی کو نور کا دریا تصور کر لیا جائے تو تیری حیثیت ایک مچھلی کے مانند ہے۔ یا پھر یوں بھی ہو سکتا ہے کہ میری پیشانی کے جمو مرے جو ایک ستارہ اگر گیا تھا وہ ستارہ تو ہی ہے جو بلندی کو چھوڑ کر اب پستی میں مقیم ہے۔

④ سے ⑦ اے شاعر! میرے وجود سے زندگی کا ایک ساز ساکت ہو کر رہ گیا ہے اور میں وہ آئینہ ہوں جس میں خوابیدہ دنیا کے تمام مناظر واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ان مظاہر کا تو کیا ذکر بخبر تو تک دریا کی تہ میں محو خواب ہو کر رہ گیا ہے اور جو بیتاب مضطرب موج بھی وہ بھی شاید ساحل سے ہم آغوش ہو کر سو گئی ہے۔ ہر چند کہ زمین پر جو بستی آباد ہیں وہ ہمیشہ ہنگاموں سے پر رہتی ہیں لیکن اس لمحے یوں لگتا ہے جیسے ہر جان سناٹا ہے اور دہاں کوئی جاندار شے موجود نہیں ہے۔ اس ساری صورتحال میں اے شاعر! میں دیکھ رہی ہوں کہ تو سکون آشنا نہیں بلکہ پریشان حال ہے۔ مجھے اس امر پر شدید حیرت ہے کہ تو میرے سحر سے مکس طرح آزاد رہ گیا۔

شاعر

① سے ③ معنی: دن کی شورش: دن کا شور و غل۔ عزالت شب: رات کی تنہائی۔ تپش شوق: عشق کی جلن۔

مطلب: نظم کے اس حصے میں شاعروں کو یہاں ہوتا ہے کہ اے رات! تیرے استفسارات کے جواب میں

یہی کہہ سکتا ہوں کہ تیری چاندنی میں میرے آنسو ایسے موتی کے مانند ہیں جو یہاں بوا رہا ہوں اور صبح کی طرح انسانوں سے چھپ کر تنہائی میں سرگرم فغاں رہتا ہوں۔ میرے آنسو جودن کے ہنگامے میں آنکھوں سے نکلتے ہوئے شرباتے ہیں وہ تیری تاریکی اور تنہائی میں آنکھوں سے نپک پڑتے ہیں۔ میرے دل میں جو آہیں اور فریاد پوشیدہ ہے وہ آخر کس کو سناؤں۔ مزید برآں سینے میں جو عشق کی حرارت موجود ہے اس کا اظہار کس کس کے سامنے کروں جب کہ میری حالت پر یہاں توجہ دینے والا کوئی بھی نہیں ہے۔

④ سے ⑦ معنی: برق ایمین: طور کی بجلی۔

مطلب: صورت یہ ہے کہ میرے سینے میں تو وہ بجلی بھی بے عمل ہو کر رہ گئی ہے اور اشک افشانی کر رہی ہے کہ وہ طور پر جلوہ دکھانے والی بجلی جس کے مماثل ہے۔ نہ جانے وہ آنکھیں اب کہاں ہیں جو کسی بھی منظر کو بنیدگی کے ساتھ دیکھنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ میری محفل تو اب اس شمع کے مانند ہے جو اجاڑ دیرانے میں کسی مزار پر روشن ہے۔ اے رات! تجھے اس حقیقت کا یقیناً علم نہیں ہے کہ میری منزل ابھی بہت دور ہے۔ اور جو مسافت ہے وہ کڑی ہے۔ اس کو طے کرنا بے حد و حساب مشکل کام ہے۔ تو کیا جانے کہ میری قوم کے لیے عہد حاضر کا ماحول قطعی سازگار نہیں ہے پھر اس کا کیا کیا جائے کہ اسے تو خود بھی اپنی اس زبوں حالی کا احساس تک نہیں ہے۔

اے رات! حقیقت یہ ہے کہ جب یہ صورت حال اور اس کا تصور میرے ضبط سے باہر ہو جاتا ہے تو مضطرب ہو کر اپنی داستان غم تیرے ابلے ستاروں کو سنانے آ جاتا ہوں۔

بزم انجم

109

سورج نے جاتے جاتے شام یہ قبا کو
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
محمل میں خاموشی کے لیلائے ظلمت آئی
وہ دور رہنے والے ہنگامہ جہاں سے

محو فلک فردزی تھی انجمن فلک کی
عرش بریں سے آئی آواز اک ملک کی

اے شب کے پاساؤ! اے آسمان کے تارو
چھینرو سرود ایسا جاگ انھیں سونے والے
آئینے قسمتوں کے تم کو یہ جانتے ہیں
رخصت ہوئی خوشی تاروں بھری فضا سے
وسعت تھی آسمان کی معمور اس نوا سے

”حسن ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں
آمین نو سے ڈرتا طرز کسں پہ اڑتا
جس طرح عکس گل ہو شبنم کی آرسی میں
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

کاروان ہستی ہے تیزگام ایسا قومیں کچل گئی ہیں جس کی روا روی میں آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

*

لظم علامہ اقبال کی منظر نگاری اور ایجری کا انتہائی خوبصورت نمونہ ہے۔ انہوں نے ان اشعار میں جو تمثیل بنائی ہیں وہ بھی بڑی حد تک انفرادیت کی حامل ہیں۔ پوری لظم تین بند پر مشتمل ہے جن میں پندرہ اشعار ہیں جن میں شام کا منظر بیان کیا گیا ہے۔

پہلا بند معنی: سیہ: قبا: سیاہ لباس۔ طشت: تھال۔ فلک: فروزی: آسمان کو روشن کرنا۔ ملک: فرشتہ۔ مطلب: سورج نے غروب ہوتے ہوئے جب دن کو الوداع کہی تو رواجی سے قبل شام کے سرمئی رنگ کو نہ صرف یہ کہ اپنے عکس سے لالے کے بھول کی مانند زردی مائل کر دیا بلکہ آسمان پر شفق یوں نمودار ہوئی جیسے کہ ساری فضا سونے کے زیورات پہنے ہوئے ہے۔ اور دن میں جو چاندی کے زیورات تھے وہ اتار دیئے ہیں۔ مراویہ کہ دن کا سارا منظر تو سورج کی روشنی سے سفیدی مائل تھا جب کہ شام کے لمحات میں اس کا عکس سونے کی مانند زردی مائل ہو گیا۔

اس لمبے بڑی خاموشی کے ساتھ فضا پر اندھیرا پھیل گیا اور اس اندھیرے آسمان پر ستارے اس طرح سے جگمگا رہے تھے جیسے موتی چمک رہے ہوں۔ انسان جن کو ستاروں کے نام سے تعبیر کرتا ہے وہ ہم سے کتنی دور یعنی آسمان پر رہتے ہیں۔ اس لمبے آسمان کی ساری محفل اپنی سجاوٹ اور تزئین میں مصروف تھی کہ آسمان سے ایک فرشتے کی آواز بلند ہوئی۔

دوسرا بند معنی:

مطلب: فرشتے نے ستاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بے شک تم رات کے محافظ ہو اور تمہاری چمکنے والی قوم آسمان پر بود و باش رکھتی ہے۔ ایسا نغمہ اور ساز چھیڑو کہ جس کو سن کر سونے والے بیدار ہو انھیں۔ دراصل راہ چلنے والے قافلے کے لیے تمہاری روشنی رہنمائی کا کام دیتی ہے۔ یہ قافلے والے تمہیں اپنے مقدر کا آئینہ تصور کرتے ہیں۔ اور اس امر کا امکان بھی ہے کہ زمین پر رہنے والے لوگ بھی تمہاری صدائیں سن سکیں۔

فرشتے کی یہ صدا سن کر ستاروں کی فضا سے خاموشی ختم ہو گئی اور آسمان کی وسعت میں یہ آواز اس سرے سے لے کر اس سرے تک پھیل گئی۔

تیسرا بند معنی: جذب باہمی: ایک دوسرے کو کھینچنا۔ یعنی نظام شمسی۔

مطلب: ستارے جواب میں یوں گویا ہوئے کہ ہماری خوبصورتی سے حسن ازل کا اظہار ہوتا ہے اسی طرح جیسے خبنم کے شفاف قطروں میں پھولوں کا عکس نمایاں ہو جاتا ہے۔ سن لو کہ قوموں کی زندگیوں میں وہ وقت بہت کبھن اور دشوار ہوتا ہے جب انہیں قدیم روایات کو کج کرکشی روایات اور نئے اصول قبول

کرتا پڑیں۔ زندگی دراصل اس قدر تیز رفتار واقع ہوئی ہے کہ اس کے چل چلاؤ میں بہت سی قومیں چکی مٹی ہیں۔ اگرچہ ہماری نگاہوں سے ہزار ہا ستارے ہماری نظر سے اوجھل ہیں اس کے باوجود ان کا تعلق تو ہماری برادری ہی سے ہے۔ بے شک ہماری عمر مختصر تھی لیکن جو نتائج ہم اخذ کر سکے وہ اہل زمین نہیں سمجھتے کہ باہمی ربط و ضبط اور اتفاق سے سارے نظام قائم ہیں۔ یہی نکتہ تاروں کی زندگی میں پوشیدہ ہے۔

سیر فلک

110

تھا تخیل جو ہم سفر میرا آسمان پر ہوا مگر میرا
 اڑتا جاتا تھا اور نہ تھا کوئی جاننے والا چرخ پر میرا
 تارے حیرت سے دیکھتے تھے مجھے راز سرستہ تھا سفر میرا
 حلقہ صبح و شام سے نکلا
 اس پرانے نظام سے نکلا
 کیا سناؤں جنہیں ارم گیا ہے خاتم آرزوئے دیدہ و گوش
 شاخ طوبے پہ نغمہ ریز طیور بے حجابانہ حور جلوہ فروش
 ساقیان جمیل جام بدست پینے والوں میں شور نوشا نوش
 دور جنت سے آنکھ نے دیکھا ایک تارے خانہ سرد و خموش
 طالع قیس و گیسوئے لیلیٰ اس کی تاریکیوں سے دوش بدوش
 خشک ایسا کہ جس سے شرما کر کرۂ زمیر ہو ردپوش
 میں نے پوچھی جو کیفیت اس کی حیرت انگیز تھا جواب سروش
 مقام خشک جہنم ہے نار سے نور سے تھی آغوش
 شعلے ہوتے ہی مستعار اس کے جن سے لرزاں ہیں مرد عبرت گوش
 اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں
 اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

*

معنی: تخیل: خیال۔ راز سرستہ: چھپا ہوا بھید۔ ارم: بہشت۔ خاتم: ختم کرنے والا۔ نوشا نوش: پینا پانا۔ کرۂ زمیر: زمین کے ارد گرد اس حلقہ سے آگے زیادہ سردی ہوتی ہے۔ سروش: فرشتہ۔ تھی آغوش: خالی جھولی۔ مستعار: مانگے ہوئے۔ عبرت گوش: نصیحت حاصل کرنے والا۔

مطلب: یہ نظم دو بند پر مشتمل ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اقبال نے اس نظم میں قرآن پاک کی سورۃ توبہ کی چونتیسویں آیت کی منظوم تفسیر پیش کی ہے۔ اس آیت میں ارشاد ہوا ہے جن لوگوں نے سونا چاندی بیع کیا اور اس کو اللہ کی راہ میں صرف کرنے سے گریز کیا۔ قیامت کے روز ان کی پیشانی پشت اور پہلو کو اسی گرم کیے ہوئے سونے چاندی سے داغنا جائے گا۔ علامہ اقبال نے اسی حوالے سے اور دوسرے زاویے سے یہی بات کہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دوزخ بجائے خود گرم نہیں ہے بلکہ جب بد اعمال

اور گناہگار لوگ وہاں بھیجے جاتے ہیں تو ان کی بد اعمالیاں ہی شعلے بن کر انہیں جلاتی ہیں۔ چنانچہ نظم میں اقبال کہتے ہیں۔

میں اپنے تخیل کے ساتھ آسمان کی سیر کر رہا تھا اور اس کی وسعتوں میں اڑتا پھر رہا تھا۔ عجب بات یہ ہے کہ وہاں مجھے جاننے والا کوئی بھی نہ تھا۔ اس لئے وہاں چمکتے ہوئے ستارے مجھے حیرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ اس لیے کہ میرے سفر کا حال تو ایک راز کی مانند تھا جس کی حقیقت سے کسی کو آگاہی حاصل نہ تھی۔ میں اس سفر میں زمان و مکان اور صبح و شام کے دائرے سے نکل گیا۔ یہی نہیں بلکہ کائنات کے اس پرانے نظام کو بھی بست پیچھے چھوڑ گیا۔

اے لوگو! تمہیں کیا بتاؤں کہ اس سفر کے دوران میں نے جنت کا نظارہ کیا۔ جنت کیسی ہے؟ اس کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس کو کانوں کی قوت ساعت اور آنکھوں کی بصارت کی تفہیمی دور ہو جاتی ہیں اور جملہ عناصر کی آرزوؤں کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ جنت میں تمام انسانی خواہشات کی تکمیل کا سامان موجود ہے۔

جنت میں جو مناظر نگاہوں کے سامنے سے گزرے ان کے مطابق میں نے دیکھا کہ شاخ طوطی پر بیٹھے ہوئے پرندے نغمہ سرا ہیں اور حمد باری تعالیٰ میں مصروف ہیں۔ حوریں کسی حجاب اور پردے کے بغیر اپنے جلوے دکھا رہی ہیں۔ انتہائی خوبصورت ساتی حاضرین کو شراب پلانے میں مصروف ہیں اور پینے والوں میں ہر چار جانب باؤ ہو کا ہنگامہ برپا ہو رہا ہے۔

اسی لمحے میں نے جنت سے دور کچھ فاصلے پر ایک جگہ دیکھی جس میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ جگہ بے حد پرسکوت اور سرد واقع ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس مقام کی تاریکی قمیص کے مقدر اور لیلیٰ کے گیسوؤں کی طرح تھی۔ یہ مقام اس قدر سرد تھا کہ جس کے مقابل زمین کے گرد انتہائی سرد حلقہ بھی نہ تھا۔

میں نے ایک فرشتے سے اس سرد ترین مقام کے بارے میں استفسار کیا تو اس کا جواب بے حد حیران کن تھا۔ فرشتے نے کہا کہ یہی سرد مقام جہنم ہے جو ہر نوع کی جو ہر طرح کی حرارت اور روشنی سے خالی ہے۔ اس کے وہ شعلے جن سے عبرت نہ حاصل کرنے والے لوگ خوفزدہ ہیں عملاً مانگے کے ہوتے ہیں جن میں عملاً کوئی حدت نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جو گناہگار یہاں سزا کے طور پر لائے جاتے ہیں وہ اپنے حصے کی آگ اور شعلے بھی ہمراہ لاتے ہیں۔

نصیحت

111

میں نے اقبال سے ازراہ نصیحت یہ کہا تو بھی ہے شیوۂ اربابِ ریا میں کمال جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے ختمِ تقریر تری مدحت سرکار یہ ہے

عالمِ روزہ ہے تو، اور نہ پابندِ نماز
دل میں لندن کی ہوس، لب پہ ترے ذکرِ حجاز
تیرا اندازِ تملق بھی سراپاِ اعجاز
فکرِ روشن ہے ترا موجدِ آمینِ نیاز

در حکام بھی ہے تجھ کو مقام محمود
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھا سکتا ہے
نظر آ جاتا ہے مسجد میں بھی تو عید کے دن
دست پرورد ترے ملک کے اخبار بھی ہیں
اس پہ طرہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے
جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں بھی
غم صیاد نہیں اور پر د بال بھی ہیں
”عاقبت منزل ما وادی خاموشان است
حالی غلغلہ در گنبد افلاک انداز“

*

یہ نظم عملاً سیاسی اور مذہبی رہنماؤں پر طنز کی حیثیت رکھتی ہے کہ علامہ اقبال نے آج کی مانند اپنے
عہد میں بھی ان لوگوں کا کردار منافقت اور مصلحت کشی پر جنی پایا لیکن براہ راست ان پر طنز کرنے کی
 بجائے یہاں اقبال نے اپنی ذات کو ہی ہدف بنایا ہے۔ نظم کا آخری شعر حافظ شیرازی کا ہے۔ دیکھا جائے
 تو یہ اسی شعر کی نقیصین ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

معنی: ارباب ریا: ریا کار لوگ۔ تعلق: خوشامد۔ موجد: ایجاد کرنے والا۔ مقام محمود: پسندیدہ مقام۔
طرہ: ان میں باتوں سے بڑھ کر۔ تشبیر کا ساز: شہرت۔

مطلب: میں نے اقبال کو نصیحت کرتے ہوئے ایک روز یہ کہا کہ نہ تو تو روزہ رکھتا ہے۔ نای نماز کا پابند
ہے۔ تو بھی لگتا ہے کہ منافقت اور ریا کاری میں بعض دوسرے لوگوں کی طرح انتہائی کامل اور پختہ کار
ہے۔ ہر چند کہ لبوں پر تو تیرے مدینے کا تذکرہ ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دل میں یہ خواہش پوشیدہ
رہتی ہے۔ کہ لندن یا ترائی جائے۔

اے اقبال! تیرے جھوٹ میں بھی مصلحت کی آمیزش ہوتی ہے یعنی ذاتی فائدے کے لیے تو جھوٹ
بولنے سے نہیں چوکتا اور تیری خوشامد کا انداز بھی ایسا ہی جیسے معجزے دکھا رہا ہو۔ اور ناممکن کو ممکن بنانے
کی صلاحیت رکھتا ہو۔ تیری تقریر کا خاتمہ بھی سرکار یعنی حکمران طبقے کی خوشامد اور تعریف و توصیف پر ہوتا
ہے۔ یہی نہیں بلکہ تیرے تازہ اور روشن خیالات عاجزی اور انکساری کے نئے نئے طریقوں کی ایجاد میں
لگے رہتے ہیں۔

حکام کا دروازہ اے اقبال! تیرے لیے گویا مقام محمود ہے۔ اور تیرے سیاسی واؤ بیچ ایاز کی زلف کے
مانند ہی ہوتے ہیں۔ بعض دوسرے لوگوں کی طرح تو بھی دنیاوی جاہ و جلال کے حصول کی خواہش کو دین کی
خدمت کرنے کے پردے میں چھپا سکتا ہے۔ کم از کم عید کی نماز کے موقع پر تو مسجد میں بھی اس طرح نظر
آ جاتا ہے کہ واعظ کی تقریر سے تیرا دل بھی پھٹتا محسوس ہوتا ہے۔ یعنی یوں لگتا ہے جیسے واعظ کی تقریر
نے تیرے دل پر بہت زیادہ اثر ڈالا ہے۔ اور تو اس سے بے حد مرعوب ہوا ہے۔

اور تو اور! جو ملک کے اخبارات ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی تیرے بے حد ممنون احسان ہیں کہ
جن پر تیری تشبیر فرض ہے بلکہ یہ اخبار تو جائز و ناجائز طور پر تیری تعہد گوئی میں ہر لمحے مصروف رہتے

ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تو شاعر بھی ہے اور تخلیق کار بھی! تو اپنی شاعری کے حوالے سے حافظ شیرازی کے مماثل ہے۔

اے اقبال! ایک لیڈر میں آج جتنے بھی اوصاف ہونے چاہئیں وہ تجھ میں بھی موجود ہیں لہذا تیرے لیے لازم ہے کہ تو بھی قومی سیاست کی اس دوڑ میں شریک ہو جا۔ مراد یہ کہ ان خصوصیات کے باوصف تو بھی قومی لیڈر بننے کی کوشش کیوں نہیں کرتا۔ بقول حافظ شیرازی۔
آخر کار سب کو مرنا ہے اور مردہ لوگوں کی داوی میں پہنچنا ہے لہذا اس گنبد اٹلاک کے نیچے کچھ تو ہنگامہ کرنا چاہیے۔

رام

112

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند سب فلسفی ہیں خطہ مغرب کے رام ہند
یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے اثر رفعت میں آسمان سے بھی اونچا ہے بام ہند
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت مشور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند
نکواری کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا

*

رام چند راجی اہل ہندو کی تاریخ میں ایک دیو مالائی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اہل ہندو کی مقدس کتاب ”رامائن“ میں ان کے حالات زندگی درج ہیں۔ وہ صوبجات متحدہ کے ایک راجہ دسرتھ کے بیٹے تھے جن کو سوتیلی ماں کے کہنے پر چودہ سال کا بن باس ملا۔ بن باس سے واپسی پر وطن پہنچ کر انہوں نے اپنی گدی سنبھالی۔ دوسرے کا تہوار اسی حوالے سے منایا جاتا ہے۔ اقبال نے زیر تشریح نظم اسی سلسلے میں لکھی۔

معنی: فکر فلک رس: آسمان پر پہنچنے والا خیال۔ ملک سرشت: فرشتہ خصلت۔ روشن تر از: زیادہ روشن۔ فرد: بے مثال۔

مطلب: ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں بعض حق پرست لوگوں نے جنم لیا۔ اسی لیے مغرب کے فلسفی اس خطہ ارض کی عظمت کے قائل ہیں۔ یہ بھی اہل ہند کے بلند تصورات کا اثر ہے کہ یہاں کا مقام آسمان کی طرح بلند ہے۔ اس مصرعے میں کوہ ہمالیہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ تو صوفیوں اور رشیوں کا ملک ہے۔ جہاں ہزار ہا فرشتہ خصلت لوگوں نے جنم لیا اور یہی وہ لوگ ہیں کہ آج بھی جن کے دم سے ہندوستان کا نام روشن ہے۔

دیکھا جائے تو رام چند راجی کے نام اور کردار پر اہل ہند بجا طور پر فخر و ناز کرتے ہیں۔ اور جو صاحبان بصیرت ہیں اگر ان کو ہندوستان کا امام تصور کرتے ہیں تو اس میں کوئی بات باعث حیرت نہیں۔ کہ وہ تو

ایسے میں چراغ ہدایت تھے جنہوں نے اسی ملک سے تاریکی کو مٹا دیا اور یہاں علم و دانش کی روشنی پھیل گئی۔
یعنی یہاں کی شام رام چند رجبی کی ہدایت کے طفیل صبح کی روشنی سے بھی زیادہ تابندہ اور درخشاں ہے۔
دیکھا جائے تو یہ فرزند ہند تلوار کا دھن بھی تھا اور بہادر بھی تھا۔ یہی نہیں بن باس کے حوالے سے
جائزہ لیا جائے تو وہ پاکیزگی اور محبت میں انفرادی حیثیت کا حامل تھا۔

موثر

113

کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کسی موثر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خوش
ہنگامہ آفریں نہیں اس کا خرام تاز باند برق تیز، مثال ہوا خوش
میں نے کہا نہیں ہے یہ موثر پہ منحصر ہے جادۂ حیات میں ہر تیزیا خوش
ہے پا شکستہ شیوہ فریاد سے جس نکت کا کارواں ہے مثال مباحوش
میں دماں شورش قلقل سے پابگی لیکن مزاج جام خرام آشنا خوش
شاعر کے فکر کو پرواز خامشی
سرمایہ دار گرمی آواز خامشی

✽

معنی: ہنگامہ: شور۔ جادۂ حیات: زندگی کا راستہ۔ تیزیا: تیز چلنے والا۔ مینا: صراحی۔ قلقل: بھری ہوئی
صراحی کی آواز۔ سرمایہ دار گرمی آواز: آواز کی گرمی کا سرمایہ۔

مطلب: اقبال نے بالعموم اپنی تخلیقات میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتائج اخذ کیے ہیں۔ زیر
تشریح نظم بھی اسی نوع کی تخلیقات میں سے ایک ہے۔ نواب ذوالفقار علی خاں جو اقبال کے احباب میں
سے تھے انہوں نے ایک ایسی کار خریدی جو شور کم کرتی تھی۔ یہ نظم اسی حوالے سے لکھی گئی ہے۔
فرماتے ہیں۔

کل دوران گفتگو جگندر نے کتنے کام کی بات کہی کہ دوسری کاروں کی نسبت ذوالفقار علی خاں کی کار
بالعموم خاموش رہتی ہے۔ اس کی چال ایسی ہے جس کا ہنگاموں اور شور شرابے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔
حقیقت تو یہ ہے کہ یہ کار، بجلی کی طرح تیز اور ہوا کے مانند خاموش رہتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ جگندر کی زبان سے یہ بات سن کر میں نے کہا کہ یہ معاملہ کار پر ہی موقوف نہیں
بلکہ زندگی میں ہر وہ شے خاموش رہتی ہے جو تیز رفتار ہو۔ قافلے کی گھنٹی فریاد کے لمحے میں بے شک بہت
شور مچاتی ہے جب کہ خوشبو کا قافلہ تیز رفتار ہوا کی طرح ساکن رہتا ہے۔ صراحی شراب اندیلے جانے کی
پابند ہے اس لیے شور پیدا کرتی ہے جب کہ پیانہ تیزی سے گردش کرتا ہے اس لیے وہ بھی خاموش رہتا
ہے۔

حد تو یہ ہے کہ شاعر کے تخیل کی اڑان کو بھی خاموشی پر پرواز عطا کرتی ہے اور خاموشی کے سبب ہی
شاعر کے کام میں جوش اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔

انسان

114

منظر چنستاں کے زیبا ہوں کہ نازبا محروم عمل زگس مجبور تماشا ہے
 رفتار کی لذت کا احساس نہیں اس کو فطرت ہی صنوبر کی محروم تمنا ہے
 تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں انسان کی ہر قوت سرگرم تقاضا ہے
 اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم یہ ذرہ نہیں شاید سنا ہوا صحرا ہے
 چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چنستاں کی
 یہ ہستی وانا ہے، مینا ہے، توانا ہے

*

معنی: چنستاں: باغ۔ زیبا: اچھا۔ نازبا: برا۔ ہیئت: شکل، وضع قطع۔

مطلب: اس نظم میں دیکھا جائے تو علامہ اقبال نے انسان کا مظاہر فطرت سے تقابل کیا کہ ان کے کردار میں کیا فرق ہے۔ حسب معمول انسانوں نے اس تقابلی جائزے سے بھی ایک نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مظاہر فطرت کتنے بھی قوی اور خوبصورت ہوں حقیقت یہ ہے کہ انسان یہ اشرف المخلوقات ہے۔ وہ جرات و حوصلہ کرے تو آن واحد میں انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

باغوں کے مناظر خوبصورت ہوں کہ بد صورت! یہاں بہار آئی ہو کہ خزاں نے اپنا تسلط بنایا ہوا ہو۔
 زگس کا پھول اپنی بے عملی کے سبب ان مناظر کو دیکھنے اور برداشت کرنے پر مجبور ہے۔ وہ حسب خواہش ان مناظر کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ اسی طرح صنوبر جیسے بلند بالا اور خوبصورت درخت چونکہ تمناؤں اور خواہشات سے محروم ہے لہذا یہ اپنے مقام پر ساکت و صامت کھڑا رہتا ہے۔ وہ حرکت کرنے کے لطف سے محروم ہے۔

دیکھا جائے تو دنیا کی ہر شے اطاعت کرنے اور دوسروں کے تابع رہنے پر مجبور ہے۔ ایک انسان ہی ہے جو ہمہ وقت جدوجہد اور محنت و کاوش میں مصروف عمل رہتا ہے۔ اگر اسے ذرہ قرار دیا جائے تو ایسا ذرہ ہے جو ہر دم وسعت کی ہوس رکھتا ہے۔ دراصل یہ ذرہ نہیں بلکہ ایک صحرا ہے جو سمٹ کر رہ گیا ہو۔ اور اب وسعت اختیار کرنا چاہتا ہو۔
 دراصل انسان اتنا قوی، دانش مند اور بصیرت رکھنے والا ہے کہ اگر چاہے تو اس باغ یعنی دنیا کی ہیئت کو تبدیل کر سکتا ہے۔

خطاب بہ جوانان اسلام

115

کبھی اے نوجوان مسلم! تدبر بھی کیا تو نے؟ وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟
 تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاج سردارا
 تومن آفریں، خلاق آئین جہاں داری وہ صحرائے عرب، یعنی شتریانوں کا گوارا

باب درنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا
 کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخش کا نہ تھا یارا
 جہاں گیر و جہاں دار و جہانباں و جہاں آرا
 مگر تیرے تخیل سے فردوں تر ہے وہ نظارا
 کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارا
 ثریا سے زمیں پر آسمان نے ہم کو دے مارا
 نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا
 جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سپارا
 ”غنی روز سیاہ حیر کنطال را تماشا کن
 کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زیبارا“

*

① سے ③ معنی: تدبیر، غور و فکر۔ تمدن آفریں: تہذیب پیدا کرنے والا۔ خلاق آئین جہاں داری
 : حکومت کے اصول وضع اور ایجاد کرنے والا۔

مطلب: یہ نظم اقبال نے بطور خاص مسلمان نوجوانوں کے لیے لکھی اور غالباً یہ کسی ایسے اجتماع میں ہی
 پڑھی گئی جس کا تعلق نوجوانوں سے تھا۔ چنانچہ وہ نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے یوں گویا ہوتے ہیں کہ
 اے نوجوان مسلم! کبھی تو نے اتنا بھی سوچا ہے کہ تیرا ماضی کس قدر شاندار تھا وہ ماضی جو ایک آسمان کے
 مانند تھا جس کا تو ایک ٹوٹا ہوا ستارا ہے۔ تجھے اس قوم نے اپنی آغوش محبت میں پالا ہے جس نے ایران
 کے مشہور ساسانی مہندار وارانہ کے تاج و تخت کو روند ڈالا تھا۔ کیا تجھے علم ہے کہ تو کتنی عظمتوں والی قوم
 سے تعلق رکھتا ہے؟ اگر تجھے اس کا علم نہیں تو میں بتائے دیتا ہوں۔ یعنی یہ وہ قوم تھی جو صحرائے عرب میں
 اونٹنی چرانے والوں کے گھوڑوں میں پئی۔ اس کے باوجود اس قوم نے دنیا بھر کے لوگوں کو تہذیب و تمدن
 اور رہنے سنے کا ڈھنگ سکھایا۔ اس کے علاوہ حکمرانی کے قاعدے بھی بتائے۔

④ سے ⑥ معنی: الفقر فخری: فقر میرا ثمر ہے۔ چہ حاجت روئے زیبارا: خوبصورت چہرہ کو کیا
 ضرورت ہے۔ منعم: امیر دولت مند۔

مطلب: اتنی کروفر اور شان و شوکت کے باوجود اس قوم کے لوگوں نے دولت مندی اور حکمرانی کے دور
 میں بھی وریشی اور فقیری کو اپنا طرہ امتیاز بنائے رکھا۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک و لکھش اور خوبصورت
 چہرے کی زیبائش کے لیے ظاہری ساز و سامان ضروری نہ تھا۔ وہ اللہ کے خاص بندے وریش اور فقیری
 کے عالم میں بھی اس قدر غیرت مند تھے کہ امراء کو اس امر کی جرات و ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ ان فقراء
 کو کچھ خیرات کے نام پر کسی قسم کا عطیہ دے سکیں۔ غرض تجھے میں کیا بتاؤں کہ وہ صحرائے رہنے والے
 لوگ فی الواقع دنیا کے فاتح اور حکمرانوں کے علاوہ ساری دنیا کے محافظ اور اس کو سہانے والے تھے۔

⑦ سے ⑧ معنی: ثابت: ایک جگہ ٹھہرا ہوا۔

مطلب: اگر میں چاہوں تو الفاظ میں ان کا نقشہ کھینچ کر رکھ دوں۔ اور اپنی شاعری کے ذریعے ان کا سراپا

بیان کروں۔ تاہم مشکل تو یہ ہے کہ تو اس عہد کا تصور کرنے سے قاصر ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اگر تیرا اور تیرے اسلاف کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ باسانی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے اس لیے کہ تو محض باتیں بناتا اور بے عمل ہے جب کہ وہ صاحب کردار، فعال اور متحرک تھے۔ تو جامد و ساکت اور دوسروں کی نقالی کرنے والوں میں سے ہے جب کہ تیرے اجداد عملاً اجتہاد و فکر کے عادی لوگ تھے۔ اور اپنی بات پر ہمیشہ ڈٹے رہنے والے تھے۔

⑨ (12) معنی: روزِ سیاہ پیرِ کثعال: حضرت یعقوب علیہ السلام کی یہ نختی۔ نورِ دیدہ اش: اس کی آنکھوں کا نور یعنی حضرت یوسف علیہ السلام۔

مطلب: دیکھا جائے تو ہم نے اس ورثے کو گنوا دیا جو اسلاف نے ہمارے لیے چھوڑا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ہم انتہائی عروج پانے کے باوجود اب پستی کے آخری مرحلے میں ہیں۔ حکومت اور سلطنت کا تو کوئی غم نہیں کہ وہ ایک عارضی چیز اور آنے جانے والی شے ہے آج ایک کے پاس ہے کل دوسرے کے پاس۔ ہمیشہ سے یہی روایت چلی آرہی ہے۔ مگر اپنے اجداد کی چھوڑی ہوئی وہ نادار اور بیش بہا کتابیں جواب اہل یورپ کے قبضے میں ہیں اور ان سے وہ استفادہ کر رہے ہیں وہاں ان کو دیکھ کر دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ آخری شعر غنی کا شمعیری کا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت یوسف پیارے تو حضرت یعقوب کو تھے مگر زلفا کو مل گئے اور حضرت یعقوب ان سے محروم ہو گئے۔

غرہ شوال

116

یا

ہلالِ عید

غرہ شوال! اے نورِ نگاہِ روزہ دار
تیری پیشانی پہ تحریرِ پیامِ عید ہے
سرگزشتِ ملتِ بیضا کا تو آئینہ ہے
جس علم کے سائے میں تیغِ آزما ہوتے تھے ہم
تیری قسمت میں ہم آغوشِ اسی راہیت کی ہے
آشنا پرور ہے قومِ اپنی وفا آئیں ترا
آج گردوں سے ذرا دنیا کی ہستی دیکھ لے
اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے

قافلے دیکھ! اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ
دیکھ کر تجھ کو افق پر ہم لٹاتے تھے گھر
فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
رہو در ماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
اے تمی ساغر! ہماری آج ناداری بھی دیکھ

فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
 دیکھ مسجد میں شکست رشتہ تسبیح شیخ
 کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر
 بارش سنگ حوادث کا تماشائی بھی ہو
 ہاں تعلق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تو
 جس کو ہم نے آشنا لطف تکلم سے کیا
 ساز عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن
 چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
 صورت آئینہ سب کچھ، دیکھ اور خاموش رہ
 شورش امروزہ میں نحو سرود دوش رہ 220

*

اتھارہ اشعار پر مشتمل یہ نظم عنوان سے ہی اپنے موضوع کی نشاندہی کرتی ہے تاہم اس موضوع کو بھی علامہ اقبال نے جس انداز سے اپنے افکار میں ڈھال کر تخلیقی عمل سے گزرا ہے وہ ان کی فکری انج اور فنی چابکدستی کا ثبوت ہے۔ عید کے چاند کے حوالے سے اردو شاعری میں نظموں کا ایک بیش قیمت ذخیرہ نظر آئے گا لیکن زیر تشریح نظم اس موضوع پر بلاشبہ ایک ایسی کوشش ہے جس سے اقبال ہی عمدہ برآہو سکتے تھے۔

اس نظم میں بھی اقبال کی روایتی ایجمیری اور تمثیلیں پورے اہتمام کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ ملت اسلامیہ کے عروج و زوال کے جن مناظر نے تمام عمر علامہ کو مضطرب اور بے چین رکھا ان کا اظہار اس نظم میں بھی ہے۔ اس امر کی پروا نہ کرتے ہوئے کہ ہلال عید بالخصوص ماہ رمضان کی آزمائشوں کے بعد خوشی اور مسرت کا پیغام لاتا ہے اقبال نے ان اشعار میں بھی ان حقائق کو سامنے رکھا ہے جو مسلمانوں کے زوال کا سبب بنے اور آج بھی ملت اسلامیہ ان سے دوچار ہے۔ عملاً یہ نظم مسرت افزاء نہیں بلکہ ایک مرفیہ ہے ملاحظہ ہو۔

① سے ② معنی: غرہ شوال: شوال کے مینے کا چاند۔ تمہید: آتماز۔

مطلب: اس نظم میں علامہ اقبال ”ہلال عید“ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ”اے ہلال عید!“ یہ امر واقعہ ہے کہ تو روزہ رکھنے والوں کی آنکھ کا تارا ہے۔ اے چاند! جلد نمودار ہو جا کہ روزہ رکھنے والے مسلمان تیرے لیے سراپا انتظار بنے ہوئے ہیں۔ اس لیے کہ تیرے طلوع ہوتے ہی اس امر کا یقین ہو جائے گا کہ اب عید آگئی ہے اور تمام مسلمان اس روز سعید پر گلے ملیں گے اور مسرت و خوشی کا اظہار کریں گے اس لیے کہ تو بے شک شام کے وقت طلوع ہوتا ہے پھر بھی آنحضرت کے پیروکاروں کے لیے تیرا وجود مسرت کی صبح کا آتماز ہے۔

③ سے ④ معنی: ملت بیضا: اسلامی ملت۔ مدنو: نیا چاند۔

مطلب: اے ہلال عید! دیکھا جائے تو تیری حیثیت ملت مسلمہ کی داستان کے لیے آئینہ کی حیثیت رکھتی

ہے۔ جو ہماری عروج و زوال کی آئینہ وار ہے۔ اسے سنے چاند! تیرے ساتھ ہماری محبت انتہائی قدیم ہے۔
 تجھے یہ بات تو یاد ہوگی کہ ہم مسلمان نعیم کے خلاف جس پرچم کے تلے تیغ آزما ہوتے تھے اس پر ستارے
 کے علاوہ تو بھی موجود ہوتا تھا۔ ان معرکوں میں ہمارے قبا کے دامن، بالعموم دشمنوں کے خون سے آلودہ
 ہوتا تھا۔

⑤ سے ⑦ معنی: راہیت: جھنڈا۔

مطلب: اے چاند! تو اسی پرچم سے ہم آغوش ہے جس نے فتح کے ہزاروں جھنڈے گاڑے تھے تجھ میں
 جو خوبصورتی ہے اس سے ملت کی عزت و توقیر میں اضافہ ہوا ہے۔ جس طرح تو وفا شعار ہے اور اس
 دستور کو بڑی تندہی سے نبھاتا ہے اسی طرح ہماری قوم بھی اپنے شناساؤں سے ہمیشہ محبت و شفقت سے
 پیش آتی ہے۔ ویسے بھی تیرے سراپا سے ہی محبت نکلتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تو نے جو لبادہ زیب تن کیا
 ہوا ہے وہ چاندی کا بنا ہوا ہے۔ اے چاند! تو آسمان کی بلندی پر جگمگا رہا ہے وہاں سے اس دنیا کا نظارہ بھی کر
 لے۔ اس بلندی سے ہم مسلمانوں کی پستی اور زیوں حالی بھی دیکھ لے۔

⑧ سے ⑩ معنی: رہرو درماندہ: گھڑا ہوا مسافر۔

مطلب: اے چاند! ان اقوام کے تیز رفتار قافلوں کا جائزہ بھی لے جو بڑے اہتمام و اعتماد کے ساتھ
 کامیابی و کامرانی کے ساتھ منزل کی جانب رواں دواں ہیں۔ ان کے مقابل ہمارے قوی کارواں کی ست
 رفتاری بھی دیکھ لے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم منزل کے تصور ہی سے ہزار ہیں۔

کبھی دور دور بھی تھا جب تیرے طلوع ہونے پر ہم عالم مسرت و شادمانی میں موتی لٹایا کرتے تھے جب
 کہ آج ہم اپنی ناداری اور تہمتی دستی کے ہاتھوں اس عمل سے معذور ہیں ہرچند کہ تیری ہیئت بھی ایک
 خالی پیالے کے مانند ہے۔ یہاں خالی پیالے کی تشبیہ نے مصرعے کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ادھر ہم مسلمان
 تو مختلف فرقوں میں اس طرح سے بٹے ہوئے ہیں کہ اس نفاق و انفاق کے باعث ایک دوسرے کے خون
 کے پیاسے بنے ہوئے ہیں۔ اے چاند! تو تو ان کھینٹوں سے بے شک آزاد ہے جب کہ ہم باہمی اتحاد و
 اتفاق سے محروم ہو کر محض باہمی تصادم کی لعنت میں اسیر ہو کر رہ گئے ہیں۔

(11 سے 12) معنی: رشتہ تسبیح: تسبیح کا دھاک۔ زناری: وہ دھاک جو ہندو لوگ اپنی گردن اور کمر میں
 مذہبی نشان کے طور پر باندھتے ہیں۔

مطلب: اے آسمان کی رفعت سے نظارہ کرنے والے! ہمارے ذہنی افلاس اور باہمی نفاق کا یہ عالم ہے
 کہ مساجد میں واعظان کرام نے تسبیح کے اس رشتے کو منتشر کر کے رکھ دیا ہے۔ جس سے ملت مسلمہ کا
 تعلق استوار تھا۔ اس کے مقابلے پر بیکدوں میں پوجا پاٹ کرنے والے برہمن ہیں جو اپنی قوم کو اتحاد و
 اتفاق اور باہمی محبت و شفقت کا سبق دیتے نہیں چھکتے۔

اس شعر میں اقبال نے ایک جانب تو ملا اور واعظ کے کردار کا ذکر کیا ہے اور دوسری طرف برہمنوں
 کی قوم پرستی کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اقبال نے بے شمار مقامات کی طرح یہاں بھی ملت مسلمہ کے مختلف
 فرقوں کے مابین نفاق کی ذمہ داری اول و آخر ملا اور واعظ بر ذالی ہے جو چھوٹے چھوٹے سے اختلافات کو
 ہوادے کر اپنی ہی قوم کو آپس میں لڑاتے ہیں اور فرقوں کی خلیج میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

اے چاند! یہ عبرت انگیز منظر بھی دیکھ لے کہ کافروں نے کس طرح مسلمانوں کے اصول اور طور طریقے اپنا لیے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مسلمان خود کس طرح اسلام اور اپنے ہم مذہب مسلمانوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

(13) معنی: آئینہ دواری: آئینہ کی طرح کمزور دیا رہیں ہیں۔ تعلق: خوشامد۔

مطلب: مسلمانوں پر جس طرح مصائب کی یلغار ہے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی بجائے وہ تو شیشے کی دیوار ثابت ہو رہے ہیں کہ ذرا ٹھیس لگی اور ٹوٹ گئی۔ اے چاند دیکھ! کہ وہ مسلمان جو کبھی صاحب عزت و وقار ہوا کرتے تھے۔ اب اپنے حریفوں کے سامنے خوشامد اور چالپوسی پر اتر آئے ہیں ان کے بالقابل وہ لوگ جو کبھی حقیر اور پست ہوا کرتے تھے اب وہی صاحب عزت و وقار ہیں۔

اے چاند! ہم نے جن گونگی اور بے زبان قوموں کو بولنا سکھایا آج وہ ہماری حریف کی حیثیت سے پورے جوش و خروش کے ساتھ گفتگو کرنے لگی ہیں اور ہم ان کے رو برو انگشت بدنداں کھڑے رہتے ہیں۔ مغربی ممالک کے محلات میں آج عیش و عشرت کی محفلیں ججی ہوئی ہیں اور ایران جیسی پر شکوہ مملکت جو حکمت و دانش کا سرچشمہ تھی وہاں اپنی بربادی پر ماتم پیا ہے۔

نظام خلافت جو دنیا بھر کے مسلمانوں کی وحدت کی علامت ہے اسے خود ہی ترکوں نے فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ اور یہ سب کچھ غیر مسلموں کی عیاری کے سبب ہوا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان کس قدر سادا اور نادان ہیں۔ لیکن اے چاند! تو بھی یہ سب کچھ آئینے کی مانند خاموشی کے ساتھ دیکھتا رہ۔ اور آج کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے ماضی میں کھوجا۔

شمع اور شاعر

(فروری 1912ء)

شاعر

117-1

دش ی گفتم بہ شمع منزل دیران خویش
در جہاں مثل چراغ لاله صحرا ستم
گیسوئے تو از پر پروانہ دارد شانہ
نے نصیب محفلے نے قسمت کاشانہ
در طواف شعلہ ام بالے نہ زد پروانہ
برخی خیزد ازیں محفل دل دیوانہ
از کجائیں آتش عالم فردز انداختی
کرک بے مایہ را سوز کلیم آموختی

شمع

117-2

مجھ کو جو موج نفس دیتی ہے پیغام اجل۔ لب اسی موج نفس سے ہے نوا پیرا ترا

تو فرداں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا
جنم افشاں تو کہ بزم گل میں ہو چھا ترا
ہے ترے امروز سے نا آشنا فردا ترا
شعلہ ہے مثل چراغ لالہ صحرا ترا
انجمن پیاسی ہے اور پیانہ بے صبا ترا
زشت روٹی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا
کس قدر شوریدہ سر ہے شوق بے پروا ترا
تنگ ہے صحرا ترا، محفل ہے بے لیلا ترا
لذت طوفاں سے ہے نا آشنا دریا ترا
گلشن ہوا برہم ترا

نغمہ بے موسم ترا

لے کے اب تو وعدہ دیدار عام آیا تو کیا
ساقیا! محفل میں تو آتشیں بجام آیا تو کیا
پھول کو باد بہاری کا پیام آیا تو کیا
صبّحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
اب کوئی سودا کی سوز تمام آیا تو کیا
پھول بے پروا ہیں، تو گرم نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے، آواز درا ہو یا نہ ہو

تیرے پروانے بھی، اس لذت سے بیگانے رہے
پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے؟
تیری محفل میں نہ دیوانے، نہ فرزانے رہے
قاعدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے
اب نہ وہ میکش رہے باقی، نہ میخانے رہے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیانے رہے
رقص میں لھیلا رہی، لیلا کے دیوانے رہے
کارواں جاتا رہا

احساس زباں جاتا رہا

شہر ان کے مٹ گئے، آبادیاں بن ہو گئیں
وہ نمازیں ہند میں نذر برہمن ہو گئیں
موج کو آزادیاں سامان شیون ہو گئیں
وہ نگاہیں نا امید نور ایمن ہو گئیں

میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضممری فطرت میں سوز
گریہ ساماں میں کہ میرے دل میں ہے طوفان اشد
گل بدامن ہے مری شب کے لوہے میری صبح
یوں تو روشن ہے مگر سوز دروں رکھتا نہیں
سوچ تو دل میں لقب ساقی کا ہے زبا تجھے
اور ہے تیرا شعار، آئین ملت اور ہے
کعبہ پہلو میں ہے، اور سودا کی ہتھکڑ ہے
قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں
اے در تابندہ! اے پروردہ آغوش موج

اب نوا پیرا ہے کیا؟

بے محل تیرا ترنم

تھا جنہیں ذوق تماشا، وہ تو رخصت ہو گئے
انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے
آہ! جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی
آخر شب دید کے قابل تھی بے ل کی تڑپ
بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصود ہر پروانہ تھا

پھول بے پروا ہیں، تو گرم نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے، آواز درا ہو یا نہ ہو

شمع محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا
رشتہ الفت میں جب ان کو پروا نہ تھا تو
شوق بے پروا گیا، فکر فلک پیا گیا
وہ جگر سوزی نہیں، وہ شعلہ آشام نہیں
خیر تو ساقی سہی، لیکن پلائے گا کے
رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی میٹا اسے
آج ہیں خاموش وہ دشت جنوں پرور جہاں
دائے ناکامی متاع

کارواں کے دل سے

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد دیرانے کبھی
سلطت توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
دہر میں عیش دوام آئیں کی پابندی سے ہے
خود تجلی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی

اڑتی پھرتی تھیں ہزاروں ہلبلیں گزار میں
 وسعت گردوں میں تھی ان کی تڑپ نگارہ سوز
 دیدہ خونبار ہو منت کش گزار کیوں
 شام غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی
 غفلت شب میں نظر آئی کرن امید کی

مرثہ اے پیانہ بردار خمستان حجاز
 نقد خودداری بہائے باوہ اغیار شعی
 ٹوٹنے کو ہے طلسم ماہ سیامان بند
 پھر یہ غوغا ہے کہ لاساقی شراب خانہ ساز
 نغمہ پیرا ہو کہ یہ ہنگام خاموشی نہیں
 در غم دیگر بسوز و دیگران را ہم بسوز
 کہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری

آنکھ کو بیدار کر دے وعدہ دیدار سے

زندہ کر دے دل کو سوز جوہر گفتار سے

رہزن ہمت ہوا ذوق تن آسانی ترا
 اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی
 زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرار حیات
 پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ
 آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

پردہ دل میں محبت کو ابھی مستور رکھ
 خیمہ زن ہو وادی سینا میں مانند کلیم
 شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجام ستم
 تو اگر خوددار ہے منت کش ساقی نہ ہو
 کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں
 خاک میں تعجکو مقدر نے ملایا ہے اگر
 ہاں! اسی شاخ کن پر پھر بنا لے آشیان
 اس چمن میں پیرد بلبل ہو یا تلمیذ گل

کیوں چمن میں بے صدا مثل رم خبثت ہے تو؟

لب کشا ہو جا سرود ربط عالم ہے تو؟

بحر تھا صحرا میں تو گلشن میں مثل جو ہوا
 چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروان ہو ہوا
 یہ کبھی گوہر کبھی خبثت کبھی آنسو ہوا
 زندگی کیسی جو دل بیگانہ پہلو ہوا
 جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا

یعنی اپنی سے کو رسوا صورت مینا نہ کر
 شعلہ تحقیق کو غارت گر کاشانہ کر
 صرف تعمیر سحر خاکستر پروانہ کر
 عین دریا میں حباب آساگوں پیانہ کر
 ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر
 تو عصا افتاد سے پیدا مثال دانہ کر
 اہل گلشن کو شہید نغمہ مستانہ کر
 یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر

داند تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
 راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو
 ناخدا تو، بحر تو کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
 قیس تو، لیلہ بھی تو، صحرا بھی تو، محل بھی تو
 سے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو
 خوف باطل کیا کہ ہے عارت گز باطل بھی تو
 آئینہ ایام ہے

کا آخری پیغام ہے

قطرہ ہے، لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے
 دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفان بھی ہے
 جو نظام دہر میں پیدا بھی ہے، پنہاں بھی ہے
 تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ سماں بھی ہے
 اے تعافل پیش! تجھ کو یاد وہ پیاں بھی ہے
 ورنہ گلشن میں علاج تنگنی داماں بھی ہے
 کسوت مینا میں سے مستور بھی عریاں بھی ہے
 اور میری زندگانی کا یہی سماں بھی ہے
 راز اس آتش نواں کا مرے سینے میں دیکھ

کے آئینے میں دیکھ

اور ظلمت رات کی سیماں پا ہو جائے گی
 کلمت خویہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
 بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی
 اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
 موج مضطرب ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی
 پھر جہیں خاک حرم سے آشنا ہو جائے گی
 خون گلچس سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی
 محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

آخر جلوۂ خورشید سے

یہ چمن معمور ہو گا نغمہ توحید سے

*

شاعر مشرق کی یہ طویل نظم گیارہ بند پر مشتمل ہے۔ جن کے چھپاسی اشعار ہیں۔ شمع اور شاعر کے
 مابین ایک مکالمہ پیش کیا ہے۔ اس مکالمے میں اقبال نے اپنے انکار کے حوالے سے بہت سی اہم باتیں
 کہی ہیں۔ پہلا بند فارسی اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں شاعر کا شمع سے مکالمہ ہے۔ باقی کے دس بند میں

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقان ذرا
 آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
 کانپتا ہے دل ترا اندیشہ طوفان سے کیا
 دیکھ آ کر کوچہ چاک گریباں میں کبھی
 وائے نادانی! کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
 شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
 پیچرا تو جوہر

تو زمانے میں خدا

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
 کیوں گرفتار طلسم بیچ مقداری ہے تو
 سینہ ہے تیرا امن اس کے پیام ناز کا
 ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفتک
 اب تلک شاید ہے جس پر کوہ فاراں کا سکوت
 تو ہی نادان چند کلیوں پر قناعت کر گیا
 دل کی کیفیت ہے پیدا پردۂ تقریر میں
 پھونک ڈالا ہے مری آتش نواں نے مجھے
 راز اس آتش نواں کا

جلوۂ تقدیر میرے دل

آسماں ہو سحر کے نور سے آئینہ پوش
 اس قدر ہو گی ترنم آفریں باد بہار
 آملیں گے نیند چاکان چمن سے سینہ چاک
 خنیم انسانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
 دیکھ لو گے سطوت رفتار دریا کا مال
 پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغام بخود
 نالہ صاوت سے ہوں گے نوا سماں طیور
 آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آسکتا نہیں
 شب گریزاں ہو گی

یہ چمن معمور ہو گا نغمہ توحید سے

شمع از خود شاعر کے استفسارات کا جواب دیتی ہے۔ فرماتے ہیں:

شاعر

سلا بند معنی: منزل ویران خویش: اپنے ویران گھر کی شمع۔ وارد شانہ: کنگھی سیاہ ہے۔ من ہم نفس می سو ختم: میں اپنے نفس کی آگ میں جل رہا ہوں۔ می طہد: تڑپ رہے ہیں۔ بر می خیزد: نہیں اٹھتا۔ آتش عالم فروزا ندوخی: دنیا کو روشن کرنے والی آگ۔ کر مک: بکیزہ۔

مطلب: کل میں نے اپنے ویران اور اجاڑ گھر میں جلنے والی شمع سے استفسار کیا کہ پروانے جو ہمہ وقت تیرا طواف کرتے رہتے ہیں بجا طور پر تجھ پر فریفتہ ہیں۔ جب کہ میری شخصیت تو اس گل لالہ کی مانند ہے جو جتنا تو رہتا ہے تاہم اس کے گرد طواف کوئی نہیں کرتا۔ جس کے مقدر میں نہ تو کوئی محفل ہے نہ ہی کوئی ڈھنگ کا گھر ہے۔ حیرت ہے کہ میرا کوئی شیدا لئی نہیں ہے جب کہ آرزوؤں اور خواہشوں میں صرف ہونے والی میری جان اس عالم رنگ و بو میں ہزاروں جلوے پیدا کر رہی ہے۔

اے شمع آخر تو نے پوری دنیا کو منور کرنے والی یہ روشنی کہاں سے حاصل کر لی۔ جس کے سبب ایک بے حقیقت پروانے کو حضرت موسیٰ جیسا سوز مل گیا۔

شمع

دو سرا بند معنی: موج نفس: ہوا کی موج۔ سوز: حرارت۔ سودا: خط۔ بزم گل: پھولوں کی محفل۔ گل بدامن: دامن میں پھول۔ فردا: آنے والا کل۔ سوز و رول: اندر کی حرارت۔ چراغ لالہ صحرا: صحرا کے لالہ کا چراغ۔ بے صہبا: بغیر شراب کے۔ شعار: طریقہ۔ زشت روی: بد صورتی۔ شوریدہ: دیوانہ۔ محل: لیلیٰ کے بیٹے کی جگہ۔ دو تار بندہ: چمک دار موتی۔ نوا پیرا: گیت گارہا ہے۔ برہم: اجڑ گیا ہے۔

مطلب: شمع اس مرحلے پر شاعر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتی ہے کہ ہر چند تیری اور میری کیفیت ایک جیسی ہے تاہم فرق یہ ہے کہ جو موج نفس تیرے لیے نغمہ پیرائی کا سبب بنتی ہے وہی میرے لیے موت کا پیغام بن جاتی ہے۔ میں تو محض اس لیے جلتی ہوں کہ میری فطرت میں مقدر نے جلنا لکھ دیا ہے جب کہ تو اپنی تخلیقات میں اس لیے سوز پیدا کرتا ہے کہ تیرے اشعار کو سننے والے تیرے دیوانے بن کر رہ جائیں۔ میں تو اس لیے آنسو نکالتی ہوں کہ میرے دل میں آنسوؤں کا ایک طوفان برپا رہتا ہے جب کہ تو اس لیے روتا ہے کہ سننے والوں میں تیری ہمدردی پیدا ہو اور وہ تجھ سے محبت کا اظہار کر سکیں۔ میں راتوں کو جل جل کر آنے والی صبح کے لیے لانا تھا قربانیاں دیتی ہے۔ جب کہ تیرا مستقبل تیرے حال سے قطعاً واقف نہیں۔ مراد یہ ہے کہ تو مستقبل کی بہتری کے لیے جدوجہد نہیں کرتا۔ بے شک تو بھی میری مانند جتنا رہتا ہے لیکن تیرے دل میں وہ حقیقی سوز نہیں جو میری فطرت میں مضمر ہے۔ لیکن تیرا شعلہ تو لالہ صحرا کے رنگ روپ کی طرح ہے۔ تو خود کو قوم کی مشکلات سے نبرد آزمائی کا دعویدار کلمانے میں فخر محسوس کرتا ہے لیکن ذرا سوچ کہ تیرے لیے یہ لقب کہاں تک موزوں ہے جب کہ نہ تیرے پاس عمل کی قوت ہے نہ

ایسے وسائل کہ قومی معاملات کو کامیابی سے ہم کنار کر سکے۔ تیری قوم تو بے وسیلہ ہے اور تو بھی بے عمل اور خالی ہاتھ ہے۔

اے شاعر! حقیقت یہ ہے کہ تیرے غلط طرز عمل اور اس کے ساتھ بے عملی نے پوری قوم کو بدنام کر دیا ہے۔ اس لیے بھی کہ تیرا طرز عمل ملت کے اصولوں کے قطعاً منافی ہے۔ بظاہر تو حرم کعبہ کا پرستار ہے جب کہ عملاً تیری فطرت، شکدے سے ہم آہنگ ہے۔ تیری قوم میں اب قیس جیسے عاشق اور دیوانوں کا پیدا ہونا یوں ممکن نہیں رہا کہ نہ تیرے پاس تو وہ جو ہر اقدار بھی موجود نہیں رہا جو کبھی سرمایہ افتخار ہوتا تھا۔ تو بے شک ایک ایسے اقدار موتی کی مانند ہے جو تند و تیز موج کی آغوش میں پلا لیکن اس کا کیا جائے کہ جس دریا میں تو نے پرورش پائی ہے وہ طوفان سے آشنا ہے۔ مراد یہ کہ تو اور تیری قوم بے حسی اور بے عملی کے سبب ناکارہ ہو چکی ہے۔ تیری قوم میں دیکھا جائے تو وہ توانائی نہیں رہی جو انقلابوں کو جنم دیتی تھی۔

اب اس نغمہ ریزی کا کیا فائدہ جب تیرا گلستاں برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ تیرے اشعار توجہ پوچھے بے وقت کی راگنی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو ملت کی بیداری میں قطعی مددگار ثابت نہیں ہو سکتے۔

تیسرا بند معنی: ذوق تماشا؛ دیکھنے کا شوق۔ شعلہ آشام: شعلہ پینے والا (یعنی شراب پی)۔ آتش بجمام: پیالے میں آگ۔ گلشن کی جمعیت: باغ کا شیرازہ۔ بالائے بام: چھت کے اوپر۔ سوز تمام: تمام حرارت۔ آواز درا: کارواں کی گھنٹی کی آواز۔

مطلب: اے شاعر! ملت مسلمہ کے وہ باشعور افراد جو ساری صورت حال کو سمجھنے کا اور اک رکھتے تھے وہ تو اب اس دار فانی سے بے نیل و مرام رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد تو حالات کی بہتری کی نوید لے کر آیا ہے تو اس کا کیا فائدہ۔ اگلے دو اشعار کا مفہوم بھی قریب قریب وہی ہے جو اس بند کے پہلے شعر کا تھا۔ چنانچہ ان اشعار میں الفاظ، تراکیب اور استعارے بدل کر کیا گیا ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں جو لوگ انتہائی حقیقت پسند تھے ان کے رخصت ہونے کے بعد اگر تو اپنے اشعار میں مسائل کا کوئی حل پیش کرتا ہے تو اس سے کیا حاصل ہو گا۔ اس لیے کہ جب گلستاں ہی اجڑ گیا اور اس کا شیرازہ ہی منتشر ہو گیا تو اس لیے بہار کی تازہ ہوا کے پیام کی نوید بے معنی سی بات ہے۔

اس لیے کہ وہ منظر تو کب کا نظروں سے غائب ہو چکا جب تیری قوم اپنے عروج کے آخری لمحات میں تھی۔ وہ اضطراب اور تڑپ ناقابل فراموش ہے۔ لہذا اس کے بعد کوئی بہتری کے امکانات پیدا بھی ہو جائیں تو ان سے کیا مل سکے گا۔ اس لیے کہ ملت کے دلوں میں جدوجہد اور انقلاب کا جو شعلہ بھڑک رہا تھا وہ تو بجھ کر رہ گیا۔ اس کے بعد اگر کوئی اس شعلے کو ہوا دینے آیا بھی تو یہ ایک بے معنی سا عمل ہو گا۔ کہ جس قوم میں عمل اور احساس ذمہ داری کے جذبے مفقود ہو جائیں وہ تو مردہ بن کر رہ جاتی ہے۔

اے شاعر! اب تو نوبت یہاں تک آچکی کہ تو کتنے ہی نغمے بکھیر دے ملت کے افراد ان پر کان دھرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ یہ قائلہ بے حس ہو چکا ہے۔

چوتھا بند معنی: رشتہ الفت: محبت کا دھاکہ۔ فکر فلک پیا: آسمان پر سیر کرنے والا فکر۔ فرزانے: نکلندہ۔ مینا: مراہی۔ دشت جنوں پرور: دیوانگی دینے والا جنگل۔ احساس زیاں: نقصان کا احساس۔

مطلب: شمع کہتی ہے کہ اے شاعر! اگر ملت کو ایک بزم تصور کر لیا جائے تو تیری حیثیت اس بزم میں

ایک شمع کے مانند ہوگی لیکن یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ شمع محفل قرار دیئے جانے کے باوجود بھی جب تجھ میں سوز اور تڑپ مفقود رہی تو ملت کے افراد جن کو پروانوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ان میں سوز اور تڑپ پیدا کس طرح ہو سکتی ہے۔ یعنی جب تجھ میں ہی ملت کی بقا کے لیے جدوجہد اور قربانی کا جذبہ نہیں ہے تو ملت کے عام افراد سے کیا توقع دہشتہ کی جاسکتی ہے۔ جب تو یہ صلاحیت رکھتا تھا کہ ملت کے افراد کو رنگ و نسل کی تفریق کے بغیر تسبیح کے دانوں کی طرح یکجا اور متحد کر سکتا تھا تو پھر یہ بتا کہ یہ لوگ نفاق اور انتشار کا شکار کس لیے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس ساری صورت حال کی ذمہ داری تجھ پر اور صرف تجھ پر ہی عائد کی جاسکتی ہے۔ اب تو کیفیت یہ ہے کہ ملت کے افراد سے ماضی کی طرح مشکلات سے نیرو آزما ہونے اور بلندی فکر کی خصوصیات ناپید ہو گئیں اور اب ان پر عمل کرنے والا بھی کوئی نہیں رہا۔

اب تو افراد ملت میں نہ مشکلات و شدائد کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہے نہ نای جدوجہد اور قربانی کا جذبہ۔ یعنی اپنے مقاصد کے حصول سے انہیں کوئی رغبت نہیں رہی۔ یہ ایسی کیفیت ہے کہ اگر باقی کے چند افراد میں قربانی اور جدوجہد کی تڑپ موجود بھی ہو تو اس سے کیا فائدہ حاصل ہو سکے گا؟ اگر تجھے ساقی بھی تصور کر لیا جائے تو شراب کیسے پلائے گا جب کہ نہ پینے والے باقی رہے نہ شراب خانے۔ مراد یہ ہے کہ جب افراد ملت بے عملی اور محرومی کو اپنے سر پر مسلط کر چکے ہوں تو اسے شاعر! تو کتنی ہی دل سوزی کے ساتھ ان کے لیے نعمات تخلیق کرے۔ ان سے کوئی نتیجہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ جو قوم ماضی میں انتہائی عروج پر تھی آج وہ انتہائی سطح تک زوال کی شکار ہے۔ اس صورت حال کا اور اک اگر کسی ایک آدھ فرد کو ہے بھی تو اس سے کیا حاصل؟ آج تو وہ سارا منظر ہی تبدیل ہو چکا ہے جو کسی زمانے میں شان و شوکت اور عزت و وقار کا مظہر رہا تھا۔

افسوس تو اس امر کا ہے کہ ملت تباہ و برباد ہو کر رہ گئی بلکہ اس سے زیادہ افسوس اس امر کا ہے کہ افراد کے دل سے اس بربادی اور تباہی کا احساس بھی ختم ہو گیا۔

پانچواں بند معنی: سطوت، دہدہ۔ عیش دوام، نیش کی آسودگی۔ سامان شیون: رونے کا سامان۔ جلی: نور۔ نور امین: وہ روشنی جو حضرت موسیٰ نے کوہ طور پر دیکھی تھی۔ پابند نشیمن: آشیانوں میں بیٹھ گئیں۔ نظارہ سوز: نظارے کو جانے والی۔ دیدہ خونبار: خون پر سائے والی آنکھ۔ منت کش: احسان مند۔

مطلب: ان اشعار میں مسلمانوں کے پر شکوہ ماضی کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ جن جوانمردوں نے اپنے جوش عمل اور کارکردگی سے اجازت جنگوں کو بھی پر رونق بستیوں میں تبدیل کر دیا تھا اب ان کی زوال آمدگی کا یہ عالم ہے کہ ان جوانمردوں کے شر اور آبادیاں مسمار ہو کر ویران جنگل کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ ان جوانمردوں کی عبادت اور نمازوں سے حقیقت یہ ہے کہ بت پرستوں کے انبوه میں وحدانیت کے تصور کو فروغ حاصل ہوا۔ آج ان کی حالت یہ ہے کہ برہمن ان کے آقا بنے ہوئے ہیں اور ان کی نمازوں کا سلسلہ بھی انہیں آقاؤں کی بھیئت چڑھ گیا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں انہی اقوام کو عروج حاصل ہوا جنہوں نے اپنے آئین اور نظام کی پابندی کی ورنہ مادر پدر قسم کی آزادی سے تاسف کے بغیر اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اے شاعر! تجھے یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ جو حضرت موسیٰ کو کوہ طور پر نظر آیا تھا اور جو خود اپنے دیکھے جانے کا آرزو مند تھا وہ ناامیدی اور مایوسی کا شکار ہو چکا ہے کہ وہ بصیرت افروز نگاہیں ہی نہ رہیں جو

اس نور کے جلوے کو دیکھنے کی اہلیت رکھتی تھیں۔ وہ دور بھی کبھی تھا کہ ہزار ہا بلبل اس گلستاں میں محو پرواز رہتی تھیں۔ اب نہ جانے ان کو کیا ہوا کہ اپنے گھونسلوں میں چھپ کر بیٹھ گئیں۔ مراد یہ ہے کہ ملت کی بے عملی نے ان کو بھی باپوسی کا شکار بنا دیا ہے۔ جو بجلیاں آسمان پر چمکتی رہتی ہیں اور جن کے نظارے سے دل میں تڑپ پیدا ہوتی تھی اب وہ خرمن تک محدود ہو کر رہ گئیں یعنی ان میں حدت و حرارت اور تڑپ ختم ہو کر رہ گئیں۔ ایسے میں خون برسانے والی آنکھیں پھولوں کے لیے باغ کا احسان ہی کیوں لیں کہ انہوں نے تو اپنے مسلسل بننے والے آنسوؤں سے دامن کو ہی گزار بنا دیا ہے۔

اس ساری کیفیت کے باوجود یہ غم انگیز صورت حال مستقل حیثیت کی حامل نہیں ہے۔ یہ شام غم تو اب مسرت و شادمانی کی صبح کی خبر دے رہی ہے اور تاریکی شب میں بھی امید کی کرن نظر آنے لگی ہے۔ ملت کے زوال کا دور ختم ہونے کو ہے۔ اور آئندہ بہتر صورت حال کی توقع کی جانی چاہیے۔

چھٹا بند معنی: پیمانہ بردار: ساقی۔ خمستان حجاز: حجاز کا شراب خانہ۔ نقد خودداری: خودداری کی دولت۔ صدائے ناؤ نوش: شراب نوشی کے وقت کا شور و غوغا۔ ماہ سیما یان ہند: ہندوستان کی چاند جیسی پیشانی والے۔ سلمی: عرب کے ایک شاعر کی محبوبہ۔ جزویست از تیغیبری: تیغبری کا حصہ ہے۔ پیغام سروش: فرشتہ کا پیغام۔ سوز جو ہر گفتار: کلام کی گری۔

مطلب: اے شر حجاز کی شان میں نغمہ سرائی کرنے والے شاعر! تجھے خوش خبری ہو کہ ایک عرصے کے بعد تیرے چاہنے والے پھر سے ہوش میں آنے لگے ہیں۔ یعنی ملت اسلامیہ گمراہی نیند سے ایک بار پھر بیدار ہونے لگی ہے۔ کافی عرصے سے اس قوم نے اپنی غیرت و خودداری کو غیروں کے ہاتھ بیچ رکھا۔ مراد یہ ہے کہ ملت کے افراد اپنے عقیدے اور اصولوں کو خیر باد کہہ کر فرنگیوں اور عجمیوں کے عقائد کے ہم نوا ہو گئے تھے تاہم مقام شکر ہے کہ اب وہ پھر سے اپنے عقائد کی جانب لوٹ رہے ہیں۔ اب ہندوستان کی چاند جیسی پیشانی رکھنے والی محبوبوں کا جادو ٹوٹ رہا ہے اور پھر سلمی کا حسن جہاں سوز مسلمانوں کو اپنی جانب متوجہ کر رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ مسلمانوں پر ہندو تہذیب و ثقافت کے جو اثرات تھے ان کا ظلم ٹوٹ رہا ہے اور وہ خود اپنی تہذیب و ثقافت میں از سر نو کشمکش محسوس کرنے لگے ہیں۔

ایک بار پھر سے شور بلند ہونے لگا ہے کہ غیروں کی تہذیب و ثقافت سے نجات حاصل کر کے اپنی ہی تہذیب و ثقافت کی جانب لوٹ آؤ۔ شمع ایک بار پھر شاعر کو مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے کہ یہ خاموش رہنے کا وقت نہیں۔ تیرے نعمات قوم کی بیداری کا سبب بن سکتے ہیں۔ یہ وقت سحر ہے اور سورج طلوع ہو رہا ہے جو ملت کے لیے خوش آئندگی کی علامت ہے۔ یہ بڑی اہم بات کی جانب اشارہ ہے کہ دو سرورں کے دکھ درد میں جلو اور دو سرورں کو بھی سوز عشق میں مبتلا کرو یعنی تھک و متفق ہو کر ایک دوسرے کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھو۔ ایک بڑے دانشور یہ نکتہ بیاں کر گئے ہیں کہ اچھی شاعری عملاً پیغمبری کا جزو ہوتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ اچھی شاعری مسلمانوں کی صحیح سمت میں رہنمائی کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ اے شاعر! ملت کو اپنی شاعری کے ذریعے بیدار کر دے اور مردہ دلوں کو اضطراب اور تڑپ سے نواز دے۔

ساتواں بند معنی: جمعیت: اتحاد۔

مطلب: اے شاعر! تو جو ملت کا نمائندہ ہے افسوس ہے کہ مشکلات کا سامنا نہ کرنے اور بے عملی کی عادت نے تیرے ذہن اور حوصلے کو یست کر کے رکھ دیا۔ وہ وقت بھی تھا جب تو صحرا میں سمندر کی مانند تھا

لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ گلستان میں پہنچ کر ندی کا روپ دھار لیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ مشکلات سے بچنے اور عملی جدوجہد سے گریز کرنے کی عادت اس لیے پڑی کہ صحرائے عرب اور افریقہ کے صحراؤں میں جس جی واری کے ساتھ تیرے عساکر دشمن کے مقابلے پر سینہ سپر ہو گئے لیکن جب بہت سے علاقے فتح کر کے تجھے آرام و سکون اور عیش و عشرت میرے آئے تو بے عملی کا اس قدر عادی ہوا کہ تیری شخصیت سٹ کر رہ گئی۔ تو جب تک اپنے حقیقی اصولوں اور قواعد پر قائم تھا تو ملت بھی متحد و متفق تھی لیکن ان اصولوں اور قواعد کو فراموش کر کے تیری قوم بھی منتشر ہو کر رہ گئی۔

پانی کا ایک معمولی سا قطرہ دیکھا جائے تو ہمیں زندگی کے رازوں سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ قطرہ کبھی منجد ہو کر موتی بن جاتا ہے۔ کبھی آسمان کی بلندیوں سے شبنم کی صورت واپس زمین پر آتا ہے اور کبھی آنسو جیسی نایاب چیز بن کر آسمان سے ٹپکتا ہے۔ دل ایک بڑی دولت ہے۔ یہاں خرد حوصلے سے ہے کہ حوصلہ ہی باقی نہ رہے تو زندگی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ دنیا میں تیری عزت و آبرو اس وقت تک ہی تھی جب تک کہ تیری ملت متحد و متفق تھی اور انتشار سے دوچار نہ ہوئی تھی۔ اور جب اتحاد نہ رہا تو تیری عزت بھی خاک میں مل کر رہ گئی۔

بنور سن لے! کہ فرد کا جو اسی وقت تک قائم ہے کہ وہ ملت سے مربوط ہو۔ اسی طرح جیسے موج دریا میں تو اہم ہے دریا کے باہر بے معنی ہے۔

آٹھواں بند معنی: واوی سینا: واوی طور۔ شعلہ تحقیق: علم کی آگ۔ حباب: بلبلے کی مانند۔ آسائگوں: انا۔ تلمیذ: شاگرد۔

مطلب: اس بند کی تشریح سے قبل یہاں یہ واضح کرنا غیر ضروری نہ ہو گا کہ بعض شاعرین نے جیسے بند کے بعد کی تمام نظم کو شاعر سے مخاطبت کی بجائے اقبال کے توسط سے ملت مسلمہ سے مخاطبت قرار دیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ جیسا کہ گذشتہ بند میں لکھا گیا ہے کہ شمع نے شاعر کو ملت کا نمائندہ قرار دیا ہے اور اسی حوالے سے اس نے ملت کے بارے میں گفتگو کی ہے لیکن اس گفتگو کا تعلق شاعر یعنی اقبال سے ہی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اے شاعر! تیری بہتری اسی میں ہے کہ اپنے عشق حقیق کو دل کے پروے میں ہی چھپا کر رکھ۔ اس کو قطعاً ظاہر نہ کر۔ ورنہ ذلت و رسوائی کے سوا اور کچھ نہ ملے گا۔ اس کی مثال شراب کی صراحی ہے جو شراب کے اخراج میں قفل کی صدا سے خود شراب کے وجود کی خبر دیتی ہے۔ چنانچہ تو اس طرح کی روش اختیار نہ کر۔ اے شاعر! تو اور تیری ملت جو ایک عرصے سے اپنے وجود کی جانب سے بے نیاز ہو چکے ہو۔ کمر بستہ باندھ لو۔ حضرت موسیٰ کی طرح کوہ طور کی واوی میں ڈیرے ڈال دے اور تحقیق کے شعلے کو بلند کر اور اپنے لیے صرف کر۔ مراد یہ کہ دوسروں کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنی تہذیبی، ملی اور معاشرتی اقدار کو فروغ دے۔ بے شک میری مانند شمع رات بھر جلتی رہتی ہے اور اس کے شعلے کے سبب لافعلاد پروانے جل کر خاک ہو جاتے ہیں تاہم شمع سے اس ظلم و ستم کے انتقام لینے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ جو پروانے جل چکے ان کی خاک سے نئی شمع وجود میں لائی جائے۔ ظاہر ہے کہ صبح کی روشنی نمودار ہوتے ہی شمع کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی اس کا وجود غیر ضروری ہو جاتا ہے اور اس کو بجھا دیا جاتا ہے۔

حباب یعنی بلبل پانی میں سرنگوں رہتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ حباب پانی کی سطح پر موجود رہنے کے باوجود خود کو اٹنے پالنے کی طرح رکھتا ہے اور دریا سے کسی قسم کی خیرات نہیں لیتا۔ یہ جو قدیم کوہ و صحرا ہیں ان میں اب کوئی کشش باقی نہیں رہی اب تو ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنی تنگ و دو کے لیے نیا میدان تلاش کر۔ اس لیے کہ اب تیرا غم اور جنون بھی نئے ہیں۔

اگر تجھے حالات نے انتہائی پستی سے ہم کنار کر دیا ہے تو اس کی پروا نہ کر۔ تو بھی حوصلہ کر اور علی جدوجہد اسی طرح جاری رکھ۔ اس جدوجہد کا نتیجہ اس کسان کی کوشش کے مطابق برآمد ہو سکتا ہے جو زمین میں مل چلا کر وہاں بیج ڈال دیتا ہے۔ یہ بیج بظاہر مٹی میں مل جاتا ہے لیکن پھر مٹی سے برآمد ہو کر نئے کی شکل میں قائم و استوار ہو جاتا ہے۔ مراد یہ کہ جدوجہد اور محنت کا پھل ضرور ملتا ہے۔

اے شاعر! پھر سے اپنے شاندار اور اصول پرست ماضی کی طرف لوٹ آ۔ کہ اسی حوالے سے تو جو نفع و فائدہ کرے گا وہی ملت اسلامیہ کے لیے مسرت و شادمانی کا سبب بن جائیں گے۔ اس دنیا میں زندہ رہنے کے دو ہی طریقے اور اصول ہیں کہ یا تو مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے یا پھر خاموشی اختیار کر لی جائے۔

سوائے شاعر! تو اس دنیا میں شبنم کی طرح خاموش کیوں ہے تیرے لیے لازم ہے کہ اپنے لب کھول کر تو کائنات کے ساز کا ایک نغمہ ہے۔

نواں بند معنی: باراں: بارش۔ خاشاک: گھاس پھوس۔

مطلب: شمع کتنی ہے کہ اے شاعر! تیرا وجود تو اس کسان کے مانند ہے جو عملی سطح پر بیج بھی، بھیتی بھی، بارش بھی۔ اور اس سے حاصل ہونے والی فصل کی طرح ہے۔ نہ جانے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر تو کس چیز کے لیے سرگرداں رہتا ہے۔ جب کہ تو کسی کا محتاج نہیں ہے۔ راستے سے لے کر منزل تک سب تیرے وجود کی خبر دیتے ہیں۔ اسی طرح طوفان کے خوف سے تیرا دل نہ جانے کیوں لرزتا ہے جب کہ یہاں بھی ملاح بھی تو خود ہی ہے۔ سمندر بھی، کشتی بھی اور سمندر کا ساحل بھی بالآخر تو ہی ٹھہرتا ہے۔ تیرے وجود کے بغیر یہ عناصر بے معنی ہیں۔

اے شاعر! کبھی عشاق کے اجتماع میں بھی پہنچ کر دیکھ۔ وہاں بھی تجھے پتہ چلے گا کہ قیس اور لیلیٰ بھی تو ہے وہ صحرا جہاں قیس سرگرداں پھرتا تھا وہ بھی سٹ کر تیرے وجود کا حصہ بن گیا ہے۔ اسی طرح وہ کجاوہ جس میں لیلیٰ سوار ہوتی تھی وہ بھی تو ہی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تو نے اپنی سادگی کے سبب ساقی کو ہی سب کچھ تصور کر لیا حالانکہ حقیقت مختلف ہے۔ شراب، بول، پیانا، ساقی اور جس مخمل میں دور جام چل رہا ہے وہ سب تو ہی تو ہے۔ تجھ پر لازم ہے کہ مخالفین خدا کو شعلہ بن کر خاکستر کر دے۔ تجھے باطل کا خوف نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ باطل کو برباد کرنے والا بھی تو ہی ہے۔

نہ جانے تو اس قدر بے خبر کیوں ہے جب کہ تو ہی ہے جو زمانے کے آئینے کے جوہر کے علاوہ مسلمان کی حیثیت سے خدا کا آخری پیغام بھی ہے۔

دسواں بند معنی: شوکت طوفان: طوفان کی شان۔ ہفت کشور: سات دلاستیں۔ تسخیر: فتح۔ کوہ فاراں: مکہ معظمہ کے قریب کے پہاڑ۔ ردہ تقرر میر: گفتگو کے ردے میں۔ کسوت مینا: صراحی کا لباس۔

مطلب: اے شاعر بے بدل! تجھ پر لازم ہے کہ اپنی اصل حقیقت سے شناسائی حاصل کر لے تو تو اس قدر غفلت شعار ہے کہ یہ بھی نہیں جانتا کہ معمولی سا قطرہ ہونے کے باوجود اپنی وسعت میں بحرِ بیکراں کی مانند ہے۔ نہ جانے تو اپنی کم مانگی کے احساس میں کیوں جٹا ہے۔ جب کہ تیرے وجود میں نہ جانے کتنے طوفانوں کا جوہ و جلال پوشیدہ ہے۔ تیرا سینہ تو اس معبود حقیقی کے راز کا و فیض ہے جو اس کائنات میں ظاہر بھی ہے اور پوشیدہ بھی۔ یعنی یہاں جو مظاہر فطرت ہیں وہ چشمِ بینا کے لیے خالقِ حقیقی کے وجود کا پتہ دیتے ہیں جب کہ عملاً اس کی ذات پوشیدہ ہے۔

اے شاعر! تو اس ملت کا فرزند ہے جس نے اپنی قوتِ ایمان سے بے سرو سامانی کے عالم میں بھی ہزاروں فتوحات حاصل کیں اور عظیم الشان سلطنتوں کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ تو نے آنحضرتؐ سے کیا ہوا وعدہ فراموش کر دیا۔ اس وعدے کی شہادت کوہِ فاراں کی خامشی آج بھی فراہم کر رہی ہے۔ تو نے تو انتہائی نادانی اور سادگی کا ثبوت دیا ہے کہ محض چھوٹی چھوٹی عنایت پر ہی قناعت کر کے انہیں سب کچھ سمجھ لیا حالانکہ ذرا صبر کرتا تو تیرے اور ملت کے مسائلِ بآسانی حل ہو سکتے تھے۔

دل میں جو کیفیات پوشیدہ ہوتی ہیں وہ تو اشعار میں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ یہ تو اہلِ ذوق پر منحصر ہے کہ وہ ان اشعار تک کس حد تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ان کے مفہیم کا کس حد تک ادراک کرتے ہیں۔ اس شعر میں اقبال خود اپنی ذات کے حوالے سے کہتے ہیں کہ میں ایک آتشِ نوا شاعر ہوں اور اسی آتشِ نوائی نے مجھے جلا کر خاک کر دیا ہے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ میری زندگی کا ماحصل اور مقصد یہی آتشِ نوائی ہے۔ چنانچہ اس آتشِ نوائی کا جو راز ہے وہ میرے سینے میں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس آگ نے میرے دل کو ایک ایسے آئینے میں تبدیل کر دیا ہے جس میں مستقبل میں پیش آنے والے مناظر کو بآسانی دیکھا جاسکتا ہے۔

گیارہواں بند معنی: آئینہ پوش: منور ہو گا۔ سیما پا ہو جائے گی: بھاگ جائے گی۔ حکمتِ خویہ: سوئی ہوئی خوشبو۔ سینہ چاکاں: چہن کے سینہ چاک (یعنی مسلمان)۔ طیور طائر کی جمع (پرندے)۔ شبِ گریزاں ہوگی: رات بھاگ جائے گی۔

مطلب: زیرِ تشریحِ نظم کے ان آخری اشعار میں اقبال بالآخر امید اور رجائیت کے منظر نامے میں مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ جن مصائب سے دوچار رہ چکی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ یہ مصائب ختم ہو کر رہ جائیں گے اس لیے کہ ظلمتِ شب کا خاتمہ ہو رہا ہے اور نورِ سحر نے زمین تو کیا آسمان کا احاطہ بھی کر لیا ہے۔ اب وہ دور آنے والا ہے کہ ہمارے لٹھنڈی ہوا وہ نئے پیدا کرے گی کہ کلیوں اور غنچوں میں سوئی ہوئی خوشبو بھی نغموں کی صورت میں بیدار ہوگی یعنی ملتِ اسلامیہ کے تغافلِ شعراء اور خوابیدہ افراد بیدار ہو کر سرگرم عمل ہو جائیں گے اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت ایک بار پھر حاصل کر لیں گے۔

ملت کے مختلف فرقوں کے مابین نفاق و انتشار کی جو فضا موجود ہے وہ ختم ہو کر رہ جائے گی اور یہ لوگ ہر نوع کا بغض و کینہ فراموش کر کے ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو جائیں گے۔ میری شاعری ان لوگوں میں زندہ رہنے کا احساس پیدا کرے گی اور تمام مسلمان اس کیفیت سے آگاہ ہو جائیں گے جو میرے سینے

اور اشعار میں موجود ہے۔ مغربی تہذیب کے طوفان نے جس طرح ہمیں ہستی کے آخری مراحل تک پہنچا دیا ہے اب یہ طوفان بالا خر خود ہی مغربی تہذیب کو لے ڈوبے گا۔

اس لیے کہ وہ وقت آگیا ہے جب ملت اسلامیہ اپنے زندہ عقائد کی طرف لوٹ آئے گی اور اس کی پیشانیوں خانہ کعبہ کی جانب جھک جائیں گی۔ مراد یہ ہے کہ تمام مسلمان حضور سرور کائنات کی تعلیمات پر پھر سے عمل کر کے دنیا و آخرت میں سرخرو ہو سکیں گے۔ اسلام دشمن طاقتیں اب خود اپنے ظلم و ستم کی بنا پر کف افسوس ملیں گی اور نالہ و فریاد پر مجبور ہو جائیں گی اور یہ صورت حال مسلمانوں کے لیے یقیناً خوش آئند ہوگی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ میں اتنے بڑے انقلاب کا منظر نامہ دیکھ رہا ہوں جس پر مجھے خود بھی حیرت ہے اور اس امر کا اظہار فی الحال میرے لیے ممکن نہیں کہ اس انقلاب کے سبب دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ یہ آنے والا وقت ہی بتا سکے گا۔

بس یہ توقع ہے کہ طلوع صبح کے ساتھ ظلمت شب رخصت ہو جائے گی اور ہر طرف نغمہ توحید سنائی دے گا۔ یعنی ملت اسلامیہ کو ایک بار پھر سے عروج حاصل ہو گا۔

مسلم

(جون 1912ء)

118

ہر نفس اقبال تیرا آہ میں مستور ہے
نغمہ امید تیری بربط دل میں نہیں
گوش آواز سرود رفتہ کا جویا ترا
قصہ گل ہم نوائیان چمن سنتے نہیں
اے درائے کاروان خفتہ پا! خاموش رہ
زندہ پھر وہ محفل
شع سے روشن شب
سینہ سوزاں ترا فریاد سے معمور ہے
ہم سمجھتے ہیں یہ لیلیا تیرے محل میں نہیں
اور دل ہنگامہ حاضر سے بے پروا ترا
اہل محفل تیرا پیغام کہن سنتے نہیں
ہے بہت پاس آفریں تیری صدا خاموش رہ
دیرینہ ہو سکتی نہیں
دو شہنہ ہو سکتی نہیں

ہم نہیں! مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں
نبض موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے
حق نے عالم اس صداقت کے لیے پیدا کیا
دہر میں غارت گر باطل پرستی میں ہوا
میری ہستی پیر بن عرانی عالم کی ہے
قسمت عالم کا مسلم کو کب تابندہ ہے
آشکارا ہیں مری آنکھوں پہ اسرار حیات
کب ذرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
ہاں یہ سچ ہے، چشم بر عہد کہن رہتا ہوں میں
یاد عہد رفتہ میری خاک کو اکیر ہے

اس صداقت پر ازل سے شاہد عادل ہوں میں
اور مسلم کے مخمیل میں جبارت اس سے ہے
اور مجھے اس کی حفاظت کے لیے پیدا کیا
حق تو یہ ہے حافظ ناموس ہستی میں ہوا
میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے
جس کی تابانی سے افسوں سحر شرمندہ ہے
کہہ نہیں سکتے مجھے نومید پیکار حیات
ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوش کارزار
اہل محفل سے پرانی داستان کہتا ہوں میں

یادِ عمد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سانے رکھتا ہوں اس دور نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

*

① سے ③ معنی: مستور: چھپا ہوا۔ معمور: لبرز، بھرا ہوا۔ برہم: دل کا ساز۔ سرود رفتہ: گذرے ہوئے زمانے کا راگ۔

مطلب: اس نظم میں علامہ اقبال سے مخاطب ہو کر ایک بے عمل اور مایوس مسلمان کہتا ہے۔ اے اقبال! نہ جانے کیا وجہ ہے کہ تیرا ہر سانس آہ و فریاد میں چھپا ہوا ہے اور جو تیرا سینہ ہے وہ بھی تالہ و فریاد کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اگر تیرے دل کو ایک ساز تصور کر لیا جائے تو پھر یہ کتا پڑے گا کہ تیرے نغموں یعنی شاعری میں رجائیت کی کوئی رمت باقی نہیں ہے۔ اور تو جس محل کا پرستار ہے وہ محبوب سے خالی ہے ہر چند کہ تیری سماعت ماضی کے بھولے بسرے نغموں کو پھر سے سننے کی متقاضی ہے اور تیرا دل عصر موجود کے تمام ہنگاموں سے بے پردا ہے یعنی تو ملت مسلمہ کے عروج کا پھر سے خواہشمند ہے۔

④ سے ⑥ معنی: یاس آفریں: مایوسی پیدا کرنے والی۔ شب ووشمنہ: گذشتہ (رات)۔

مطلب: اے اقبال تو اپنے اشعار میں اسلام کے دور ماضی کی جو تاریخ و ہر آنے کا خواہاں ہے تیرے ہم عصر آج کے مسلمان اس کو سنتا پسند نہیں کرتے۔ لہذا اس مایوس کن صورت حال میں تیرے لیے یہی مناسب ہے کہ تیرے اشعار جو اب مایوسی کو جنم دے رہے ہیں ان کو منقطع کر دے۔ اس لیے کہ ملت کے دلوں میں مایوسی پیدا کرنے سے خاموش رہنا زیادہ بہتر ہے۔ لہذا تو بھی خاموش ہو جا۔ یہ اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ ماضی میں مسلمانوں کی جو عظمت و شان رہی ہے اب وہ از سر نو بروئے کار نہیں آسکتی اور محض تیرے اشعار کے سبب ملت کے دقار میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہو سکتا۔ مراد یہ کہ قوم بے حس ہو چکی ہے اس میں احساس بیداری پیدا کرنا مشکل کام ہے۔

دوسرا بند ⑦ سے (12) معنی: شاہد عادل: سچا گواہ۔ جسارت: بے باکی۔ ناموس: عزت۔ گو کب تابندہ: روشن ستار۔

مطلب: ان اشعار میں اقبال جو اہم کہتے ہیں کہ اے ہم نشیں! یہ نہ بھول کہ میں ایک سچا مسلمان ہوں اور حق تعالیٰ کی وحدانیت کا پوری طرح قائل ہوں اور توحید کی صداقت پر ازل سے ہی میں ایک سچے گواہ کی حیثیت رکھتا ہوں۔ یہ تصور توحید ہی ہے جس کے سبب پوری کائنات میں حرارت اور عمل کی قوت موجود ہے۔ یہ توحید ہی ہے جس کے سبب ملت کے پیروکاروں میں جرات و ہمت پائی جاتی ہے۔ اسی صداقت کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لیے کائنات کی تخلیق کی اور مسلمانوں کو اس صداقت کے تحفظ کی ذمہ داری سونپی۔

یہ ملت مسلمہ کے پیروکار ہی تھے جنہوں نے دنیا میں باطل کو فنا کر ڈالا اور اسی لیے سچ تو یہ ہے کہ زندگی اور اس کے ننگ و ناموس ک محافظ ٹھہرتے ہیں۔ یہ میرا جو وہی تھا جو کائنات کی عرانی کو لبابہ فرما ہم

پوری دنیا کے لیے روشن ستارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسا ستارہ جس کی چمک دمک سے صبح کا نور بھی ماند پڑتا نظر آتا ہے۔

(13) معنی: دوش: گذرا ہوا کل۔ فردا: آنے والا کل۔

مطلب: میری آنکھوں پر زندگی کے تمام راز ہائے سرستہ آشکار ہیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو عملی جدوجہد سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ میں ملت کے عارضی زوال سے خوفزدہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ مجھے اس کے تابندہ مقدر پر پورا پورا اعتماد ہے۔ میرے روز و شب ناامیدی اور یاس کے غصے سے بے نیاز ہیں۔ میں جس معرکے میں ہوں اس کا جوش و خروش مکمل فتح کی نوید دے رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ ماضی کی پر شکوہ تاریخ پر میری نظر رہتی ہے اور دینی داستان میں اپنے اشعار میں ہم عصر مسلمانوں کو سناتا ہوں۔ یہی یاد میری خاک کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتی ہے اور اسی شاندار ماضی میں اپنے درخشاں مستقبل کی جھلکیاں دیکھتا ہوں۔

حضور رسالت مابین

119

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامہ زمانہ ہوا جہاں سے باندھ کے رخت سفر روانہ ہوا
قید شام و سحر میں بسر تو کی لیکن نظام کمنہ عالم سے آشنا نہ ہوا
فرشتے بزم رسالت میں لے گئے مجھ کو
حضور آئے رحمت میں لے گئے مجھ کو

کہا حضور نے اے عندلب باغ حجاز کلی کلی ہے تری گرمی نوا سے گداز
ہمیشہ سرخوش جام ولا ہے دل تیرا فتاوگی ہے تری غیرت جہود نیاز
اڑا جو پستی دنیا سے تو سوائے گردوں سکھائی تجھ کو ملائکہ نے رفعت پرداز
نکل کے باغ جہاں سے برگ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آگینہ لایا ہوں جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آہد اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لبو اس میں

پہلا بند معنی: گراں: ناقابل برداشت۔ رخت سفر: راستے کا سامان۔ آئیہ رحمت: رسول اکرم

حضور کی رحمت کے حضور۔

مطلب: ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

مطلب: دو بند پر مشتمل اس نظم کے اولین بند میں اقبال کہتے ہیں کہ ایک روز مجھ کو ایک قومی رہنما نے بتایا کہ سعودی عرب کے شہر جدہ میں ہسپتال کا قیام عمل میں آ رہا ہے۔ جب تو کسی شخص سے مجاز کا ذکر سنتا ہے تو تیرے جسم کا ہر ذرہ بے قرار ہونے لگتا ہے۔ اب میں اس سرزمین میں ہسپتال کے قیام کی تجھے جو نوید دے رہا ہوں تو اس سے اظہار عقیدت کے طور پر اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھا اور ہسپتال کی تعمیر میں امداد کے لیے عطیہ دے کہ اس علاقے میں مریضوں کے لیے ہسپتال کا قیام اشد ضروری ہے تاکہ اطباء وہاں بیمار لوگوں کا علاج کر سکیں۔

شفا بند معنی: شفا: صحت۔

مطلب: اقبال اس پیشوائے قوم سے مخاطب ہو کر جوابا کہتے ہیں کہ جس شے کو موت سے تعبیر کیا جاتا ہے فی الواقع وہ زندگی کا ایک ایسا رخ ہی ہے جس طرح کہ حقیقت مجاز میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ ایک بچے عاشق کو فنا میں جو لطف حاصل ہوتا ہے وہ حضرت خضرؑ اپنی طویل عمر میں بھی حاصل نہیں کر سکے۔ سو جناب زندگی کا یہ پیغام حضور دو سرود کو دیں میں تو سرزمین مجاز پر موت کا تمنائی ہوں۔ آپ میرے پاس شفا کا یہ کیا پیغام لے کر آئے ہیں کہ اہل درد لوگ تو معالجوں سے سروکار نہیں رکھا کرتے۔ کہ تکلیف ان کے لیے راحت ہے۔

زیر تشریح نظم کا پس منظر یہ ہے کہ انگریزوں نے سرزمین مجاز میں ہسپتال تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے رقم درکار تھی۔ ہندوستان میں بھی اس مقصد کے لیے عطیات جمع کیے گئے لیکن اقبال اور بعض دوسرے اکابر اس نوعیت کے ہسپتال کی تعمیر کے خلاف تھے جو انگریز کی زیر سرپرستی قائم ہو۔ لہذا اس منصوبے کے خلاف یہاں آواز اٹھائی گئی۔ اقبال کی یہ نظم بھی اس احتجاج کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔





جواب شکوہ

121

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے پر نہیں، طاقت پرواز مگر رکھتی ہے
 قدسی الاصل ہے، رفعت پہ نظر رکھتی ہے خاک سے اٹھتی ہے، گردوں پہ گزر رکھتی ہے
 عشق تھا فتنہ مگر و سرکش و چالاک مرا
 آسمان چیر گیا نالہ بے باک مرا
 چیر گردوں نے کما سن کے، کہیں ہے کوئی بولے سارے، سر عرش بریں ہے کوئی
 چاند کستا تھا، نہیں، اہل زمیں ہے کوئی ککشاں کہتی تھی، پوشیدہ ی ہیں ہے کوئی

کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھے جنت سے نکالا ہوا انسان سمجھا

تمہی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا عرش والوں پہ بھی کھلا نہیں یہ راز ہے کیا
تا سر عرش بھی انسان کی تک و تاز ہے کیا؟ آگنی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا؟
غافل آباد سے سکان زمیں کیسے ہیں!
شوخی و گستاخ یہ ہستی کے مکیں کیسے ہیں!

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے تھا جو مسجود ملائک یہ وہی آدم ہے؟
عالم کیف ہے، دانائے رموز کم ہے ہاں، مگر عجز کے اسرار سے ناعمرم ہے!
ناز ہے طاقت گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا اشک بیتاب سے لبریز ہے پیانہ ترا
آسمان گیر ہوا نفرو متانہ ترا کس قدر شوخ زباں ہے دل دیوانہ ترا
شکر شکوے کو کیا حسن ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں راہ دکھلائیں کسے؟ رہرو منزل ہی نہیں
تریت عام تو ہے، جوہر قاتل ہی نہیں جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں
کوئی قاتل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

ہاتھ بے زور ہیں، اتحاد سے دل خوگر ہیں امت باعث رسوائی پیغمبر ہیں
بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں تا براہیم پدر اور پسر آذر ہیں
بادہ آشام نئے، بادہ نیا، خم بھی نئے
حرم کعبہ نیا، بت بھی نئے، تم بھی نئے

وہ بھی دن تھے کہ یہی مایہ رعنائی تھا نازش موسم گل لالہ صحرائی تھا
جو مسلمان تھا اللہ کا سودائی تھا کبھی محبوب تمہارا یہی ہرجائی تھا
کسی یکجائی سے اب عمد غلامی کر لو
ملت احمد مرسل کو مقامی کر لو

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے ہم سے کب پیار ہے، ہاں نیند تمہیں پیاری ہے
طبع آزاد پہ قید رمضان بھاری ہے تمہیں کھلو، یہی آئین وفاداری ہے

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں، تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں، محفل انجم بھی نہیں

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن، تم ہو نہیں جس قوم کو پروائے نشین، تم ہو

جلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ فرسن، تم ہو
 ہوگو نام جو قبروں کی تجارت کر کے
 کیا نہ بچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے؟
 صفہ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟ نور انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
 میرے کبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟ میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟
 تھے تو آباء وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو؟
 ہاتھ پر ہاتھ دھرے خنجر فردا ہو
 کیا کہا؟ ہر مسلمان ہے فظہ وعدہ حور شکوہ بچا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور
 عدل ہے فاطر ہستی کا ازل سے دستور مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور
 تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
 جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں
 منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک ایک ہی سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
 حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
 فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
 کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟
 کون ہے تارک آئین رسول، مختار؟ مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا میعار؟
 کس کی آنکھوں میں نمایا ہے شعار اغیار؟ ہو گئی کس کی نگہ طرز سلف سے بیزار؟
 قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
 کچھ بھی پیغام محمد کا تمہیں پاس نہیں
 جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا، تو غریب زحمت روزہ جو کرتے ہیں گوارا، تو غریب
 نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا، تو غریب پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا، تو غریب
 امرا نشہ دولت میں ہیں غافل ہم سے
 زندہ ہے ملت بیضا غریا کے دم سے
 واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی! برق طبعی نہ رہی، شعلہ مقاتلی نہ رہی
 رہ گئی رسم اڑاں، روح بلالی نہ رہی قلفہ رہ گیا، تلقین غزالی نہ رہی
 مسجدیں مرفیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
 یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے
 شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلمان نابود ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود؟
 وضع میں تم ہو نصاریٰ، تو تمدن میں ہنود یہ مسلمان ہیں! جنہیں دیکھ کے شرابائیں یہود!
 یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
 تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

دمِ فقرِ حقِ مسلم کی صداقت یہاں
 شجرِ فطرتِ مسلم تھا حیا سے نمناک
 عدل اس کا تھا قوی، لوٹ مراعات سے پاک
 خود گدازیِ نم کیفیتِ صہائش بود
 خالی از خویش شدن صورتِ مینالیش بود
 ہر مسلمان رگِ باطل کے لیے نشتر تھا
 جو بھروسا تھا اسے قوتِ بازو پر تھا
 اس کے آئینہ ہستی میں عمل جو ہر تھا
 ہے ہمیں موت کا ڈر، اس کو خدا کا ڈر تھا
 باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
 پھر پھر قاتلِ میراث پر کیونکر ہو
 ہر کوئی مست سے ذوقِ تنِ آسانی ہے
 حیدری فقر ہے، نے دولتِ عثمانی ہے
 تم مسلمان ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
 تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟
 وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر
 اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہو کر
 تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم
 تم خطاکار و خطائیں، وہ خطا پوش و کریم
 چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم
 پہلے دینا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم
 تختِ فغفور بھی ان کا تھا، سرے کے بھی
 یوں ہی باتیں ہیں، کہ تم میں وہ حیت ہے بھی؟
 خود کشی شیوہِ تمہارا، وہ غیور و خوددار
 تم اُخت سے گریزاں، وہ اُخت پہ نثار
 تم ہو گفتارِ سراپا، وہ سراپا کردار
 تم ترستے ہو کُلی کو، وہ گلستاں بکنار
 اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
 نقش ہے صفحہ ہستی پہ صداقت ان کی
 نخلِ اعجم افقِ قوم پہ روشن بھی ہوئے
 شوقِ پرواز میں مجبورِ نشین بھی ہوئے
 بتِ ہندی کی محبت میں برہمن بھی ہوئے
 بے عمل تھے ہی جواں دین سے بدطن بھی ہوئے
 ان کو تہذیب نے ہر بند سے آزاد کیا
 لا کے کعبے سے منم خانے میں آباد کیا
 قیسِ زحمت کشِ تنہائی صحرا نہ رہے
 شر کی کھائے ہوا، بادِ بیا نہ رہے
 وہ تو دیوانہ ہے، بستی میں رہے یا نہ رہے
 یہ ضروری ہے، حجابِ رخ لیلانہ رہے
 گلہ جو نہ ہو، شکوہِ بیداد نہ ہو
 عشقِ آزاد ہے، کیوں حسن بھی آزاد نہ ہو
 عہدِ نوبت ہے، آتشِ زن ہر خرمن ہے
 ایمن اس سے کوئی صحرا، نہ کوئی گلشن ہے
 اس نئی آگ کا اقوامِ کمنِ اندھن ہے
 ملتِ ختمِ رسلِ شعلہ بہ پیراہن ہے
 آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
 آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مائی کوکب غنچے سے شائیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی گل بر انداز ہے خون شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عتالی ہے

یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے
امین گلشن ہستی میں شرم چیدہ بھی اور محروم شرم بھی ہیں، خزاں دیدہ بھی
سیکڑوں گل ہیں، کاہیدہ بھی، بالیدہ بھی سیکڑوں بطن چمن میں ابھی پوشیدہ بھی
فلک اسلام نمونہ ہے برومندی کا
پہل ہے یہ سیکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

پاک ہے گرد وطن سے سر داماں تیرا تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کھل تیرا
تقلہ ہو نہ سکے گا کبھی دیراں تیرا غیریک بانگ درا کچھ نہیں سماں تیرا
گل جمع اتی و در شعلہ درد ریشہ تو
عاقبت سوز بود سایہ اندیشہ تو
تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے نشہ سے کو تعلق نہیں پیانے سے
ہے عیاں یورپ آثار کے افسانے سے پاساں مل گئے کبے کو صمن خانے سے
کشتی حق کا زمانے میں سارا تو ہے
عصر نورات ہے، دھندلا سا ستارا تو ہے

ہے جو ہنگامہ ہپا یورش بلغاری کا غفلوں کے لیے پیغام ہے بیداری کا
تو سمجھتا ہے، یہ سماں ہے دل آزاری کا امتحاں ہے ترے ایثار کا، خودداری کا
کیوں ہراساں ہے صہیل فرس اعدا سے
نور حق بجھ نہ سکے گا نفس اعدا سے

چشم اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری ہے ابھی محفل ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری کوکب قسمت امکاں ہے خلافت تیری
وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

مثل بوقید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا رخت بردوش ہوئے چمنستاں ہو جا
ہے تنگ مایہ، تو ذرے سے بیاباں ہو جا نغمہ موج سے ہنگامہ طوفاں ہو جا
قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے

ہو نہ یہ پھول، تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ سانی ہو تو پھرے بھی نہ ہو، غم بھی نہ ہو بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں 'دامن کسار' میں میدان میں ہے بحر میں 'موج کی آغوش' میں 'طوفان' میں ہے
چمن کے شہر 'مراقض' کے بیابان میں ہے اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے
چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے

رفت شان دفعتاً لک ذکرک دیکھے
مردم چشم زمیں یعنی وہ کالی دنیا وہ تمہارے شدا پالنے والی دنیا
گری مر کی پروردہ ہلائی دنیا عشق والے جسے کہتے ہیں ہلائی دنیا
پیش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

عقل ہے تیری پر عشق ہے شمشیر تری میرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
اموا اللہ کے لیے آگ ہے نکیر تری تو مسلمان ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

*

یہ تو ایک واضح حقیقت ہے کہ زیر تشریح نظم اقبال نے اپنی پہلی نظم "شکوہ" کے جواب میں کہی۔
"شکوہ" میں اقبال نے جس بے تکلفانہ انداز میں رب جلیل سے مکالمہ کیا تھا اس وقت اس نظم کے خلاف
شدید رد عمل کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ اس تاثر کو کسی حد تک زائل کرنے کے لیے "جواب شکوہ" لکھی
ہوئی "بانگ درا" میں شکوہ اور جواب شکوہ کے درمیان چودہ نظمیں اور موجود ہیں لیکن میں نے بوجہ
ترتیب بدل کر مذکورہ دونوں نظموں کو یکجا کر دیا ہے۔ تاکہ قاری کے لیے تسلسل برقرار رہ سکے۔ ترتیب
کے اعتبار سے مذکورہ چودہ نظمیں اس کے بعد شامل کی جائیں گی۔ زیر تشریح نظم میں چھتیس بند شامل
ہیں۔

سہلا بند معنی: قدسی الاصل: اپنی اصل کے لحاظ سے فرشتہ۔ رفعت: بلندی۔ گرووں: آسمان۔ فتنہ
گر: ہنگامہ برپا کرنے والا۔

مطلب: اس بند کی طرح دوسرے کئی ابتدائی بند میں اقبال نے اپنی نظم "شکوہ" کی اثر انگیزی کا تذکرہ
کرتے ہوئے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ جو بات انسان کے دل کی گہرائی سے نکلتی ہے وہ دور رس
اثرات کی حامل ہوا کرتی ہے۔ غلوں دل سے کہی ہوئی بات دسائل نہ ہونے کے باوجود وسیع تر سطح پر
تشریح کی صلاحیت ضرور رکھتی ہے کہ یہ سچائی ہمیشہ رفعت اور بلندی پر نظر رکھتی ہے۔ بے شک یہ بات
زمین پر کہی جائے تاہم اگر اس میں وزن ہے اور صداقت ہے تو اس کی رسائی آسمان تک ممکن ہوتی ہے۔
اقبال کہتے ہیں کہ "شکوہ" میں میرا عشق اور اس کا اظہار بے شک تند و تیز سہی تاہم سچائی پر جبنی تھا۔ یہی
وجہ تھی کہ میری فریاد نے آسمان اور اس کے باسیوں تک کو ہلا ڈالا۔

دوسرا بند معنی: عرش بریں: آنھواں آسمان۔ رضواں: بہشت کا دار و در۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ جب میری فریاد بلند ہوئی تو اس سے متاثر ہو کر بوڑھے آسمان نے کہا لگتا ہے
قریب ہی کوئی شخص موجود ہے۔ سیاروں کا خیال تھا کہ غالباً فریادی عرش پر موجود ہے۔ چاند کا استدلال یہ

تھا کہ یہ تو کوئی زمین پر رہنے والا شخص ہے جب کہ کشاکش کا خیال تھا کہ یہ شخص کہیں ہمارے ارد گرد ہی چھا ہوا ہے۔ تاہم اگر میری فریاد کو کسی حد تک حقیقت کے روپ میں دیکھا تو وہ وارو غہ جنت رضوان تھا جو مجھے جنت سے نکالے ہوئے انسان سے تعبیر کر رہا تھا۔

تیسرا بند معنی: عرش والوں: ساتویں آسمان والے۔ تاسرے عرش: عرش کے کنارے تک۔ پستی کے کمین: زمین کے رہنے والے۔

مطلب: فرشتے پر اس امر پر حیرت زدہ تھے کہ یہ فریاد کی جو صدا ان تک پہنچ رہی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ جو لوگ عرش پر مقیم تھے وہ بھی اس راز کی تہ تک نہ پہنچ سکے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کیا انسان کی رسائی اب آسمان تک بھی ہو گئی ہے؟ اور کیا خاک کی چٹکی میں وہ صلاحیت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ اس قدر بلندی تک پرواز کر سکے؟ ان کا کہنا تھا کہ اگر ایسا ہے تو ماننا پڑے گا کہ ساکنان زمین آواب محفل سے آگاہی نہیں رکھتے۔ اتنی پستی پر قیام کرتے ہوئے یہ جسارت شوخی اور گستاخی نہیں تو کیا ہے؟

چوتھا بند معنی: برہم: ناراض۔ مسجود ملائک: جس کو فرشتوں نے سجدہ کیا (مراد انسان)۔ نامحرم: ناراض۔

مطلب: یہ فریاد تو اس قدر شوخ ہے کہ رب ذوالجلال سے بھی برہمی کا اظہار کر رہا ہے۔ کیا یہ وہی آدم ہے جس کو کبھی فرشتے سجدہ کیا کرتے تھے؟ یہ درست ہے کہ انسان کو زندگی کے بیشتر مسائل کا علم ہے اور وہ اپنی دانش کے ذریعے ہر شے تک رسائی بھی حاصل کر سکتا ہے تاہم لگتا یوں ہے کہ ان خصوصیات کے باوجود عجز و انکسار کے خواص سے قطعی طور پر آگاہ نہیں ہے۔ اس کو اپنی طاقت گفتار پر تو بے شک فخر و ناز ہے لیکن امر واقع یہ ہے کہ اس میں بات کرنے کا سلیقہ تک نہیں۔

پانچواں بند معنی: لبریز: بھرا ہوا۔ آسماں گیر: آسمان کی بلندی پر پہنچنے والا۔

مطلب: فرشتوں کی یہ گفتگو جاری تھی کہ عرش بریں سے ایک بلند آواز پیدا ہوئی۔ یقیناً یہ رب ذوالجلال کی آواز تھی اس آواز نے اقبال سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ بے شک تیری داستان غم و اندوز سے لبریز ہے اور تیری آنکھوں سے جو آنسو نکلے ہیں ان کی سچائی میں بھی کلام نہیں۔ تیری یہ شوخ لہجہ والی فریاد آسمان تک پہنچ گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تو ایسے دل کا مالک ہے جو دیوانگی میں انتہا تک پہنچ گیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ تو نے اپنے شکوہ کا جس طرح اظہار کیا ہے اس میں شکایت کو بھی شکر کے قالب میں ڈھال دیا ہے یوں اپنے حسن کلام سے تو نے انسانوں اور خدا کے مابین مکالمہ کرایا ہے۔

چھٹا بند معنی: مائل بہ کرم: مہربانی کے لیے راغب۔ گل: مٹی۔ شان کئی: "کے" "امیران کے بادشاہ کا ایک مشہور خاندان۔

مطلب: رب ذوالجلال فرماتے ہیں! کہ ہم تو ہمیشہ سے مائل بہ کرم رہے ہیں لیکن جب کوئی سائل ہی نہ ہو تو عنایت و کرم کس پر ہیں۔ اے اقبال! تو نے اپنے "شکوہ" میں جو گلے کیے ہیں وہ خلاف حقیقت ہیں۔ دراصل رہنمائی اسی کی کی جاتی ہے جس میں جو ہر قابل اور صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ صورت احوال یہ ہے کہ تیری قوم میں تو وہ مادہ ہی برقرار نہیں رہا جو قوموں کی تعمیر کا سبب بنتا ہے۔ اگر کسی میں حاصل کرنے

کی صلاحیت ہو تو ہم اسے باوشاہوں جیسی شان و شوکت عطا کرنے کے لیے تیار ہیں اور کولبس کی مانند جو کوئی نئی دنیا کی تلاش میں نکلے تو ہم اسے اس دنیا کی راہ بھی دکھا دیتے ہیں۔ اس بند میں کہا گیا ہے کہ ملت مسلمہ جب خود ہی قوت عمل سے محروم ہو کر اپنی بے عملی پر انحصار کیے بیٹھی ہے تو خدا سے التفات و کرم کی کمی کا شکوہ کیسا؟

ساتواں بند: معنی: بے زور: بے طاقت۔ بت گر: بت تراش۔ آزر: حضرت ابراہیم کے والد کا نام۔ باوہ آشام: شراب پینے والے۔

مطلب: یہ بھی سن لے کہ اس دور کے مسلمان صرف بے عمل اور قوت تخلیقی انج سے محروم ہی نہیں بلکہ ان کے دل بھی کفر و الحاد کے عادی بن چکے ہیں۔ یہی وہ امتی ہیں جو آج اپنے پیغمبر کو رسوا کرنے کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے جو کبھی بت شکن ہوا کرتے تھے وہ تو جا چکے۔ اب جو باقی رہ گئے ہیں وہ تو عملی سطح پر بت تراش واقع ہوئے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ باپ کو ابراہیم سمجھ لو جو بت شکن تھے لیکن بیٹا آزر کی حیثیت رکھتا ہے جو بت تراش تھا۔ یعنی تمہارے اسلاف ابراہیم کی مانند تھے جب کہ تم آزر کے مماثل ہو۔

اب تو کیفیت یہ ہے کہ پرانی اقدار کو فراموش کر کے نئی قدروں کو اپنالیا گیا ہے حتیٰ کہ نئے کعبے کے ساتھ تم نے بھی خود کو اسی رنگ میں رنگ لیا ہے۔

آٹھواں بند: معنی: باہمی عنائی: حسن کا سرمایہ۔ نازش: فخر: ملت احمد مرسل: مراد مسلمان۔

مطلب: وہ زمانہ فراموش نہیں کیا جاسکتا جب کہ مسلمان میری ذات کو ہی باعث فخر سمجھا کرتے تھے اور میں ہی ان کے لیے سب کچھ تھا۔ اس وقت تو جو مسلمان صفحہ ارض پر موجود تھا میرا ہی سودا کی بنا پھرتا تھا اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جسے تو آج ہرجائی قرار دے رہا ہے وہی تم مسلمانوں کا محبوب ہوا کرتا تھا۔ پھر بھی اگر خیر صفت سے بد ظنی کا اظہار کرتے ہو تو جاؤ کسی جاہد شخصیت کے ہاتھ پر بیعت کر لو اور آنحضرت کی نبوت کو محدود کر کے کسی ایک مقام سے وابستہ کر لو۔

نواں بند: معنی: گراں: جو نعل۔ جذب باہم: باہمی کشش۔ محفل انجم: ستاروں کی محفل۔

مطلب: تم لوگ شکایت تو کرتے ہو پر اتنا تو بتاؤ کہ نماز فجر کے لیے بیدار ہونا تمہارے لیے کس قدر تکلیف دہ امر ہو گیا ہے۔ تمہیں دراصل ہم سے محبت نہیں بلکہ اپنی نیند ہی تمہیں پیاری ہے۔ پھر تم لوگ اس قدر آزاد طبع ہو چکے ہو کہ تمہیں ماہ رمضان کے روزے بھی ایک مصیبت نظر آتے ہیں۔ اب یہ بتاؤ کہ ان حالات کے پیش نظر مجھ سے وفاداری کا یہی انداز رہ گیا ہے۔ جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ قوم مذہب کی بنیاد پر ترتیب پاتی ہے۔ اگر مذہب نہیں تو وہ قوم ہی نہیں۔ تم لوگوں کی حصیت بھی بے معنی ہے۔ اس کی مثال ستاروں سے وی جاسکتی ہے۔ کہ یکجا ہو کر وہ ایک جھرمٹ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

دسواں بند: معنی: خرمن: کمایاں۔ اسلاف کے مدفن: بزرگوں کی قبریں۔ نکونام: نیک نام۔

مطلب: امر واقعہ یہ ہے کہ جن کو دنیا میں رہتے ہوئے کوئی ہنر اور فن نہیں آتا وہ تم لوگ ہو۔ جس قوم کو اپنے گھر کی پر دابھی نہیں ہے کہ وہ کیسا ہے کس حال میں ہے وہ قوم تم جیسے لوگوں سے ہی عبارت ہے۔ تمہارے نشین پر تو بجلیاں بھی بڑی آسانی سے گر سکتی ہیں یعنی تم اس قدر کمزور واقع ہوئے ہو کہ

دشمن کسی وقت کے بغیر تمہیں زیر کر سکتا ہے۔ اور تو اور تم لوگ تو اپنے اسلاف کے مقبروں کو بھی بچ کھاتے ہو۔ ذرا غور تو کرو کہ جب تم اس عمل میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تو تمہیں بت فروشی میں کیا عار محسوس ہوگا۔

گیارہواں بند معنی: صفحہ دہر: مراد دنیا سے۔ آبا: آباء و اجداد۔ مختصر فردا: کل کے انتظار میں۔

مطلب: مجھے کم از کم ان سوالات کا جواب تو دو کہ ان دنیا سے کفر باطل کا نشان مٹانے والا کون تھا؟ پھر یہ بھی بتاؤ کہ دنیا بھر کے انسانوں کو غلامی سے نجات دلوائی، احرم کعبہ کو اپنے سجدوں سے آباؤ کس نے کیا؟ آخری بات یہ کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے میرے پیچھے ہوئے صحیفے یعنی قرآن کو اپنے سینوں سے لگا کر رکھا؟ بے شک اس سارے عمل کے ذمہ دار تمہارے اسلاف ہی تھے مگر ان کے مقابلے میں تم تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے مستقبل کے مختصر ہوا اس کے سوائے اور کچھ نہیں۔

بارہواں بند معنی: شعور: عقل۔ فاطر ہستی: دنیا کو پیدا کرنے والا (مراد خدا)۔

مطلب: یہ تم نے ہی شکایت کی ہے کہ ہم نے مسلمانوں کو محض وعدہ حور پر ہی ٹال رکھا ہے مگر سوچو کہ اگر کوئی شخص بے جا شکوہ بھی کرتا ہے تو اس کے لیے بھی تہذیب و شعور و درکار ہوتے ہیں۔ اس کائنات کو پیدا کرنے کے بعد ہم نے توازن سے ہی اپنا وطیرہ عدل و انصاف بنا رکھا ہے چنانچہ اگر کافر بھی مسلمانوں کے طور طریقے اختیار کر لیں تو عدل و انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ ان کو حور و قصور سے نوازا جائے ان پر کسی دوسرے کی اجارہ داری تو نہیں ہے۔ تمہارے طرز عمل کے پیش نظر لگتا تو یوں ہے کہ تم میں دراصل حوروں کو چاہنے کی خواہش موجود نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ طور کا جلوہ تو اپنی جگہ موجود ہے لیکن اس کو دیکھنے کے لیے موسیٰ موجود نہیں۔

تیرہواں بند معنی: منفعت: نفع۔ حرم پاک: خانہ کعبہ۔ پھینچنے: تڑپ کرنا۔

مطلب: اے مسلمانو! تمہاری جو قوم ہے اس کا نفع نقصان بھی سب کے لیے یکساں ہے۔ سب کا نبی بھی، دین بھی اور اسلام بھی ایک ہی ہے۔ ان کے حوالے سے کسی فرقے یا قبیلے میں امتیاز کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ تمہارا تو خانہ کعبہ بھی سب کے لیے ایک ہی ہے۔ پالنے والا اور قرآن بھی ایک ہی ہے۔ یہ کتنی بڑی بات ہوتی جو مسلمان سب کے سب ایک ہی ہوتے۔ جب کہ وہ تو گروہ و رگروہ بنے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان کے نفع نقصان کے علاوہ 'نبی'، 'دین'، 'ایمان'، 'حرم پاک'، 'خدا' اور قرآن سب کے لیے ایک ہی ہے۔

اس کے باوجود ملت اسلامیہ میں کہیں تو لوگ فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور کہیں ذاتوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ کیا انہی حالات میں کوئی قوم پنپ سکتی ہے۔

چودھواں بند معنی: تارک: ترک کرنے والا۔ آئین رسول مختار: سنت نبوی۔ طرز سلف: بزرگوں کے طور طریقے۔

مطلب: پیغمبر اسلام کے دینی اصولوں کو یہ بتاؤ، ترک کرنے والا کون ہے؟ کون ہے جو ذاتی منفعت کے لیے مصلحت کشی کا شعار اپناتے ہوئے ہے؟ اور غیر مسلموں کی بدعتوں نے کس کو اس طرح متاثر کیا ہے کہ اس نے انہیں ایک طرح سے اپنا عقیدہ شمار کر لیا ہے اور کس کا دل ہے جو بزرگوں کے طرز عمل

سے بیزار ہو چکا ہے۔

سچ پوچھو تو تم وہ لوگ ہو جن کے دل تپش سے خالی ہو چکے ہیں اور جن کی روح میں جیالوں کی طرح زندگی گزارنے کا احساس نہیں رہا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تمہیں تو آنحضرتؐ کے پیغام کا بھی احساس نہیں رہا یعنی تم پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات کو بھی بھلا بیٹھے ہو۔

پندرھواں بند۔ معنی: صف آرا: مفیض باندھنا۔ زحمت: تکلیف۔ ملت بیضا: اسلام۔

مطلب: یہ کس قدر ستم طرہی ہے کہ مساجد کا جائزہ لیں تو اس امر کا پتہ چلے گا کہ وہاں نماز کی ادائیگی کے لیے صرف غریب طبقے کے لوگ ہی وارد ہوتے ہیں اور جو روزہ رکھنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں وہ بھی غریب لوگ ہی ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ہمارا (خدا) کا نام لیتا ہے تو وہ بھی غریب ہی ہوتا ہے۔ اور اگر کسی نے اپنے عمل سے تمہارا اور ملت اسلامیہ کا بھرم قائم رکھا ہوا ہے تو وہ غریب ہی ہے۔

جہاں تک دولت مند لوگوں کا تعلق ہے وہ دولت کے نشے میں ہم سے قطعاً غافل ہو چکے ہیں۔ چنانچہ دیکھا جائے تو ملت مسلم صرف اور صرف غریب اور نادار لوگوں کے دم سے ہی زندہ ہے۔

سولھواں بند۔ معنی: پختہ خیالی: سنجیدہ خیالات۔ برق طبعی: جوش و خروش۔ روح بلالی: حضرت بلالؓ جیسا جذبہ۔ فلسفہ: عقلی علم۔ تلقین غزالی: غزالی کا اخلاقی فلسفہ۔

مطلب: قوم کو جو لوگ وعظ و نصیحت کرتے رہتے ہیں دیکھا جائے تو ان میں پختہ خیالی کا فقدان ہے۔ نہ ان کی طبیعتوں میں بجلی کی سی تڑپ ہے نہ ہی گفتگو میں کسی قسم کی تاثیر باقی رہی ہے۔ وہ شعلہ بیانی کا جو ہر دیکھا جائے تو تابود ہو چکا ہے۔ کیفیت تو یہ ہے کہ اب اذان محض ایک رسم کی طرح باقی رہ گئی ہے جو پانچ وقت ادا کی جاتی ہے۔ اس میں حضرت بلالؓ کی سی روح اور جذبے کا عمل دخل نہیں رہا یعنی جب بلال اذان دیا کرتے تھے تو آنحضرتؐ خود ان کے گھن کو پسند فرمایا کرتے تھے۔ اسی طرح فلسفہ تو باقی رہ گیا لیکن امام غزالی کی طرح اس کی توجیہ کرنے والے باقی نہیں رہے۔ اب تو مساجد اس امر پر مرعیہ خواں ہیں کہ نماز باقی نہیں رہے یعنی وہ لوگ بھی موجود نہیں جو تجازیوں کے سے وصف رکھتے تھے۔

سترھواں بند۔ معنی: تابود: نائب۔ نصاریٰ: عیسائی۔ ہنود: ہندو۔

مطلب: ہر طرف اس امر کا شور و غوغا عام ہے کہ اس دنیا سے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے بحیثیت قوم اب ناپید ہو چکے ہیں جب کہ ہمارا موقف یہ ہے کہ کیا کہیں کسی مقام پر مسلمان موجود بھی تھے؟ اس لیے کہ اے اسلام کے نام لیواؤ! دیکھا جائے تو تم وضع قطع میں تو عیسائیوں کے اور رہن سہن کے حوالے سے ہندوؤں کے پیروکار نظر آتے ہو۔ سچ پوچھو تو تم ایسے مسلمان ہو جنہیں دیکھ کر یہودی بھی شرما کر رہ جائیں۔

یہ تسلیم کہ ذات پات کے حساب سے تو تم میں سید بھی موجود ہیں، مرزا بھی افغان بھی! لیکن ذرا یہ تاؤ کہ سبھی کچھ ہو۔ نے کے باوجود کیا تم مسلمان بھی ہو؟

ہواں بند۔ معنی: بیباک: بے خوف۔ لوٹ: آدھی۔ نمناک: تازہ۔ فوق الادراک: عقل خود گدازی: اپنے آپ کو کھانا۔

وہ وقت بھی تھا کہ جب خطاب کے دوران مسلمان مقرر کی تقریر صداقت اور جرات:

ہیما کی آئینہ دار ہوا کرتی تھی۔ عدل و انصاف کے دوران ہر قسم کی رعایتوں سے گریز کرتے تھے وہ فطری اعتبار سے اس درخت کی مانند تھی جو صدائے آلودہ رہتا ہے۔ شرم و حیا اس کے زیور تھے۔ جہاں تک جہاں توجہ و شجاعت کا تعلق ہے اس کی صلاحیتوں کا عقل و شعور تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اس بندے کے آخری شعر میں فی الواقع آنحضرتؐ کے بعد کا جو دور تھا اس کے اولوالعزم اور راح العقیدہ مسلمانوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ باہم ایثار سے کام لیا کرتے تھے۔ دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھا کرتے تھے۔ ہمیشہ ضرور تمندوں کے کام آتے اور اپنے عمل کو ذاتی مفادات سے آلودہ نہیں کرتے تھے۔

انیسواں بند معنی: رگ باطل: کافر۔ ازبر: زبانی یاد۔

مطلب: اس عمد میں صورت یہ تھی کہ ہر مسلمان کفر و باطل کے سینوں میں نشتر کی مانند تھا۔ ان میں سے ہر ایک کے گرد اس عمل بنیادی جو ہر کی حیثیت رکھتا تھا۔ انہیں اگر کسی پر بھروسہ بھی تھا تو اپنے قوت بازو پر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عمر موجود کے مسلمانوں کو تو محض موت سے لہر لگتا ہے جب کہ ماضی کے مسلمان تو محض خوف خدا کے قائل تھے۔

سو یہ بتاؤ کہ اگر بیٹے کو باپ کی علیت کا ادراک نہ ہو اس صورت میں وہ کیسے باپ کا وارث بن سکتا ہے۔

بیسواں بند معنی: ذوق تن آسانی، آرام و آرائش کا شوق۔ حیدری فقر: حضرت علیؑ جیسا فقر۔ تارک قرآن: قرآن کو ترک کرنے والے۔

مطلب: تم میں سے تو ہر کوئی سسل انگار ہے اور محض عیش و آرام کی زندگی کا خواہاں ہے۔ مجھے بتاؤ کہ تم جو مسلمان ہونے کے دعویدار ہو کیا مسلمان کا انداز یہی ہے؟ جس کے تم عادی ہو چکے ہو۔ دیکھا جائے تو نہ تمہاری طبیعت میں حضرت علیؑ کا سا فقر اور درویشی ہے نا ہی حضرت عثمانؓ جیسی امیرانہ شان و شوکت ہے۔ اس صورت میں کیا اس امر کی جوابدہی کر سکو گے کہ اپنے اسلاف کے ساتھ تمہاری کیا روحانی نسبت ہے؟

جہاں تک تمہارے اسلاف کا تعلق تھا تو وہ بحیثیت مسلمان معزز و محترم رہے جب کہ تمہاری حالت یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات کر کے تم دنیا میں خوار اور رسوا ہو رہے ہو۔ ان اشعار میں اقبال نے ماضی اور آج کے مسلمانوں کا ایک تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔

اکیسواں بند معنی: خطائیں، غلطیاں پکڑنے والے۔ اوج ثریا: انتہائی بلندی۔ فغفور: چین کے بادشاہوں کا لقب۔

مطلب: جہاں تک تمہارا تعلق ہے تم تو آپس میں جنگ و جدل کے قائل ہو جب کہ تمہارے اسلاف ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی سے پیش آیا کرتے تھے۔ تم خود بھی خطا کرتے ہو اور دوسروں کی خطاؤں کے ضمن میں متجسس رہتے ہو۔ جب کہ تمہارے اسلاف دوسروں کی خطاؤں کو نظر انداز بھی کر دیتے تھے اور بخش بھی دیا کرتے تھے۔ یوں تو دنیا میں سب ہی لوگ اس امر کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ وہ انتہائی بلند درج پر فائز ہوں لیکن اس کے لیے کوئی ضروری صلاحیت بھی تو پیدا کرے۔

جہاں تک تمہارے اسلاف کا تعلق تھا انہوں نے اپنی ہمت و جرات سے کم و بیش ساری دنیا کو تسخیر کر لیا جس کے عوض انہوں نے چین جیسے عظیم ملک کے شہنشاہ کا تخت بھی حاصل کر لیا اور ایران کے تخت پر بھی قبضہ جمالیا جب کہ تم تو ان کے مقابلے میں محض باتیں بنانے کے عادی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم میں اسلاف کی سی حمیت نہیں رہی۔

باکیسواں بند : معنی : گلستان بکنار : جموں میں باغ۔ نقش : لکھی ہوئی ہے۔

مطلب : تمہارا طرزِ عمل تو فی الواقع خود کشی کے مترادف ہے جب کہ تمہارے اسلاف بلاشبہ غیرت مند اور خوددار تھے۔ تم لوگ بھائی چارے سے گریز کرتے ہو جب کہ وہ بھائی چارے کو انسانی رشتوں کی بنیادی اساس تصور کیا کرتے تھے۔ تم تو سر تاپا باتوں اور بڑبڑے ہو جب کہ وہ کلہا "عمل کے قائل تھے۔ تم تو ایک کلی کے لیے ترستے ہو جب کہ باغات ان کی دسترس میں تھے۔ مراد یہ کہ تم بے عملی کا شکار ہو اور تمہارے اسلاف بلند کردار اور باعمل لوگ تھے۔ اسی سبب وہ ساری دنیا پر مختصر عرصے میں چھا گئے۔

آج تک دنیا بھر کی قوموں کو ان کی داستانیں ازبر ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کی صداقت کے نقوش صلیب دہر پر ثبت ہیں۔

تیسواں بند : معنی : بت ہندی : ہندی تمدن۔ مجبور نشین : آشیانے سے جدا۔

مطلب : تمہاری حالت تو یہ ہے کہ قلیل عرصے کے لیے قوی افق پر ستاروں کی طرح سے روشن ہو گئے پھر ہندوستان کو اپنا وطن تصور کر کے تم اسی کے ہو رہے اور اپنے مذہبی و قومی تقاضوں کو قطعی فراموش کر دیا۔ دوسرے مقامات پر جانے کے لیے پر تولے تو گھر کو بھی تاج دیا۔ تمہارے جو جس سال فرزند تمہاری ہی طرح بے عمل تو تھے ہی دیکھا دیکھی دین سے بدظن بھی ہو گئے۔

یہ وہی لوگ تھے جنہیں جدید تمدن نے راہ سے ہٹا دیا اور یہ پھر مادر پدر آزادی کے جویا بن گئے۔ حد تو یہ ہے کہ کعبہ کو چھوڑ کر انہوں نے بت خانے کو آباد کر لیا۔ مراد یہی ہے کہ انہیں نہ اسلاف کی عظمت اور کردار کا پاس رہا نہ ہی وہ مذہبی اصولوں اور تعلیمات کے ہی قائل رہے۔

چوبیسواں بند : معنی : زحمت کش تھائی : تھائی کی تکلیف۔ باد یہ پیمانہ : صحرا کو طے کرنے والا۔ حجاب : پردہ۔ شکوہ بیداد : ظلم کی شکایت۔

مطلب : عمر موجود کے قیس کی مانند عاشق صادق ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن کسی نوع کی بھی سختی اٹھانے سے گریز کرتے ہیں۔ شری زندگی کو اس لیے زیادہ پسند کرتے ہیں کہ یہاں کی زندگی عیش و عشرت سے مزین ہے۔ یہ عشق کے عویدار صحرا نور دی کے قریب نہیں پہنچتے۔ اس کے برعکس اس نظریے کے قائل ہیں کہ قیس تو دیوانہ تھا وہ خواہ شہر میں بود و باش اختیار کرتا یا صحرا کی ریت پھانکتا اس سے اسے کیا فرق پڑ سکتا تھا البتہ لیلیٰ کو اس عشق میں جو صعوبت اٹھانا پڑی ان کا خاتمہ ضروری ہے۔ یہ نوجوان تو ایسی زندگی چاہتے ہیں جس میں مشکلات نہ ہوں جس میں عشق کی طرح حسن بھی آزاد ہو۔

چھپسواں بند : معنی : عہد نو : دور جدید۔ ایمین : امن میں محفوظ۔ ملت ختم رسل : مسلمان قوم۔ شعلہ بہ پیرا امن : جس کے لباس میں آگ لگی ہوئی ہے۔

مطلب : عہد نو تو ایک ایسی بجلی کی مانند ہے جو ہر کھلیان کو پھونکنے کے لیے ہر لمحے آمادہ ہے۔ اس

ہجلی سے کوئی صحرا اور کوئی گھٹاں محفوظ نہیں ہے اور بچ پوچھئے تو یہ ایک ایسی آگ کی طرح ہے جس کا ایندھن قدامت پرست اقوام کو قرار دیا جاسکتا ہے جس کے سبب نبیؐ آخر الزماں کی امت کا پیراہن جل کر خاک ہو رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جو قدامت پرست اقوام نئے زمانے کا ساتھ دینے سے عاری ہیں وہ ان کو ختم کرنے پر تیار ہوا ہے۔ اس ساری صورت حال کے سبب مسلمانوں کو پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ اس لیے کہ آج بھی ان میں اگر حضرت ابراہیمؑ جیسے پیغمبروں کا عقیدہ پیدا ہو جائے تو پھر ان کے عہد کی طرح آگ گھٹاں میں ہو سکتی ہے۔

چھبیسواں بند معنی: کوکب: ستارہ۔ خس و خاشاک: گھاس پھوس۔ گل بر انداز: پھول برسانا۔ عنابی: سرخ۔ افق تابی: افق کو روشن کرنا۔

مطلب: ملت مسلمہ کی جو اتر صورت حال ہے اس کو دیکھ کر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ بے شک یہ چمن اجڑا ہوا ہے تاہم جلد ہی اس میں بہار آنے والی ہے۔ اب یہ چمن گھاس پھوس اور غیر ضروری اشیاء سے پاک ہونے والا ہے۔ شہداء کے لہو کی سرخی اب یہاں پھول نکھیر رہی ہے۔ ذرا غور سے دیکھ کہ آسمان کا رنگ بڑی تیزی کے ساتھ عنابی ہوتا جا رہا ہے۔ یہ اس امر کی علامت ہے کہ اندھیری شب کے بعد سیرا نمودار ہونے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طلوع آفتاب کے آثار پیدا ہونے لگے ہیں۔

ستائیسواں بند معنی: شرجیدہ: پھلوں سے لدی ہوئی (یعنی کامیاب)۔ کاہیدہ: سوکھے ہوئے۔ بالیدہ: سربز۔

مطلب: اس کائنات میں بے شمار قومیں ایسی ہیں جو اپنی جدوجہد کے طفیل سرخورد ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ ایسی اقوام بھی موجود ہیں جو اب بھی محرومی کا شکار ہیں۔ اوریوں لگتا ہے کہ خزاں ان کے چمن کا مقدر ہے۔ زندگی کے ایک باغ کی مانند ہے اس میں بے شمار درخت ہیں جن میں سے بعض کمزور اور مر جھائے ہوئے ہیں جب کہ کچھ درخت شاداب اور سرسبز نظر آتے ہیں۔ یہی نہیں سینکڑوں درخت تو ابھی باغ کے بطن میں پوشیدہ ہیں۔ لیکن ان سب کے مقابلے میں شجر اسلام پھلنے پھولنے کے حوالے سے مثالی حیثیت کا حامل ہے کیوں نہ ہو جب کہ یہ صدیوں کی کاوش کا ثمر ہے۔

اٹھائیسواں بند معنی: گرد و وطن: وطن کی مٹی۔ کنعاں: حضرت یوسفؑ کا وطن۔ نخل: درخت۔

مطلب: یہ امر باعث اطمینان ہے کہ تیرا دامن وطنیت کے تصور سے پاک ہے۔ تو تو ایسے یوسفؑ کی مانند ہے جس کے لیے مصر کی سرزمین بھی کنعاں کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمان کا کوئی ملک وطن نہیں ہوتا بلکہ ہر خطہ زمین اس کے لیے وطن کی مانند ہے۔ اسی واسطے تیرا قافلہ کیسے کیسے بغیر منزل کی جانب رواں دواں رہے گا۔ اس لیے کہ تو نے تو اپنے آپ کو ہر نوع کے ساز و سامان سے بے نیاز رکھا ہے۔

اے مسلمان! تیری مثال تو ایک ایسی موم بتی کی طرح ہے جس میں دھماکہ ایک رشتے کے مانند شعلے میں دوڑتا ہے۔ تیرے فکر و خیال کا عکس بھی اسی طرح دل انسان میں سوز اور تپش پیدا کرے گا۔

انتیسواں بند معنی: پیکانے: جام۔ یورش تاتار: تاتاریوں کا قتل۔

مطلب: زیر تشریح بند میں وطنیت کے تصور کی اسلامی نقطہ نظر سے وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ

بافرض سلطنت ایران کا خاتمہ ہو جائے تو اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ اسلام اور مسلمان ختم ہو کر رہ جائیں گے۔ اس کی مثال شراب کا نشہ ہے جس کا عمل پینے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ نشہ شراب میں ہوتا ہے نہ کہ پینے میں۔ یہ حقیقت تاریکوں کے حملوں سے بھی کھل جاتی ہے کہ ایک زمانے میں انہوں نے بغداد اور کئی دوسرے اسلامی ممالک کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ پھر یہی تاریک مغل اور ترکوں کے روپ میں ایشیا، افریقہ اور یورپ میں اسلام کے علمبردار بن گئے۔ جہاں تک تیری ذات کا تعلق ہے کہ سچائی کو زندہ رکھنے کے لیے تیری ذات ہی بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ اور یہ جو عصر لوہے کا تو ایک اندھیری رات کی طرح ہے اس میں تو یہی ہے جو ستارے کی طرح جگمگا رہا ہے۔

تیسواں بند معنی: یورش بلغاری: بلغاریہ کا قتلہ (13-1912ء میں)۔ صہل فرس: گھوڑے کی ہنناہٹ۔ نفس: سانس۔

مطلب: ترکوں پر بلغاریہ کے عساکر نے جو یلغار کر رکھی ہے وہ تم لوگوں کے لیے جو غفلت کی نیند سو رہے ہو بیداری کا پیغام ہے۔ تیرا خیال ہے کہ ان حملوں کے باعث تیری دل آزاری مقصود ہے؟ نہیں! یہ تو دراصل تیرے ایثار اور خودداری کا امتحان ہے۔

نہ جانے تو دشمنوں کے گھوڑوں کی ہنناہٹ سے خوف زدہ کیوں ہو رہا ہے۔ ذرا بنظر غائر دیکھے تو تجھے خود ہی پتہ چل جائے گا کہ دشمنوں کی پھونکوں سے حق کا چراغ نہیں بجھ سکتا۔

اکتیسواں بند معنی: کوکب: ستارہ۔ خلافت: اتمام: تمام کرنا، تکمیل کرنا۔

مطلب: تو کیا ہے اور تیری حقیقت کیا ہے؟ یہ سب تو ابھی دوسری اقوام کی نگاہوں سے چھپا ہوا راز ہے۔ ورنہ امر واقعہ تو یہ ہے کہ ابھی اس دنیا کو تیری ضرورت ہے تجھ میں جو عمل کی حرارت موجود ہے وہی تو زمانے کو زندہ اور سرگرم رکھے ہوئے ہے۔ تیری خلافت و حکومت اس دنیا کے مقدر کا ستارہ ہیں کہ تو ختم ہو گیا تو یہ بھی ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اے مسلمان! اٹھ سرگرم عمل ہو کہ فرصت کا وقت نہیں رہ ذوالجلال نے تجھے جو ذمے داری سونپی ہے اس کی تکمیل تیرا فرض ہے خدا کی وحدانیت کو عام کرنے کا کام بھی باقی ہے۔

تیسواں بند معنی: رخت بردوش: سائبان کندھے پر اٹھائے ہوئے۔ چمنستان: باغ۔ تنگ مایہ: بے مایہ۔

مطلب: تیری مثال تو اس خوشبو کے مانند ہے جو غنچے میں محبوس ہے تیرے لیے لازم ہے کہ اس قید سے رہا ہو کر گلستان کی ہوا کے کاندھے پر سوار رخت سربانندہ کر سارے عالم میں پھیل جا۔ اگر تو بے بضاعت اور بے مال و منال ہے تو ایسی ملاحیت پیدا کر کہ زرے سے بیاباں میں تبدیل ہو جائے۔ اور اگر دریا کی موج کے نغمہ کے مماثل ہے تو اس حیثیت کو ترک کر کے طوفان کے ہنگامے کی شکل اختیار کر لے۔

تجھ میں جو عشق حقیقی کی قوت موجود ہے اس کی وساطت سے دنیا کی ہر اونٹنی کو بلند کروے اور اس تاریک زمانے میں آنحضرتؐ کے نام کی روشنی سے اجالا کر دے۔

تینتیسواں بند معنی: ترنم: سر۔ خم: شراب کا منکا۔ استادہ: کھڑا ہوا۔ تپش آمادہ: حرارت

پذیر۔

مطلب: آنحضرتؐ کی ذات صفات کو پھول سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ پھول باغ میں نہ ہو تو بلبل نفعی الا پنا جھوڑو۔ دنیا کے باغ میں کلیوں کا تبسم بھی باقی نہ رہے۔ اگر آنحضرتؐ نفعی حقیقی نہ پلائیں تو نہ پیمانہ ہو نہ صراحی! یہ جو وحدانیت کی محفل بھی ہوئی ہے یہ اور تم مسلمان بھی ناپید ہو جاؤ۔ آسمان اسی نام سے قائم ہے اور انسانی وجود میں جو حرارت ہے اس کا سبب بھی یہی نام ہے۔ مراد یہی ہے کہ آنحضرتؐ کے لیے ہی یہ دنیا پیدا کی گئی۔

چونتیسواں بند معنی: بحر: سمندر۔ رفعت: بلندی۔

مطلب: یہ نام اور شخصیت جو پیغمبر آخر الزماںؐ کی ہے اس کا وجود ہر شے میں ہے۔ خواہ صحرا ہو، پہاڑ ہوں، میدان ہوں، سمندر اور اس کی موجوں کی آغوش میں یا طوفان میں سب میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ چین کے شہروں میں، مراکش کے بیابانوں میں اور اہل اسلام کے ایمان میں پوشیدہ ہے۔ دنیا بھر کی قومیں قیامت تک یہ منظر دیکھتی رہیں گی کہ رب ذوالجلال نے حضورؐ کا تذکرہ اور مرتبہ بلند رکھنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ کس انداز میں پورا کیا جاتا رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے نام کے ساتھ توحید اور رسالت بھی ہمیشہ قائم رہے گی اور یہ وعدہ ضرور پورا ہوتا رہے گا۔

پہنچتیسواں بند معنی: مردم چشم زمیں: زمین کی آنکھ کی پتلی (مراد افریقہ کی سیاہ فام قوم)۔ گرمی مہر: سورج کی گرمی۔ تپش اندوز: گرمی حاصل کرنے والی۔

مطلب: اس بند میں براعظم افریقہ کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ یہ خطہ ارض جسے ”کلی دنیا“ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اس خطہ ارض پر بے شمار شہداء کی پرورش ہوئی ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جسے سورج کی حدت نے پرورش کیا ہے اور جو ملت مسلمہ کے پرچم سے متعلق ہے جس پر چاند ستارہ بنا ہے جسے اہل عشق حضرت بلال حبشیؓ سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ دنیا! آنحضورؐ کے نام سے ہی پارے کی مانند متحرک اور پر جوش ہے۔ اسی نام کے طفیل آنکھ کی پتلی کی طرح نور اور روشنی میں ڈوبی ہوئی ہے۔

چھتیسواں بند معنی: سپر: ڈھال۔ ماسوا: اللہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لوح و قلم: قسمت کی تختی اور تقدیر کو رقم کرنے والا قلم۔

مطلب: اے ملت مسلمہ کے فرزند! عقل تیرے لیے ڈھال کی حیثیت رکھتی ہے اور عشق تیری لکوار ہے۔ اے میرے درویش! بے شک تیری حکومت و خلافت ساری دنیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ تیری تکبیر معبود حقیقی کے سوا اور سب کے لئے آگ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر تو پاک اور پختہ عقیدہ مسلمان ہو جائے تو تیری تدبیر ہی تقدیر کا روپ و حار لے گی۔

سواے عزیز! اگر تو نے میرے پیغمبر محمدؐ سے وفا کی اور ان کی تعلیمات کو اپنا شعار بنایا تو جان لے کہ ہم تیرے ہی ہیں اور یہ دنیا تو الگ رہی لوح و قلم بھی تیرے ہوں گے۔



ساقی

122

نشہ پلا کے گرا تا تو سب کو آتا ہے مزا تو جب ہے کہ مگرتوں کو تمام لے ساقی
جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں کہیں سے آب بقاء دوام لے ساقی
کئی ہے رات تو ہنگامہ محسوس میں تری
حسرت قریب ہے، اللہ کا نام لے ساقی

*

معنی: ساقی: شراب پلانے والا۔ بادہ کش: شرابی۔ آب بقاء دوام: ہمیشہ زندہ رکھنے والا پانی۔
مطلب: یہ مختصر نظم محض تین اشعار پر مشتمل ہے۔ ان اشعار کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ
لگانے میں کوئی قیادت نہیں ہوگی کہ اقبال نے اس نظم میں اپنے عہد کے بعض ایسے رہنماؤں پر طنز کی
ہے جو ذاتی مفاد کے لیے اپنے پیروؤں کو مذہب اور سیاست کے نام پر استعمال کرتے تھے۔ فرماتے ہیں:
شراب پلا کر ہر کوئی دوسرے کو بدست اور مدہوش کر سکتا ہے اور اس بدستی اور مدہوشی میں اپنے

والا زمین پر ہی کرتا ہے لیکن ساتی کا کام محض مدہوش کرنا ہی نہیں ہے بلکہ مرتے ہوؤں کو تھامنا بھی ہے۔ مطلب یہ کہ ذاتی مفاد کے لیے دوسروں کو پستی سے ہم کنار کرنا تو سب کو آتا ہے تاہم حقیقی رہنمائی کا لطف اس عمل میں ہے کہ پستی میں گرنے والے کو سہارا دے۔ پستی سے نجات دلائی جائے جو پرانے لوگ سے نوشی کے عادی تھے وہ تو بتدریج فتا کے گھاٹ اترتے جا رہے ہیں چنانچہ یہ امر اب لازم ہو گیا ہے کہ انہیں آب حیات پلا کر بقائے دوام سے ہم کنار کیا جائے۔

اے ساتی! تو نے اپنی باری عمر تو اسی قسم کے ہنگاموں میں گزاری ہے اب جب کہ تو عمر کے آخری مراحل میں ہے سب ہنگامے چھوڑ کر اللہ اللہ کر لے کہ یہی آخرت میں کام آئے گا۔ مرد یہ ہے کہ خود ساختہ اور مفاد پرست رہنماؤں کا کردار عام لوگوں کے لیے زہر قاتل سے کم نہیں۔ خدا کرے وہ عبرت حاصل کر سکیں۔

تعلیم اور اس کے نتائج

123

(تضمین بر شعر ملاعرشی)

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر اب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما لے کے آئی ہے مگر تیشہ فریاد بھی ساتھ ساتھ
”ختم دیگر بکھ آرمیم و بکاریم ز نو کانچہ کشتم ز جلت نتواں کرد ورو“

*

معنی: الحاد: دین سے پھرنا۔ پرویز: خرد مانی (شاہ ایران کا لقب)۔ ختم: ختم۔ ج۔

مطلب: حصول تعلیم کے ضمن میں نوجوانوں نے جو ترقی کی وہ دوسروں کی طرح ہمارے لیے بھی مسرت و انبساط کا باعث ہے۔ مگر مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے ساتھ ہی فریاد بھی نکل جاتی ہے اس لیے کہ ہم تو یہی سوچتے تھے کہ تعلیم کے سبب قوم کی مشکلات دور ہوں گی لیکن اس کا علم نہ تھا کہ مردِ جہل کے ہمراہ قوم کے نوجوانوں میں فراغت اور آسائش کے ساتھ کفر و الحاد بھی ان کے دلوں میں گھر کر لے گا۔ اس کی مثال تو ایسی کہ پرویز بادشاہ کے محل میں اس کی مطلوبہ محبوبہ شیریں آتو گئی مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اپنے عشاق فریاد کا تیشہ بھی ساتھ لے آئی۔ مراد یہ کہ تعلیم نے نوجوانوں کے ذہنوں کو قدرے جلاء تو بخشی لیکن انہیں کفر و الحاد سے بھی متاثر کر کے رکھ دیا۔

آخری شعر ایرانی شاعر ملاعرشی کا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اب ہمیں کیس سے نیا چل لانا چاہیے اور اسے کاشت کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ جو بیج پہلے کاشت کیا تھا اس کی فصل کاٹنا باعثِ ندامت بن گیا ہے۔ یہاں ملاعرشی کا مختصر تعارف بے محل نہ ہو گا کہ وہ ایران کے صفوی بادشاہ طہماسب کے دربار سے وابستہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بڑے زود گو شاعر تھے۔ ن کا دیوان دس ہزار اشعار پر مشتمل بتایا جاتا ہے۔

قرب سلطان

124

تمیز حاکم و محکوم مٹ نہیں سکتی
جہاں میں خواجہ پرستی ہے بندگی کا کمال
مگر غرض جو حصول رضائے حاکم ہو
پرانے طرز عمل میں ہزار مشکل ہے
مزا تو یہ ہے کہ یوں زیر آسمان رہیے
یہی اصول ہے سرمایہ سکون حیات
مگر خروش پہ مائل ہے تو، تو بسم اللہ
شریک بزم امیر و وزیر و سلطان ہو
پیام مرشد شیراز بھی مگر سن لے
محل نور تجلی است رائے انور شاہ
جو قرب او طلبی در صفائے نیت کوش

*

اس دنیا کا نظام ہی اس طرز پر وضع کیا گیا ہے کہ حاکم و محکوم کے مابین جو امتیاز قائم کیا گیا وہ کسی طور پر بھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے یہ بات طے ہے کہ کوئی بھکاری بادشاہ کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں غلامی کا کمال ہی یہ ہے کہ آقا کی پرستش کی جائے اور اس کے احکامات بے چون و چرا مان لیے جائیں۔ کہ آقا کی خوشنودی کی صورت میں غلام سرخرو ہو سکتا ہے۔ تاہم مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی حاکم کی خوشنودی حاصل کرنے کا خواہاں ہو تو اسے عہدوں کا لالچی اور قوم فروش کھنا جاتا ہے اور لوگ اسے معاف کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔

اب دیکھا جائے تو ماضی کے اصولوں پر عمل کرنے میں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ جدید قواعد اور اصولوں میں فکر موجود ہی نہیں۔ لطف تو اسی صورت میں ہے کہ اس آسمان تلے رہائش کے دوران ہر چند کہ زبان پر ہزار ہا باتیں ہوں پھر بھی لب کشائی نہ کی جائے اور خاموشی اختیار کر لی جائے۔

اقبال کہتے ہیں کہ زندگی میں سکون و اطمینان کا ایک نسخہ خواجہ حافظ شیرازی نے اس طرح سے پیش کیا ہے کہ اے حافظ! بے شک تو ترک دنیا کر کے محض ایک گوشے میں پناہ لینے والا درویش ہے اس لیے تجھے شور و ہنگامہ بپا کرنے کی بجائے خاموش رہنا چاہیے۔ اس کے باوجود اگر تو ہنگامہ کرنے پر تلا ہی ہوا ہے تو شوق سے کر۔ مگر اس کے لیے شراب خالص کا حصول ناگزیر ہے کہ سے راگ و رنگ کی محفل میں نوش جال کیا جاسکے۔ شاہوں، وزیروں اور امیروں کی محفلوں میں شرکت اس طرح سے کر کہ اپنے فکرو شعور کو بھول جاؤ اور محض اہل محفل کی خوشنودی کا خیال رکھو۔

اس ساری صورت حال کے باوجود شیراز کے مرشد کا یہ پیغام بھی بہ قانعی ہوش و حواس سن لے۔ عملاً یہ پیغام ایک ایسا راز ہے جو انسانوں کو خوش خبری دینے والے فرشتے کے ضمیر میں پوشیدہ ہے اور وہ

پیغام یہ ہے کہ شاہوں کی رائے پر تجلیوں کا نور برستا ہے۔ لہذا جب تو شاہ کی قربت میں بیٹھے تو ہمیشہ اپنی نیت کو صاف رکھ۔

در اصل یہ اشعار اقبال نے بظاہر تو بندہ و آقا کے مابین امتیاز کے حوالے سے کہے ہیں لیکن عملاً وہ مسئلہ جبر و قدر کو زیر بحث لاتے ہیں کہ فرد کے تقدیر میں غلامی کبھی ہے تو اس پر قاعدت ہی کی جاسکتی ہے۔

شاعر

125

جوئے سرود آفریں آتی ہے کوہسار سے پی کے شراب لالہ گوں میکدہ بہار سے
ست سے خرام کا سن تو ذرا پیام تو زندہ وہی ہے کام کچھ جس کو نہیں قرار سے
پھرتی ہے وادیوں میں کیا دختر خوش خرام ابر کرتی ہے عشق بازیاں سبزہ مرغزار سے
جام شراب کوہ کے خمکدے سے اڑاتی ہے

پست و بلند کر کے طے کھیتوں کو جا پلاتی ہے
شاعر دل نواز بھی بات اگر کہے کھری ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرع زندگی ہری
شان خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آزاری
اہل زمیں کہ نسخہ زندگی دوام ہے خون جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری
گلشن دہر میں اگر جوئے سے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو



پہلا بند معنی: جوئے سرود آفریں: نغمہ سنانی ہوئی ندی۔ خمکدے: شراب خانہ۔

مطلب: اس نظم میں بھی منظر نگاری اور ابجری اپنے کمال پر ہے۔ ندی اپنی تمام تر نغمہ ریزی کے ساتھ پہاڑ کی چٹانوں میں سے گزرتی بل کھاتی نیچے زمین کی طرف آ رہی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بہار کے موسم میں گل لالہ جیسی سرخ شراب پی کر مستی و مدہوشی کے عالم میں رواں دواں ہو۔ اس ندی کا پیغام سن۔ جو زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ اس دنیا میں وہی شے زندہ رہتی ہے جو سکون و ثبات کی بجائے حرکت و عمل کی قائل ہو۔

یہ خوبصورت چال والی بادل کی بیٹی ندی۔ اس طرح وادیوں کا طواف کرتی ہے جیسے کہ مرغزار کے سبزے سے عشق لڑا رہی ہو۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ندی کوہسار کے میکدے سے شراب کے جام اڑ کر لاتی ہے اور پھر اونچے نیچے مقامات سے گزار کر کھیتوں تک جا پہنچتی ہے اور یہ شراب انہیں پلا دیتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ پہاڑی ندی چٹانوں سے گزرتی ہوئی جب وادی میں پہنچتی ہے تو کھیتوں کو سیراب کرتی ہے۔

دوسرا بند معنی: مزرع: کھیتی۔ سخنوری: مراد شاعری۔

مطلب: اس بند کے اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح ندی کے کردار کا ذکر اوپر کے شعروں میں کیا گیا ہے اسی منظر نامے میں اگر کسی دلنواز شاعر کی تخلیقات اور فکر کا جائزہ لیا جائے تو یہ چلتا ہے کہ اگر شاعر

بھی مبالغہ آرائی کی بجائے سچ کو اپنا شعار بنالے اور اس سچ کے اظہار میں جرات مندی سے کام لے تو حیات انسانی کے لیے مفید اور سودمند ثابت ہو سکتا ہے یعنی ندی تو صرف کھیتوں اور باغات کو سیراب کرتی ہے جب کہ شاعر کی فکر انسان اور کائنات کے لیے افادیت کا سبب بنتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ شاعر اگر حقیقت پسند ہے اور سچائی کے اظہار پر دسترس رکھتا ہے تو ایسے شاعر کے کلام سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی شان ظاہر ہوتی ہے خاص طور پر ان مراحل میں جب کہ اس کی قوم آزر کی طرح بت تراشی اور بت پرستی کی جانب مائل ہو جائے۔ چنانچہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے ان بتوں کو ریزہ ریزہ کر کے وحدانیت اور حق پرستی کا راستہ دکھایا تھا۔ شاعر بھی اپنی ملت کے لیے یہی کروار اوا کر سکتا ہے جو شاعری سچائی اور خون جگر سے پرورش پاتی ہے وہ سننے والوں کے لیے ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔

چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے اس گھٹاں میں اگر شعر کی ندی نہ ہو یعنی شاعری نہ ہو تو پھر یہاں پھول، کلی، سبزہ اور چمن کا وجود بھی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

نوید صبح

126

آتی ہے مشرق سے جب ہنگامہ در دامن سحر منزل ہستی سے کر جاتی ہے خاموشی سفر
محفل قدرت کا آخر ٹوٹ جاتا ہے سکوت دیتی ہے ہر چیز اپنی زندگانی کا ثبوت
چمکاتے ہیں پرندے پا کے پیغام حیات باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرام حیات
مسلم خوابیدہ اٹھ، ہنگامہ آرا تو بھی ہو وہ چمک اٹھا اٹھ، گرم تقاضا تو بھی ہو
وسعت عالم میں رہ چکا ہو مثل آفتاب دامن گردوں سے ٹاپیدا ہوں یہ وارغ سحاب
سمیچ کر خنجر کرن کا، پھر ہو سرگرم ستیز پھر سکھا تاریکی باطل کو آداب گرہ
تو سراپا نور ہے خوشتر ہے عریانی تجھے اور عریاں ہو کے لازم ہے خود افشانی تجھے
ہاں! نمایاں ہو کے برق دیدہ نقاش ہو اے دل کون و مکاں کے راز مضمر فاش ہو



پہلا بند معنی: ہنگامہ در دامن: اپنے دامن میں ہنگامے لیے ہوئے۔ خاموشی سفر: خاموشی رخصت ہو جاتی ہے۔

مطلب: زیر تشریح نظم دو بند پر مشتمل ہے۔ پہلے بند کا آغاز اقبال اس انداز سے کرتے ہیں کہ جس گہری مشرق کی جانب سے صبح اپنے دامن میں ہنگامے لیے آتی ہے اس وقت کائنات سے خاموشی رخصت ہو جاتی ہے۔ ساری فضاء پر جو سکوت چھایا ہوا ہوتا ہے وہ ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور کائنات میں موجود ہر شے اپنی زندگی کا ثبوت فراہم کرنے لگتی ہے جو ہی ہر جانب سے زندگی کا پیغام ملنے لگتا ہے تو پرندے بھی چمکانے لگتے ہیں اور پھول بھی اپنی گلشنی سے اپنے وجود سے آگاہ کر دیتے ہیں۔

سوجب کائنات کی ہر شے سرگرم عمل ہے تو اے مسلمان! تو بھی اپنی نیند سے بیدار ہو جا کہ مشرق میں افق کی روشنی پھیل رہی ہے لہذا دوسرے عناصر کی طرح تو بھی مصروف عمل ہو جا۔
دوسرا بند معنی: سرگرم ستیز: جنگ میں مصروف۔

مطلب: اے مسلمان! تو بھی سورج کی مانند کائنات کی وسعت میں اپنے سفر کا آغاز کر دے تاکہ آسمان پر بادلوں کے جوداغ احاطہ کیے ہوئے ہیں وہ مٹ جائیں۔ سورج کی کرنوں کی طرح تو بھی اپنے مخمجر کو تیز کر لے اور باطل کے خلاف اعلان جنگ کر دے کہ وہ حق کے مقابلے میں فرار پر مجبور ہو جائے۔ آج باطل کے اندھیرے بڑھتے جا رہے ہیں۔ اگر تو سرگرم عمل ہو جائے تو حق کی فتح لازمی ہے اور اس کی روشنی ہر طرف پھیل سکتی ہے۔ تو کہ سرے پائیک روشنی ہے تجھے تو اپنے دُجو کو نمایاں کرنا چاہیے اور اپنی صلاحیتوں کو ظاہر کرنا چاہیے۔
اگر باطل کو چنگوڑ یعنی اندھیرا تسلیم کر لیا جائے تو اے مسلمان تو اس پر اپنی روشنی سے حملہ آور ہو تاکہ باطل کی تاریکی ختم ہو کر رہ جائے۔

دعا

127

یا رب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
پھر دادی فاراں کے ہر ذرے کو چکا دے
مخروم تماشا کو پھر دیدہ بینا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
پیدا دل ویراں میں پھر شورش محشر کر
اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو
رفعت میں مقاصد کو ہمدش ثریا کر
بے لوث محبت ہو بیباک صداقت ہو
احساس عنایت کر آثار مصیبت کا
میں بلبل نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاشیر کا ساک ہوں محتاج کو داتا دے

*

① سے ⑤ معنی: فاراں: پہاڑ کا نام ہے۔ دیدہ بینا: دیکھنے والی آنکھ۔ آہو: ہرن۔ خوگر: عادی۔

مطلب: اس نظم میں اقبال بارگاہ الہی میں یوں دعا گو ہیں کہ اے مالک جہاں! مسلمانوں کے دلوں میں ایسی بیدار تمنائیں پیدا کر جو ہر قلب کو مضطرب کر دے اور ان کی روح کو تڑپا کر رکھ دے۔ اے مولا! ایک بار پھر حرم کعبہ کے ایک ایک ذرے کو منور کر دے اور مسلمانوں کے دلوں میں وہ شوق پیدا کر دے جو اس روشنی کو اپنے اندر جذب کرنے کا سبب بن سکے۔ وہ لوگ جو چشم بصیرت سے محروم ہو چکے ہیں انہیں بصیرت کے ساتھ بصارت بھی عطا کر۔ اور میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ دوسرے مسلمانوں کو بھی

زکھا دے۔ مسلمان آج ایک گم کردہ راہ ہرن کی طرح ہے۔ اسے پھر سے حرم کعبہ کی طرف لوٹا دے اور اس کی فکر کو صحرا جیسی وسعت عطا کر دے۔ اس اجڑے ہوئے دل میں پھر سے حشر پھا کر دے اس کے خالی کبا دے کو لیلیٰ جیسا محبوب عنایت فرما۔

⑥ سے ⑩ معنی: رفعت: بلندی۔ مینا: شیشہ، صراحی۔

مطلب: یہ دور تاریکی کا دور ہے جس میں کسی کو کچھ نہیں سوجھ رہا۔ اسی سبب مسلمانوں کے دل اتھری کا شکار ہیں۔ ان دلوں کو ایسا داغ محبت دے جو چاند کو بھی شرما دے۔ ان کے جو مقاصد ہیں ان کو شریا کی سی بلندی عطا کر۔ ان کو ساحل جیسی خودداری اور دریا کی روانی جیسی آزادی بخش دے۔ ان مسلمانوں کے دلوں میں ایسی محبت موجزن ہو جو بالکل بے لوث ہو جس میں لالچ اور ہوس کا شائبہ تک نہ ہو۔ مزید یہ کہ انہیں بے خوف و خطر جگ بولنے کی توفیق عطا فرما۔ ان کے دلوں میں اجالا پیدا کر دے اور دلوں کو وہ صلاحیت دے جو دو سرورں کو فیض پہنچا سکے۔ مسلمان آج مصائب و آلام میں گھرے ہوئے ہیں لیکن بے حسی کا شکار ہیں۔ خدایا انہیں مصائب سے متنبہ کر اور حال کے ہنگاموں کے پس منظر میں مستقبل کی فکر عطا کر۔

اقبال کہتے ہیں اے آقا! میں تو ایک ویران باغ میں نالہ و فریاد کرنے والا بلبل کی طرح ہوں جس کی گریہ و زاری میں تاثیر باقی نہیں رہی چنانچہ اے ہر فرد کی حاجت روائی کرنے والے میں تجھ سے اپنی تاثیر کا طلبگار ہوں۔

128 عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں

یہ شالامار میں اک برگ زرد کتا تھا گیا وہ موسم گل جس کا رازدار ہوں میں
نہ پائمنل کریں مجھ کو زائران چمن انہیں کی شاخ نشین کی یادگار ہوں میں
ذرا سے پتے نے بے تاب کر دیا دل کو چمن میں آ کے سراپا غم بہار ہوں میں
خزاں میں معجکوں رلاتی ہے یاد فصل بہار خوشی ہو عید کی کیونکر کہ سوگوار ہوں میں
اجاڑ ہو گئے عید کسن کے سے خانے گذشتہ بادہ پرستوں کی یادگار ہوں میں
پیام عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے
ہلال عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

*

چھ اشعار پر مشتمل اس مختصر نظم میں اقبال ایک مخصوص صورت حال کے پس منظر میں غم و الم کی تصویر بنے آتے ہیں۔ یوں بھی عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں انہوں نے یہاں جو کچھ کہا ہے اسے ایک مغذرت نامے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔

معنی: برگ زرد: زرد رنگ کا پتہ۔ زائران چمن: باغ کی سیر کرنے والے۔ ہلال عید: عید کا چاند۔

مطلب: مقلوں کے خوبصورت باغ شالامار میں سیر کے لیے گیا تو کسی درخت کے ایک مرجھائے ہوئے زرد پتے نے زبان حال سے کہا کہ وہ بہار اور شان و شوکت کا زمانہ تو رخصت ہو گیا جس کا میں چشم دید گواہ

اور رازدار ہوں۔ باغ میں سیر کو آنے والے لوگ مجھے یوں اپنے قدموں تلے نہ روند ڈالیں کہ میں اس درخت سے شاخ کا جزو ہوں جس پر کبھی ان کا نشین ہوا کرتا تھا یعنی میں بھی اس گزری ہوئی شان و شوکت کا منظر ہوں جو کبھی ملت اسلامیہ کی عظمت کا حصہ تھی۔

اقبال کہتے ہیں کہ اس ذرا سے پتے کی زبان حال سے فریاد نے میرے دل کو اضطراب سے دوچار کر دیا اور یہاں باغ میں سیر سے لطف اندوز ہونے کی بجائے مذکورہ فریاد سن کر دل بے چین ہو کر رہ گیا اور قلبی مسرت غم کے سانچے میں ڈھل گئی۔ یہی وجہ ہے کہ میں خزاں کے دور میں بہار کے موسم کو یاد کر کے اشک بار ہوتا ہوں۔ اس غم انگیز کیفیت میں مجھے عید کی کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ میں تو ماضی کی یاد میں پہلے ہی سوگوار ہوں۔ ملت اسلامیہ کی عظمت و شان کا وہ دور ختم ہو چکا جس کی یادگار کے طور پر میں ابھی تک بقیہ حیات ہوں۔

اس کیفیت میں عید کا چاند ہمیش و مسرت کا مژدہ سنا کر دراصل ہمارا مذاق اڑاتا ہے۔

فاطمہ بنت عبد اللہ

129

(عرب لڑکی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی)

1912ء

فاطمہ! تو آہوئے امت مرحوم ہے ذرہ ذرہ تیری مٹت خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حور صحرائی تری قسمت میں تھی غازیوں دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر ہے جبارت آفریں شوق شادیت کس قدر
یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں

بجلیاں برے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

فاطمہ! گو خنیم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے نغمہ عشرت بھی اپنے نالہ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا سستا نشاط انگیز ہے ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں
ہے خبر ہوں گرچہ ان کے وسعت مقصد سے میں آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں
تازہ انجم کا فضاے آسمان میں ہے ظہور دیدہ انساں سے نامحرم ہے جن کی موج نور
جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانہ ایام سے جن کی ضو نا آشنا ہے قید صبح و شام سے
جن کی تابانی میں انداز کس بھی، نو بھی ہے اور تیرے کو کب تقدیر کا پرتو بھی ہے

*

پہلا بند معنی: امت مرحوم: مراد ہے ملت اسلامیہ۔ سقائی: پانی پانا۔ خاکستر: راکھ۔ آہو: ہرن۔ مطلب: مندرجہ بالا نوٹ میں علامہ اقبال نے خود اس لہم کی شان نزول کی جانب اشارہ کیا ہے۔ زیر

تشریح بند کا آغاز کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں اے فاطمہ بنت عبد اللہ تو اس امت کی عزت و آبرو ہے جس پر باری تعالیٰ نے اپنی رحمت کا نزول فرمایا۔ سچ تو یہ ہے کہ تیرے جسم کا ذرہ ذرہ تمام گناہوں سے پاک و منزه ہے۔ اے حور صحرائی! دراصل یہ سعادت تیرے حصے میں ہی آئی تھی کہ دین کی راہ میں جان نثار کرنے والوں اور فاتح جوانوں کو میدان کارزار میں پانی پلانے کا شرف حاصل کرے۔

سچ تو یہ ہے کہ تو نے اللہ کی راہ میں کسی کھوار اور دھال کے بغیر حیرت انگیز طور پر بڑی جی داری کے ساتھ جہاد کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شوق شہادت نے تجھ کس جرات مند اور بہادر بنا دیا تھا۔ تیری مختصر زندگی اور موت کے پیش نظر حیرت زدہ ہو کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خدا یا! ہمارے اجڑے ہوئے باغ میں ایسی کھلی بھی موجود تھی؟ یہی نہیں بلکہ ملت اسلامیہ جو دیکھا جائے تو راکھ کا ڈھیر بن چکی ہے۔ اس ڈھیر میں ایسی تاناک اور باطل کو جلا دینے والی چنگاری بھی موجود تھی۔

لیکن مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ ہمارے صحرا میں اتنے جیلے آہو ابھی تک چھپے ہوئے ہیں اور جو بادل برس چکا ہے اس میں ابھی تک بجلیاں چھپی ہوئی ہیں۔ مراد یہ کہ قوم میں ابھی بھی جو ہر قاتل اور جاں نثاروں کی گئی نہیں ہے۔

دوسرا بند معنی: خانہ ایام: زمانے کا اندھیرا۔

مطلب: اے فاطمہ! ہر چند کہ تیرے غم میں ہماری آنکھیں اٹھکبار ہیں لیکن آہ و زاری کے ان مراحل میں کچھ طمانیت بخش پہلو بھی موجود ہیں۔ تیری حیات اور موت کے واقعات ہمارے لیے بے حد حوصلہ افزا ہیں۔ تیری خاک کا ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے معمور ہے۔ تیری قبر کا سکوت بھی ایک ہنگامے کا پتہ دیتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس قبر کی آغوش میں ایک نئی اور زندہ قوم پرورش پا رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ میں اس نئی قوم کی وسعت اور اس کے بنیادی مقاصد سے آگاہی نہیں رکھتا۔ تاہم اس قدر یقین ہے کہ اس نئی قوم کی پیدائش اور آغاز تیری ہی قبر سے ہو رہا ہے۔

اے فاطمہ بنت عبد اللہ! میری چشم بصیرت افروز اس حقیقت کا نظارہ کر رہی ہے کہ آسمان پر ایک نئے اور تابندہ ستارے کا ظہور ہو رہا ہے۔ ہر چند کہ عام انسان کی نظروں کو اس کا اور اک نہیں ہے۔ یہ محض ایک ستارہ نہیں بلکہ بہت سے ستارے ہیں۔ یہ ستارے ابھی وقت اور ماحول کے اندھیرے سے نمودار ہو رہے ہیں۔ ان کی روشنی ابھی تک دن رات اور صبح و شام کی پابندیوں سے آزاد ہے۔ مراد یہ ہے کہ ملت مسلمہ کے لیے عروج و ارتقا کے نئے مواقع فراہم کیے جا رہے ہیں تاکہ وہ حال کے ساتھ اپنے مستقبل کی تعمیر کر سکے۔

اے فاطمہ بنت عبد اللہ! یہ جو ستارے نمودار ہو رہے ہیں ان کی روشنی اور چمک دمک میں قدیم اور نئے انداز کے ساتھ تیرے مقدر کے ستارے کا عکس بھی موجود ہے۔

شبنم اور ستارے

130

اک رات یہ کہنے لگے شبنم سے ستارے ہر صبح نئے تجھ کو میسر ہیں نظارے کیا جانے تو کتنے جہاں دیکھ چکی ہے جو بن کے نئے ان کے نشان دیکھ چکی ہے

زہرہ نے سنی ہے یہ خبر ایک ملک سے . انسانوں کی بستی ہے بہت دور فلک سے
کہ ہم سے بھی اس کشور دگلش کا فسانہ
گاتا ہے قمر جس کی محبت کا ترانہ

اے تارو! نہ پوچھو چمنستان جہاں کی
آتی ہے مباداں سے پلٹ جانے کی خاطر
کیا تم سے کہوں کیا چمن افروز کلی ہے
گل نالہ بلبل کی صدا سن نہیں سکتا
ہیں مرغ نوا ریز گرفتار غضب ہے
رہتی ہے سدا تجھس بیمار کی تر آنکھ
دل سوختہ گرمی فریاد ہے شمشاد
تارے شرر آہ ہیں انہاں کی زباں میں
تاوانی ہے یہ گرد زمیں طوف قمر کا
بنیاد ہے کاشانہ عالم کی ہوا پر
فریاد کی تصویر ہے قرطاس فضا پر

پہلا بند معنی: زہرہ: ایک مشہور ستارہ۔ اسے قمر فلک بھی کہتے ہیں۔

مطلب: یہ ایک رات کا ذکر ہے کہ ستاروں نے جہنم سے مخاطب ہو کر کہا۔ تجھ کو ہر صبح نئے نئے
نظارے دکھائی دیتے ہیں۔ نہ جانے تو اب تک کتنی دنیا میں دیکھ چکی ہے۔ جو چہرے عروج پا کر زوال کا شکار
ہو چکی ہیں تو نے تو ان کی افتاد کا نظارہ بھی کیا ہے۔ اے جہنم! زہرہ ستارے نے کسی فرشتے سے یہ خبر سنی
ہے کہ انسان جس دنیا میں آباد ہیں وہ آسمان سے کافی فاصلے پر واقع ہے۔

اے جہنم! چونکہ تو انسانوں کی اس دگلش بستی کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے۔ چاند بھی جس کی
محبت کے نغمے گاتا ہے اس کا احوال سنا۔

دوسرا بند معنی: چمن افروز: باغ کی زینت۔ شعلہ بے سوز کلی: ایک چنگاری ہے جس میں جلن نہیں
ہے۔ مرغ نوا ریز: نغمے گانے والے پرندے۔ تہ سایہ گل: پھول کے سائے میں۔ درماں: علاج۔ قرطاس:
صفیہ۔

مطلب: ستاروں کی زبانی یہ بات سن کر جہنم نے جواباً کہا کہ اے ستارو! تم انسانی دنیا کے بارے میں کیا
پوچھتے ہو۔ وہ کوئی گفتگو باغ نہیں بلکہ ایسی بستی ہے جو آہ و فغاں سے عبارت ہے وہاں مباحض اس لیے
آتی ہے کہ مایوس ہو کر واپس لوٹ جائے اور باغوں میں کلی صرف مرجھانے کی خاطر ہی کھلتی ہے۔ اس کلی
کا احوال تم سے کیا کہوں کہ وہ کس طرح باغ کی آرائش کا سامان بنتی ہے۔ وہ تو شاید ایک ایسا ننھا سا شعلہ
ہے جو تپش سے محروم ہے۔

اس دنیا میں پھول اس قدر مجبور ہے کہ اسے نالہ بلبل بھی سنائی نہیں دیتا۔ میں خود اس کے دامن

میں موتیوں کی طرح گرتی ہوں لیکن وہ انہیں بھی نہیں چن سکتا۔ اس بستی میں تو نئے لاسے والے پرندوں کو بھی قیدی بنالیا جاتا ہے۔ حیرت تو یہ کہ وہاں پھولوں کے زیر سایہ کانٹے اگتے ہیں۔ زرخس کے پھول نظارے کی تڑپ تو رکھتے ہیں لیکن ان کی آنکھیں بصارت سے محروم ہیں۔ شمشاد کا درخت فریاد کی حدت سے تپش آمادہ رہتا ہے۔ بظاہر وہ آزاد ہے پھر بھی قیدی کی حیثیت کا حامل ہے۔ خوبصورت ستارے بھی انسان کی زبان میں آہوں کے شرارے ہیں اور اہل گلشن مجھے بھی آسمان کے آنسوؤں سے تعبیر کرتے ہیں۔ چاند جو زمین کی محبت میں گرفتار ہو کر وہاں کا طواف کرتا ہے ناوان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جہان فانی کی بنیاد محض ہوا پر قائم ہے۔ اور یہ درحقیقت غم و اندوہ اور نالہ و فغاں کا مرقع ہے۔ اس نظم میں اقبال نے دنیا کی بے ثباتی کی تصویر کشی کی ہے۔

محاصرہ ادرنہ

131

یورپ میں جس گھڑی حق و باطل کی چھڑ مٹی
مرد صلیب، گرد قمر حلقہ زن ہوئی
مسلم سپاہیوں کے ذخیرے ہوئے تمام
آخر امیر عسکر ترکی کے حکم سے
ہر شے ہوئی ذخیرہ لشکر میں منتقل
لیکن فقیہ شہر نے جس دم سنی یہ بات
ذی کا مال لشکر مسلم پہ ہے حرام
چھوٹی نہ تھی یسود و نصاریٰ کا مال فوج
مسلم خدا کے حکم سے مجبور ہو گیا

*

علامہ اقبال نے یہ نظم اس جنگ کے پس منظر میں تخلیق کی ہے جو ترکی پر 1913ء میں بلغاریہ اور سربیا کے مشترکہ حملے کے سبب وقوع پذیر ہوئی۔ ان دونوں ممالک نے ادرنہ پر حملے کر کے اسے فتح کر لیا لیکن چند ماہ کے بعد ترک سپہ سالار انور پاشا نے اس شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ دراصل ادرنہ وہ شہر تھا جو فتح قسطنطنیہ سے قبل ترکی عثمانیہ سلطنت کا دار الخلافہ تھا۔ اسی سبب اس عہد میں ادرنہ کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

① سے ④ معنی: صلیب: سولی۔ آئین جنگ: فوجی قانون یا مارشل لاء۔

مطلب: چنانچہ نظم کا آغاز کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ یورپ میں جس لمحے حق و باطل کے مابین جنگ چھڑ گئی تو حق کو بھی مجبور ہونا پڑا کہ باطل کے خلاف تلوار اٹھائے۔ مراد یہ ہے کہ بلغاریہ اور سربیا کی افواج نے جس وقت ترکی کے دار الحکومت ادرنہ پر حملہ کیا تو عثمانی سلطنت کے عساکر بھی ان کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ صلیبی یعنی عیسائی افواج نے جب مسلم علاقے کا محاصرہ کر لیا تو ترک سالار اپنی فوجی قوت کو مجتمع کر کے ادرنہ کے قلعہ میں محصور ہو گیا اور دشمن کے خلاف مختصر فوج کے باوجود اس بے

جگری سے مزاحمت کی کہ عیسائی سالار بھی اسے داؤ دینے پر مجبور ہو گئے۔

اس معرکے نے اتنا طول پکڑا کہ مسلمانوں کے پاس سامان رسد ختم ہو گیا اور فوجی بھوکوں مرنے لگے۔ باہر سے کمک کی کوئی توقع نہیں تھی آخر کار مجبور و کر شکر پاشا نے حکم جاری کیا کہ جنگ کے قانون کے مطابق شہریوں سے جبرا سامان خوراک حاصل کر لیا جائے۔ اس حکم کی رو سے اسلامی لشکر نے عام لوگوں سے خوراک کے ذخیرے حاصل کر کے جمع کر لیے۔

⑤ سے ⑧ معنی: منتقل: ایک جگہ سے دوسری جگہ لانا۔ عصفور: چڑیا۔ فقیہ شہر: شہر کا مفتی۔ صاعقہ: چمکنے والی بجلی۔ ذمی: وہ غیر مسلم جس کی حفاظت کا ذمہ مسلم حکومت نے اٹھایا ہے۔

مطلب: جب تمام سامان رسد لشکر کے ذخیرے میں منتقل ہو گیا تو عمومی سطح پر اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جانے لگا کہ ”شاہیں جو تھوہ چڑیوں کی خوراک کا بھکاری بن گیا ہے۔“ مراد یہ کہ مسلمان فوجی جو بے حد جی وار اور جرات مند ہونے کے ساتھ بلند حوصلہ بھی رکھتے تھے انہوں نے آخر کار بھوک سے مجبور ہو کر عام لوگوں کے کھانے پینے کا سامان بھی قبضے میں لے لیا ہے۔

تاہم جب یہ خبر شہر کے مفتی تک پہنچی تو وہ اس قدر غضبناک ہوا کہ فوری طور پر ترک لشکر کے حکم کے خلاف فتویٰ جاری کیا جس کی رو سے اسلامی آئین کے مطابق پناہ میں آئے ہوئے غیر مسلموں کا مال مسلمانوں کے لیے حرام قرار دیا گیا۔ یہ فتویٰ آٹا ”فانا“ سارے شہر کے لوگوں کے مابین پھیل گیا۔ حتیٰ کہ ترک سپاہیوں تک بھی یہ خبر پہنچ گئی۔

اس فتوے کی جاری ہونے کے بعد اس پر فوری طور پر عمل شروع ہو گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ترک فوجیوں نے اور نہ میں رہنے والے یہودیوں اور عیسائیوں کے مال و متاع کو ہاتھ لگانے تک سے انکار کر دیا۔ اور یوں مسلمان اپنی شدید ضرورتوں کے باوجود اس حکم خداوندی کی پیروی پر مجبور ہو گئے۔ جو مفتی شہر کی وساطت سے ان تک پہنچا تھا۔

۱

غلام قادر ربیلہ

132

نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوک خنجر سے یہ انداز ستم کچھ کم نہ تھا آثار عشر سے شہنشاہی حرم کی نازنینا سن بر سے نماں تھا حسن جن کا چشم مرواہ و اختر سے رواں دریاے خوں شہزادیوں کے دیدہ تر سے کیا گھبرا کے پھر آزاد سر کو بار مغفر سے سبق آموز تابانی ہوں انجم جس کے جوہر سے تقاضا کر رہی تھی نیند گویا چشمِ امر سے نظر شرما گئی ظالم کی درد انگیز منظر سے شکایت چاہیے تم کو نہ کچھ اپنے مقدر سے

ربیلہ کس قدر ظالم، جفا جو، کینہ پرور تھا دیا اہل حرم کو رقص کا فرماں شہنشاہ نے بھلا قہیل اس فرمانِ غیرت کس کی ممکن تھی بتایا آہ! سامانِ طرب بیدرد نے ان کو لرزتے تھے دل نازک، قدم مجبور جنبش تھے یونہی کچھ دیر تک محوِ نظر آنکھیں رہیں اس کی کمر سے اٹھ کے تیغِ جانستل آتشِ فشاں کھولی رکھا خنجر کو آگے، اور پھر کچھ سوچ کر لینا بھجائے خواب کے پانی نے اٹھ اس کی آنکھوں کے پھر اٹھا اور تیموری حرم سے یوں لگا کینے

مرا مند پہ سو جانا بناوٹ تھی، کھلف تھا کہ غفلت دور ہے شان صف آرایان لشکر سے
یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بنی مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

✽

غلام قادر رہیلہ، رھیل کھنڈ کے سردار ضابطہ خاں کا بیٹا اور نجیب الدولہ کا پوتا تھا۔ تاریخی اعتبار سے
نجیب الدولہ ان مسلم سرداروں میں سے ایک تھا جنہوں نے مرہٹوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان
آنے کی دعوت دی۔ پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں مرہٹوں نے جو ہزیمت اٹھائی جس کا
بدلہ انہوں نے نجیب الدولہ کے انتقال کے فوراً بعد لیا۔ بد قسمتی سے روہیل کھنڈ پر حملہ آور ہونے اور
یہاں قتل و غارت کا بازار گرم کرنے کے عمل میں مغلیہ تاجدار شاہ عالم ثانی کی فوجیں بھی مرہٹوں کے
ساتھ شامل تھیں۔ غلام قادر رہیلہ اس وقت چھوٹا سا تھا جب جوان ہوا تو اس نے دہلی پر قبضہ کر کے شاہ
عالم ثانی کی انتقام آنکھیں نکال لیں۔ بعد میں وہ مرہٹوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

① سے ⑧ معنی: رہیلہ: غلام قادر۔ شاہ تیموری: شاہ عالم ثانی۔ سمن بر: چنبیلی جیسے جسم والی۔ بار
مغفر: خود لڑائی میں سر پر پہنے کی فولادی ٹوپی۔ چشم احمر: سرخ آنکھ۔

مطلب: چنانچہ اس تاریخی پس منظر کے حوالے سے زیر تشریح نظم میں اقبال کہتے ہیں کہ غلام قادر
رہیلہ اس قدر ظالم، ستم شعار اور جفا جو تھا کہ مغل تاجدار شاہ عالم ثانی کی آنکھیں انتقاماً خنجر سے نکال
لیں۔ یہی نہیں بلکہ بعد میں اس نے شاہی خاندان کی خواتین کو اپنے روبرو قتل کرنے کا حکم دیا۔ یہ حکم
ظاہر ہے کہ انتہائی ظالمانہ اور منحرف تھا۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ اس نے یہ سب کچھ انتقاماً کیا اور شاہی
خاندان کی ان خواتین کی بے حرمتی کی جن کو سب عزت و احترام سے دیکھتے تھے۔ اور جو کبھی کسی ناخرم
کے سامنے بھی نہ آئی تھیں۔ اس ظالم نے اپنی انا کی تسکین کے لیے ان خواتین کو قتل پر مجبور کیا جن
کا آپہل تک چشم فلک نے بھی نہیں دیکھا تھا۔

اس عمل کے دوران شہزادیوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور شرم و حیا کی شدت سے جسم لرز
رہے تھے۔ غلام قادر رہیلہ کچھ دیر تک تو یہ منظر دیکھتا رہا پھر اس کے بعد اس نے گہرا کر سر سے اپنا خود
اتار لیا۔ اور پھر کمر سے تلوار بھی کھول لی۔ اس کے بعد اس نے خنجر کو کچھ سوچتے ہوئے اپنے سامنے
قائین پر رکھ لیا۔ اور بظاہر اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے کہ اسے غنودگی نے بری طرح سے گھیر لیا ہو۔

⑨ سے (13) معنی: انکھر: شعلہ۔ حمیت: غیرت۔

مطلب: یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قدر ظالم اور سنگدل ہونے کے باوجود غلام قادر رہیلہ داخلی طور پر
انتہائی شرمسار تھا۔ اس کے بعد وہ تھوڑی دیر تک اسی عالم میں آنکھیں بند کیے ہوئے پڑا رہا لیکن کب
تک۔ آخر کار وہ اپنا رنج و کد کرا اس طرح اٹھ بیٹھا جیسے نیند سے بیدار ہو۔

چند لمحے بعد وہ شاہی محل کی خواتین کو مخاطب کر کے کہنے لگا کہ تمہیں اپنے مقدر کی شکایت نہیں کرنی
چاہیے۔ میں جس انداز میں مسند پر بظاہر محو خواب تھا یہ تو ایک بناوٹ تھی اور دکھاوے کی نیند تھی۔ اس

لیے کہ جنگ جو سرداران لشکر کبھی اس طرح سے غفلت کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ میں تو محض یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم تیمور کی بیٹیوں میں کوئی حوصلہ مند ایسی بھی ہو جو مجھے غفلت کے عالم میں موت کے گھاٹ اتار دے مگر یوں لگتا ہے کہ جس چیز کا غیرت و حمیت نام تھا وہ تیمور کے خاندان سے رخصت ہو گئی۔

ایک مکالمہ

133

اک مرغ سرانے یہ کہا مرغ ہوا سے
گر تو ہے ہوا گیر تو ہوں میں بھی ہوا گیر
پرواز خصوصیت ہر صاحب پر ہے
کیوں رہتے ہیں مرغان ہوا مائل پندار
مجموع حمیت جو ہوئی مرغ ہوا کی
یوں کہنے لگا سن کے یہ گفتار دل آزار
کچھ شک نہیں پرواز میں آزاد ہے تو بھی
حد ہے تری پرواز کی لیکن سر دیوار
واقف نہیں تو ہمت مرغان ہوا سے
تو خاک نشین، انہیں گردوں سے سردار
تو مرغ سرانی، خورش از خاک بجوئی
مادر صدو دانہ بانجم زدہ منقار



ہر دانشور کا طرز عمل بالعموم یہی ہوتا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے نتائج اخذ کرے چنانچہ اقبال کی بے شمار نظمیں اسی طرز عمل کی آئینہ دار ہیں۔ وہ معمولی کرداروں اور چھوٹی چھوٹی اشیاء کی فطرت اور کارکردگی کا مطالعہ و مشاہدہ کرتے ہیں پھر ان کا تجزیہ کر کے اظہار کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ زیر تشریح نظم میں بھی کم و بیش ایک نئے دو پرندوں کی فطرت اور کردار کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس کا مطالعہ و مشاہدہ اس ”مکالمہ“ کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

① معنی: مرغ سرانہ: گھمیلو پرندہ۔ مرغ ہوا: فضا میں اڑنے والا پرندہ۔ مائل پندار: مغز۔ مجموع: زخمی۔ حمیت: غیرت۔ خورش: خوراک۔ مادر صدو دانہ بانجم زدہ منقار: ہم ستاروں کو دانہ سمجھ کر چونچ مارتے ہیں۔

مطلب: ایک گھر میں پلنے والے پرندے نے اڑنے والے پرندے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں بھی مرتبے میں تجھ سے کم تر نہیں ہوں۔ اس لیے کہ اگر تو پر رکھتا ہے تو میرے جسم میں بھی پر موجود ہیں۔ اگر تو ہوا میں اڑ سکتا ہے تو کیا میں پرواز کا اہل نہیں ہوں۔ جب کہ پرواز تو ہر پرندے کی فطرت میں شامل ہے پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ جو پرندے فضا میں اڑنے والے ہیں وہ اتنے مغرور کس لیے ہیں۔

گھمیلو پرندے کی ان باتوں سے فضا میں اڑنے والے پرندے کے دل کو نہیں پہنچی تو وہ یوں گویا ہوا بے شک تو بھی پرواز کے عمل میں آزاد ہے لیکن تیری رسائی زیادہ سے دیوار تک ہے۔ دراصل تو فضا میں اڑنے والے پرندوں کی ہمت و حوصلے سے آگاہ نہیں۔ تو نے تو زمین پر بسرا کر رکھا ہے جب کہ میں آسمان تک کی خبر لاتا ہوں۔ تو اپنی خوراک مٹی سے حاصل کرتا ہے جب میں تو ستارہ تک کو دانہ سمجھ کر اپنی ذراک کے لیے نشانہ بنا سکتا ہوں۔

میں اور تو

134

مذاق دید ہے تا آشنا نظر ہے مری تری نگاہ ہے فطرت کی رازداں پھر کیا؟
 رہیں شکوہ ایام ہے زباں مری تری مراد پہ ہے دور آساں پھر کیا؟
 رکھا مجھے جن آوارہ جہل موج نسیم عطا فلک نے کیا تعجکو آشاں پھر کیا؟
 فزوں ہے سود سے سرمایہ حیات ترا مرے نصیب میں ہے کاوش زباں پھر کیا؟
 ہوا میں تیرے پھرتے ہیں تیرے طیارے مرا جہاز ہے محروم بادباں پھر کیا؟
 قوی شدیم؟ چه شد؟ ناواں شدیم؟ چه شد؟ چنیں شدیم؟ چه شد؟ یا چناں شدیم؟ چه شد؟
 ہج گونہ دریں گلستاں قرارے نیست تو گر بہار شدی ماخزاں شدیم؟ چه شد؟
 یہ نظم عملاً ایک عجیب و غریب کیفیت کی حامل ہے۔ معنوی سطح پر اس کے کرداروں میں اگرچہ ”میں“ مشترک ہے کہ اس کا تعلق ایک عام فرد سے ہے لیکن ”تو“ کو کم از کم دہرے کردار کے منظر نامے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ پہلا ”تو“ ایک آسودہ حال سرمایہ دار ہو سکتا ہے جو استحصال پسندی کا قائل ہے۔ دوسرا کردار مغربی استعمار پرستوں پر مشتمل ہے۔ اقبال نے دوسرے کردار کو واضح طور پر پیٹ نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے شعوری طور پر ایسا کیا ہو۔ بہر حال وہ فرماتے ہیں۔

① سے ⑦ معنی: مذاق دید: دیکھنے کی لذت۔ رہیں شکوہ ایام: زمانے کی شکایت۔ فزوں: زیادہ۔ کاوش زباں: نقصان کی تکلیف۔ قوی شدیم؟ چه شد؟ ہم طاقتور ہوئے تو کیا؟ گلستاں: مراد ہے دنیا۔ قرارے نیست: قیام ممکن نہیں۔

مطلب: میری آنکھیں تو کسی شے کو اس کے حقیقی منظر نامے میں دیکھنے کا ذوق بھی نہیں رکھتیں جب کہ تیری نگاہ تو فطرت کی رازداں غمگینی ہے مگر اس سے کچھ بھی تو فرق نہیں پڑتا۔ ادھر میری زبان تو ہر لمحے زمانے کے شکوے کرتی رہتی ہے جب کہ آسمان تیری مرضی کے مطابق گردش کرتا رہتا ہے لیکن اس سے بھی کیا ہوا مجھے تو موج نسیم کی طرح آوارہ و سرگرداں رکھا گیا ہے اور تجھ کو بود و ہاش کے لیے قدرت نے کمر عطا کیا ہوا ہے تو اس سے کیا؟ اگر تیری تقدیر میں فائدے ہی فائدے ہیں اور میرے نصیب میں نقصان ہی نقصان تو بھی اس سے کوئی فرق پڑنے کا امکان نہیں۔

اگر تیرے جہاز فضا میں پرواز کرتے رہتے ہیں اور میری کشتی کو بادباں بھی میسر نہیں تو کیا ہوا؟ اگر تو طاقتور ہے تو کیا اور میں کمزور ہوں تو پھر کیا ہوا؟ اس طرح ہو گیا تو کیا؟ اور اس طرح ہو گیا تو کیا ہوا؟ اس کائنات میں کسی طور پر بھی آرام و سکون میسر نہیں ہے۔ اگر تو بہار ہے اور میں خزاں ہوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ بالا خرا خراج تمام دونوں کا یکساں ہے۔

تضمین بر شعر ابو طالب کلیم

135

خوب ہے تجھ کو شعار صاحب یثرب کا پاس کہ رہی ہے زندگی تیری کہ تو مسلم نہیں
 جس سے تیرے حلقہ خاتم میں گردوں تھا اسیر اے سلیمان! تیری غفلت۔ زنگویا وہ نگیں

وہ نشان سجدہ جو روشن تھا کوکب کی طرح ہو گئی ہے اس سے اب نا آشنا تیری جبین
 دیکھ تو اپنا عمل تجھ کو نظر آتی ہے کیا وہ صداقت جس کی بیباکی تھی حیرت آفریں
 تیرے آبا کی نگہ بجلی تھی جس کے واسطے ہے وہی باطل ترے کاشانہ دل میں کیس
 غافل! اپنے آشیان کو آ کے پھر آباد کر نغمہ زن ہے طور معنی پر کلیم نکتہ بین
 ”سرکشی باہر کہ کردی رام او باید شدن
 شعلہ ساں از ہر کجا برخاستی آنباشیں“

*

ابو طالب کلیم وہ ہمہ جہت فارسی شاعر ہے جسے ایک بار خوش ہو کر شاہجہاں نے چاندی میں تلویا تھا۔
 پیدا ہمدان میں ہوا۔ جنگگیر کے دور میں ہندوستان آیا اور یہیں آباد ہو گیا۔ بعد میں کشمیر میں مستقل
 بودوباش اختیار کر لی اور وہیں پر وفات پائی۔ اقبال نے اس کے شعر پر تفسیر کی۔ ملاحظہ ہو:
 ① سے ⑦ معنی: صاحب یشرب: مراد ہے رسول کریم ﷺ۔ حلقہ خاتم: انگوٹھی۔ نکلیں:
 گمیز۔ حیرت آفریں: حیرت کا باعث۔

مطلب: اے مسلمان تجھ کو آنحضرت ﷺ کے اصولوں اور سنت کا اچھا پاس ہے؟ تیرا عمل ہی
 پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ تو تو فی الواقعہ مسلمان ہی نہیں ہے۔ تیری غفلت کے سبب وہ گمیز تلف ہو گیا
 جس کے باعث تقدیر خود تیری گرفت میں تھی۔ تیری پیشانی پر سجدوں کے وہ نشان جو ہمیشہ ستاروں کی مانند
 روشن رہتے تھے اب تو ان سجدوں سے ہی تیری پیشانی محروم ہو چکی ہے۔
 اے آسمان! ذرا تو اب اپنے اعمال کا جائزہ لے کہ کیا تجھے اب اپنی زندگی میں وہ صداقت نظر آتی ہے
 جس کی بے خوفی ایک زمانے میں دنیا بھر کو حیران کر دیتی تھی۔ تیرے اسلاف کی نظر جو کبھی باطل اور
 جھوٹ کے لیے برق کی حیثیت رکھتی اب وہی باطل اور جھوٹ خود تیرے دل میں اپنے پنجے پو ست کیے
 بیٹھا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اب تو عملاً ایسی زندگی گزار رہا ہے جو کافروں کے لیے مخصوص ہے۔ اے غفلت
 شعرا! تیرے لیے یہی مناسب ہے کہ اپنے قدیم طور طریقوں پر عمل کر۔ غور کر کہ حقیقت کو پرکھنے والا ابو
 طالب کلیم کیا کہہ رہا ہے؟ وہ کتنا ہے تو نے جس سے بناوت کی اب پھر اس کی اطاعت قبول کر لے۔ تو
 جس مقام سے شعلہ کی طرح بلند ہوا تھا پھر اسی پر مرتکز ہو جا۔

شبلی وحالی

136

مسلم سے ایک روز یہ اقبال نے کہا
 تیرے سرود رفت کے نغمے علوم نو
 پھر ہے اس کے واسطے موج نسیم بھی
 مردان کار دھونڈ کے اسباب حادثات
 پوچھ ان سے جو جن کے ہیں دیرینہ رازدار
 مسلم مرے کلام سے بے تاب ہو گیا
 دیوان جزو و کل میں ہے تیرا وجود فرد
 تہذیب تیرے قافلہ ہائے کمن کی گرد
 نازک بہت ہے آئندہ آبروئے مرو
 کرتے ہیں چارۂ ستم چرخ لا جورد
 کیونکر ہوئی خزاں ترے گلشن سے ہم نبرد
 غماز ہو گئی غم پنہاں کی آہ سرد

کنے لگا کہ دیکھ تو کیفیت خزاں اور اق ہو گئے شجر زندگی کے زرد
 خاموش ہو گئے چمنستان کے رازدار سرمایہ گداز تھی جن کی نوائے درد
 شبلی کو رد رہے تھے ابھی اہل گلستاں حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نور
 ”انکوں کرا دماغ کہ پرسدز باغباں
 بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟“



1914ء اس لیے تاریخ میں بے حد اہمیت کا سال گردانا جاتا ہے کہ اسی سال جنگ عظیم ہوئی اور
 اس حوالے سے مسلمانوں کے لیے یہ سال خصوصیت سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ برصغیر کے دو عظیم
 مسلم دانشور اور رہنما مولانا شبلی نعمانی اور مولانا الطاف حسین حالی علی الترتیب نومبر 14ء اور دسمبر 14ء
 میں اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ اقبال کو ان زعماء کی وفات سے جو گہرا رنج پہنچا اس کا اظہار انہوں نے
 اس نظم میں اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

① معنی: فرد: بیگانہ۔ موج: نسیم: ہوا کی لہر۔ چرخ لاہور: نیلے رنگ کا آسمان۔ ہم نیرو: لڑنے والا۔
 سوئے فردوس رہ نور: بہشت کی طرف راہ لی۔

مطلب: ایک روز اقبال نے مسلمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش
 نہیں کہ اس کائنات میں تیرا وجود یقیناً بڑی انفرادیت کا حامل ہے۔ جو آج نئے مروجہ علوم ہیں وہ تیرے
 شاندار ماضی کے پیدا کردہ ہیں اور جو آج کی تہذیب ہے یہ بھی تیرے ماضی کی تہذیب کا چرہ ہے۔ یہ
 تہذیب ایک ایسے نازک اور لطیف آئینے کی مانند ہے کہ موج نسیم بھی اس کے لیے ایک پتھر کی حیثیت
 رکھتی ہے۔ یعنی انسان اپنی عزت و آبرو کے حوالے سے ایک نازک آئینے کی مانند ہے جو ذرا سی ٹھیس
 لگنے سے ہی ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔

اے مسلم یاد رکھ! کہ جب لوگوں میں قوت عمل ہوتی ہے وہ نیلے آسمان کے ظلم و ستم کا تذکرہ کر
 لیتے ہیں اور حادثوں کے اسباب بھی معلوم کر لیتے ہیں۔ جو لوگ امت مسلمہ کے عروج و زوال کی تاریخ
 سے آگاہی رکھتے ہیں تو ان سے جملہ مسائل کے بارے میں استفسار کر سکتا ہے جس سے تجھے اس امر کا
 بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ تیرے گلستاں میں خزاں کیونکر وارد ہوئی یعنی امت مسلمہ زوال پذیر کس طرح
 سے ہوئی۔

سو میری بات سن کروہ مسلمان مضطرب ہو گیا اور ایک سرد آہ نے اس کے سینے میں پوشیدہ غم کو ظاہر
 کر دیا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ اے اقبال تو نے جو امت کے زوال کا ذکر کیا ہے تو وہ کیفیت بھی دیکھ لے
 جس سے مسلمان دوچار ہیں۔ زندگی کو اگر ایک درخت سے تعبیر کر لیا جائے تو یہ بھی دیکھ لے کہ اس
 درخت کے پتے مرجھا کر سوکھ چکے ہیں۔

اے اقبال! وہ لوگ جو ملت اسلامیہ کے بی خواہ اور رازدار تھے اور جن کی پرسوز اور درد بھری
 آواز ہمارے دلوں کو متاثر کرتی تھی اور پگھلا کر رکھ دیتی تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے خاموشی اختیار کر گئے۔ شبلی
 کی وفات نے ہمارے دلوں کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔ ابھی ہم اس الیے پر آنسو بہا رہے تھے کہ مولانا حالی
 بھی اس دنیا سے کوچ کر کے جنت کو سدھار گئے۔

اب یہ جرات و حوصلہ کس میں ہے کہ باغباں سے استفسار کرے کہ بلبل نے کیا کہا، گل نے کیا سنا اور صبا نے کیا عمل کیا؟

ارتقا

137

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مصطفویٰ سے شرار بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز سرشت اس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی
سکوت شام سے تا نغمہ سحرگاہی ہزار مرحلہ ہائے فغان نیم شبی
کشاکش زم و گرما، تپ و تراش و خراش زخاک تیرہ دروں تا بہ شیشہ حلبی
مقام بست و فکلت و فشار و سوز و کشید میان قطرہ نیسان و آتش عنبی
اسی کشاکش عیم سے زندہ ہیں اقوام یکی ہے راز تب و تاب ملت، علی
”مغال کہ دانہ انگور آب ی سازند ستارہ ی شکند آفتاب ی سازند“

*

① سے ⑦ معنی: ستیزہ کار: لڑائی کرنے والا۔ شرار بولہبی: ابولب کا شر۔ حضرت محمد ﷺ کے چچا کی کنیت۔ غیور: غیرت مند۔ زخاک تیرہ دروں: ایسی مٹی جس میں جانیں۔ قطرہ نیسان: موسم بہار کی بارش کا قطرہ۔ آتش عنبی: انگور کی شراب۔

مطلب: زیر تشریح نظم میں اقبال نے اسلام کے حوالے سے مسئلہ ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب سے کائنات وجود میں آئی ہے کفر یا مل اور حق و صداقت کے مابین آویزش جاری ہے اور کفر اسلام کے خلاف ہمیشہ سے معرکہ آرا رہا ہے۔ دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ زندگی اپنے مزاج کے اعتبار سے ہمیشہ شعلہ مزاج، غیور اور ہنگامہ خیز رہی ہے۔ اس کی سرشت میں مشکلات اور دشواریاں جھیلتا رہا ہے یعنی آرام و سکون زندگی کی فطرت سے ربط نہیں رکھتے۔ شام کے سکوت سے لے کر طلوع سحر تک رات بظاہر خاموشی سے گزرتی ہے لیکن اس کی خاموشی میں ہزار ہا نالے اور آہیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حلب میں تاریک مٹی سے بڑھائیں اور خوبصورت آئینہ تیار ہوتا ہے لیکن مٹی کو آئینے تک پہنچنے کے لیے ہزار ہا مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

موسم بہار میں برسنے والی بارش کے ایک قطرے اور شراب انگور کے مابین بظاہر کوئی فرق نہیں لیکن بارش کا یہ قطرہ انگور کی کاشت اس کے بعد کشیدگی کے عمل اور شراب کی تیاری تک نہ جانے کتنا سفر طے کرتا ہے۔ زندگی میں اسی مسلسل جدوجہد اور کشاکش عیم کے سبب ہی قومیں زندہ رہتی ہیں اور ملت اسلامیہ کو جو عروج حاصل ہوا اس کا راز بھی یہی ہے۔

شراب بنانے والے بظاہر انگور کو پانی بناتے ہیں جب کہ عملاً وہ ستارے توڑ کر ان سے سورج بناتے

صدیق رضی اللہ عنہ

138

اک دن رسول پاکؐ نے اصحابؓ سے کہا
 ارشاد سن کے، فرطِ طرب سے عمر اٹھے
 دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیقؓ سے ضرور
 لائے غرض کہ مال رسول امیںؐ کے پاس
 پوچھا حضور سرورِ عالم نے اے عمرؓ
 رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا
 کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق
 باقی جو ہے وہ ملت بیضا پہ ہے نثار
 اتنے میں وہ رفیقِ نبوتؐ بھی آگیا
 لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت
 ملکِ یمین و درہم و دینار و رخت و جنس
 بولے حضورؐ چاہیے فکرِ عیال بھی
 اے تجھ سے دیدارِ منہ و انجمِ فردغِ گیر
 پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
 صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

*

پہلا بند معنی: اصحابؓ، صحابہؓ۔ راہوار: گھوڑا۔ دستِ نگر: ہتاج۔

مطلب: یہ نظم عملاً دو بند پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں اقبال اس طرح سے آغاز کرتے ہیں کہ ایک روز آنحضرتؐ نے اپنے اصحاب اور رفقا سے فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ دولت مند ہوں وہ اپنا مال راہِ حق میں عطیہ کے طور پر دیں۔ آنحضرتؐ کی زبان سے یہ الفاظ برآمد ہوئے تو حضرت عمرؓ مسرت و انبساط کے عالم میں جھوم اٹھے۔ اس روز ان کے پاس کئی ہزار درہم موجود تھے۔ انہوں نے دل میں سوچا کہ آج میں یقیناً حضرت ابو بکرؓ سے بازی لے جاؤں گا۔ چنانچہ وہ اپنی رقم لے کر آنحضرتؐ کے پاس آئے اور حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دی۔

آنحضرتؐ نے استفسار کیا کہ اے عمرؓ! واقعی تیرا دل جوشِ حق سے مضطرب ہے۔ لیکن یہ تو بتا کہ اس مال میں سے اپنے اہل و عیال کے لیے بھی کچھ رکھا ہے یا نہیں؟ کہ مسلمان پر یہ بھی فرضِ عائد ہوتا ہے کہ اپنے اہل و عیال اور دیگر اعزہ کا خیال رکھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں نے اپنی رقم میں سے نصف اپنے اہل خانہ کے لیے مخصوص کر دی ہے اور باقی ملتِ مسلمہ پر نثار کر رہا ہوں۔

دوسرا بند معنی: ملکِ یمین: مراد ہے لوندی غلام۔ اسبِ قمرِ سم: چاند جیسے سم والے گھوڑے۔ قاطر: خچر۔ حمار: بگدھا۔ فروغِ گیر: روشنی حاصل کرنے والے۔ تنگوین: بنانا، پیدا کرنا۔

مطلب: ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ حضرت ابو بکرؓ بھی آگئے اور ساتھ وہ سارا مال و متاع لے آئے جو

ان کے پاس موجود تھا۔ اس میں نہ صرف درہم ہی تھے بلکہ دوسرا ساز و سامان حتیٰ کہ سواری کا گھوڑا، اونٹ اور لکوار تک شامل تھی۔ حضورؐ نے ان سے بھی ارشاد فرمایا کہ ہر شخص کو اپنے اہل و عیال کی فکر بھی کرنی چاہیے۔ اس مرحلے پر حضرت ابو بکرؓ نے عرض کی کہ حضورؐ کی ذات والا صفات سے ستارے اور چاند درخشندہ و تابندہ ہیں اور حضورؐ کی ذات ہی کائنات کی تزئین و آرائش کا باعث ہے۔ چنانچہ جس طرح پردانے کو چراغ اور بلبل کے لیے پھول کا وجود کافی ہوتا ہے اسی طرح میرے لیے خدا کا رسولؐ ہی کافی ہے یعنی میں آپؐ کی ذات مگرانی قدر سے زیادہ اپنے عزیز و اقربا اور اہل و عیال کو بھی اہمیت دینے کو تیار نہیں ہوں۔

تمذیب حاضر

139

تضمین بر شعر فیضی

حرارت ہے بلا کی بادۂ تمذیب حاضر میں
کیا ذرہ کو جٹنو دے کے تاب مستعار اس نے
نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
تغیر آ گیا ایسا تدبیر میں، تخیل میں
کیا گرم تازہ پردانوں نے اپنا آسیاں لیکن
حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
فروغ شمع نو سے بزم مسلم جگمگا اٹھی
”تو اے پروانہ! اس گرمی ز شمع معطلے داری
چومن در آتش خود سوز اگر سوز دلے داری“



① سے ③ معنی: بادۂ تمذیب حاضر: موجودہ تمذیب کی شراب۔ بھوکا بن کے: شعلہ بن کر۔ تاب مستعار: عارضی چمک۔ بے بالکی: مراد بے گستاخی۔

مطلب: عالمی سطح پر جو تمذیب رائج ہے وہ مغرب کی وضع کردہ ہے۔ اس تمذیب میں اتنی حرارت اور حدت ہے جس نے ملت اسلامیہ کو بھی بھسم کر کے رکھ دیا ہے۔ مراد یہ ہے مسلمانوں کی اپنی زندہ تمذیب اور معتمد روایت کے باوجود یورپی تمذیب اس قدر بھرپور انداز میں عام ہو چکی ہے کہ مسلم تمذیب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ قدرت کی یہ ستم ظریفی دیکھیے کہ یورپی تمذیب کو ایسی روشنی عطا کی ہے جس کے ذریعے یوں کہا جاسکتا ہے کہ ایک ذرے کو جٹنو کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم نوجوانوں نے وہی رعنائی، بیداری، آزادی اور بے خوفی کے انداز اپنا لیے جو مغرب کی تمذیب سے عبارت ہیں۔

④ سے ⑤ معنی: ساحر: جاوڑ کر۔

مطلب: اقبال آئندہ چل کر اس نظم میں کہتے ہیں کہ انسانی تدابیر اور تخیل میں اس نوع کی تبدیلی واقع ہو گئی ہے کہ خلوص کے ساتھ انجام دیئے ہوئے کارناموں کو بھی اب مذاق سے تعبیر کیا جانے لگا ہے اور ہر نوع کی قربانی کو محض دکھاوے کا نام دیا جا رہا ہے۔ لیکن تہذیب حاضر کے نوجوانوں پر اثرات کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ ماضی کی محکم روایت اور اسلام کے وضع کردہ بلند ترین اصول فراموش کر چکے ہیں اور اس راہ سے بھٹک کر اب تباہی کے غار میں گر رہے ہیں۔

⑥ سے ⑧ معنی: کہنہ اور اکی: پختہ سمجھ۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ جب سے مغربی تہذیب مشرق پر اثر انداز ہوئی تو اس کے منفی اثرات رقابت، خود فروشی، بے صبری اور حرص و ہوس کی صورت میں رد نما ہوئے ہیں۔ یعنی مسلم نوجوان نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے حسد کرنے لگے ہیں بلکہ انہوں نے چھوٹے چھوٹے مفادات کے لیے اپنے آپ کو غیروں کے ہاتھوں بیچ دیا ہے۔ وہ اس قدر بے صبرے اور ناشکرے بن چکے ہیں کہ لالچ اور حرص دہوانے ان کی تمام تراجمی صلاحیتیں چھین لی ہیں۔ بظاہر اس نئی تہذیب سے مسلمان استفادہ کر کے دوسری قوموں کی برادری میں شامل ہو رہے ہیں لیکن میری ماضی پرست فطرت اس امر کی نشاندہی کر رہی ہے کہ دوسروں سے مستعار لی ہوئی روشنی سے کسی حد تک استفادہ تو ممکن ہے تاہم انفرادیت خود اپنے اصولوں کی حدت میں ہے۔

والدہ مرحومہ کی یاد میں

140

ذره ذرہ دہر کا زندانی تقدیر ہے
آسمان مجبور ہے، شمس و قمر مجبور ہیں
ہے شکست انجام غنچے کا سیو گلزار میں
نغمہ بلبل ہو یا آواز خاموش خمیر
ہے اسی زنجیر عالمگیر میں ہر شے اسیر

آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سر مجبوری عیاں
قلب انسانی میں رقص عیش و غم رہتا نہیں
علم و حکمت رہزن سالن اشک و آہ ہے
گرچہ میرے باغ میں خنجر کی شادابی نہیں
جانتا ہوں آہ! میں آلام انسانی کا راز
میرے لب پر قصہ نیرنگی دوراں نہیں

گر یہ ہرشار سے بنیاد جاں پایندہ ہے
آہ یہ تردید میری تری تصویر قاصد گریہ
حکمت محکم کی ہے
درد کے عرفاں سے عقل سجدل شرمندہ ہے

موج دور آہ سے آئینہ ہے روشن مرا
حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا
رفتہ و حاضر کو گویا پاپیاس نے کیا
جب ترے دامن میں چلتی تھی وہ جان ناثواں

اور اب چرچے ہیں جس کی شوخی گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشم گوہر بار کے

علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کا شعور
زندگی کی ادج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم
بے تکلف خندہ زن ہیں، فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

کس کو اب ہو گا وطن میں آہ، میرا انتظار؟
خاک مرتد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
تریت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
دفتر ہستی میں بھی زریں درق تیری حیات
عمر بحر تیری محبت میری خدمت گر رہی
وہ جواں، قامت میں ہے جو صورت سرو بلند
کاروبار زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا
تجھ کو مثل طفلک بے دست و پا روتا ہے وہ

چشم جس کا تو ہماری کشت جاں میں بو گئی
شرکت غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

آہ! یہ دنیا، یہ ماتم خانہ برتا و پیر
کتنی مشکل زندگی ہے، کس قدر آساں ہے موت
زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں
کلینہ افلاس میں دولت کے کاشانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلم خاموش میں
نے مجال شکوہ ہے، نے طاقت گفتار ہے

قافلے میں غیر فریاد
اک متاع دیدہ تر کے سوا کچھ بھی نہیں

ختم ہو جائے گا لیکن امتحان کا دور بھی
سینہ چاک اس گلستاں میں لالہ و گل ہیں تو کیا؟
جھاڑیاں، جن کے قفس میں قید ہے آہ خزاں

ہیں پس نہ پردہ گردوں ابھی دور اور بھی
نالہ و فریاد پر مجبور بلبل ہیں تو کیا؟
سبز کر دے گی انہیں باو بہار جادواں

خفتہ خاک پے پر میں ہے شرار اپنا تو کیا؟
 زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
 ٹوٹنا جس کا مقدر ہو، یہ وہ گوہر نہیں

زندگی محبوب الہی دیدہ قدرت میں ہے
 موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقش حیات
 ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
 آہ! غافل! موت کا راز نماں کچھ اور ہے
 جنت نظارہ ہے نقش ہوا بالائے آب
 موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ
 پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
 اس روش کا کیا اثر ہے ہیئت تعمیر پر؟
 فطرت ہستی شہید
 آرزو رہتی نہ ہو

خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو
 آہ! سیلاب پریشاں، انجم گردوں فردز
 عقل جس سے سربراز ہے وہ مدت ان کی ہے
 پھر یہ انساں آں سوئے افلاک ہے جس کی نظر
 جو مثال شمع روشن محفل قدرت میں ہے
 جس کی نادانی صداقت کے لیے بیتاب ہے
 شعلہ یہ کتر ہے گردوں کے شراردں سے بھی کیا؟

کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا؟
 ختم گل کی آنکھ زیر خاک بھی بے خواب ہے
 زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
 سردی مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
 پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
 ہے لحد اس قوت آشفقت کی شیرازہ بند
 موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے
 خوگر پرداز کو پرواز
 موت اس گلشن میں جز سنجیدن پر کچھ نہیں
 کس قدر نشوونما کے واسطے بے تاب ہے
 خود نمائی، خود فزائی کے لیے مجبور ہے
 خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں
 موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ
 ڈالتی ہے گردن گردوں میں جو اپنی کند
 خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
 میں ڈر کچھ نہیں

زخمِ فرقت دقت کے مرہم سے پاتا ہے شفا
 حلقہ زنجیرِ صبح و شام سے آزاد ہے
 دقت زخمِ تیغِ فرقت کا کوئی مرہم نہیں
 کہتے ہیں اہل جہاں درد اجل ہے لادوا
 دل مگر غم مرنے والوں کا جہاں آباد ہے
 وقت کے افسوں سے تھمتا تالہ ماتم نہیں

سر پہ آ جاتی ہے جب کوئی معیبت ناگیاں
ربط ہو جاتا ہے دل کو نالہ و فریاد سے
آوی تاب کلیباتی سے گو محروم ہے
جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
رخت ہستی خاک، غم کی شعلہ افشانی سے ہے

آہ! یہ ضبط نغایں غفلت کی خاموشی نہیں
آگہی ہے یہ دلا سائی فراموشی نہیں

پردہ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
لالہ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ
سینہ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے
خفتگان لالہ زار و کوہسار و رود بار
یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقد انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح؟

وام سیمین تخیل ہے مرا آفاق کیر
یاد سے تیری دل درد آشنا معور ہے
وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات
مختلف ہر منزل ہستی کی رسم و راہ ہے
ہے وہاں بے حاصلی کشت اجل کے واسطے
نور فطرت ظلمت پیکر کا زندانی نہیں
زندگانی تھی تری متاب سے تابندہ تر
مٹل ایوان سحر مرقد فردزاں ہو ترا
آسمان تیری لحد شبنم افشانی کرے
برزخ نورستہ اس گھر کی تمبانی کرے

✽

عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ یہ نظم علامہ اقبال نے اپنی والدہ امام بی بی کی وفات پر لکھی۔ ظاہر ہے کہ اس نظم کی حیثیت اگرچہ ایک مرثیہ کی سی ہے تاہم اس میں جابجا انہوں نے اپنے نظریات اور فلسفے کے حوالے سے اہم اشارے کیے ہیں۔ ہر چند کہ امام بی بی پڑھی لکھی نہیں تھیں اس کے باوجود علامہ اقبال کی تربیت میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ زیر تشریح نظم تیرہ بند اور چھیالیس اشعار پر مشتمل ہے اور یہ علامہ کی طویل نظموں میں سے ایک ہے۔

پہلا بند معنی: دہر: دنیا۔ زندانی تقدیر: تقدیر کا قیدی۔ انجم سیماب پا: پارے کے قدم رکھنے والے ستارے۔ شکست انجام: جس کا انجام شکست ہو۔ آواز خاموش ضمیر کی خاموش آواز۔
مطلب: نظم کا آغاز کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ اس کائنات کا ہر ایک ذرہ عملاً تقدیر کے زنداں میں

قید ہے۔ یعنی ہر لمحے دنیا بھر میں وہی کچھ ہوتا ہے جو تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے۔ اور جس چیز کو ہم تدبیر کا نام دیتے ہیں وہ فی الواقع اپنی مجبوری اور بے بسی پر پردہ ڈالنے کی ایک صورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آسمان بھی مجبور ہے اور سورج کے علاوہ چاند بھی مجبور ہے۔ ان کے علاوہ ستارے جو انسانی تیز رفتار سمجھے جاتے ہیں وہ بھی اپنی رفتار کی حد تک مجبور واقع ہوئے ہیں۔ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ ہر لمحے سفر میں ہی رہیں۔ باغ میں موجود پتھروں کا انجام چٹک کر پھول کی وضع اختیار کر لینے میں ہی ہے۔ اسی طرح سبزہ ہوا پھول یہ سب اس امر پر مجبور ہیں کہ نمونائیں اور پھلیں پھولیں۔ خواہ بلبل کا نغمہ ہوا یا ضمیر کی خاموش آواز۔ یہ سب چیزیں کائنات پر محیط اسی تقدیر کی زنجیر میں قید ہیں۔

دوسرا بند معنی: سر مجبوری: مجبوری کا راز۔ زیر و بم: آثار چھاؤ۔ الماس کا ٹکڑا: ہیرے کا ٹکڑا۔ اشک عنبی: خونی آنسو۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ جب ہماری آنکھ پر ان مجبوریوں کا راز منکشف ہوتا ہے تو دل سے برآمد ہونے والا آنسوؤں کا سیلاب خود بخود ہی خشک ہو جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ایسی صورت میں ان مجبوریوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ بریں وجہ قلب انسانی میں مسرت اور غم کا احساس باقی نہیں رہتا۔ یوں زندگی کا نغمہ تو برقرار رہتا ہے لیکن اس کے سروں کے آثار چھاؤ کا لطف باقی نہیں رہتا۔ مراد یہ ہے کہ انسان پر بے حسی اور بے کیفی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور وہ مختلف جذلوں سے متاثر ہونا چھوڑ دیتا ہے۔

مختلف اشیاء کے بارے میں معرفت اور دانائی فی الواقع آنسوؤں اور آہوں کے اٹاٹے کے لیے لوٹ مار مچانے والے ڈاکو ثابت ہوتے ہیں اور ہر نوع کے اسرار و رموز سے آگاہی رکھنے والا دل بالا خیر الماس کا ایک ٹکڑا بن کر رہ جاتا ہے۔ ہر چند کہ میرا باغ اس قدر ویران ہو چکا ہے کہ اس میں شبنم کی تازگی تک باقی نہیں رہی۔ یہی نہیں بلکہ میری آنکھوں میں وہ آنسو بھی موجود نہیں جو کبھی خون برسایا کرتے تھے۔ اور جن آنسوؤں کی رنگت عنبی یعنی سرخ ہوا کرتی تھی۔

دراصل میں انسان کے غم و اندوہ کے راز سے پوری طرح سے آگاہ ہوں اسی لیے میں شکوہ شکایت کی جانب مائل نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ میں گردش زمانہ کا لگہ بھی نہیں کرتا۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ اقبال کے بقول میرے لبوں پر تغیرات زمانہ اور تبدیلیوں کی کہانی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا دل حسب واقعات حیراں بھی نہیں ہے تاہم نہ خوشی کے موقع پر ہنستا ہوں نہ غم کے موقع پر آنسو بہاتا ہوں۔

لیکن اے ماں! جب بھی تیری تصویر کی جانب نظر ڈالتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ مجھے مسلسل رونے اور اشک بہانے پر مجبور کرتی ہے۔ افسوس کہ یہ عمل میری حکمت و دانائی کو بھی روک رہا ہے اور اسے غیر مستحکم بھی بناتا ہے۔

تیسرا بند معنی: موج دود آہ: آہ کے دھوئیں کی موج۔ گنج آب آور: پانی کا لایا ہوا خزانہ، آنسوؤں کی حالت۔ عمد طفلی: بچپن کا زمانہ۔ بے ہما: جیتی۔

مطلب: یہاں اقبال یوں گویا ہوتے ہیں کہ اے ماں! میں اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوں کہ مسلسل رونے سے زندگی کی بنیاد زیادہ مضبوط و مستحکم ہوتی ہے۔ درد کے عرفان سے بے شک عقل کتنی بھی سنگدل ہو شرمسار ہو کر رہ جاتی ہے۔ مراد یہ کہ تکلیف و درد میں جو عرفان پوشیدہ ہے عقل کی اس تک

رسائی ممکن نہیں ہے۔ اے ماں! تیرے غم میں جو آہیں بھرتا ہوں ان کے سبب میرا آئینہ دل مزید صاف و شفاف ہو جاتا ہے۔ اور تیرے غم میں بننے والے آنسوؤں سے میرا دامن تر ہو جاتا ہے۔

اے ماں! یہ آغاز تیری تصویر کا ہی ہے جس نے وقت کی پرواز کا رخ بدل ڈالا ہے۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اس تصویر نے میرے حال و ماضی کو یکجا کر دیا ہے بلکہ یہ کتنا بے جا نہ ہو گا کہ اس نے ایک بار پھر مجھے اپنے بچپن سے آشنا کر دیا ہے۔ بے شک مجھے وہ وقت یاد آ رہا ہے۔ جب میرا کمزور جسم تیرے سایہ عاطفت میں پرورش پا رہا تھا اور میں نے ابھی اچھی طرح بولنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ جب کہ آج ہر جگہ میری شونی گفتار یعنی شاعری کے چرچے ہو رہے ہیں اور میری آنکھوں سے بننے والے آنسو موتی تصور کیے جاتے ہیں۔

چوتھا بند معنی: اوج گاہوں: بلندیوں۔ خندہ زن: ہنسا۔

مطلب: علم کے حصول اور اس کے بعد سنجیدگی سے متفکروں کے کام میں اپنی ضعیفی اور عمر کے باعث حاصل ہونے والی دانائی اور حکمت زندگی میں ملنے والے مراتب اور منصب اس کے ساتھ جوانی کی عمر کا غرور اور ولولہ۔ بے شک عرف عام میں انہیں انسانی بلندی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے لیکن جب وہ ماں کے سامنے ہوتا ہے تو پھر ان تمام بلندیوں سے نیچے اتر آتا ہے اور محض ایک معصوم بچہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ماں کے رو بہ تو بڑے سے بڑے شخص کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

ماں کی محبت میں تو بڑے بڑے لوگوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ سب تکلفات بالائے طاق رکھ کر بلند آہنگ قہقہے لگاتے ہیں اور ہر نوع کے نظرات سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ ماں کے سامنے وہ خود کو ماضی کی کھوئی ہوئی دنیا میں محسوس کرتے ہیں جو ایک طرح سے جنت گمشتہ کی مانند تھی۔

پانچواں بند معنی: دعائے نیم شب: آدمی رات کی دعا۔ سرو بلند: سرد کا درخشاں رخسار۔ بہرہ مند: خوش نصیب۔ طفلک بے دست و پا: بے بس بچہ کی مانند۔ صبح و مسابح و شام: کشت جاں: روح کی بھتی۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ والدہ کے انتقال کے بعد اب وطن میں میرا اور میرے خط کا انتظار کون کرے گا۔ واضح رہے کہ ان دنوں اقبال یورپ میں مقیم تھے وہ کہتے ہیں کہ جب میری وطن واپسی ہوگی تو اے ماں! تیری قبر پر یہ فریاد لے کر آؤں گا کہ نصف شب کے وقت میری بہودی کے لیے تو جو دعائیں کرتی تھی اب کون کرے گا؟

اے ماں! یہ تیری تربیت اور پرورش کا نتیجہ ہی تھا کہ آج مجھے یہ عزت و وقار حاصل ہوا ہے اور ساری دنیا کی نظروں میں ہمارے خاندان کے احترام میں اضافہ ہوا ہے۔ اس صحیفہ کائنات میں تیری زندگی ایک سنہرے باب کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور عملاً تیری زندگی دین و دنیا کے حوالے سے ایک سبق کی مانند تھی۔ ساری عمر تو میری محبت و شفقت سے سرشار میری تربیت میں کوشاں رہی لیکن جب میں تیری خدمت کے قابل ہوا تو کس قدر دکھ کی بات ہے کہ تو داغ مفارقت دے گئی۔

ان اشعار میں اقبال اپنے بڑے بھائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ بلند قد جوان سال، خوبصورت اور خوب سیرت شخص جو میرا بھائی اور تیرا بیٹا ہے وہ یہاں موجود رہ کر تیری خدمت میں سرگرداں رہا۔ اور میری نسبت تیرا زیادہ دکھ بھلا، کرتا رہا۔ یہ شخص جو میرا عزیز بھائی ہے، ار، شک کا،

ہے وہ میرے لیے عملاً تیری محبت کا بدل ہے۔ وہ میرے لیے قوت بازو کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اب یقیناً تیری موت پر بچوں کی طرح روتا ہو گا۔ اسے مبرکس طرح آئے گا۔ ظاہر ہے کہ صبح شام گریہ اس کا کام ہو گا۔ میں تو یہاں یورپ میں مقیم تیری یاد میں غم گسار ہوں۔ میرے لیے یہ کرب ناقابلِ برداشت ہے جب کہ میرا بھائی تو تیرے موت کے حوائے کو اپنی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

لیکن اے ماں! تو نے ہم بھائیوں کے دلوں میں محبت کا جو جذبہ پیدا کیا تھا اب تیرے غم کے سبب یہ جذبہ اور مستحکم ہو گیا ہے کہ یہ دکھ ہمارے مابین قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔

چھٹا بند معنی: پیر: بوڑھا۔ طلسم دوش و فروا: ماضی اور مستقبل کا جادو۔ کلیشہ افلاس: غریبی کی جموہیزی۔ کاشانے: محل۔ مجال شکوہ: شکایت کی طاقت۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ یہ دنیا کیا ہے؟ یہی ناکہ ہر جوان اور بوڑھے کے لیے ماتم کدے کی حیثیت رکھتی ہے جب کہ انسان اس کی حقیقت کو سمجھ نہیں پا رہا۔ یوں لگتا ہے کہ وہ ابھی ماضی اور حال کے طلسم میں اسیر ہے۔ زندگی اور موت کا اگر مقابلہ کیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی بسر کرنا بے حد مشکل کام ہے۔ اور موت اسی قدر سہل ہے جیسے کہ کسی باغ میں نسیم بلا کسی تردد کے رواں دواں رہتی ہے۔ اس زندگی میں تو زلزلے، بجلیاں، قحط اور آلام و مصائب کی ہستات ہے۔ زمانہ کی حیثیت ایک ایسی سنگ دل ماں کی طرح ہے جو اس نوع کی اولاد پیدا کرتی ہے۔ موت تو ایک ایسی حقیقت ہے جو افلاس و غربت کے تنگ و تاریک گھروں کے علاوہ امراء کے دولت کدوں تک جس کی رسائی ہے۔ یہی نہیں بلکہ بیابان و صحرا، آبادیاں، باغات اور دیرانے، بھی موت کی دسترس سے نہیں بچ سکتے ہیں۔

موت تو ان پر سکون سمندروں پر بھی محیط ہے جو ہر نوع کے ہنگاموں اور طوفانوں سے محفوظ تصور کیے جاتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ کہ ایسے سمندروں میں رواں دواں کشتیاں موجوں کی آغوش میں ڈوب جاتی ہیں۔ موت تو ایک ایسی اصل حقیقت ہے کہ اس کے خلاف نہ تو کسی کو شکوہ کرنے کی جرات ہوتی اور نہ گلہ کرنے کا حوصلہ۔ امر واقعہ یہ ہے کہ موت تو ایک ایسے طوق کی مانند ہے جس سے پسینے والے کا گلا گھٹ جاتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو حیات انسانی ایک ایسے قافلے کے مانند ہے جس میں ایک انتہائی ٹھنڈی گھنٹی کے سوا ہر طرف خامشی طاری ہے۔ یہاں انسانی متاع محض آنکھ ہے جو آنسو بہاتی رہتی ہے۔

ساتواں بند معنی: باوہار جادوواں: بیشہ کی بہار کی ہوا۔ خاکستر: راکھ۔

مطلب: جان لے کہ یہ مصائب و ابتلا کا دور بھی بالآخر ایک روز ختم ہو کر رہ جائے گا۔ اس لیے کہ نو آسمانوں کے پس پشت ابھی کچھ اور آسمان یعنی ادوار ابھی باقی رہتے ہیں۔ جنہیں کسی نہ کسی مرحلے پر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اگر اس دنیا میں لالہ و گل کے سینے چاک ہیں اور ببل آہ و زاری پر مجبور ہے تو پھر کیا ہوا؟ اس لیے کہ ایسی جھاڑیاں جنہیں خزاں نے نہ وبالا کر کے رکھ دیا ہے انہیں بہار کی ہوائے سرے سے ترو تازہ کر کے رکھ دے گی۔

اگر ہماری زندگی ایک پامال اور پرمردہ روح کی مانند ہے اور یہ خاکی جسم محض عارضی حیثیت کا حامل ہے تو کیا ہوا؟ اس لیے کہ زندگی جس آگ سے عبارت ہے اس کا انجام محض خاک نہیں ہے کہ زندگی تو ایک ایسا موتی ہے جس کے مقدرمیں شکستگی نہیں ہے۔

آٹھواں بند معنی: دیدہ قدرت: فطرت کی نگاہ۔ حفظ زندگی: زندگی کی حفاظت۔ نقش حیات: زندگی کی تصویر۔ خلل: رکاوٹ۔ جنت نظارہ: جنت کا جلوہ۔ بالائے آب: پانی کا بلبلہ۔ ہیئت تعمیر: تعمیر صورت۔ فطرت ہستی: زندگی کی سرشت۔ پیکر: جسم۔

مطلب: یوں بھی قدرت کی نگاہ میں زندگی اس قدر پیاری ہے کہ رب ذوالجلال نے ہر شے کو تخلیق کرتے وقت اس میں زندگی کے تحفظ کا جذبہ بھی شامل کر دیا تھا۔ اگر موت اتنی طاقتور ہوتی کہ اس کے ہاتھوں حیات انسانی کا نظام زیر و زبر ہو جاتا تو اس کو یعنی موت کو نظام کائنات میں یوں عام نہ کر دیا جاتا۔ اگر موت اتنی ارزاں اور سستی واقع ہوتی ہے تو سمجھ لو کہ جس طرح خواب کے عمل سے زندگی میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح موت کی حقیقت بھی معمولی سی ہے۔ انسان تو اس قدر غفلت شعار ہے کہ اس حقیقت کا بھی اسے اور اک نہیں کہ موت کا اصل راز کیا ہے؟ زندگی کی ٹاپائیداری سے کچھ اور ہی ظاہر ہوتا ہے۔

ذرا غور کیا کہ ہوا کے طرز عمل سے تعمیر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ مضرب موج بلبلوں کو تو ذکر پھر سے تعمیر کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ لیکن ہوا کرتی کیا ہے کہ بلبلوں کو پیدا کر کے موج کے دامن میں چھپا دیتی ہے۔ یعنی خود ہی انتہائی بے دردی کے ساتھ اس نقش کو مٹا دیتی ہے۔ اس عمل کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ اگر ہوا بلبلے کو از سر نو پیدا کرنے پر قادر نہ ہوتی تو اس بے پروائی سے اسے توڑتی ہی کیوں؟

ہوا کے اس رویے کا اثر تعمیر کی ہیئت پر کچھ نہیں پڑتا بلکہ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ہوا کو اپنی قوت تعمیر پر کس قدر گرفت حاصل ہے۔

اس ساری گفتگو سے ایک بات ظاہر ہوتی ہے کہ زندگی ہمیشہ فطرتاً ہی نئی آرزوؤں اور خواہشوں کی متلاشی رہتی ہے اور اس کو بہتر سے بہتر چیز کی جستجو رہتی ہے۔

نواں بند معنی: ممنون شب: رات کا احسان مند۔ سربرانو: گھنٹوں پر سر رکھے ہوئے۔ سوئے افلاک: آسمان کی طرف۔ قدسیوں: فرشتے۔ وسعت فطرت: فطرت کا پھیلاؤ۔ مضرب: ستار بجانے کا آلہ۔ کم بہا: ارزاں۔

مطلب: افسوس کہ یہ پارے کی مانند مضرب اور چمکدار ستارے جو فضائے آسمان کو منور کرتے ہیں یہ شوخ چنگاریاں جو اپنے وجود کی نمائش کے لیے تاریکی شب کی احسان مند ہیں انسانی و انش جب ان کی عمر کے پارے میں غور و خوض کرتی ہے تو کسی نتیجے پر پہنچنے کی بجائے حیران و پریشان ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے کہ حیات انسانی ان ستاروں کے مقابلے میں محض چند لمحوں تک محدود ہے۔ مگر انسان جس کی نگاہ ہمیشہ آسمانوں سے بھی آگے نظارہ کرنے کی حامل ہے اور جو اپنے مقاصد میں فرشتوں سے بھی زیادہ پاک و پاکیزہ ہے، یہی انسان جو محفل کائنات میں ایک روشن شمع کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کی فطرت اور صلاحیتوں کے مقابلے میں آسمان محض ایک نقطے کی مانند ہے اس کے باوجود اپنی کم فہمی کے سبب سچائی کی تلاش میں مضرب اور پریشان ہے جس کا وجود زندگی کے ساز کے لیے ایک مضرب کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا وہ گروں کے ستاروں سے بھی آب و تاب میں کمتر ہے اور کیا اس کا رتبہ سورج کے مقابلے میں بھی کم ہے؟

دسواں بند معنی: ختم گل: پھول کا بیج۔ مستور: چھپا ہوا۔ خود نمائی: اپنے آپ کو ظاہر کرنا۔ قبائے زندگی: زندگی کا لباس۔ قوت آشفته: پریشان طاقت۔ شیرازہ بند: بیج کرنے والا۔ جز سنجیدہ: پر اڑنے سے پہلے پرندوں کا پر تولنا۔

مطلب: اقبال ان اشعار میں یوں خن طراز ہیں کہ پھول کا بیج زیر خاک بھی بویا جاتا ہے تو وہ نشوونما کے لیے مضطرب اور بے تاب رہتا ہے۔ اس معمولی سے بیج میں فی الاصل ایک ایسا شعلہ چھپا ہوا ہے جو زندگی سے عبارت ہے۔ یہ بیج اپنے اظہار و نمود کے لیے بے چین رہتا ہے۔ یہ بیج مٹی کی خنکی سے بھی نہیں مرتا اور خاک میں دبائے جانے کے باوجود اس میں زندگی کی حرارت باقی رہتی ہے۔

چنانچہ موقعہ پاتے ہی یہ بیج پھول بن کر خاک کی تھوس سے باہر نکل آتا ہے۔ بالفاظ دیگر موت کے ہاتھوں زندگی کا لباس پہن لیتا ہے یعنی مٹی ہی اس کی تخلیق اور نمو کا باعث بنتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قبر انسان کو فنا نہیں کرتی بلکہ اس کی ان منتشر قوتوں کو منظم کرتی ہے جو آسمان پر بھی کندہ الٰہ کیس۔ یوں موت زندگی کے ذوق کی تجدید کا دوسرا نام ہے۔ بالفاظ دیگر عالم خواب میں بیداری کا پیغام ہے۔

اس لیے کہ جو پرواز کے عادی ہوتے ہیں ان کو پرواز کا کوئی خوف نہیں ہوتا جب کہ موت اس دنیا میں نئے سرے سے پرواز پر آمادہ کرتی ہے۔

گیارہواں بند معنی: شفا: صحت۔ حلقہ زنجیر: زنجیر کی قید۔ افسوس: جاوہ۔ سرشک آلود: آنسوؤں کی بہتی۔ تاب شکیبائی: صبر کی طاقت۔ جو ہر انساں: انسان کی روح۔ آگہی: عقل و شعور۔ دلا سائی: دل کی تسکین۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ دنیا والوں کے نزدیک موت کا کوئی مداوا نہیں۔ اس کے باوجود مرنے والے کی جدائی کا غم دقت گزرنے کے ساتھ کم ہوتا جاتا ہے۔ گویا دقت زخم جدائی کے لیے مرہم کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دل ایک ایسی بہتی ہے جو مرنے والوں کے غم کو اپنے دامن میں محفوظ رکھتی ہے اور اس پر زمانے کی کوئی گرفت نہیں ہوتی۔ گریہ و زاری اور نالہ و ماتم کو وقت کا طلسم بھی نہیں روک سکتا۔ یوں مرنے والے جدائی کا جو زخم دے جاتے ہیں وقت اس کا مرہم نہیں بن سکتا۔ جس لمحے انسان پر اچانک کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔

اس کیفیت میں دل کو نالہ و فریاد سے ایک باضابطہ تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور دل کا خون آنکھوں کے راستے بہ نکلتا ہے۔ ہر چند کہ انسان صبر کی قوت سے محروم ہے اس کے باوجود اس کی فطرت میں غیر محسوس طریق پر یہ حقیقت چھپی ہوئی ہے۔ کہ انسان مرنے کے بعد بے شک ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا۔ بے شک غم کے شعلے زندگی کو جلا کر خاک تو کر دیتے ہیں تاہم دل کی یہ آگ محض اس احساس کی بدولت ہی بجھتی ہے کہ انسان اس دار فانی سے اٹھ تو جاتا ہے لیکن عملاً فنا نہیں ہوتا۔ اور یہی وہ احساس ہے جو رنج و غم کی مسلسل کی کا سبب بنتا ہے۔

اگر کوئی شخص اپنے کسی عزیز کی وفات پر آہ و فغاں سے گریز کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ غم کے احساس سے غافل ہو چکا ہے اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ وہ موت کے بھیدوں سے آگاہی رکھتا ہے۔

بار ہواں بند معنی: دامن آفاق: دنیا کا دامن۔ آتش قبا: آگ کا لباس۔ سرود: نغمہ۔ خفتگان: سوئے ہوئے۔ عروس زندگی: زندگی کی دلہن۔ مرقد: قبر۔

مطلب: زیر تشریح اشعار میں اقبال پھر سے اپنے موضوع کی طرف پلٹتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب مشرق کی جانب سے آتی پر صبح نمودار ہوتی ہے تو یوں لگتا ہے کہ کائنات کے دامن سے شب کی سیاہی کا داغ دھو رہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ رات کی تاریکی کے بعد صبح کی روشنی نمودار ہو رہی ہے۔ باغ میں لالہ کا پھول و تاریکی شب کے سبب افسردہ نظر آتا تھا صبح سورج کی وساطت سے اس کو شعلے جیسا سرخ لباس عطا کرتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ علی الصبح جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کا عکس لالے کے پھول کو سرخی مائل کر دیتا ہے۔ اور پرندے جو تمام رات اپنے گھونسلوں میں خاموش رہے۔ ان کو چھمانے اور نغمہ ریزی پر مجبور کر دیتی ہے۔ بلبل بھی اس لمحے نغمے گانے لگتی ہے اور صبح کی ٹھنڈی ہوا میں پرندے ترنم ریز ہو جاتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ باغوں، پہاڑوں اور دریاؤں میں جو مظاہر شب بھر سکون رہے آمد صبح ان میں بھی زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے۔

سو! یہ اگر قانون قدرت ہے کہ ہر شام صبح پر منتج ہو تو پھر انسانی قبر کی تاریکی کا خاتمہ کس لیے ممکن نہیں۔ صبح اس کا مقدر کیوں نہیں ہو سکتی۔ اقبال نے ان اشعار میں ایک منطقی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے کہ موت کوئی آخری مرحلہ نہیں ہے اس کے بعد بھی زندگی ہے۔

تیر ہواں بند معنی: دام سیمین تخیل: تخیل کا چاندی سا جال۔ جہان بے ثبات: فانی دنیا۔ جولان گاہ: تیزی و کھانے کی جگہ۔ بے حاصلی: کچھ حاصل نہ ہوا۔ حلقہ افکار انسانی: انسان کی فکر کا دائرہ۔ ایوان: محل۔ شبستل: رات بسر کرنے کی جگہ۔ سبزہ نورست: تازہ آبی ہوئی گھاس۔

مطلب: نظم کے اس آخری بند میں اقبال کہتے ہیں کہ اے ماں! میرے خیالات میں اتنی وسعت ہے کہ ان کی حدود میں تیری یاد کو محفوظ کر لیا ہے۔ میرا غم زدہ دل تیری یاد سے معمور ہے بالکل اسی طرح جیسے حرم کعبہ کی فضائیں دعاؤں سے معمور ہیں۔ زندگی جس چیز کا نام ہے وہ تو ایک طرح سے انسانی فرائض کے تسلسل سے عبارت ہے۔ یہ زندگی لاکھوں ناپائیدار دنیاؤں میں جلوہ گر ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ زندگی کی ہر منزل کا طریق کار مختلف ہے۔ مرنے کے بعد انسان جس جہاں میں جاتا ہے وہ بھی زندگی کا ایک مظہر ہے۔ وہاں موت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہاں کا ماحول عمل کے لیے برا مناسب اور سازگار ہے۔

اے ماں! وہ جہاں تو ایسا ہے جہاں انسان جسم کا قیدی نہیں ہو گا بلکہ وہاں تو محض روح ہوگی اور اس کا نور ہو گا۔ چنانچہ یہ قدرتی امر ہے کہ وہاں فکر انسانی کا دائرہ میاں کی طرح محدود نہیں ہو گا۔ اے ماں! میاں پر بھی تیری زندگی چاند کی روشنی سے بھی زیادہ منور تھی اور تیرا سفر حیات صبح کے ستارے سے بھی زیادہ آسودگی کا مظہر تھا۔ اے ماں! خدا کرے صبح کے مانند تیری قبر بھی منور اور روشن رہے اور تیری آخری آرام گاہ نور سے معمور رہے۔

اے عظیم ماں! بارگاہ ایزدی میں دعاگو ہوں کہ تیری قبر پر آسمان شبنم برسائے ورنہ اس کی نمکینی تازہ آگاہا سبزہ کرے۔

شعاع آفتاب

141

صبح جب میری نگہ سودائی نظارہ تھی آسمان پر اک شعاع آفتاب آوارہ تھی
میں نے پوچھا اس کرن سے اے سراپا اضطراب تیری جان ناشکیبا میں ہے کیا اضطراب
تو کوئی چھوٹی سی بجلی ہے کہ جس کو آسمان کر رہا ہے خرمن اقوام کی خاطر جواں
یہ تڑپ ہے یا ازل سے تیری خو ہے کیا ہے یہ؟
رقص ہے، آوارگی ہے؟ جستجو ہے؟ کیا ہے یہ؟

”خفتہ ہنگامے ہیں میری ہستی خاموش میں پرورش پائی ہے میں نے صبح کی آغوش میں
مضطرب ہر دم مری تقدیر رکھتی ہے مجھے جستجو میں لذت تغیر رکھتی ہے مجھے
برق آتش خو نہیں فطرت میں گوناری ہوں میں مر عالم تاب کا پیغام بیداری ہوں میں
سرمہ بن کر چشم انساں میں سا جاؤں گی میں رات نے جو کچھ چھپا رکھا تھا دکھلاؤں گی میں
”تیرے مستوں میں کوئی جویائے ہشیاری بھی ہے“ سونے والوں میں کسی کو ذوق بیداری بھی ہے“

*

اقبال کی یہ نظم بھی ”بانگ درا“ کی دوسری بعض نظموں کی طرح مناظر فطرت کے حوالے سے تخلیق کی گئی ہے۔ اس نظم میں آفتاب کی ایک شعاع کو انہوں نے اظہار کا موضوع بنایا ہے۔ نواشعار کی یہ نظم دو حصوں پر مشتمل ہے جس میں اقبال کہتے ہیں۔

پہلا حصہ معنی : سودائی نظارہ : نظارہ کے لیے جہاں۔ سراپا اضطراب : سر سے پاؤں تک بیقراری۔

مطلب : صبح کے لمحات میں جب میری نگاہیں مناظر فطرت کا جائزہ لے رہی تھیں تو میں نے آسمان پر آفتاب کی ایک کرن کو اضطراب کے عالم میں ادھر ادھر سرگرداں پایا۔ اس کرن سے میں نے استفسار کیا کہ تو کیوں سراپا اضطراب بنی ہوئی ہے۔ آخر تو اس قدر بے چین کیوں ہو رہی ہے اور اس طرح بے صبری کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ کیا تو ایک انسانی نفس کی برق ہے۔ آسمان جسے دنیا کے لیے پرورش کر رہا ہے یعنی اگر اقوام عالم کو ایک کلیان سے تعبیر کر لیا جائے تو تیری حیثیت غالباً اس کلیان کو خاک کرنے کے حوالے سے دیکھی جاسکتی ہے۔

ابتدائے آفرینش سے تجھ میں جو اضطراب ہے یا عادت ہے مجھے بتا کہ آخر یہ سب کیا ہے؟ کیا یہ رقص کا انداز ہے یا تجھے کس چیز کی تلاش ہے۔ اتنا بتا دے کہ یہ سب کیا ہے؟

دوسرا حصہ : معنی : ہستی خاموش : خاموش زندگی۔ مر عالم تاب : دنیا کو روشن کرنے والا سورج۔ ذوق بیداری : جاگنے کی لذت۔

مطلب : اقبال کے اس استفسار پر سورج کی وہ کرن زبان حال سے گویا ہوتی ہے کہ اے شاعر ہر چند کہ خامشی اور سکوت پر مبنی ہے اور عملاً میں نے صبح کی آغوش میں پرورش پائی ہے اس کے باوجود نہ جانے کیوں میری تقدیر مجھے مضطرب اور بے چین رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ مجھے ہر لمحے روشنی، تاب، جستجو اور نگاہ کی ضرورت ہے۔

پیداوار ہوں اس کے باوجود میری عادتوں میں برق جیسا رویہ موجود نہیں ہے یعنی میں بجلی اور آگ کی طرح
تکسی شے کو جلا کر خاکستر میں تبدیل کرنے کی قائل نہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ سورج جو طلوع کے بعد
ساری دنیا کو اپنے احاطے میں لے لیتا ہے اس کی جانب سے کائنات کے لیے بیداری کا پیغام لے کر آئی
ہوں۔

میرا کردار تو اے اقبال یہ ہے کہ جس طرح سرمہ آنکھوں میں روشنی پیدا کرتا ہے اسی طرح میں بھی
انسانوں کی آنکھوں میں سرمے کی مانند سا جانا چاہتی ہوں تاکہ ان سب مناظر کو واضح کیا جاسکے جو رات کی
تاریکی کے سبب ان کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے تاہم تجھ سے بھی ایک سوال ضرور پوچھوں گی کہ اے
اقبال! کیا تیرے چاہنے والوں میں کوئی ہوش و خرد کا متلاشی ہے اور کیا ان میں نیند سے بیدار ہونے کی
خلش بھی موجود ہے؟

عرفی

142

تصدق جس پہ حیرت خانہ سینا و فارابی
میر جس سے ہیں آنکھوں کو اب تک اشک عتابی
نہیں ہنگامہ عالم میں اب سلمان بیتی
کہ رخصت ہو گئی دنیا سے کیفیت وہ سیلابی
نہ ہو جب چشم محفل آشنائے لطف معنوی
گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسمان تابی
نوارا تلخ تری زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تری خواں چو محل را گراں بینی

کل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے
فضائے عشق پر تحریر کی اس نے نوا ایسی
سے دل نے یہ اک دن اس کی تربت سے شکایت کی
مزاج اہل عالم میں تغیر آ گیا ایسا
نغان نیم شب شاعر کی بارگوش ہوتی ہے
کسی کا شعلہ فریاد ہو ظلمت رہا کیوں کر
صدائے تربت سے آئی ”شکوہ اہل جہاں کم گو
حدی را تیز تری خواں چو محل را گراں بینی

*

معنی: عرفی: اکبر کی حمد کا شاعر۔ تصدق: قریان۔ سینا و فارابی: دو مشہور مسلمان فلسفی۔ اشک عتابی:
عتابی رنگ کے آنسو۔ نغان نیم شب: آدمی رات کو آنسو و نغان کرنا۔ بارگوش: کانوں کے لیے بوجھ۔

مطلب: زیر تشریح نظم کا مرکزی کردار ”عرفی“ فارسی زبان کا بلند پایہ شاعر تھا۔ ایران کے شہر ”شیراز“
کے ایک خاندان میں پیدا ہوا۔ تلاش روزگار کے سلسلے میں مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں
ہندوستان وارد ہوا اور یہاں عبدالرحیم خان خاناں کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ اس نے صرف چھتیس
سال کی عمر ہی لیکن فن شاعری میں یکتا تھا۔ اس مختصر عمر میں ہی عرفی نے انتہائی شہرت حاصل کی۔

چنانچہ اس نظم میں اقبال ایک طرح سے ”عرفی“ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ
اے عرفی! تیرے بلند پایہ تخیل نے شاعری اور فلسفے کی ایسی عمارت تعمیر کی ہے جس پر بوعلی سینا اور فارابی
جیسے عظیم فلسفیوں کے نظریات بھی قریان کیے جاسکتے ہیں۔ اپنے اشعار میں عرفی نے عشق کے تصورات و
خیالات واضح کیے جن پر آج بھی اہل درد خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ ایک روز میں اس
کی قبر پر گیا اور یوں شکوہ سنج ہوا کہ اب دنیا میں وہ اضطراب اور بے چینی کی کیفیت موجود نہیں ہے۔

لوگوں کی طبیعتوں میں ایسا تغیر پیدا ہو گیا ہے کہ اب وہ بالکل پرسکون ہو چکے ہیں۔ اب تو ان کو شاعری فعال غم شبی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی کہ ان میں وہ جذب و کیف ہی باقی نہیں ہے کہ جو لوگ تاریکی شب کے پرستار ہوں انہیں صبح کی روشنی بھی گراں گزرتی ہے۔
اس لمحے قبر سے آواز آئی کہ اہل دنیا کا شکوہ نہ کر! اگر شعر و نغمہ کا ذوق لوگوں میں مفقود ہو جائے تو اپنی آواز کو زیادہ تلخ اور دردناک بنالے تاکہ لوگ تیری طرف متوجہ ہو سکیں کہ اونٹنی کے محل پر وزن بڑھ جائے تو حدی خوانی اور تیز ہو جانی چاہیے۔

ایک خط کے جواب میں

143

ہوس بھی ہو تو نہیں مجھ میں امت تک و تاز
ہزار شکر طبیعت ہے ریزہ کار مری
مرے غن سے دلوں کی ہیں کھیتیاں سرسبز
جہاں میں ہوں میں مثال سحاب دریا پاش
یہ عقد ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں
کہ فیض عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش
ہوائے بزم سلاطین، دلیل مردہ دنیا
کیا ہے حافظ رنگیں نوانے راز یہ فاش
”گرت ہو است کہ باخضر ہم نشیں باشی
نہاں ز چشم سکندر چو آب حیاں باش“



معنی: تک و تاز: بھاگ دوڑ۔ ریزہ کار: باریک کام کرنے والا۔ سحاب دریا پاش: دریا جاری کر دینے والا بادل۔ ہوائے بزم سلاطین: بادشاہوں کی محفل میں بیٹھنے کی خواہش۔

مطلب: جس دوست کے خط کے جواب میں علامہ اقبال نے یہ اشعار لکھ کر بھیجے۔ اس حوالے سے مراسلہ نگار اور اس کے ارسال کردہ خط کے متن کے بارے میں اگرچہ مختلف روایتیں ہیں لیکن علامہ کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دوست نے حصول جاہ کے لئے انہیں تحریریں دی تھیں جب کہ یہ صورت حال اقبال کے مزاج سے قطعی طور پر یکسانت نہیں رکھتی تھی چنانچہ جوابی اشعار میں وہ فرماتے ہیں۔

اول تو مجھے ہر نوع کی شان و شوکت اور منصب و اقتدار کی خواہش ہی نہیں ہے بالفرض ہو بھی تو ان کے لیے جس بھاگ دوڑ اور تلاش و جستجو کی ضرورت ہوتی ہے وہ کم از کم اس مقصد کے لیے مجھ میں نہیں ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری فطرت باریک بینی سے ہم آہنگ ہے۔ میں تو اپنی قوت بازو سے ہر شے کے حصول کی خواہش رکھتا ہوں اور یہ بھی باری تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں حصول منصب کے لیے منافقت اور فتنہ انگیزی کا قائل نہیں۔

مجھے تو اپنے تخلیقی علم پر بھروسہ ہے اور اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوں کہ میری شاعری سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں کو متاثر اور گفتہ کرنے والی ہے۔ میں تو اس دنیا میں ایسے بادل کی مانند ہوں جس کے برسنے سے اور اک و شعور کے دریا بہتے اور بہتے ہیں۔ اے مراسلہ نگار دوست! سیاست کے یہ

عقدے جن کی طرف تو نے مجھے راغب کرنے کی سعی کی ہے۔ تجھے ہی مبارک ہوں اس لیے کہ عشق حقیقی کے فیض سے میرے ناخن ہی سینہ خراشی میں مصروف ہیں۔ مراد یہ کہ میں تو اپنے ضمیر کی چھین سے ہم کنار رہتا ہوں۔ بادشاہوں اور امراء کے درباروں میں تو مردہ دلی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ حافظ شیرازی نے اسی راز کو فاش کرتے ہوئے اپنے ایک شعر میں فرمایا ہے کہ اگر تیرے دل میں خضر کی رقاقت اور اس کی مصابحت کی خواہش ہو تو جان لے کہ سکندر کی طرح آب حیات کا چشمہ تیری نظروں سے بھی بیش پوشیدہ رہے گا۔

نانک

144

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروا نہ کی
آہ! بد قسمت رہے آواز حق سے بیخبر
آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
شیع حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی
آہ! شور کے لیے ہندوستان غم خانہ ہے
برہمن سرشار ہے اب تک سے پندار میں
بکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نور ابراہیمؑ سے آزر کا گھر روشن ہوا
مگر انھی آخر صدا توحید کی بھخاب سے
ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

*

جیسا کہ سب کو علم ہے گورو نانک سکھ مذہب کے بانی تھے۔ وہ اہل ہند کی طرح بت پرستی کے قائل نہ تھے اور وحدانیت پر یقین رکھتے تھے۔ اس نظم میں علامہ اقبال نے گورو نانک کو غالباً اسی وجہ سے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ نظم آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ چنانچہ علامہ فرماتے ہیں۔

① سے ④ معنی: گوتم: مطلب ہے گوتم بدھ۔ گوہر یک دانہ: بے مثال موتی۔

مطلب: یہ مقام افسوس ہے کہ اہل ہند نے گوتم بدھ جیسے بلند مرتبہ انسان کی تعلیمات کی قطعاً پروا نہ کی اور انہیں یکسر نظر انداز کر دیا۔ اہل ہند بد قسمت واقع ہوئے تھے کہ گوتم جیسے انسان کے مرتبے اور مقام کو پہچان نہیں سکے۔ جس طرح اپنے پھل کی مٹھاس سے درخت ناواقف ہوتا ہے اسی طرح اہل ہند بھی گوتم بدھ اور ان کی تعلیمات سے بے بہرہ رہے۔ یہ گوتم بدھ ہی تھے جنہوں نے زندگی کے اسرار کو آشکار کیا جب کہ اہل ہند تو محض اپنے خیالی فلسفے پر نازاں رہا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے گوتم کے پیغام کو درخور اعتناء نہ سمجھا۔ دراصل یہ وہ بزم ہی نہ تھی جو شیع حق کی روشنی سے منور ہو سکتی۔ ہند کی سرزمین پر ابرہمت برسا تو ضرور! لیکن یہ زمین شور ثابت ہوئی۔

⑤ سے ⑧ معنی: شور: ہندوؤں کی ایک ذات۔ مرد کامل: یہاں گورو نانک مراد ہے۔

مطلب: افسوسناک امر یہ ہے کہ شور یعنی اچھوت طبقے کے لیے ہندوستان ایک غم کدے کی حیثیت

رکھتا ہے۔ یہاں تو کسی کے دل میں انسانی ہمدردی کا شائبہ تک نہیں ہے جب کہ برہمن کو چونکہ اعلیٰ ذات کا ہندو تصور کیا جاتا ہے اس لیے وہ اسی غرور میں مبتلا رہتا ہے اور گوتم بدھ نے معرفت کی جو شمع جلائی تھی اس سے اب غیر استفادہ کر رہے ہیں۔ لیکن گورو نانک کی آمد سے ہند کا جو بنگلہ تھا اس میں ایک عرصے کے بعد وحدانیت کی شمع جلی۔ بالفاظ دیگر حضرت ابراہیمؑ کے نور سے بت تراش آزر کا گھر جگمگا اٹھا۔ چنانچہ توحید کی یہ صدا پنجاب سے انہی اور ایک مرد کال نے اہل ہند کو بیدار کر دیا۔

کفر و اسلام

145

تضمین بر شعر میر رضی دانش

ایک دن اقبال نے پوچھا کلیم طور سے آتش نمود ہے اب تک جہاں میں شعلہ ریز تھا جواب صاحب سینا کہ مسلم ہے اگر ذوق حاضر ہے تو پھر لازم ہے ایمان خلیل ہے اگر دیوانہ غائب تو کچھ پروا نہ کر عارضی ہے شان حاضر، سطوت غائب مدام شعلہ نمود ہے روشن زمانے میں تو کیا نوراً چوں آتش سنگ از نظر پنہاں خوش است

*

معنی: آتش نمود: نمود کی آگ۔ سوز کسن: پرانا سوز یعنی خدا کی محبت۔ ایمان خلیل: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ایمان۔ خیمہ زن: خیمہ نصب کرنا یعنی اسلامی تعلیم کا پابند ہونا۔

مطلب: عربی کی طرح میر رضی دانش بھی فارسی کے شاعر تھے اور شاہجہان کے دور میں مشہد (ایران) سے آئے تھے۔ انہوں نے ایک مقبرے پر دو ہزار روپے انعام حاصل کیا بعد میں وہ دارا شکوہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ دارا شکوہ کو ان کا ایک شعر اس قدر پسند آیا کہ ایک لاکھ روپے انعام دیا۔ اقبال نے انہی میر رضی دانش کے ایک شعر کی تضمین کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

ایک روز اقبال نے حضرت موسیٰؑ سے استفسار کیا کہ بے شک آپ کے نقش قدم کی بدولت "وادی سینا" گلستان بنی ہوئی ہے۔ لیکن اتنا تو بتائیے کہ ابھی تک دنیا میں آتش نمود بھڑک رہی ہے۔ آخر آپ کا وہ نور کہاں گیا جو کفر و باطل کو جلا کر خاک کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا؟ میرے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ اگر تو مسلمان ہے تو غائب کو چھوڑ کر سامنے موجود چیزوں کا عاشق نہ بن کہ غائب وجود تو ذات باری تعالیٰ کا ہے۔ ہر چھوٹی بڑی شے بلکہ دونوں جہاں اس کے زیر اقتدار ہیں۔ پھر بھی اگر حاضر اشیاء کا زیادہ ذوق رکھتا ہے تو پھر حضرت ابراہیمؑ جیسے پیغمبر کی صفات کا موجود ہونا ضروری ہے۔ سطحی نظر سے کسی شے کو دیکھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ورنہ تیرا عقیدہ تباہی کا سبب بن جائے گا۔

اے اقبال! اگر تو غائب یعنی خالق حقیقی کا پیروکار ہے تو تجھے ہر شے سے بے نیاز ہو جانا چاہیے بلکہ اسلام کی رسی کو مضبوطی سے تمام کر حالات کے بدلنے کا انتظار کر۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کر لے کہ کائنات میں موجود اشیاء کی شان اور افادیت محض عارضی حیثیت کی حامل ہے اور غائب کی شان مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے جس کا تعلق باری تعالیٰ کی ذات سے ہے۔ بالفرض زمانے میں شعلہ نمود روشن ہے یعنی کفر و باطل کا دور دورہ ہے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ باطل بھی شمع کی مانند بقول میر رضی دانش پھیل کر ختم ہو جائے گا جب کہ حق و صداقت کا نور پتھر کی آگ کی طرح نظروں سے اوجھل ہے اور اس کا اوجھل رہنا ہی بہتر ہے۔

بلالؓ

146

لکھا ہے ایک مغربی حق شناس نے اہل قلم میں جس کا بہت احترام تھا
جولانگہ سکندر رومی تھا ایشیا گردوں سے بھی بلند تر اس کا مقام تھا
تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا
دنیا کے اس شہنشاہ انجم سپاہ کو حیرت سے دیکھتا فلک نیل قام تھا
آج ایشیا میں اس کو کوئی جانتا نہیں
تاریخ دان بھی اسے پہچانتا نہیں
لیکن بلالؓ وہ حبشی زادہ حقیر فطرت تھی جس کی نور نبوت سے مستنیر
جس کا امیں ازل سے ہوا سینہ بلالؓ محکوم اس صدا کے ہیں شاہنشاہ و فقیر
ہوتا ہے جس سے اسود و احمر میں اختلاط کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر
ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوش چرخ حیر
اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے؟
رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے!

*

پہلا بند معنی: پورس: پنجاب کا ایک مشہور راجہ۔ دارا: ایران کا شہنشاہ۔

مطلب: مغرب کا ایک حقیقت پسند دانشور جو انتہائی قابل احترام گروانا جاتا ہے بقول اقبال کتا ہے کہ ایشیا روم کے جلیل القدر بادشاہ سکندر ایشیا کو ہمیشہ اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند تا رہا۔ مقدونیہ میں پیدا ہونے والا یہ عظیم سپہ سالار اوائل عمری میں ہی ایشیا کے متعدد ممالک فتح کر چکا تھا۔ بظاہر اس کا مرتبہ آسمان سے بھی بلند تھا۔ تاریخ عالم اس امر کی گواہی دے رہی ہے کہ ہندوستان کے پورس اور ایرانی بادشاہ دارا نے اپنی جرات و ہمت کے دعوے کیے تھے وہ غلط تھے۔ سکندر کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ سکندر دنیا میں ایسا بادشاہ گزرا ہے جس کی فوجوں کی تعداد ستاروں جتنی تھی۔ اسی لیے غالباً آسمان بھی اس کو حیرت سے دیکھا کرتا تھا۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ اس سطوت و جلال کے باوجود ایشیا میں آج کوئی شخص اسے جانتا تک نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ مورخ بھی اس کے کارناموں سے واقف نہیں۔

دوسرا بند معنی: مستنیر: روشنی حاصل کرنے والی۔ اسود و احمر: کالا۔ گورا۔ اختلاط: فرق۔

مطلب: لیکن بلال جو ایک معمولی حبشی زادہ تھا جس نے انوار نبوت سے روشنی پائی تھی اور آواز اس کے سینے میں خالق حقیقی کی امانت تھی وہ آج بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب پر حکومت کرتی ہے۔ یہی آواز اذان ہے جس کو سن کر دنیا بھر کے مسلمان سجدے میں جھک جاتے ہیں۔ یہی اذان مسلمانوں میں اخوت اور میل جول پیدا کرتی ہے۔ اور جس کے سبب محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر عبادت خداوندی کرتے ہیں۔ وہ صدیوں سے تازگی کی منظر ہے اور دلوں کو براتی رہتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ یہ آواز تو نبوت کا فیض عام ہے یعنی سکندر جیسا فاتح فنا ہو گیا جب کہ اسی آواز کے طفیل بلال حبشی کو دائمی زندگی حاصل ہے۔

مسلمان اور تعلیم جدید

147

تضمین بر شعر ملک قتی

لازم ہے رہرو کے لیے دنیا میں سامان سفر
تھے جو گراں قیمت کبھی، اب ہیں متاع کس مخز
گھٹ کر ہوا مثل شرر تارے سے بھی کم نور تر
غالب ہے اب اقوام پر معبود حاضر کا اثر
فرسودہ ہے پھندا تر، زیرک ہے مرغ تیز کر
ہے خون فاسد کے لیے تعلیم مثل نیشتر
واجب ہے صحرا گمراہ پر قہیل فرمان خضر
”رقتم کہ خار از پاکشم“ قہیل نماں شد از نظر
یک لحظہ غافل ششم و صد سالہ راہم دور شد

مرشد کی یہ تعلیم تھی اے مسلم شویہ سر
بدلی زمانے کی ہوا، ایسا تغیر آ گیا
وہ شعلہ روشن تر، ظلمت گریزاں جس سے تھی
شیدائی غائب نہ رہ، دیوانہ موجود ہو
نہیں اس باغ میں کوشش ہو بار آور تری
اس دور میں تعلیم ہے امراض ملت کی دوا
رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے
لیکن نگاہ نکتہ ہیں دیکھے زیوں بختی مری
یک لحظہ غافل ششم و صد سالہ راہم دور شد

*

ملک قتی بھی فارسی زبان کا بلند پایہ شاعر تھا۔ اس کا تعلق ”قم“ (ایران) سے تھا۔ اسی مناسبت سے وہ قتی کہلاتا ہے۔ چودھویں صدی میں وہ ہندوستان آیا اور دکن پہنچ کر ”ابراہیم عادل شاہ“ والی بیجا پور کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ اقبال نے زیر تشریح اشعار ملک قتی کے ایک شعر پر تضمین کرتے ہوئے کہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ

معنی: ملک قتی: ایران کا ایک مشہور شاعر۔ شویہ سر: دیوانہ۔ متاع کس مخز: ایسا مال جسے کوئی نہ خریدے۔ دیوانہ موجود: موجود چیز کا شیدائی۔ فرسودہ: پرانا۔ زیرک: ہوشیار، چالاک۔ خون فاسد: گندہ خون۔

مطلب: مجھے مرشد نے یہ تعلیم دی تھی کہ اے مسلمان! اس دنیا میں ہر راہرو کے لیے لازم ہے کہ ہر لمحے سامان سفر تیار رکھے۔ مراد یہ ہے کہ کسی لمحے بھی اسے موت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ لہذا اپنا رشت

سفرِ بیش تیار رکھے۔ لیکن اب زمانے کی ہوا اس طرح بدلی ہے اور ایسا انقلاب آیا ہے کہ دنیا کی نادر و نایاب چیزیں بھی اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھیں۔ تجھ میں جو ایک روشن شعلہ تھا وہ تاریکی کا خاتمہ کر دیتا تھا وہ بدرجہ فتم ہوتا رہا۔ اب تو اس میں ستارے سے بھی کم روشنی ہے۔ اب تو قوموں پر موجودہ تہذیب کے اثرات اس طرح سے مسلط ہو گئے ہیں کہ وہ خالق حقیقی سے روگردانی کر کے بت پرستی کی طرف مائل ہیں۔

اے اقبال! لگتا تو یوں ہے کہ اس معاشرے میں تیری انقلابی کوششیں بار آور ہو سکیں اس لیے کہ تیرے نظریات فرسودہ ہیں اور تہذیب جدید زیادہ تیز طرار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس عہد میں تمام معاشرتی نقائص کا علاج تعلیم اور صرف تعلیم کا حصول ہے۔ فی الواقع تعلیم ہی خونِ فاسد کے لیے نشتر کی مانند ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ اپنے مرشد کے ارشاد کے سبب میں نے بھی حصول علم کی خاطر دن رات ایک کر دیئے لیکن ہوا یوں کہ میں حقیقی راہ سے بھٹک کر رہ گیا۔ معلوم یہ ہوا کہ جدید تعلیم چھوٹے امراض کا علاج تو ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ بڑے مرض میں مبتلا کر دیتی ہے اور انسان حقیقت سے غافل ہو جاتا ہے۔

پھولوں کی شہزادی

148

کلی سے کہہ رہی تھی ایک دن شبنم گلستاں میں
تہارے گلستاں کی کیفیت سرشار ہے ایسی
تا ہے کوئی شہزادی ہے حاتم اس گلستاں کی
کبھی ساتھ اپنے اس کے آستان تک مجھ کو تالے چل
رہی میں ایک مدت غنچہ ہائے باغِ رضواں میں
نگہ فردوسِ در دامن ہے میری چشم حیراں میں
کہ جس کے نقش پا سے پھول ہوں پیدا بیاباں میں
چھپا کر اپنے دامن میں برنگِ موج بو لے چل

کلی بولی سر پہ آرا ہماری ہے وہ شہزادی
مگر فطرت تری اختصار اور ہیتم کی شان اونچی
پہنچ سکتی ہے تو لیکن ہماری شاہزادی تک
نظر اس کی پیامِ عید ہے اہل محرم کو
بنادیتی ہے گوہر غمزدوں کے اشکِ ہیتم کو

*

پہلا بند معنی: فردوسِ در دامن: دامن میں بہشت لے ہوئے۔

مطلب: یہ نظم دوبند پر مشتمل ہے اس میں شبنم اور کلی کا ایک مکالمہ پیش کیا گیا ہے اس کے مطابق ایک روز باغ میں شبنم کلی سے کہہ رہی تھی کہ میں ایک مدت سے باغوں کے پھولوں کی قربت میں قیام پذیر ہوں لیکن یہ تمہارا جو باغ ہے وہ ایسی مست کر دینے والی اور خوشگوار فضا کا حامل ہے کہ جب اس پر نظر ڈالتی ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بہشت کے کسی منظر میں داخل ہو رہی ہوں۔ میں نے یہ چیز سنی ہے کہ اس باغ کی سربراہ کوئی ایسی شہزادی ہے کہ اگر وہ کسی دیرانے اور صحرا میں بھی چلی جائے تو اس کے

نازک قدوں کے نشان پھول اگاتے چلے جاتے ہیں۔
اے کلی! کبھی تو اپنے ہمراہ اس شہزادی کے پاس لے چل۔ اگر اس میں کوئی قباحت ہے تو اپنے دامن
میں اس طرح چھپا کر لے چل جیسے تو نے خوشبو کو چھپایا ہوتا ہے۔

دوسرا بند معنی: سریر آرا: تخت کو زینت دینے والی۔ الفتلہ: پست، حقیر۔

مطلب: کلی نے شبنم کی گفتگو سنی تو بولی کہ اے شبنم! واقعی تیری بات بڑی حد تک درست ہے ہماری
پھولوں کی شہزادی میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ اگر وہ پتھر کو بھی ٹھوکر مارے تو وہ موتی بن کر چمکنے لگتا ہے
لیکن تیری اس تک رسائی یوں ممکن نہیں کہ تو ایک اونٹنی شے ہے اور شہزادی بڑی عالی مرتبت ہے۔ لیکن
صرف ایک ایسا ذریعہ ہے جو تجھے اس شہزادی تک پہنچا سکتا ہے کہ تو اگر کسی معصیت زدہ کا آنسو بن جائے
تو شہزادی تک رسائی ممکن ہے۔

اس لیے کہ غمزدہ لوگوں کے لیے ہماری شہزادی مسرت کا پیغام لاتی ہے اور ان کے آنسوؤں کو موتیوں
میں ڈھال دیتی ہے۔

تضمین بر شعر صائب

149

کہاں اقبال تو نے آ بنایا آشیاں اپنا
شرارے داوی ایمن کے تو بوتا تو ہے لیکن
کلی زور نفس سے بھی وہاں گل ہو نہیں سکتی
قیامت ہے کہ فطرت سو گئی اہل گلستاں کی
دل آگاہ جب خوابیدہ ہو جاتے ہیں سینوں میں
نہیں ضبط نوا ممکن تو اڑ جا اس گلستاں سے
”ہاں بہتر کہ لیلیٰ در بیاباں جلوہ گر باشد
ندارد تنگنائے شہر تاب حسن صحرائی“

محمد علی صائب فارسی زبان کا نثر گو اور بلند پایہ شاعر تھا۔ تبریز میں پیدا ہوا۔ افغانستان آکر فکر معاش
میں کاہل کے صوبہ دار ظفر خاں کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ آخری عمر میں اصفہان چلا آیا اور بیس پر
وفات پائی۔ اقبال نے اس کے ایک شعر کی تضمین کرتے ہوئے جو اشعار کہے ہیں ان میں خود سے مخاطب
ہو کر فرماتے ہیں۔

معنی: ختم سینائی: کوہ سینا کا جج۔ تقاضائے خود افزائی: ترقی کی آرزو۔ شکر خانی: میٹھی چیز کھانا یعنی
شیریں بیانی۔ تنگنائے شہر: شہر کی تنگ جگہ۔

مطلب: اے اقبال! تو نے نہ جانے کیا سوچ کر اس شہر میں قیام کیا ہے جہاں شعر تو الگ رہا زبان سے
کوئی بات نکالنا بھی ذلت کا سبب بن جاتا ہے۔ بے شک تو اس بنجر زمین سے امن و ارتقا کا تقاضا کر رہا ہے
لیکن اس زمین سے یہ توقعات وابستہ کرنا بے معنی سی بات ہے جہاں افراد میں خود ترقی کرنے اور عملی

جدوجہد کا جذبہ موجود نہ ہو وہاں یہ عمل ایسا ہی ہے جیسے سانس کی قوت سے کلی کو پھول بنانے کی سعی کی جائے۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ملت اسلامیہ اپنی کارکردگی اور عمل سے محروم ہو چکی ہے نہ اس کے بوڑھوں میں بیداری رہی ہے نہ نئی جوانوں میں ہمت و حوصلہ موجود ہے۔ جب باشعور لوگوں میں جذبہ احساس ختم ہو جاتا ہے تو شاعر کے لیے نغمہ گری کا عمل تلخ نوائی کا سبب بن جاتا ہے۔ تیرے لیے بہترینی ہے کہ اس بے حس مقام سے کہیں اور چلا جا کہ یہاں سے تو اجازت صحرا ہی بہتر ہے۔

صائب کہتے ہیں کہ مردہ دل قوم کے لیے زندہ قوموں کے ترانے بے معنی ہوتے ہیں۔ یہ ترانے تو زندہ قوموں کو ہی زیب دیتے ہیں۔

فردوس میں ایک مکالمہ

150

حالی نے مخاطب ہوئے یوں سعدی شیراز
دامن بھواریؔ نہ و اختر زدہ باز
داماندہ منزل ہے کہ مصروف تک و تاز؟
تھی جس کی فلک سوز کبھی گرمی آواز؟
رو رو کے لگا کہنے کہ اے صاحب اعجاز
آئی یہ صداؔ پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
دنیا تو ملی طائر دیں کر گیا پرواز
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیرؔ زمیں تاز
وہیں زخمہ ہےؔ جمعیت ملت ہے اگر ساز
ظاہر ہے کہ انجام گلستاں کا ہے آغاز
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز
بہمیں نہ کہیں ہند کے مسلم مجھے غماز

ہاتف نے کہا مجھ سے کہ فردوس میں اک روز
اے آنکہ زبور مگر انظم فلک تاب
کچھ کیفیت مسلم ہندی تو بیاں کر
مذہب کی حرارت بھی ہے کچھ اس کی رگوں میں
باتوں نے ہوا شیخ کی حالی متاثر
جب پیر فلک نے ورق ایام کا الٹا
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
ویں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
مذہب سے ہم آپسگی افراد ہے باقی
بنیاد لرز جائے جو دیوار چمن کی
پانی نہ ملا زمزم ملت سے جو اس کو
یہ ذکر حضور شہ شربؐ میں نہ کرنا

خرما نواں یافت ازاں خار کہ کشتہ
دیبا نواں یافت ازاں پشم کہ رشتہ

*

① سے ④ معنی: ہاتف: نبی فرشتہ۔ داماندہ منزل: چلتے چلتے راستے میں تھک کر بیٹھ جانا۔ فلک سوز: آسمان جل جانا۔

مطلب: زیر تشریح نظم ایک تصوراتی مکالمے پر مبنی ہے جس کے دو کردار شیخ سعدی اور مولانا حالی ہیں۔ منظر بہشت ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ مجھ سے ہاتف نبی (غیب سے آواز دینے والا فرشتہ) نے کہا کہ اک روز بہشت میں شیخ سعدی اور مولانا حالی کچھ ہو گئے۔ علیک سلیک کے بعد شیخ سعدی نے استفسار کیا کہ مجھے شک آپ نے اپنی شاعری سے ہر بلند و پست شے کو منور کر دیا۔ ازراہ کرم مجھے ہندوستان کے مسلمانوں

کے حالات سے آگاہ کجیے۔ کہ وہ عملی جدوجہد میں مصروف ہیں یا کہیں تھک کر تو نہیں بیٹھ گئے۔ یہ فرمایئے کہ وہ لوگ جن کی صداؤں کی حرارت و تپش سے آسمان کے فرشتے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کیا اب ان کی کیفیت وہی ہے؟ کیا ان میں اپنے مذہب کی حرارت باقی ہے۔ کہ اسلامی اصولوں کی بنیاد پر ہی وہ کامرانی حاصل کر سکتے تھے۔

⑤ سے ⑦ معنی: ورق ایام: زمانے کی کتاب کا ورق۔ تزلزل: خرابی۔

مطلب: مولانا حالی نے جس وقت شیخ سعدی کی باتیں سنیں تو وہ ان سے متاثر ہو کر حالی کی آنکھوں میں اشک بھر آئے اور جواباً بولے کہ صاحب اعجاز حقیقت یہ ہے کہ جب ہندوستان میں مسلمانوں کا اقتدار ختم ہوا اور یورپ سے آکر فرنگی مسلط ہو گئے تو یہ فطری امر ہے کہ اپنی تہذیب، تعلیم اور زبان بھی ہمراہ لے کر آئے۔ تو مسلم زعماء نے سوچا کہ اب اس جدید تعلیم کو اپنائے بغیر ملت کامیابی کے مرحلے طے کر سکتی ہے نہ اس معاشرے میں باوقار انداز میں بسراوقات کر سکتی ہے لیکن اس جدید تعلیم کا رد عمل یہ ہوا کہ مسلمانوں کے عقائد متزلزل ہو کر رہ گئے چنانچہ صورت یہ ہے کہ دنیاوی عز و جاہ تو کسی حد تک حاصل ہو گیا لیکن مذہب کا تصور دھندلا پڑ گیا۔

⑧ سے ⑨ معنی: زمیں گیر پست۔ زخمہ: منفراب۔ جمعیت: جماعت۔

مطلب: اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے مولانا حالی نے کہا ”اگر دین باقی رہا ہو تو پھر مقاصد میں بھی بلندی پیدا ہو جاتی ہے لیکن جب دین ہی باقی نہ رہے تو نوجوانوں سے کسی کار خیر کی توقع عبث ہے۔ ان میں الحاد کے تاثرات پیدا ہو جائیں تو یہ ایک فطری امر ہے۔ مذہب کے طفیل ہی ملت کے افراد میں اتفاق و اتحاد برقرار رہ سکتا ہے اور اسی کے سبب ملت عملی جدوجہد کے لیے متحرک رہتی ہے۔

⑩ سے (13) معنی: خرما: سبجور۔ دینا: اون۔ پشم: نمل یا ریشم۔

مطلب: چنانچہ یہ جان لینا چاہیے کہ کسی عمارت کی بنیاد لرز جائے تو اس عمارت کے انجام کا آغاز ہو چکا ہے یعنی ملت نے اپنے اصولوں کو چھوڑ کر خود اپنے زوال کا سامان پیدا کر لیا ہے۔ ملت کا استحکام تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ اپنے اصولوں اور تعلیمات پر مضبوطی سے قائم رہیں۔

آہم اب صورت احوال یہ ہے کہ جدید تہذیب کے سبب مسلم نوجوانوں نے اپنی تعلیمات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے تو ان کا الحاد کی طرف مائل ہو جانا کوئی حیران کن بات نہیں۔ شیخ صاحب! میں نے حقیقت آپ کے دربرور رکھ دی ہے لیکن خدا کے لیے آنحضرتؐ کے دربار میں حاضری دیں تو اس صورت حال کا ذکر نہ کرنا ورنہ ہندی مسلمان مجھے پھل خور سمجھیں گے اور آخر میں آپ کے ہی ایک شعر کے حوالے سے کہتا ہوں کہ ہم نے جو کانٹے بوئے ان سے سبجور حاصل کرنے کی توقع عبث ہے اور جوان ہم نے تیار کی اس سے حریر و پرنیاں اور ریشم تیار نہیں ہو سکتا۔

مذہب

151

تضمین بر شعر میرزا بیدل

تعلیم پیر قلف مغربی ہے یہ ناداں ہیں جن کو ہستی غائب کی ہے تلاش
 پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا ہے سچ بھی مثال برہمن صنم تراش
 محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش
 مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنون خام ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش
 کتا مگر ہے قلف زندگی کچھ اور مجھ پر کیا یہ مرشد کمال نے راز فاش
 ”باہر کمال اند کے آشفتگی خوش است
 ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباح“

*

معنی: پیر: عالم، سائنسدان۔ ہستی غائب: ذات خداوندی سے مراد ہے۔ برہمن: برہمن کی طرح۔
 جنون خام: جنون کی ابتدائی حالت۔ انتعاش: بلند ہونا۔ مرشد کمال: میرزا بیدل کی طرف اشارہ ہے۔
 مطلب: یہ تضمین جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے پنڈ (ہمارا) کے ممتاز فارسی شاعر اور نثر نگار میرزا عبدالقادر
 بیدل کے ایک شعر پر اقبال نے تخلیق کی ہے۔ روایت ہے کہ میرزا بیدل انتہائی زود گو شاعر تھے انہوں
 نے کم و بیش ایک لاکھ شعر تخلیق کیے۔

اقبال کہتے ہیں کہ مغرب کے جدید فلسفیوں نے اپنے اس نقطہ نظر کی تبلیغ میں سر پیر کا زور لگایا دیا ہے
 کہ وہ لوگ ناداں اور احمق ہیں جو اس دنیا میں رہتے ہوئے ایسی ہستی کو حقیقت مطلق تصور کرتے ہیں جو
 ہمیشہ نگاہوں سے غائب رہی ہے اور بظاہر اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس پر وہ یکنڈے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا
 ہے کہ مسلمان زعماء بھی غیر مسلموں کی طرح خدا کے وجود سے غافل ہو کر ظاہری اشیاء یعنی بتوں کو سب
 کچھ سمجھنے لگے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ علوم جدید کی بنیاد حواسِ خمسہ پر ہے۔ اسی سبب آج دنیا بھر کے
 مذہبی عقائد ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئے ہیں۔

مغربی دانشوروں کے نزدیک مذہب ایک ناچختہ جنون کی حیثیت رکھتا ہے۔ بس اسی ناچختہ جنون کی بنیاد
 پر مذہب پر یقین رکھنے والے لوگوں کے حوصلے بلند رہتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ ان مغربی دانشوروں کے مقابلے پر میرزا بیدل نے اپنے کمال علم کی بنیاد پر یہ راز
 فاش کیا ہے کہ دنیا میں ہر کمال کے لیے تھوڑا سا جنون اور دیوانگی بھی درکار ہوتی ہے۔ خواہ اس کمال کا
 تعلق عقل کل سے ہی ہو۔ جنون کے بغیر تو عقل کل بھی بے معنی شے ہے۔

جنگ یرموک کا ایک واقعہ

152

صف بستہ تھے عرب کے جوانان تیغ بند تھی خنجر حنا کی عروس زمین شام

اک نوجوان صورت سیماں مضطرب
اے بو عبیدہ رخصت پیکار دے مجھے
پیتاب ہو رہا ہوں فراق رسولؐ میں
جاتا ہوں میں حضور رسالتؐ پناہ میں
یہ ذوق و شوق دیکھ کے پر غم ہوئی وہ آنکھ
بولا امیر فوج کہ ”وہ نوجوان ہے تو
پوری کرے خدائے محمدؐ تری مراد
پہنچے جو بارگاہ رسولؐ میں تو
ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے جو وعدے کیے تھے حضورؐ نے“

*

میدان یرموک اردن میں شام کے قریب واقع جہاں ایک زمانے میں شام کی حکمرانی ہو ا کرتی تھی۔ یہ وہ میدان ہے جہاں پندرہویں ہجری میں حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح کی سپہ سالاری میں صرف بیس ہزار مسلمان سپاہیوں کے لشکر نے روم کے ان عساکر کو شکست فاش دی جن کی تعداد دو لاکھ بتائی جاتی ہے۔ حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح نے اس معرکے بعد فاتح شام کی حیثیت سے شہرت پائی۔ اس جنگ کے آغاز میں ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا جس کو اقبال نے ان اشعار میں نظم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

① سے ⑤ معنی: حنا: مراد خون ہے۔ صورت سیماں مضطرب: شوق شادت میں بیتاب۔ امیر عساکر: سپہ سالار۔ بو عبیدہ: ایک صحابی۔

مطلب: میدان جنگ میں ردی افواج کے مقابلے پر عرب افواج کے تیغ و تلوار سے مسلح ہوتے صف آرا تھے اور شام کی سرزمین پر ہردو افواج کے سرفروشوں کا خون بہنے والا تھا۔ اس لمحے مسلمان افواج سے ایک نوجوان بڑی تیزی سے اپنی صف سے نبرد آزمائی کے لیے رخصت ہو چکا ہے لہذا مجھے سب سے درخواست کی کہ میرا صبر و سکون دشمنوں سے نبرد آزمائی کے لیے رخصت ہو چکا ہے لہذا مجھے سب سے پہلے جنگ کی اجازت دیجیے۔ اس لیے کہ میں تو آنحضرتؐ کی جدائی میں بیتاب ہو رہا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ عشق رسولؐ میں ایک لمحے کی زندگی بھی حرام ہے۔ بندہ پرور! میں تو بلا تاخیر آنحضرتؐ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا خواہاں ہوں۔ ہاں اگر آپ ان کے لیے کوئی پیغام دینا چاہیں تو میں بخوشی حضورؐ تک پہنچا دوں گا۔

⑥ سے ⑩ معنی: تیغ بے نیام: بنگی تلوار۔ غیور: غیرت مند۔

مطلب: لشکر اسلام کے امیر ابو عبیدہؓ ایک لمحے تک خاموش رہے اور اس نوجوان میں راہ حق میں شادت کا جوش و خروش دیکھ کر شدت جذبات سے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ہر چند کہ ان نگاہوں میں تلوار کی سی کٹ تھی پھر بھی آنسو بہنے لگے۔ وہ نوجوان سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ تیری شادت کی آرزو رب ذوالجلال پوری کرے تاہم یہ ثابت ہوگی کہ حضورؐ سے تیری محبت کا مقام بہت بلند ہے۔

اے نوجوان! جب تو اپنی مراد پالے اور بارگاہ رسالت میں پیش ہو تو اس غلام کی جانب سے بعد از سلام دست بستہ گزارش کرنا کہ ہم پر رب ذوالجلال نے اپنی رحمتوں کی بارش کر دی ہے اور حضورؐ نے امت مسلمہ سے جو وعدے کیے تھے وہ ایک ایک کر کے پورے ہو رہے ہیں۔

مذہب

153

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

*

معنی: اقوام مغرب: یورپی اقوام۔

مطلب: اس مختصر نظم میں اقبال مسلمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تجھے اپنی ملت اور اس کی تعلیمات کا تقابل اقوام مغرب سے نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ اپنی ترتیب و تنظیم کے اعتبار سے آنحضرتؐ کی امت دنیا بھر کی دوسری قوموں سے قطعی مختلف واقع ہوئی ہے۔ مغربی اقوام کا واردہ اور تو خطہ ارض اور ان کی نسل و خون کی نسبت پر ہے جب کہ اے مسلمان تیری جمعیت کا انحصار اتحاد اور مذہب کی قوت پر ہے انہی کے سبب ملت میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔

اے مسلمان! یہ نکتہ ذہن نشین کر لے کہ اگر تو نے دین کو ترک کر کے مغرب کے لوگوں کی طرح مذہب کو ذاتی اور انفرادی معاملہ تصور کر لیا تو تیری جمعیت کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا اور جمعیت کا خاتمہ ہوا تو قوم و ملت کا وجود ختم ہو کر رہ جائے گا۔

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

154

ڈال گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے
ہے لازوال عمد خزاں اس کے واسطے کچھ واسطہ نہیں ہے اے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصل خزاں کا دورر خالی ہے جیب گل زر کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے ظلوت اور ارق میں طور رخصت ہوئے ترے شجر سایہ وار سے
شاخ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو نا آشنا ہے قاعدہ روزگار سے

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

*

معنی: سحاب: بادل۔ زر کامل عیار: بالکل کھرا سونا۔ شاخ بریدہ: کٹی ہوئی شاخ۔ قاعدہ روزگار:

زمانے کا قاعدہ۔ استوار: مضبوط۔ پیوستہ: چنارہ۔

مطلب: علامہ اقبال کہتے ہیں کہ موسم خزاں سے اگر کوئی شاخ جھڑ کر درخت سے جدا ہو گئی تو بہار کے موسم میں کتنے ہی بادل برسیں وہ شاخ کسی سرے پر بھی شاداب و سرسبز نہیں ہو سکتی۔ خزاں کا موسم اس شاخ کے لیے لازوال حیثیت کا مالک ثابت ہو گا اور اس شاخ کا درخت کے دوسرے پتوں اور شاخوں کے ساتھ کوئی ربط و تعلق نہیں رہے گا۔ جب کہ اے مسلمان تیرے گلستان میں بھی ایک طرح سے خزاں کے دور کا تسلط ہے اور ملت ہر نوع کی صلاحیت سے عاری ہو چکی ہے۔ تیری ملت کے زعماء جن کی رہنمائی سے حالات رو بہ اصلاح تھے وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔

اے مسلمان! درخت کی اس جھڑ جانے والی شاخ سے سبق حاصل کر کہ تو آج بھی زمانے کے دستور سے آگاہ نہیں ہے۔ تیری بہتری اسی میں ہے کہ ملت و قوم کے ساتھ اپنا رابطہ برقرار رکھے اور خزاں کے بعد متوقع موسم بہار سے تعلقات استوار کرے۔

شب معراج

155

آخر شام کی آتی ہے فلک سے آواز سجدہ کرتی ہے سحر جس کو وہ ہے آج کی رات
رہ یک گام ہے ہمت کے لیے عرش بریں کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

✱

معنی: رہ یک گام: ایک قدم کا فاصلہ۔ عرش بریں: قرب الہی سے مراد ہے۔ معراج: انبوی معنی بیڑی۔

مطلب: ہر چند کہ یہ انتہائی مختصر نظم محض دو اشعار پر مشتمل ہے مگر موضوع کو پس منظر کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اقبال نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ شب معراج کے ساتھ بحیثیت شاعر خود ان کی فکری عظمت کی دلیل ہے۔ فرماتے ہیں کہ

آسمان کی وسعتوں سے ستارہ شام کی آواز آرہی ہے کہ ”شب معراج“ ایسی عظمتوں والی رات ہے جس کو سحر بھی سجدہ کرتی ہے یعنی اس کا احترام کرتی ہے۔ یہی ”شب معراج“ مسلمانوں کو سبق دے رہی ہے کہ ہمت تو زمین سے عرش بریں کا فاصلہ صرف ایک قدم کی راہ ہے۔

پھول

156

تجھے کیوں فکر ہے، اے گل! دل صد چاک بلبل کی تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے
تمنا آبرو کی ہو کر گھڑا ہستی میں تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
صنوبر باغ میں آ رہی ہے، پابگل بھی ہے انہیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے
تک بخشی کو استغنا سے پیغام فحالت دے نہ رہ منت کش شبنم، غموں جام و سبو کر لے

نہیں یہ شان خودداری، چمن سے توڑ کر تجھ کو
چمن میں غنچہ گل سے یہ کہہ کر اڑ گئی شبنم
اگر منظور ہو تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا
اسی میں دیکھ! مضر ہے کمال زندگی تیرا
جو تجھ کو زینت دامن کوئی آئینہ رو کر لے

✱

معنی: اے گل: مراد ہے مسلمان۔ پائگل: ایک جگہ مڑا ہے۔ تنگ بخشی: معمول بخشش۔ استغنا: بے نیاز۔ خجالت: مذمت۔ گلوں: اوندھا۔ جہان رنگ و بو: دنیا کی گونا گوں دلقریبیوں۔ آئینہ رو: یعنی محبوب۔ مطلب: اقبال زیر تشریح نظم میں پھول سے منکالمہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے پھول! بلبل کا دل اگر کسی کے فراق میں ریزہ ریزہ ہوتا ہے تو تجھے اس کی اتنی فکر کیوں ہے کہ تیرے لبوے میں جو چاک ہیں پہلے ان کو روک کرنے کی فکر کر۔ مراد یہ کہ دوسروں سے ہمدردی جتانے سے پہلے اپنے بریدہ دامن کا جائزہ بھی تو لینا چاہیے۔ اگر اس گلزار ہستی میں آبردار و عزت و وقار کی خواہش ہو تو اس کے لیے یہ لازم ہے کہ کانٹوں کے مابین زندہ رہنے کی عادت بھی اختیار کر لی جائے۔ مراد یہ ہے کہ زندگی تو بے پناہ مشکلات سے عبارت ہے اس کو باوقار طریقے پر گزارنے کے لیے یہ امر لازم ہے کہ مشکلات سے عمدہ بر آہونے کی عادت ڈال لی جائے۔ یہ کامیابی اور کامرانی کا واحد راستہ ہے۔

صنوبر کا درخت ہر نوع کے پھل سے بے نیاز ہے۔ اسی لیے اس درخت کو آزاد تصور کیا جاتا ہے۔ اس آزادی کے باوجود وہ پابند بھی ہے کہ اس کی جڑیں زمین میں پیوست ہیں تو بھی صنوبر کی طرح سے آزادی حاصل کر لے کہ وہ آزاد بھی ہے اور ایک حد تک پابند بھی ہے۔ مراد یہ ہے کہ مادر پدر قسم کی آزادی تو کسی مرحلے پر بھی مفید نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی شخص تجھے برائے نام فیاضی سے ممنون احسان کرنا چاہے تو تیری انا کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی فیاضی کو قبول نہ کرے کہ میرے ایک دوسرے شعر کے مطابق اگر کسی پیارے کو سمندر سے شبنم کے محض چند قطرے دستیاب ہوں تو یہ رزاقی اور فیاضی نہیں بلکہ انتہائی کتبوسی کا مظاہرہ ہے۔ اگر تیرے پیارے میں کوئی شراب کے محض چند قطرے ڈالنا چاہے تو ان کو قبول کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ اپنا پیارہ الٹا کر رکھ دے یعنی شراب کے چند قطروں کو قبول کرنے سے بہتر یہ مناسب ہے کہ پیارہ خالی ہی رہے۔

یہاں ایک بار پھر اقبال پھول سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ یہ شان خودداری تو نہیں کہ باغ میں جا کر کوئی تجھ کو شاخ سے توڑ لے اور پھر کوئی اپنی پگھڑی میں لگا لے تو کوئی ہار میں پرو کر گلے کی زینت بنالے۔ شبنم اس راز کو غنچہ گل پر منکشف کر کے اڑ گئی کہ اگر تجھے پھول توڑنے والے کے ظلم برداشت کرنے کا حوصلہ ہے تو اس کے لیے اپنے دامن میں رنگ و بو پیدا کر لے کہ کبھی تو محض پھول کو اسی وقت توڑنے کا خواہش مند ہوتا ہے جب وہ اس میں رنگ و بو محسوس کر لیتا ہے۔ اے پھول اگر تو چاہتا ہے کہ تجھے کبھی خزاں سے واسطہ نہ پڑے تو پھر رنگ و بو کے حصول سے اجتناب کر۔ بلکہ اس اجتناب سے قبل رنگ و بو کے حصول کی خواہش ترک کر دے۔

اس ساری صورت حال کے برعکس اے پھول! تیری زندگی کا کمال اسی حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ

تجسکو کوئی خوبصورت چہرہ اپنے دامن کی زینت بنا لے۔

اس نظم میں اقبال بظاہر پھول سے مکالمہ کرتے ہیں اور اس مکالمے میں کچھ متضاد باتیں بھی آگئی ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے عارفانہ انداز کلام میں کچھ ایسے نکتوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جن کا تعلق حیات انسانی سے ہے۔ ان مرحلوں میں پھول کو محض علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

شیکسپئیر

157

شفق صبح کو دریا کا خرام آئینہ نغمہ شام کو خاموشی شام آئینہ
برگ گل آئینہ عارض زیبائے بہار شاہدے کے لیے مجلہ جام آئینہ
حسن آئینہ حق اور دل آئینہ حسن دل انسان کو ترا حسن کلام آئینہ
ہے ترے فکر فلک رس سے کمال ہستی
کیا تری فطرت روشن تھی مال ہستی
تجھ کو جب دیدہ دیدار طلب نے ڈھونڈا تاب خورشید میں خورشید کو پنہاں دیکھا
چشم عالم سے تو ہستی رہی مستور تری اور عالم کو تری آنکھ نے عیاں دیکھا
حفظ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

*

زیر تفریح فرمائشی نظم دو بند پر مشتمل ہے۔ فرمائشی اس لیے کہا گیا ہے کہ ایک روایت کے مطابق شیکسپئیر کے بارے میں دنیا بھر کے بڑے بڑے شعراء سے نظمیں لکھوائے کی تحریک چلی۔ ان نظموں کے انگریزی تراجم بعد میں کتابی شکل میں شائع کیے گئے۔ اقبال نے بھی دنیا کے اس ممتاز ڈرامہ نگار اور شاعر کے بارے میں یہ نظم لکھی۔

پہلا بند معنی: شاہدے، محبوبہ شراب۔ مجلہ جام: پیالے کی جلوہ گاہ۔

مطلب: اس بند میں اقبال کہتے ہیں کہ علی الصبح جب شفق پھوٹی ہے اور اس کا سرخ عکس پتے دریا پر پڑتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ شفق کے لیے دریا کا شفاف رواں پانی آئینے کی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح شام کے وقت نغمہ ریزی کے لیے اس لمحے کا سکوت آئینے کا کام دیتا ہے۔ بہار کے خوبصورت رخسار کے لیے پھولوں کی پتیاں بھی آئینے کی مثال ہوتی ہیں اور پیانہ شراب کے لیے آئینے کا کام دیتا ہے۔ اسی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حقیقت اور سچائی کے لیے حسن آئینے کی صفت رکھتا ہے۔ اس منظر نامے میں اگر شیکسپئیر کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو وہ قاری کے لیے انسانی نفسیات کے اسرار درموز کو سمجھنے کے لیے آئینہ ہے۔

اقبال اس شعر میں شیکسپئیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں تیرے بلند فکر کلام نے انسان کو زندگی کے حالات سے روشناس ہونے کے مواقع فراہم کیے۔ کیا تیری روشن فطرت زندگی کے انجام سے عبارت تھی۔ یا پھر تیرے بعد تجھ سا دوسرا کوئی پیدا نہیں ہوا؟ اس سوال سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال

شیکسپیر کی خلا قانہ صلاحیت کے کس قدر قائل تھے۔

دوسرا بند معنی: مستور: چھپا ہوا۔ حفظ اسرار: بھید چھپانا۔ سودا: جنون۔

مطلب: یہاں اقبال کہتے ہیں کہ اے شیکسپیر! تو وہ عظیم تخلیق کار ہے کہ جب بھی کسی مداح نے تیرا دیدار کرنا چاہا تو اس طرح محسوس کیا جیسے سورج کی تیز اور آنکھوں کو چند حیا دینے والی روشنی میں سورج کے وجود کو دیکھ رہا ہے۔ ہر چند کہ دنیا کی نگاہوں سے تیرا وجود پوشیدہ رہا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار کی گنجائش نہیں کہ تیری بصیرت افروز نگاہوں نے ساری کائنات کو عیاں اور بے پردہ دیکھ لیا۔ آخری بات یہ ہے کہ اپنے رازوں کو چھپانے کا فطرت کو ایسا جنون ہے کہ تیرے بعد شاید کوئی شخص تخلیق نہ کیا جاسکے جو تیری طرح فطرت کے رازوں کو افشا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

میں اور تو

158

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں نوائے سوختہ درگلو، تو پریدہ رنگ، رنیدہ بو
مرا عیش غم، مرا شدم، مری بود، ہم نفس عدم
دم زندگی رم، زندگی غم، زندگی سم، زندگی
تری خاک میں ہے اگر شر تو خیال، فقر و غنا نہ کر
کوئی ایسی طرز طواف تو مجھے اے چراغِ حرم بتا
مکہ بجائے وقفا، نہ کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
نہ ستیزہ گاہ جہاں تھی، نہ حریف پنجہ گلشن نئے
کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں خنجر کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری

*

یہ نظم علامہ اقبال کے مخصوص طرز فکر کی آئینہ دار ہے جس میں انہوں نے اپنی ذات اور ملت کے جملہ افراد کے کردار کا ایک تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ اقبال کو دراصل مسلمانوں کے سیاسی اور اخلاقی زوال کا جو دکھ تھا اسے وہ اپنے شاندار ماضی کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ ان کے عہد میں مسلمانوں کی جو صورت حال تھی اس کے پیش نظر ان کے کرب میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کرب کا اظہار ان کی بیشتر نظموں اور اشعار میں ہوتا ہے اس ساری کیفیت کے باوجود وہ بہت کم مایوس نظر آتے ہیں۔ رجائیت کی ایک واضح لہر اقبال کی شاعری کا بنیادی عنصر ہے۔ چنانچہ زیر تشریح نظم میں وہ یوں گویا ہوتے ہیں۔

②① معنی: شیوہ آوری: آزر کا طریقہ مرادبت پرستی۔ درگلو: حلق میں۔ حدیث ماتم: ماتم کا افسانہ۔

مطلب: اے عمر جدید کے مسلمان! میں دیکھتا ہوں کہ اپنی تمام تر معنوری کے باوجود مجھ میں حضرت موسیٰ کی کلیسی کا کوئی عنصر موجود نہیں ہے اور جہاں تک تیری ذات اور کردار کا تعلق ہے تو بھی حضرت ابراہیمؑ، خلیلؑ، اللہ کا کسا، اک سنت سے بھی بہرہ ور نہیں ہے۔ اس کے برعکس میں کلیم ہونے کی بجائے

میں بھی سامری جیسے ساحر کے زیر اثر آ گیا ہوں۔ اور تو بھی اپنے صحیح راستے سے ہٹ کر آزر کی مانند بت گری اور بت فردشی کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہوں۔ میری مثال دیکھا جائے تو اس بلبل کے مانند ہے جس کی آواز اس کے گلے میں تحلیل ہو کر رہ گئی ہو۔ اور تیری کیفیت اس پھول کی سی ہے جس کا رنگ بھی اڑ چکا ہے اور خوشبو بھی اس کو داغ مفارقت دے گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں خصوصیات کے بغیر پھول ایک مجہول و مغفوج وجود بن کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں تو اپنی آرزوؤں کے غم کی حکایت بن چکا ہوں اور تو محبوبیت کے ماتم کا مظہر بن چکا ہے۔

④③ معنی: سم: زہر۔

مطلب: ان حالات میں عیش و مسرت میرے لیے غم و اندوہ کا روپ و ہار چکے ہیں۔ میرے لیے اب شدید زہر کی مانند تلخ ہو چکا ہے۔ اس لمحے میرا وجود عدم وجود زندگی اور موت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح تیرا دل جو حرم کعبہ کی مانند پاکیزہ تھا اب غیر اسلامی عقائد و تصورات کے پاس رہن رکھا ہوا ہے جب کہ تو نے اپنے دین کو کافرانہ خیالات کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ زندگی کا ایک ایک سانس جو گزر رہا ہے زندگی کو کم کر رہا ہے۔ اور اسے خاتے کی طرف لے جا رہا ہے اور یہ ساری صورت حال ہمیں غم زدہ کر رہی ہے۔ یہ غم فی الواقع ایک زہر کی مانند ہے جو آخر کار ہماری زندگیوں کا خاتمہ کر کے رکھ دے گا۔ لیکن ہمیں زندگی کے گزارنے اور اس غم کے زہر کی پروا نہیں کرنی چاہیے کہ قلندر کی شان یہی تو ہے۔

⑥⑤ معنی: نان شعیر: جو کی روٹی۔

مطلب: اے مسلمان! اگر تیرے وجود میں غیرت اور حمیت کی کوئی چنگاری باقی رہ گئی ہے تو تجھ افلاس و امارت کا خیال ہی نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ شیر خدا حضرت علیؑ کی تمام قوت کا انحصار جو کی روٹی پر تھا۔ یہی ان کی خوراک جو کی روٹی ہی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے خیر کار اور اکھاڑ بھینکا۔ اے چراغ حرم! میں تیرے گرد طواف تو کر رہا ہوں لیکن کوئی ایسا طریقہ بتا دے کہ تیرے دیوانے اور شیدائی کو مشکلات سے نبرد آزما ہونے کا کوئی گر حاصل ہو جائے۔

⑦ سے ⑨ معنی: ہری ہری: خدا خدا۔ ستیزہ گاہ: جنگ کا میدان۔ پنچہ فلن: پنچہ آزمانے والے۔ مرجی: ایک یہودی۔ یہاں مراد ہے اسلام دشمن۔

مطلب: دنیا بھر کے مسلمانوں سے کہئے کہ جو شکایت ہے اگر میں اس کا اظہار کسی بت کے لیے میں کروں تو وہاں رکھے ہوئے بت بھی اظہار ہمدردی کے طور پر توبہ توبہ کرنے لگ جائیں کہ حرم کعبہ جو دین کی عظمت کی علامت ہے ہم نے اس کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے اور مخالف قوتوں کے ہمنوا بن گئے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ دنیا بھر میں بے شمار انقلابات آئے جنہوں نے بے شمار تہذیبوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ اس کے باوجود دیکھا جائے تو صورت حال میں کوئی بنیادی اور واضح تبدیلی رونما نہیں ہوئی کہ آج بھی معاشرتی سطح پر ساری دنیا میں حق و باطل کے مابین آویزش جاری ہے۔ ایک جانب مرحب و عنوتو جیسے لوگ باطل کو فروغ دینے کی سعی میں مبتلا ہیں۔ دوسری جانب شیر خدا حضرت علیؑ مرتضیٰ حق کی حمایت میں تبحر بہت ہیں۔

آخری شعر میں اقبال آنحضرتؐ سے رجوع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے عرب و عجم کے مالک ہم پر کرم کر۔ کہ ہم اگرچہ بھکاری ہیں لیکن تیری تعلیمات نے ہمارے مزاج میں سکندر جیسی مملکت پیدا کر دی ہے۔

اسیری

159

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشک ازفر چیز کیا ہے، اک لہو کی بوند ہے مشک بن جاتی ہے ہو کر نافہ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
”شہپر زانغ و زغن در بند قید و صید نیست
ابن سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند“

*

یہ نظم اپنے پس منظر کے اعتبار سے ان نظموں میں سے ایک ہے جو اقبال نے خالصتاً سیاسی موضوعات کے حوالے سے کہیں اور مختلف سیاسی اجتماعات میں پڑھیں۔ ہر چند کہ یہ نظم تحریک خلافت کے دوران مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی گرفتاری اور رہائی کے بعد امرتسر کے ایک جلسہ عام میں سنائی گئی لیکن موضوع اور پتویشن کے اعتبار سے یہ آج بھی اسی قدر تروتازہ ہے جتنی کہ 1919ء میں تھی۔ اس لیے کہ حکومتوں کے خلاف احتجاج اور گرفتاریوں کا سلسلہ ہر دور میں جاری رہا ہے اور ان کی نوعیت میں بھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اقبال نے اسیری اور زندان کو کس رخ سے دیکھا ہے۔ ان اشعار سے اندازہ ہو سکے گا۔ فرماتے ہیں کہ:

معنی: اعتبار افزا: قدر و منزلت بڑھانا۔ قطرۂ نیساں: پسی میں ابر بہار کی بوند۔ مشک ازفر: خالص مشک۔ نافہ آہو: ہرن کی ناف۔ شہپر: بال و پر۔ زانغ و زغن: کوا اور چیل۔

مطلب: اگر فطرت بلند ہو تو اسیری اور نظربندی انسانی وقار میں اضافے کا سبب بنتی ہے اس کی مثال وہ بارش کے ایک معمولی قطرے سے دیتے ہیں جو پسی میں بند ہو کر ایک نایاب موتی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح وہ مشک کے حوالے سے یک دوسری مثال بھی پیش کرتے ہیں کہ خالص مشک خون کا ایک قطرہ ہی تو ہے جو ہرن کی ناف میں منجمد ہو کر خالص مشک کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور نایاب شے بن جاتا ہے۔ لیکن قدرت اس انداز میں ہر کسی کی تربیت نہیں کرتی۔ دنیا میں کم ہی ایسے پرندے ہیں جنہیں جال اور پنجرے میں رکھا جاتا ہے۔ بقول حافظ شیرازی اگرچہ کوئے اور چیل بلند پرواز ہیں لیکن انہیں کوئی پنجرے میں بند نہیں کرتا۔ یہ امتیاز تو محض شاہیں اور عقاب کو حاصل ہے۔

دریوزہ خلافت

160

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے تو احکام حق سے نہ کر یوفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟ خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لو سے مسلمان کو ہے ننگ وہ پادشائی
مرا از شکستن چنان عار ناید
کہ از دیگران خواستن مومیائی

*

معنی: گدائی: بھیک مانگنا۔

مطلب: گزشتہ نظم ”اسیری“ میں تحریک خلافت کے ضمن میں اقبال نے جو گول مول رویہ اختیار کیا ہے اس کی توجہ زیر تشریح نظم سے ہو جاتی ہے۔ اقبال تحریک خلافت کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ اقتدار کوئی بھیک میں نہیں دیتا بلکہ قوت بازو سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کی واضح مثال پہلی عالمی جنگ میں ترکی پر انگریزوں کا تسلط اور ہندوستانی مسلمانوں سے ان کی بدعہدی تاریخی شواہد کے طور پر علامہ کے سامنے تھیں۔ بعد میں حالات و واقعات نے ثابت کر دیا کہ ترکی کے ضمن میں اقبال کی سوچ صد فی صد درست تھی اور ہندوستانی مسلمانوں کی جانب سے چلائی ہوئی تحریک خلافت بے جواز تھی۔ بعد میں ترک جرنیلوں نے ہی انگریزوں سے لڑ کر اپنے وطن کو آزاد کرایا۔

زیر تشریح نظم میں اقبال کہتے ہیں کہ اے ملت اسلامیہ کے فرزندو! بے شک یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ تمہارے ملک پر دوسرے لوگ مسلط ہو جائیں لیکن اگر ملک ہاتھوں سے چلا بھی گیا ہے تو احکام حق سے بے وفائی کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ وہ استفسار کرتے ہیں کہ آج تم لوگ خلافت کی گدائی کرنے لگے ہو۔ تو کیا تمہیں تاریخ سے واقفیت حاصل نہیں ہے۔ تاریخ تو واضح طور پر اس امر کا انکشاف کرتی ہے کہ حکومت اور سلطنت مانگے سے نہیں ملا کرتی بلکہ قوت بازو سے حاصل ہوتی ہے اور یہ کہ جس پادشاہی کو اپنے لوہے نہ خریدا جائے وہ تو مسلمانوں کے لیے باعث ننگ ہے۔ اقبال کہتے ہیں میرے نزدیک اپنی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے علاج کی خاطر غیروں سے مرہم حاصل کرنا بے غیری کی بات ہے۔

ہمایوں

161

(مشر جسٹس شاہ دین مرحوم)

اے ہمایوں زندگی تیری سراپا سوز تھی تیری چنگاری چراغ انجمن افروز تھی
گرچہ تھا تیرا تن خاکی نزار و درد مند تھی ستارے کی طرح روشن تری طبع بلند
کس قدر بیباک دل اس ناتواں پیکر میں تھا شعلہ گردوں نور اک مشت خاکستہ مہ تھا

موت کی لیکن دل دانا کو کچھ پروا نہیں شب کی خاموشی میں جز ہنگامہ فروا نہیں
موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

*

میاں دین محمد کا شمار پنجاب کے ان زعماء میں کیا جاتا ہے جو بیسویں صدی کے اوائل میں اس خطہ ارض کی عزت و تحریم کا سبب تھے۔ وہ اقبال کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ 1918ء میں وفات پائی تو اقبال نے یہ تعزیتی اشعار لکھے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ جس دین محمد شاعر بھی تھے اور ”ہمایوں“ تخلص کرتے تھے۔ مرحوم کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے میاں بشیر احمد نے اپنے والد کے نام پر ہی بلند پایہ ادبی رسالہ ”ہمایوں“ جاری کیا۔ خود اقبال کی بیشتر نظمیں اسی جریدے میں شائع ہوئیں۔

معنی: نزار: نجف، کمزور۔ شعلہ گردوں نور: آسمان کو لپٹ میں لینے والا شعلہ۔ مشت خاکستر: خاک کی ایک مٹی۔

مطلب: زیر تشریح اشعار میں اقبال فرماتے ہیں۔ اے ہمایوں! تیری زندگی تو ملت کے لیے سراپا سوز کی حیثیت رکھتی تھی۔ تیری ذات ایک ایسے چراغ کے مانند تھی جو ساری محفل کے لیے روشنی کا سبب بنتا ہے۔ ہر چند کہ تیرا جسم ناتواں خاک کا ایک مختصر سا تودہ تھا لیکن تیری روشن طبع تو ستاروں کی طرح سے منور تھی۔

اے ہمایوں! جو لوگ تیری شخصیت سے آشنا تھے وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ تیرے ناتواں جسم میں کس قدر بیباک اور نڈر دل موجود تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس مٹی بھر مٹی میں ایک ایسا شعلہ موجود تھا جس کی لپک آسمان تک جاتی تھی۔

لیکن دانشمند لوگ موت کی قطعی پروا نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ رات کے سکوت میں آنے والی کل کے ہنگامے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ موت کو احمق لوگ زندگی کے خاتمے سے تعبیر کرتے ہیں جب کہ یہ زندگی کی شام تو انسان کو بیشکلی بخشے والی صبح کے مانند ہے۔

خضر راہ

شاعر

162

گوشہ دل میں چھپائے اک جہان اضطراب
تمہی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب
موج مضطر بھی کہیں گہرائیوں میں مست خواب
انجم کم وضو گرفتار طلسم ماہتاب
جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب

ساحل دریا پہ میں اک رات تھا محو نظر
شب سکوت افزا ہوا آسودہ دریا نرم سیر
جیسے گوارے میں سو جاتا ہے طفل شیر خوار
رات کے انسو سے طائر آشیانوں میں اسیر
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیک جہاں بیتا خضر

کلمہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرار ازل
دل میں یہ سکر
چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب
پا ہنگامہ محشر ہوا
میں شہید جستجو تھا
یوں سخن عسکر ہوا
اے تری چشم جہاں میں پر وہ طوفاں آشکار
”کشتی مسکین“ و ”جان پاک“ و ”دیوار یتیم“
چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد
زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقہ دیرینہ چاک
گرچہ اسکندر رہا محروم آب زندگی
پنچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ
خاک و خون میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش
آگ ہے، اولاد ابراہیم ہے، نمود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا احتمال مقصود ہے

جواب خضر

163

صحرا نوردی

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے؟
اے رہین خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
ریت کے نیلے پہ وہ آہو کا بے پردا خرام
وہ نمود اختر سیلاب پا ہنگام صبح
وہ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب
اور وہ پانی کے چشمے پر مقام کارواں
تازہ دیرانے کی سوائے محبت کو تلاش
پنہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی
ہے یہی اے بے خبر راز دوام زندگی

زندگی

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ٹاپ
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
جادواں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
زندگانی کی حقیقت کو کہن کے دل سے پوچھ
ہنگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
زندگی کی قوت تغیر سے
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تغیر سے
قلم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو

پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنار تو

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار
خاک مشرق پر چمک جائے مثال آفتاب
سوئے گردوں نالہ شبیچہ کا بھیجے سفیر

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

سلطنت

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیہ ان الملوک
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
خون اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
سروریِ نیا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا کن
ہے وہی سازِ کمن مغرب کا جمہوری نظام
دلو استبدادِ جمہوری قبا میں پائے کوب
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
گرمی گفتارِ اعضائے مجالسِ الاماں

سلطنتِ اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمران کی ساحری
دیکھتی ہے حلقہ گردن میں سازِ دلبری
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ ظلمِ سامری
حکمران ہے اک وہی باقی بتانِ آزادی
تا تراشیِ خواجہ از برہمنِ کافر تری
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثرِ خوابِ آوری
یہ بھی اک سرمایہ واروں کی ہے جنگِ زرگری

اس سرابِ رنگِ دبو کو گلستانِ سمجھا ہے تو
آہ! اے نادانِ قفس کو آشیانِ سمجھا ہے تو

سرمایہ و محنت

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
دست دولت آفریں کو مزدیوں ملتی رہی
ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
کت مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیام کائنات
شاخ آہو پر رہی، صدیوں تلک تیری برات
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
اور تو اے پیغمبر سمجھا اے شاخ نہات
”خواجگی“ نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
نغمہ بیداری جسور ہے سلمان عیش
آفتاب تازہ پیدا ہلن گیتی سے ہوا
توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام
باغبان چارہ فرا سے یہ کہتی ہے بہار
کرک ناداں طواف
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو
غنجہ سا غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک
قصہ خواب آور اسکندر و جم کب تلک
آساں! ڈوبے ہوئے تاروں کا مام کب تلک
دوری جنت سے روتی چشم آدم کب تلک
زخم گل کے واسطے تہیہ مرہم کب تلک
شع سے آزاد ہو

اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

دنیاۓ اسلام

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل
ہو گئی رسوا زمانے میں کھاد لالہ رنگ
لے رہا ہے بے فروشان فرنگستاں سے پارس
حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ہو گیا مانند آب ارزاں مسلمان کا لو
گفت روی ہر بنائے کمنہ کا باداں کنند

ی ندانی اول آل

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں

حق ترا چشمے عطا کر دست غافل در مگر

مور بے پر! حلقے پیش سلیمانے مہر

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست

ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بچر
ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر
نیل کے ساحل سے لے کر تانخاک کا شفر
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا سمر
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہگذر
لاکھوں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش

اے گرفتار ابو بکر و علی ہشیار باش

اب ذرا دل تمام کر فریاد کی تاثیر دیکھ
منوج مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
اے مسلمان آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہان پیر دیکھ
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ
سانے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

مسلم استی سینہ را از آردو آباد دار

ہر زماں پیش نظر لا بخلف المعاد دار

*

زیر تحریک نظم اقبال کی طویل نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم کی تفکیک حضرت خضر علیہ السلام اور ایک شاعر کے مابین مکالمے سے ہوئی ہے۔ حضرت خضرؑ کا ذکر قرآن پاک میں بھی آیا ہے تاہم ان کے بارے میں جو مختلف روایات مشہور ہیں۔ ان کے مطابق وہ ایک ایسے پیغمبر ہیں۔ حق تعالیٰ نے جن کو طویل عمر عطا کی ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ازل سے ابد تک دنیا میں موجود رہیں گے۔ اور بھٹکے ہوئے لوگوں کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتے رہیں گے۔ اقبال نے اپنے اشعار میں بے شمار مقامات پر حضرت خضرؑ اور ان کے خصوصی کردار کا ذکر کیا ہے۔ اس مکالمے سے بھی اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حضرت خضرؑ کی رہنمائی کو اہمیت کا حامل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ نظم کا آغاز شاعر کے مکالمے سے ہوتا ہے جس میں وہ شاعر کی زبان سے یوں گویا ہوتے ہیں۔

پہلا بند معنی: سکوت افرا: خاموشی کو بڑھانے والی۔ گہوارے: پینکھوڑا۔ افسوں: جادو۔ انجام کم: کم روشنی والے ستارے۔ طلسم: جادو۔ پیک جہاں پیا: دنیا کی میر کرنے والا قاصد۔ جو یائے اسرار: راز کے متلاشی۔

مطلب: شاعر کہتا ہے کہ ایک شاعرات میں ساحل دریا پر سرگرواں پھر رہا تھا۔ ان لمحات میں نہ جانے میرادل کس لیے اضطراب اور بے چینی میں مبتلا تھا۔ وہ رات انتہائی سکوت آمیز تھی ساحل پر خوشگوار ہوا کا دور دورہ تھا اور اسی مناسبت کے ساتھ دریا بھی بڑی آہستگی اور نرم روی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ اس لمحے دریا کا نظارہ کرتے ہوئے مجھے حیرانی اس امر کی تھی کہ یہ دریا ہے یا پھر پانی کی تصویر

ہے۔ دریا کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے گوارے میں کوئی شیر خوار بچہ خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہو۔ یا پھر پانی کی مضطرب موج تھک تھکا کر محو خراب ہو۔ ان لمحات میں پرندے اپنے آشیانوں میں رات کے سحر میں گرفتار ہو کر سو رہے تھے۔ اور کم روشنی والے ستارے غالباً چاند کے ظلم میں گرفتار تھے۔

اس لمحے سامنے نظر پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ساری دنیا کی رہنمائی کرنے والا حضرت دروہو کھڑا ہے اور اس کی ضیعی میں بھی صبح کی طرح عالم شباب کا رنگ موجود ہے۔ چند لمحے تک خاموش رہنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر یوں گویا ہوا کہ اے شاعر! تو جو ابتدائے آفرینش سے کائنات کے تمام رازوں سے آگاہی رکھنے والا ہے۔ اس حقیقت کو بھی پوری طرح جان لے کہ دل کی آنکھیں روشن ہوں تو پوری کائنات کی تقدیر اور اس کے بارے میں تفصیلات واضح ہو کر پردے سے باہر آ جاتی ہیں۔

حضرت خضرؑ کی زبان سے یہ نکتہ میری سماعت سے نکلایا تو دل میں ایک محشر سا پاپا ہو گیا۔ میں تو ابتداء سے ہی حقیقت کی تلاش و جستجو میں مگن رہا تھا۔ حضرت خضرؑ سے مخاطب ہو کر بولا۔

دوسرا بند : معنی : چشمِ جہاں میں : دنیا کو دیکھنے والی آنکھ۔ کشتی مسکین، جانِ پاک، دیوارِ یتیم : یہ تینوں تلمیحات ہیں۔ آبِ زندگی : (تلخ) آبِ حیات۔ ہاشمی : ترکوں کی طرف سے کہہ میں شریف کہ مقرر ہوا۔ اولادِ ابراہیم : مراد ہے مسلمان۔

مطلب : اے خضرؑ! بے شک تو وہ صاحبِ بصیرت انسان ہے جس کی نگاہیں ان طوفانوں سے بھی آگاہی رکھتی ہیں جو ابھی خاموشی کے ساتھ دریا میں محو خواب ہیں۔ مراد یہ ہے کہ تو ان انقلابات سے بھی واقف ہے جو ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئے۔ اگلے شعر میں اقبال ”سورہ کف“ میں بیان کردہ ایک واقعہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک یتیم و مسکین کی کشتی کو خراب کرنے، ایک بے گناہ بچے کا قتل اور ضیافت سے انکار کر دینے کے باوجود یتیم بچے کی دیوار کو از سر نو تعمیر کرنا اور ان کے بارے میں حضرت موسیٰؑ کے اعتراضات اور سوالات سے اس امر کی غمازی ہوتی ہے کہ نبیؐ ہونے کے باوجود حضرت موسیٰؑ جیسے پیغمبر کا علم بھی تیرے سامنے حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

اے خضرؑ! آخر یہ کیا تماشا ہے کہ تو آبادیوں کو چھوڑ کر صحرا نور دی میں جھلا رہتا ہے اور تیری زندگی دیکھا جائے تو رات دن کے علاوہ آج اور کل یعنی ماضی و مستقبل کے تصورات سے قطعی آزاد ہے۔ مراد یہ ہے کہ تیری ذات ہر نوع کے سرد و گرم سے بے نیاز واقع ہوئی ہے لیکن اتنا بتا دے کہ یہ جو انسان کی زندگی ہے اس کا حقیقی بھید کیا ہے؟ سلطنت و حکومت کی نوعیت کیا ہے؟ اور یہ جو سرمایہ و محنت کے مابین آویزش ہے اس کی بنیاد کیا ہے؟ یعنی سرمایہ دار اور محنت کش کے مابین تصادم کی فضا کیوں قائم ہے۔

اے خضرؑ! آج صورتِ حال یہ ہے کہ ایشیائی ممالک کی تہذیب و ثقافت دم توڑ رہی ہے اور نئی نئی اقوام ہیں کہ اقتدار حاصل کر رہی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ نئی نسلیں ان تازہ ترقی پذیر قوموں کے انداز و اطوار اپنا رہی ہیں۔ ہر چند کہ سکندر جیسا اولوالعزم فاتح پوری کوشش اور جدوجہد کے باوجود آبِ حیات سے محروم رہا اور بیکش کی زندگی نہ اپنا سکا اس کے باوجود آج بھی سکندر کی مانند جنگ و جدل اور فتح و غلبہ کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ ہاشمی جن کے طفیل ساری دنیا میں اسلام و مسرت پذیر ہوا آج ناموس رسولؐ مقبول کو واؤپر لگائے بیٹھے ہیں اور ترک جو ایک عرصے تک اسلام کے مخالف رہے، اب اس کی بقا کے لیے اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں۔

ماضی کی طرح حضرت ابراہیمؑ کی اولاد اور نمود کے مابین آویزش جاری ہے یعنی حق و باطل میں بدستور تصادم ہے اتنا تاکہ کیا اب بھی مسلمان امتحان کے مراحل سے گزر رہے ہیں؟

جواب خضر

صحرا نور دی

تیسرا بند : معنی : تگاپوئے: دوڑ دھوپ۔ دمام: مسلسل۔ رہین خانہ: خانہ نشین۔ بانگ رحیل: قافلے کی رحلت کی صدا۔ حضر: قیام، پاؤ۔ سنگ و میل: راستہ کا نشان۔ نمود اختر سیما: تیز رفتار ستارہ۔ خلیل: حضرت ابراہیمؑ کا لقب۔ سلسبیل: جنت کی ایک نہر۔ زنجیری: تندی، اسیر۔ کشت و فغان: کھیت اور بانات۔

مطلب: شاعر کے استفسارات کے جواب میں خضرؑ یوں گویا ہوتے ہیں کہ اے شاعر! میں جو صحرا نور دی کے شغل سے دوچار ہوں تو تجھے آخر میرے اس عمل پر تعجب کس لیے ہے کہ میری یہ مسلسل بھاگ دوڑ اور جدوجہد عملاً زندگی کی دلیل ہے۔ اے گھڑی چار دیواری تک محدود رہنے والے شاعر! تو نے وہ منظر نہیں دیکھا جب صحرا میں قافلے رواں دواں ہوتے ہیں اور ان کے اونٹوں کی گھنٹیاں عالم سکوت میں نغمے بکھیرتی ہیں۔ ریت کے نیلے پر ہرن بڑی بے نیازی کے ساتھ چوکڑیاں بھر رہا ہوتا ہے اور قافلے بغیر سامان کے کسی سنگ میل کی رہنمائی کے بغیر سفر کرتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ ہر نوع کی پابندیوں سے بے نیاز ہوتے ہیں اور صبح کے وقت جب شمالی فطرت رکھنے والے ستارے طلوع ہوتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آسمان کی بلندی سے حضرت جبرئیلؑ کی پیشانی نمودار ہو رہی ہے۔

اے شاعر! تو اس منظر سے کیسے آشنا ہو سکتا ہے جب کہ شام کے سے صحرا کے سکوت میں سورج غروب ہو رہا ہو یہی منظر حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی وسعت نظر میں اضافے کا سبب بنا۔ پھر جب قافلے تھک کر پانی کے چشمے پر قیام کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جنت میں سلسبیل کے گرد اہل ایمان جمع ہوں جو لوگ عشق و محبت کے جویا ہوتے ہیں وہ تو نئے نئے صحراؤں کی جستجو میں رہتے ہیں جب کہ تیری ذات محض آبادی تک محدود رہتی ہے۔

اے شاعر! حقیقت یہ ہے کہ مسلسل گردش اور صحرا نور دی ہی حرکت اور عمل کی دلیل ہوتے ہیں چنانچہ حقیقی زندگی کا راز ہی یہی ہے۔

زندگی

چوتھا بند : معنی: اندیشہ، فکر۔ سود و زیاں: نفع نقصان۔ تسلیم جاں: جان قربان کرنا۔ امروز و فردا: آج اور کل۔ سر آدم: آدم کی تخلیق کا راز۔ کوہکن: پہاڑ کھودنے والا (مراد فردا)۔ جوئے شیر: دودھ کی نصیب۔ بحر بیکراں: بے کنار اسندر۔ تسخیر فتح: مانند حباب: بلبلے کی مانند۔ شمشیر بے زنمار: پناہ دینے والی

نکور۔

مطلب: آغاز نظم میں اقبال نے شاعر کی وساطت سے صحرا ووردی 'زندگی' سلطنت اور بعض دوسرے عوامل کے ضمن میں جو سوالات اٹھائے تھے ان کا فردا فردا جواب دیتے ہوئے صحرا ووردی کے بعد اس بند میں خضر اس طرح سے زندگی کے بارے میں اپنے نظریات کا اظہار کرتے ہیں کہ اے شاعر! زندگی تو ایک ایسا عمل ہے جو نفع نقصان کے تصور سے بلند ہوتا ہے۔ کہ زندگی کا صحیح مفہوم اس حقیقت میں ہی مضمر ہے کہ زندگی کو اس کے حقیقی تاثر میں دیکھا جائے اس لیے کہ کسی مرحلے پر تو زندگی جان و مال کے تحفظ کا نام ہے اور کسی مرحلے پر راہ حق میں جان و مال قربان کرنے کا نام زندگی ہے۔

اے شاعر! تو زندگی کو آج اور کل کے پیمانے سے کیوں ماپ رہا ہے۔ یہ تو ہر دم موجود رہنے والی ہے اور ہر دم جوان و زندہ شے ہے۔ اگر تجھ زندہ رہنے والے لوگوں میں شامل ہونے کا شوق ہے تو اس کے لازم ہے کہ دوسروں کی جدوجہد پر قناعت کرنے کی بجائے اپنی دنیا خود پیدا کر۔ اسی صورت میں تو یہ جان سکے گا کہ تخلیق آدم کا راز اور دنیا میں ہر شے کے وجود کا کرشمہ زندگی کے عمل سے ہی عبارت ہے۔

اے شاعر! اگر تو فی الواقع زندگی کی حقیقت جاننے کا خواہاں ہے تو اس ضمن میں فرہاد سے رجوع کر جس نے اپنے مقصد عشق کو حاصل کرنے کے لیے پہاڑ کاٹ کر وہاں سے دودھ کی نہر جاری کرنے کا کام کیا تھا۔ اس سے خود بخود اندازہ ہو سکے گا کہ زندگی عیش و عشرت کا نام نہیں بلکہ عمل اور سخت کوشی کا نام ہے۔ یہ بھی جان لے کہ زندگی کا عمل غلامی میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے جب کہ آزادی میں یہی زندگی وسعت پذیر ہو کر بحر بے کنار کی مانند ہو جاتی ہے۔ ہر چند کہ یہ اس کا تعلق خاک کے عصر سے ہے لیکن اس میں دوسروں کو تسخیر کرنے کی بے پناہ صلاحیت بھی موجود ہے۔

اے شاعر! اگر ہستی کو ایک سمندر تسلیم کر لیا جائے تو تیرا وجود اس میں ایک بلبلے کی مانند ہے اور بچ پوچھے تو یہاں یہ زندگی تیرے لیے ایک آزمائش اور امتحان کی حیثیت کی حامل ہے۔ یہ جان لے کہ جب تک تیری زندگی کا عمل ناپختہ ہے تو تیرا وجود محض ایک مٹی کے ڈھیر کی مانند ہے لیکن جب پختہ ہوا تو پھر شمشیر آبدار کی طرح ہے۔

پانچواں بند : معنی : مستعار: مانگے ہوئے۔ خاکستر: راکھ۔ لعل گراں: قیمتی پتھر۔ نالہ شبگیر: رات کو گھیرے میں لینے والی فریاد۔ عرصہ محشر: محشر کا میدان۔

مطلب: خضر کہتا ہے کہ اے شاعر! اس حقیقت کا ادراک بھی تیرے لیے لازم ہے کہ جس دل میں سچائی کے لیے مرنے کی تربت موجود ہوتی ہے تو اس کے لیے عمل ناگزیر ہے کہ پہلے وہ اپنے خاکی جسم میں قوت عمل پیدا کرے۔ یہ زمین و آسمان تو ایک طرح سے بنے بنائے ہیں۔ قوت عمل تو اس امر کا نام ہے کہ انسان اپنا زمین و آسمان خود تخلیق کرے۔ مراد یہ ہے کہ مستعار لی ہوئی کوئی شے اتنی کار آمد نہیں ہوتی بلکہ نفسیاتی سطح پر اس کے اچھے اثرات مرتب نہیں ہوتے اس لیے انسان پر لازم ہے کہ جو کچھ حاصل کرے وہ اپنی محنت اور قوت بازو سے حاصل کرے۔ زندگی میں جو قوت پوشیدہ ہے اس کو آشکار کرنا بھی ضروری ہے کہ یہی قوت ابدی حیثیت کی حامل ہوتی ہے۔ کامیابی و کامرانی کے لیے مشرق میں سورج کی مانند چمکنا بھی ناگزیر ہے۔ یہی عمل ماضی کی مثبت کارکردگی کی طرف لے جاسکتا ہے اور یہاں پہلے کی طرح ممتاز و انشور، فلاسفر اور صاحب فن پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی لازم ہے کہ تیری آسمان تک رسائی ہو تیری

گرفت ستاروں پر بھی ہونی چاہیے۔

اے شاعر! یہ نہ بھول کہ تیرا عہد قیامت کی طرح ابتلاء کا عہد ہے جس کے لیے فرد پر لازم ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی اچھا کام اعمال نامے میں موجود ہے تو اسے پیش کیا جائے۔ مراد یہ کہ محض ترقی پانے کی خالی خولی خواہش سے کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ کامیابی کے لیے قوت عمل درکار ہوتی ہے۔

سلطنت

چھٹا بند : معنی : آیہ ان الملوک : سورہ نمل کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جب بادشاہ کسی بستی میں داخل ہوتے ہی فساد برپا کر دیتے ہیں۔ سلطنت : یہاں مراد توسیع ملک سے ہے۔ ساحری : جادوگری۔ خون اسرائیل : حضرت موسیٰ جو بنی اسرائیل سے تھے۔ ظلم سامری : سامری کا جادو۔ سروری : سرداری۔ ذات بے ہمتا : ذات بے مثال۔ گمن : نہ کر۔ خواجہ : آقا۔ برہمن : بت پرست۔ نوائے قیصری : شہنشاہیت کی صدا۔ استبداد : ظلم۔ پائے کوب : ناپنے والا۔ اعضائے مجالس : قانون ساز اسمبلی کے ایوان عام اور ایوان خاص۔ الامال : خدا محفوظ رکھے۔ سراب : دھوکہ۔

مطلب : شاعر نے چونکہ خضرؑ سے استفسارات میں سلطنت کے بارے میں بھی سوال کیا تھا کہ اس کی نوعیت کیا ہے؟ چنانچہ اس کے جواب میں خضرؑ نے کہا کہ اے شاعر! آئیں تجھے اس حوالے سے قرآن پاک کی ایک سورہ کی معنیت بتاتا ہوں جس میں کہا گیا ہے کہ سلطنت صرف اور صرف طاقتور لوگوں کی طرف سے کمزور لوگوں کا استحصال کرنے اور ان پر حکمرانی کرنے کا نام ہے۔ مراد یہ کہ جو قوم طاقتور ہوگی وہ کمزور قوموں پر حکمرانی کر کے ان کا استحصال کرتی رہے گی۔ یہ عمل تو ایک ایسے ظلم کے مانند ہے کہ اگر کوئی کمزور قوم یا فرد اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کرتا ہے اور استحصالی قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہوتا ہے تو طاقتور حکمران اپنے تحریکیز حروں سے ان کی قوت مدافعت کو ختم کر دیتا ہے۔ اس طرح اپنا جابرانہ نظام مسلط کیے رکھتے ہیں۔ اے شاعر! جان لے کہ ایسے حکمران جب غلام قوموں پر اپنا ظلم بکھیرتے ہیں تو وہ طوق غلامی پر بھی فخر کرنے لگ جاتے ہیں۔ محمود و ایاز اور اسی نوعیت کی مثالیں ایک واضح کیفیت کی آئینہ دار ہیں۔ لیکن یہ صورت حال ایک حد تک قائم رہتی ہے کہ جب غلام قوموں پر حقیقت حال واضح ہوتی ہے تو ان کی غیرت و میت جاگ اٹھتی ہے اور جس طرح حضرت موسیٰؑ نے سامری کے ظلم کا توڑ کر کے اپنی قوم کو حقیقت حال سے باخبر کر کے بیدار کر دیا تھا اسی طرح کوئی بھی غلام اٹھ کر استحصالی قوتوں کو ختم کر دیتا ہے اور اپنی قوم کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کر دیتا ہے۔

اے شاعر! یہ ایک حقیقت ہے کہ حکمرانی تو صرف رب ذوالجلال کی ذات تک محدود ہے۔ صرف خدا ہی حقیقی حکمران ہے باقی سب لوگ مصنوعی حیثیت کے حامل ہیں۔ کہ یہ ان کی حکومتیں عارضی ہوتی ہیں جو کبھی بنتی ہیں اور کبھی ٹوٹ جاتی ہیں۔ لہذا تجھے چاہیے کہ اپنی آزاد فطرت کو غلامی سے رسوا اور بدنام نہ کرے۔ اس کے برعکس اگر تو خدائے واحد کے سوا کسی اور کو اپنا آقا تصور کرے گا تو جان لے کہ تو برہمن سے بھی بڑا کافر ہے۔ مغرب کا نیا نظام جسے دنیا بھر کے سیاستدان اور دانشور جمہوریت سے تعبیر کرتے ہیں فی الواقعہ دہی پرانا نظام ہے جو بادشاہت اور قیصریت سے ہم آہنگ رہا ہے۔ جمہوریت تو ایک

ایسے دیو کے مانند ہے ظلم و ستم جس کا شعار ہے۔ بد قسمتی سے تو اسے انفرادی آزادی کا پیغام لانے والا تصور کرتا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ جمہوری نظام میں عوام کی زندگی کو منظم کرنے، ان کی فلاح کے لیے ادارے قائم کرنے اور لوگوں کو رعایتیں اور حقوق دینے کے لیے جو ادارے قائم کیے گئے ہیں وہ مغربی استعماریت کا ایسا نسخہ ہے جس کے اثرات بظاہر شریں ہیں لیکن لوگوں کو اپنے حقوق سے غافل کر دیتا ہے اور یہ اسمبلیاں اور ان کے ارکان کی پر جوش تقریروں سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ عوامی مسائل چشمِ زدن میں حل ہو جائیں گے لیکن غور کھجیے تو یہ سرمایہ داروں کی طرف سے مزید دولت حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔

اے شاعر! یہ جمہوریت کا نظام تو ایک فریب کے سوا اور کچھ نہیں جب کہ تو اسے ملک و ملت کے مفاد کے لیے بہترین طرز عمل سمجھے بیٹھا ہے۔ دیکھا جائے تو اس سراب کو رنگِ دبو سے مزین گلستان سمجھا ہوا ہے بلکہ اس قدر نادان ہے کہ قفس کو بھی اپنے آسٹیاں سے تعبیر کر رہا ہے۔

سرمایہ و محنت

ساتواں بند : معنی : پیامِ کائنات : کائنات کے دل کی آواز۔ شاخِ آہو : ہرن کا سینگ۔ برات : حصہ (مراد ہے رزق)۔ دستِ دولتِ آفریں : دولت پیدا کرنے والا ہاتھ۔ مزد : مزدوری۔ اہلِ ثروت : امیر لوگ۔ زکات : مراد بخشش۔ ساحرِ الموط : الموط کا جادوگر (مراد سرمایہ دار)۔ مسکرات : وہ چیزیں جو نشہ پیدا کرتی ہیں۔ سکر : نشہ۔

مطلب : مختصر پہلے سوالات کے جوابات کے بعد سرمایہ و محنت کے بارے میں شاعر نے جو سوال کیا تھا اس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اے شاعر! تو سرمایہ محنت کے حوالے سے بندہٴ مزدور کو جا کر یہ پیغام سنا دے اور یہ امر خود بھی ذہن نشین کر لے کہ یہ پیغام صرف میرا ہی نہیں بلکہ پوری کائنات کا پیغام ہے چونکہ ذرا غور سے دیکھا جائے تو مختلف مسائل پر ساری کائنات پیغامِ دہی نظر آتی ہے کہ مزدور یہ حقیقت ہے کہ تیری محنت کا پھل بھانے بھانے سے سرمایہ دار کھا جاتے ہیں۔ تیری محنت سے سرمایہ دار ہی فائدہ اٹھاتا ہے اور تجھے اس کا برائے نام معاوضہ حاصل ہوتا ہے۔ تو دولت اپنی محنت سے پیدا کرتا ہے لیکن اس کا معمولی سا معاوضہ سرمایہ دار اس انداز سے دیتا ہے جیسے تجھے زکوٰۃ کی رقم دے رہا ہو۔ یعنی محنت کش کو اس کی محنت کا پھل اس طرح دیا جاتا ہے جیسے اس پر احسان کیا جا رہا ہو۔

فی الواقعہ دیکھا جائے تو سرمایہ دار حسن بن صباح کی مانند ہے۔ حسن بن صباح اپنے معتقدین کو بھگ پلا کر مد ہوش کر دیتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ انہیں دنیا کی بہت بڑی دولت مل رہی ہے۔ سرمایہ دار بھی مزدوروں کو ان، حقوق سے غافل کرنے کے لیے اسی طرح سے جل دیتا ہے اور بے چارہ محنت کش اپنی ناعاقبت اندیشی کے سبب ہر کو بھی مصری کی ذلی سمجھ کر نگل لیتا ہے۔ سرمایہ داروں نے نسل، قومیت، عبادت گاہیں، سلطنت، تہذیب اور رنگ کے ایسے ایسے نشے ایجاد کر رکھے ہیں اور محنت کش انہی کو سب کچھ سمجھتے ہوئے سرمست و سرشار ہو جاتا ہے حالانکہ یہ سب عناصر سرمایہ دار کے استحصالی نظام کے ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب کہ عام مزدور انہی عناصر کے نشے کے سبب اپنے ذاتی اثاثے سے بھی

مردم ہو جاتا ہے حالانکہ بغور دیکھا جائے تو مکرر فریب کی چالوں کے سبب سرمایہ دار محنت کشوں کا سب کچھ سمیٹ کر لے جاتے ہیں اور غریب مزدور اپنی سادگی کی بنا پر ہمیشہ مار کھاتا ہے۔

لیکن اسے مزدور اس خواب غفلت سے بیدار ہو کہ یہ استحصالی نظام اب زیادہ دیر جاری نہیں رہتا چاہیے۔ کائنات کی فضا بدل چکی ہے اور اب تو مغرب ہو یا مشرق، ہر جگہ بحال ساری دنیا میں تیرے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ مراد یہ کہ حالات ایسے پیدا ہو رہے ہیں جب مروجہ استحصالی نظام بدلے گا اور سرمایہ دار، مزدور کے حقوق غصب نہیں کر سکیں گے۔

اے شاعر! اگر انسان میں بلند ہمتی اور حوصلہ ہو تو وہ شبنم کا قطرہ تو الگ رہا اسے دریا بھی بخش دیا جائے تو وہ اس کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ جب کہ معمولی مراعات سے اب بھی دھوکہ دینے کی کوششیں جاری ہیں۔ آخر تو ان پر کب تک قناعت کرے گا ذرا بغور دیکھ کہ اصل حقیقت تو عوام کی بیداری میں پوشیدہ ہے۔ آخر سکندر و جشید جیسے بادشاہوں کے مہموت کرنے والے واقعات کب تک سنے گا۔ دیکھ کہ زمین کے بطن سے ایک نیا سورج طلوع ہو رہا ہے۔ آخر ان ستاروں کا ماتم کب تک کرے گا جو عرصہ ہوئے ڈوب چکے ہیں۔ انسانی فطرت نے آج ان تمام زنجیروں کو توڑ ڈالا ہے جو استعماری نظام نے مسلط کی تھیں۔ یہ درست ہے کہ آدم کا جنت سے نکلنا ایک بڑا سانحہ تھا لیکن اب اس سانحہ کو یاد کر کے کیوں ذہنی کرب کا شکار ہوا جائے جس طرح پھولوں کا کھلنا ایک فطری امر ہے اسی طرح محنت کشوں کی بیداری بھی ایک فطری امر ہے۔ اب اس میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔

اس شعر میں خضر ایک بار پھر محنت کشوں کی توجہ اس امر کی طرف منعطف کرتا ہے کہ اپنے معمولی مفاد کے لیے سرمایہ داروں کے گرد طواف کرنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا بلکہ اپنی غفلت کا احساس کرو اور اپنے حقوق جس طرح بھی ممکن ہیں حاصل کر لو۔

دنیاۓ اسلام

آٹھواں بند : معنی : پنہاں : چھپا ہوا۔ تشکیل : باپ، بیٹا اور روح یعنی میمانی۔ میراث خلیل : مسلمانوں کا ورثہ۔ خشت : اینٹ۔ کلاہ لالہ رنگ : سرخ ٹوپی۔ یارس : ایران۔ مے سرکش : تند و تیز شراب۔ مینا گداز : سرائی کو پتھلا دینے والی۔ گاز : سونا کاٹنے کی فینچی۔ ارزاں : سستا۔ بنائے کسہ : پرانی بنیاد۔

مطلب : زیر تشریح نظم میں اقبال نے شاعر کے کردار کے توسط سے مختلف موضوعات کے بارے میں خضر سے جو استفسارات کیے ہیں یہ ”آٹھواں بند“ ”دنیاۓ اسلام“ کے حوالے سے ہے۔ تیس اشعار پر مشتمل اس نظم کا یہ آخری اور سب سے طویل بند ہے۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اس نظم میں آغاز سے انجام تک ایک ایسی کیفیت موجود ہے جو قاری کو نہ صرف یہ کہ متاثر کرتی ہے بلکہ ساتھ ساتھ لے کر چلتی ہے اور شروع سے ہی جس طرح نظم آگے بڑھتی جاتی ہے اس میں زیادہ روانی اور زور پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ طویل نظم ایک طرح سے ”بانگ درا“ ہی نہیں بلکہ اقبال کی پوری شاعری میں بے

مزید براں اس نظم کے موضوعات اور ان کی تفہیم کے لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ ان کو اقبال کے فلسفے کے تاثر میں ہی دیکھا جائے۔ اقبال نے یہاں اظہار کے لیے جو موضوعات منتخب کیے ہیں ان میں ”صحرا نوردی“، ”زندگی“، ”سلطنت“، ”سربایہ و محنت اور اسلام کو بطور خاص پیش نظر رکھا ہے اور جس فنی مہارت“ نفسیاتی ایچ اور فکری حوالوں کے ساتھ ایسے مباحث کو شامل کیا گیا ہے جن کا اظہار کم از کم شاعری میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ان مباحث سے اس امر کا اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں رہتا کہ شاعری کے ابتدائی دور میں (بانگ درا کی تکمیل تک) اقبال کے نظریات کیا تھے۔

اقبال ”زندگی“ کو اول و آخر ہمیشہ مثبت انداز میں دیکھتے اور پرکھتے رہے ہیں۔ سلطنت کے حوالے سے وہ نہ آمریت کے قائل تھے (خواہ وہ کسی شکل میں بھی ہو) نہ ہی جمہوریت پر یقین رکھتے تھے۔ سلطنت و جمہوریت والے بند میں انہوں نے جس انداز سے یہ موضوع زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے اس سے اختلاف کی گنجائش تو بے شک ہو سکتی ہے لیکن پاکستان کا مروجہ جمہوری نظام، اسمبلیاں اور انتخابات پھر ملکی معیشت اور عوام کے مسائل کے پیش نظر ان کی باتیں بڑی حد تک درست نظر آتی ہیں۔

بہر حال یہ طے ہے کہ ”خضر راہ“ ایک ایسی نظم ہے جو ہمارے مروجہ نظام کے لیے ایک آئینے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ”محنت و سربایہ“ کی آویزش کے ساتھ محنت کش اور سربایہ دار کا کردار اقبال نے جس مہارت سے پیش کیا ہے۔ اس پر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ نظم کا آخری طویل حصہ اسلام کے بارے میں ہے۔ اس موضوع پر اقبال نے نظم اور نثر میں بہت کچھ لکھا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ مذہب کو وسیع انظری کے حوالے سے دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیر، ملّا و اعظا اور اسی نوعیت کے دوسرے کردار ان کی شاعری میں کسی مرحلے پر بھی مثبت تاثر پیدا نہیں کر سکے۔ بہر حال ان مختصر سی گزارشات کے ساتھ اب نظم کی طرف آئیے۔ وہ فرماتے ہیں:

خضر عالم اسلام کے بارے میں استفسار پر شاعر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے شاعر! تو مجھے ترک و عرب یعنی عالم اسلام کی داستان کیا سنانا ہے؟ کہ میں اس سے پوری طرح نئے آگاہ ہوں اور اس ضمن میں مجھ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے۔ صورت احوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کا ورثہ تو اب مسلمانوں کی بجائے عیسائیوں نے حاصل کر لیا اور حجاز کی جو خاک بھی وہ اب کلیسا کی تعمیر میں کام آ رہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ مغرب کی سیاست نے ملت مسلمہ کی شان و شوکت کو زیر و زبر کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ترک جیسی اولوالعزم قوم کی سرخ ٹوپی جو ساری دنیا میں باعث افتخار سمجھی جاتی تھی اب بدنام اور رسوا ہو کر رہ گئے ہیں۔ دوسری طرف اہل ایران اپنی تہذیب و تمدن اور اس کے شخص سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور مغرب کی نقالی میں مصروف ہیں۔ یہی اسباب ہیں کہ اہل یورپ کی سیاست اردو عیار کی کے سبب ملت مسلمہ اس طرح پارہ پارہ ہو چکی ہے جیسی چٹینی سونے کو کات کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیتی ہے۔ آج تمام دنیا میں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح سے بہہ رہا ہے اور اے شاعر تو اس صورت حال پر مضطرب اور بے چین ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے حالات کا پوری طرح تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اے شاعر! مولانا رومی کا قول ہے کہ کسی عمارت کو از سر نو تعمیر کرنا ہو تو پہلے اس کو بنیاد سے اکھاڑ دیتے ہیں اس کے بعد ہی وہ نئے سرے سے بنائی جاسکتی ہے۔

اے شاعر! اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک اور سلطنت پر غیروں نے تسلط جمالیا اور ملت اسلامیہ

اقدار سے محروم ہو گئی۔ یہ صریحاً ناقابلِ تلافی نقصان تھا پھر بھی اس نقصان سے یہ فائدہ ضرور پہنچا کہ مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں اور اب ان کو اپنے نفع نقصان کا احساس ہونے لگا ہے کہ خدا نے اسے بصارت کے ساتھ بصیرت بھی بخشی ہے۔ اس صورت میں بغور حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ انسانی تعمیر کے لیے مانگی ہوئی دواؤں کے حصول سے یہ امر زیادہ بہتر ہے کہ انسان ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے اور عارضی سطح پر شکست کو قبول کر لے۔ اس لیے کہ اگر تیرا وجود ایک معمولی چوہنی کی مانند بھی ہو پھر بھی تجھے حضرت سلیمان جیسے عظیم فرمانروا کے دروہو حاجت روائی کے لیے دست طلب دراز نہیں کرنا چاہیے کہ یہ امر تیری اناء کی توہین کے مترادف ہے اور تیری حیات کی نفی کرتا ہے۔ مشرق کی نجات اسی نکتے میں مضمر ہے کہ ملت بیضامیں ہر چار جانب اتحاد و یگانگت اور باہمی ارتباط کا سلسلہ از سر نو قائم ہو جائے لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ ایشیا کے لوگ ابھی تک اس نکتے سے آگاہی نہیں رکھتے۔

اے شاعر! میری بات غور سے سن کہ ملت کی نجات اسی عمل میں پوشیدہ ہے کہ سیاست کو ترک کر کے مسلمان از سر نو اپنے دین کی طرف رجوع کریں۔ اس لیے ملک و دولت کا بنیادی مقصد تو صرف اسی قدر ہے کہ حرم یعنی مذہب اور اپنی اقدار کا تحفظ کیا جاسکے۔ چنانچہ یہ امر ناگزیر ہے کہ حرم اور دین کا تحفظ انہی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ دریائے نیل کے ساحل سے لے کر کاشغر تک مسلمان متحد ہو کر صف آرا ہوں یعنی افریقہ سے لے کر ترکی تک مسلمان اپنے تمام اختلاف بھلا کر ایک ہو جائیں اسی اتحاد میں ملت اسلامیہ کی نجات ہے۔

اے شاعر! یہ بھی گوش ہوش سن لے کہ اگر ملت میں اختلافات باقی رہے تو وہ ہمیشہ کے لیے مٹ کر رہ جائے گی اس ضمن میں کوئی تخصیص نہیں کہ اختلاف کرنے والے خواہ شاہی خیموں میں رہنے والے ترک ہوں یا بلند مرتبہ خاندان سے تعلق رکھنے والے عرب ہوں کہ رنگ و نسل کا امتیاز ہمیشہ تباہی کا باعث ہوتا ہے اور یہ امتیاز برقرار رہا تو ملت کا زوال ناگزیر ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ امتیازات کو ختم کر کے دین کی حقیقی بنیاد پر پیروی کی جائے کہ دنیا میں یہی عمل کامیابی و کامرانی کا سبب بن سکتا ہے۔ یہ بھی جان لے کہ رنگ و نسل کی لعنت اگر دین پر مغربی اقوام کی طرح مسلط ہو گئی تو ملت اسلامیہ اس طرح صفحہ ہستی سے مٹ کر رہ جائے گی جس طرح راہ میں پڑا ہوا غبار بادِ موسوم کے جھونکوں سے اڑ کر اپنا وجود کھو دیتا ہے۔

اے شاعر! یاد رکھ کہ ملت اسلامیہ اسی وقت اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کر برسرِ اقتدار آ سکتی ہے جب کہ وہ ہر معاملے میں دین کی پیروی کرے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ اپنے اسلاف جیسی ہمت اور حوصلہ پیدا کیا جائے۔ یاد رکھ! کہ اسی صورت میں ساری دنیا میں خلافت کا نظام از سر نو قائم کیا جاسکتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اسلاف جیسے 'فوصلے' جرات و وسیع العشوبی اور قوت فیصلہ کے بغیر یہ اہم کام سرانجام نہیں دیا جاسکتا۔

اس شعر میں مسلمانوں کے مابین فرقہ بندی کو ہدف تنقید بناتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تم لوگ ابو بکرؓ و علیؓ کی برائیاں ثابت کرنے کے چکر میں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو اور فرقہ پرستی کو ہوا دے کر اپنی صفوں میں انتشار پیدا کر رہے ہو۔ تمہیں ہوش و خرد کا دامن ہاتھوں سے تھامنا چاہیے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ تم پوشیدہ اور ظاہری باتوں میں امتیاز پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس لیے

تمہیں خبردار ہو جانا چاہیے۔ یہاں اس امر کی بطور خاص نشاندہی کی گئی ہے کہ مسلمان اپنے درپیش مسائل کا حل تلاش کرنے کی بجائے چھوٹے چھوٹے باہمی اختلاف کی بنیاد پر نفاق کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ یوں اپنی قوت اور توانائیاں ضائع کر رہے ہیں۔

اب آخری مرحلے پر خفزیوں کہتا ہے کہ اے شاعر! ملت پر متوقع مصائب کے بارے میں خدائے زوالجلال کے حضور جو فریاد کی جانی چاہیے نئی عشقِ حقیقی کے طفیل وہ فریاد بھی ہو چکی۔ اب اس کے بعد یہی مناسب ہے کہ اس فریاد کے اثرات کا جائزہ لیا جائے کہ بارگاہِ ایزدی میں اس فریاد کا کیا رد عمل ہوتا ہے۔ تو نے ابھی تک دریا، اس کی عظمت اور رفتار کی تیزی ہی دیکھی ہے اب ذرا یہ دیکھ کہ دریا کی تیز اور مضطرب موج خود اس کے لیے نہیگر کس طرح سے بنتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ مغربی تہذیب نے مسلمانوں کو بے شک حمزہ جی اور سیاسی سطح پر تو مفلوج کر کے رکھ دیا لیکن اس تہذیب کا اپنا کیا حشر ہو گا یہ حقیقت بھی غفریب سامنے آجائے گی۔

تمام دنیا کے لیے جو آزادی اور حریت فکر کا خواب اسلام نے دیکھا تھا وہ اب تعبیر کے مراحل میں داخل ہونے والا ہے۔ مراد یہ ہے کہ آج بے شک مسلمان زوال سے دوچار سہی لیکن جس طرح ان کا ماضی شان و شوکت والا تھا بے شک آج وہ شاندار ماضی ایک خواب کی مانند ہے تاہم وقت آگیا ہے کہ یہ خواب پھر سے شرمندہ تعبیر ہو گا۔ اس کی مثال ”سمندر“ کی سی ہے۔ سمندر وہ کیرہ جو آگ میں پیدا ہوتا ہے پھر اسی میں جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنی راکھ سے خودی جنم لیتا ہے۔ مراد یہ کہ سمندر کا آگ میں جل کر خاک ہو جانا اس کی حیاتِ نو کے لیے ایک پیغام ہے۔ مسلمانوں کی مثال بھی سمندر کے مانند ہے کہ ملت کی نشاۃ ثانیہ کا دور پھر سے متوقع ہے۔ مراد یہ کہ عالم اسلام اپنے انتہائی زوال کے بعد اب ترقی کی راہ پر از سر نو گامزن ہو گا۔

خفزی کہتا ہے کہ اے شاعر! میری گفتگو میں تجھے آنے والے دور کی تصویر یقیناً نظر آئے گی ہر چند کہ یہ تصویر فی الحال قدرے دھندلی ہے تاہم رفتہ رفتہ یہ تصویر واضح ہوتی چلی جائے گی۔ لیکن اس حقیقت کو نہ بھولیو کہ فلک کج رفتار کے پاس ایک آزمودہ فتنہ بھی ہے جس کا نام تقدیر ہے۔ جان لے کہ تقدیر وہ شے ہے جس کے بالقابل تدبیر کے سارے حربے ناکام ہو کر رہ جاتے ہیں۔

زیر تشریح نظم کے اس آخری شعر میں آلِ عمران کی ایک سورۃ سے اقتباس شامل کیا گیا ہے۔ چنانچہ خفزی شاعر سے کہتا ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس امر پر یقین رکھ کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ لہذا خدا کی رحمت سے یابوس ہونے کی بجائے اپنی امیدوں اور خوش آئند توقعات سے دل کو آباد رکھ۔ کہ ملت مسلمہ ایک بار پھر عروج سے دوچار ہوگی۔

طلوع اسلام

164

ایلِ صبح روشن ہے ستاروں کی ننگِ تابلی
افق سے آفتاب ابھرا، گیا دور گراں خوابلی
عروقِ مردہ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

حلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی
”نوارا تلخ تری زن چو ذوق نغمہ کم یابی
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیر سیلابی
نظر آتی ہے جس کو مرد غازی کی جگر تابی
ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کر دے

خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گھر پیدا
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و برگ پیدا
مبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے بحر پیدا
جگر خون ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ترے سینے میں ہے پوشیدہ راز زندگی کہہ دے
مسلمان سے حدیث سوز و ساز زندگی کہہ دے

یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
ستارے جس کی گرد راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جادواں تو ہے
تری نسبت براہمی ہے معمار جہاں تو ہے
جہاں کے جوہر مضر کا گویا امتحان تو ہے
نبوت ساتھ جس کو لے گئی، وہ ارمغان تو ہے
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاساں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی
ترے بازو میں ہے پرواز شاہین قہستانی
بیاباں کی شب تاریک میں قدیل رہبانی
وہ کیا تھا؟ زور حیدر، فقر بوذر، صدق سلمانی
تماشا کی شکاف در سے ہیں صدیوں کے زندانی

مسلمان کو مسلمان کر دیا طوفان مغرب نے
عطا موسن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
ترپ سخن چمن میں، آشیان میں، شاخساروں میں
وہ چشم پاک ہیں کیوں نہنت بر گستاواں دیکھے
ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کر دے

سرشک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
ربود آں ترک شیرازی دل تہریز و کابل را
اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
جہانباں سے ہے دشوار تر کار جہاں بینی
ہزاروں سال زرخس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلمان کی
مکان فانی، مکین آئی، ازل تیرا، ابد تیرا
حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا
تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی
جہان آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
یہ نکتہ سرگزشت ملت بیضا سے ہے پیدا

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہ مقصود فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی
بتان رنگ خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
میان شاخساراں محبت مرغ چمن کب تک
گماں آباد ہستی میں یقین مرد مسلمان کا
منایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
ہوئے ازار ملت جاہد پنا کس جہل سے

ثبات زندگی ایمان محکم سے ہے دنیا میں کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی
جب اس انگارہ خاکی میں ہوتا ہے یقین پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا؟
ولایت، پادشاهی، علم اشیا کی جہانگیری
برائی نظر پیدا کر مشکل سے ہوتی ہے
تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے
حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
یقین محکم، عمل عظیم، محبت فاتح عالم

چہ پایہ مرو را طبع بلندے، مشرب نابے
دل گرے، نگاہ پاک بے، جان بیتابے

عقبی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ہوئے مدفون دریا زیر دریا تیرنے والے
غبار رہگذر ہیں، کیا پر ناز تھا جن کو
ہمارا نرم رو قاصد پیام زندگی لایا
حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے
زمیں سے نوریان آسمان پرواز کستے تھے
جہاں میں اہل ایمان صورت خورشید جیتے ہیں

یقین افزاؤ کا سرمایہ تعمیر ملت ہے

یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

توراز کن نکال ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے گلڑے گلڑے نوع انسان کو
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
غبار آلودہ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سر زندگانی ہے
مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر
گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے

ترے علم و محبت کی

نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر ساز فطرت میں نوا کوئی

ابھی تک آدمی صید زبون شہراری ہے قیامت ہے کہ انسان نوع انسان کا شکاری ہے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندان مغرب کو
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
خروش آموز بلبل ہو گرہ غنچے کی دا کر دے
پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
یہ صنائی مگر جمونے گلوں کی ریزہ کاری ہے
ہوس کے پنجہ خونیں میں تیغ کارزاری ہے
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
کہ تو اس گستاخ کے واسطے باد بہاری ہے
زمین جولانگہ اطلس قباہان تباری ہے

بیا پیدا خریدار است جان ناتوانے را
”پس از مدت گذار افتاد برآ کاروانے را“

بیا ساقی نوائے مرغ زار از شاخسار آمد
کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
سرت گردم تو ہم قانون پیشیں سازدہ ساقی
کنار از زابداں برگیر و بیابانہ ساغر کش
مشتاقاں حدیث خواجہ بدر و حنین آرد
دگر شاخ خلیل از خون ما ننناک میگردد
سر خاک شہیدے برگنائے لالہ می پاشم
”بیاتا گل بلفشا نیم و سے در ساغر اندازیم
فلک راسقف ہشکایم و طرح دیگر اندازیم“



تعارف: اس حقیقت سے تو ہر صاحب ذوق اور اقبال شناس پوری طرح سے آگاہ ہے کہ ”بانگ درا“ علامہ اقبال کا اولین شعری مجموعہ ہے اور اب تک لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکا ہے۔ اشاعتی رفتار اور تعداد کے حوالے سے اردو زبان شاید ہی اس کے بالقابل دوسری کوئی کتاب ہو۔

زیر تشریح نظم کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل اس امر کی نشاندہی غیر ضروری نہ ہوگی کہ ”بانگ درا“ میں نظموں اور غزلوں کی تعداد یوں تو سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے تاہم ان کی انتہائی اہم نظموں میں آٹھ طویل نظمیں شامل ہیں جو بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان میں علی الترتیب ”تصویر درد و گورستان شادی“، ”شکوہ“، ”جواب شکوہ“، ”شع اور شاعر“، ”والدہ مرحومہ کی یاد میں“، ”خضر راہ اور طلوع اسلام نمایاں حیثیت کی حامل ہیں۔ اقبال کا تفصیلی مطالعہ کبھی تو یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ ان طویل نظموں میں دوسرے کلام کی نسبت زیادہ زور اور بہاؤ ہے۔ اس سلسلے کی آخری نظم ”طلوع اسلام“ نو بند پر مشتمل ہے۔

پہلا بند : معنی: تنگ تابی: مدھم روشنی۔ گراں خوابی: بکری نیند۔ عروق مرده: مرده رگیں۔ سینا: شیخ ابو علی سینا۔ نطق اعرابی: عربوں جیسی قوت گفتار۔ چشم پاک میں: پاکیزہ نظر۔ برگستواں: سپاہی اور گھوڑے کا لباس۔

مرکزی خیال: زیر تشریح نظم نو بندوں اور بہتر اشعار پر مشتمل ہے۔ اس امر کی وضاحت قدرے ضروری ہے کہ اقبال ایک دانشور کی حیثیت سے دل دردمند رکھتے تھے۔ وہ دنیا کے مختلف حصوں میں ملت

اسلامیہ کے عروج و زوال کو نہ صرف یہ کہ حقیقت پسندانہ انداز میں دیکھتے ہیں بلکہ اس کے اثرات بھی قبول کرتے ہیں۔ بانگ درا کی اس آخری طویل نظم میں وہ نسبتاً رجائیت کے حوالے سے سامنے آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس وقت اس نظم کی تخلیق عمل میں آئی تو ساری دنیا کے مسلمانوں، بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں میں بیداری کی دوڑ رہی تھی، جو اقبال کی افتاد طبع اور خواہشات کے عین مطابق تھی۔ چنانچہ پوری نظم اسی قسم کے تاثرات کی آئینہ دار ہے۔ فرماتے ہیں۔

مطلب: شب کے آخری لمحات میں ستاروں کی روشنی جس طرح سے ماند پڑ رہی ہے اس سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ صبح نمودار ہونے والی ہے۔ جلد ہی افق سے سورج ظلوں ہو گا اور پوری کائنات اپنی گہری نیند سے بیدار ہو جائے گی۔ چنانچہ مشرق کی مردہ رگوں میں اسی سبب زندگی کا گرم لہو دوڑنے لگا ہے تاہم یہ صورت حال ایک ایسے راز سے ہم آہنگ جسے بو علی سینا اور فارابی جیسے دانشور اور فلسفی بھی نہیں سمجھ سکتے۔ مغرب میں جو تہذیب و تمدن کو فروغ ہوا ہے اور وہاں کے استعمار نے جس طرح کمزور ملکوں خصوصیت سے مسلم حکومتوں کو زیرِ تلگیں کر لیا ہے اس کا رد عمل بالآخر دنیا بھر کے مسلمانوں میں رونما ہونے لگا ہے۔ اس صورت حال نے انہیں پھر سے اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع ہونے کی ترغیب دی ہے۔ اس لیے کہ موجوں کے تند و تیز تھپیڑے ہی ایک معمولی قطرہ آب کو قیمتی گوہر میں ڈھال دیتے ہیں۔

اقبال پر امید ہو کر اس توقع کا اظہار کرتے ہیں کہ اب وقت آپہنچا ہے کہ مرد مسلمان کو ایک بار پھر ترکوں جیسی شان و شوکت، ہندوستانیوں جیسی فکر اور عربوں جیسی تہذیب اور فصاحت و بلاغت کے جوہر عطا ہوں۔ اس کے باوجود اگر مسلمانوں میں ذہنی سطح پر زوال کے کچھ اثرات باقی ہیں تو یہ اب شاعروں اور دانشوروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ انہیں زیادہ بلند آواز کے ساتھ خواب غفلت سے بیدار کریں۔ خواہ اس آواز میں سختی بھی شامل کرنا پڑے۔ ان کے لیے لازم ہے کہ ہر مقام پر قیام بیداری بن جائیں۔ یہ امر پیش نظر رکھتے ہوئے کہ پارے کی فطرت میں جو اضطرابی کیفیت ہے وہ کسی طور پر بھی نہیں بدل سکتی۔ اہل ایمان کے روبرو تو انتہائی زریں اور بلند پایہ اصول موجود ہیں پھر ان پر کب لازم آتا ہے کہ ان کی توجہ دوسروں کی تہذیب و تعلیمات پر مرکوز ہیں خصوصاً اس لیے کہ جب انہیں اپنے اسلاف کی فتح مندانه فطرت اور دلیری سے بھی آگاہی ہو۔

سوائے شاعر! یہ تیری ذمہ داری ہے کہ مسلمانوں کے پڑھ دلوں میں پھر سے زندگی کی تڑپ بھر دے۔ آرزوؤں اور امیدوں کے چراغ روشن کر دے یہی نہیں بلکہ تیرے پیغام میں اتنی شدت ہو کہ ملت کا ایک ایک فرد تحقیق و جستجو کا والد و شہید ابن جائے۔

دوسرا بند : معنی : سرشک : آنسو۔ فیساں : ایسی بارش کے قطرے جو سیبیوں میں پڑ کر موتی بن جاتے ہیں۔ رلرو : تھینا۔ جمانبانی : حکومت۔ جہاں بینی : دنیا کا مشاہدہ کرنا۔

مطلب: اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح موسم بہار کے کے بادلوں سے تازگی اور قوت تخلیق کے اثرات نمودار ہوتے ہیں یہی کیفیت اب مسلمانوں کی آنکھوں سے بننے والے آنسوؤں میں موجود دکھائی دیتی ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ ظلیل اللہ کی اولاد میں پھر سے وہ قوت عمل بیدار ہونے لگی ہے جو کبھی ان کے اسلاف کا ورثہ ہوا کرتی تھی اور جس کے سبب انہوں نے اپنی قلیل

تعداد کے باوجود دنیا بھر میں فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ ملت مسلمہ ایک بار پھر سے یکجا ہوتا ہوا کر باطل کے خلاف صف آرا ہو رہی ہے جس کے نتیجے میں امت محمدیؐ اپنی منزل مقصود کی جانب رواں دواں ہونے کو ہے۔ ترکی کے عظیم سپہوت مصطفیٰ کمال پاشا اور اس کے رفقاء نے اپنی جرات و ہمت کے طفیل ایران اور افغانستان کے مسلمانوں کے دل جیت لیے اور جس طرح صباء پھولوں کی خوشبو کو اپنا ہم سفر بنا لیتی ہے اسی طرح دوسرے علاقوں کے مسلمان بھی ترکوں کی طرح بیدار ہو گئے ہیں۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ اس عمل میں ترکوں کو بے حد قربانیاں دینی پڑیں اور بے حد دکھ اٹھانے پڑے لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ لاکھوں ستاروں کی موت ہی نمود محرم کامیاب بنتی ہے یعنی قربانیوں کے بغیر کامیابی اور کارنامی ممکن نہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ گرد و پیش کے معاملات اور ان کے بارے میں حقیقت تک رسائی کا عمل کسی ملک پر حکمرانی سے زیادہ مشکل امر ہے۔ اس لیے کہ دل خون ہو کر بہ جائے تو چشم بصیرت وا ہوتی ہے۔ اپنے استدلال کی حمایت میں اقبال زرغس کے حوالے سے ایک تمثیل اس طرح پیش کرتے ہیں کہ زرغس کا پھول جو آنکھ سے مشابہت رکھتا ہے وہ ہزار ہا سال بینائی سے محرومی کے کرب میں مبتلا رہتا ہے اس کے باوجود بصارت پھر بھی اس کا مقدر نہیں بنتی کہ اس کا حصول بے حد مشکل ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسان آنکھیں رکھنے کے باوجود بصیرت حاصل کرنے کے لیے بڑے مرحلوں سے گزرتا ہے۔

اے شاعر! اب تجھ پر یہ امر پھر سے لازم ہو گیا ہے کہ افراد ملت جو ایک عرصے سے بے عملی کا شکار رہے ہیں۔ تیرے پر جوش نغموں سے ان کے خون میں حدت پیدا ہو جائے اور وہ ماضی کی طرح جرات و ہمت سے کام لے کر صف آرائی کے لیے تیار ہو سکیں۔

اس مقصد کے لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ اے شاعر! تیرے سینے میں زندگی کا جو راز پوشیدہ ہے وہ منکشف کر دے اور مسلمانوں کو زندگی کے ان تمام نشیب اور فراز سے آگاہ کر دے جو ان کی نظروں سے بوجہ پوشیدہ ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ملت کے افراد اپنی بے حسی کے سبب ماضی کے اصولوں اور تعلیمات کو جس طرح بھلائے بیٹھے ہیں تو ان کو آگاہ کر دے۔

تیسرا بند : معنی : خدائے لم یزل : لازوال خدا۔ چرخ نیلی فام : نیلا آسمان۔ حنا بند : ہندی لگانے والے۔ عروس : دلہن۔ معمار جہاں : حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ تعمیر کیا تھا۔ ممکنات زندگانی : زندگی کی ترقی کے امکانات۔ جو ہر مضمحل، چھپی ہوئی صلاحیتیں۔ ارمغان : تحفہ۔ نکتہ : بارکی۔ ملت بیضا : ملت اسلامیہ۔

مطلب : اے شاعر! اب وقت آگیا ہے کہ مرد مسلمان کو اس حقیقت سے آشنا کر دے کہ اس دنیا میں تو ہی ازل سے ابد تک رب ذوالجلال کا نائب ہے تو ہی اس کی زبان اور قدرت کاملہ کا مظہر ہے۔ البتہ یہ ہے تو بے اعتمادی کا شکار ہے چنانچہ اپنی حقیقت کو پوری طرح سے جاننے کے لیے یقین و اعتماد حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ تیرا دل شکوک و شبہات کا خزانہ بنا ہوا ہے جس کے سبب تو حقائق کی آگاہی سے محروم رہتا ہے۔ لہذا تجھ پر لازم ہے کہ خود میں یقین و اعتماد پیدا کرے۔

اے مسلمان! ذرا غور کر کہ تیری منزل مقصود تو آسمان سے بھی کیسی آگے ہے۔ تیرے بلند مقاصد کے سامنے ستارے بھی گرد کارواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ قدرت نے تیرے مقام کو جو رفعت عطا کی ہے وہ کسی دوسری قوم کو حاصل نہیں ہے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ

عالم امکان فانی ہے اور اس میں موجود باشندے بھی فانی ہیں۔ ان کی ذات آتی جاتی ہے صرف ایک تو ہی ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ ازل سے ابد تک جس کی زندگی باقی رہے گی اس لیے کہ ایک تو ہی رب ذوالجلال کا آخری پیغام ہے اسی باعث اے مسلمان تو ہمیشہ قائم و دائم رہے گا۔ تیرا تعلق حضرت ابراہیمؑ سے ہے جنہوں نے خدا کا گھر تعمیر کیا تھا لیکن تیری ذمے داری کچھ اور زیادہ ہے یعنی یہ کہ ساری دنیا کی تعمیر کرے اس کو منظم کرے۔ زندگی کے جس قدر امکانات بھی موجود ہیں دیکھا جائے تو تو ان کا امانت دار ہے اس اعتبار سے یہ پوشیدہ امکانات تیری وساطت سے ہی اہل عالم پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اس عالم فانی سے جو پانی اور مٹی جیسے عناصر سے بنا ہوا ہے جب نبوت ہمیشہ کے لیے عالم جاوداں کے لیے رخصت ہوئی تو صرف اور صرف تیرا وجود ہی اس کے ہوا تھا۔

اے مسلمان! سن کہ یہ نکتہ بھی اب کسی سے پوشیدہ نہیں رہا کہ ملت مسلمہ کی تاریخ اس امر کی منظر ہے کہ وہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے ہمیشہ ایشیائی اقوام کا تحفظ کیا۔ اس صورت حال میں تیرے لیے لازم ہے کہ پھر سے اپنے اسلاف کی تعلیمات کو یاد کرے یعنی سچائی، انصاف اور شجاعت کو اپنائے جو تیرے اجداد کی خصوصیات تھیں اس لیے کہ یہ تو طے ہے اور قدرت نے اس مرتبے کا تجھے اہل قرار دیا ہے کہ بالآخر مستقبل میں دنیا بھر کی رہنمائی اور قیادت کا ذمہ دار تو ہی ہے۔

چوتھا بند : معنی : مقصود فطرت : فطرت کی مرضی : رمز : حقیقت : جمالیگری : حکومت : مرغ : پرندہ۔ قہستلنی : ایک عائدہ کا نام۔ قبیر : روم کے بادشاہوں کا لقب۔ کسریٰ : ایران کے بادشاہوں کا لقب۔ جاوہ پیا : راست طے کرنے والا۔ المانی : جرمنی باشندہ۔ انگارہ خاکی : مراد انسان۔ روح الامیں : حضرت جبریل علیہ السلام کا لقب۔

مطلب : ملت مسلمہ کے جملہ افراد کو مخاطب کرتے ہوئے زیر تشریح اشعار میں اقبال کہتے ہیں کہ اے مرد مسلمان! تیرے لیے لازم ہے کہ تو محبت اور بھائی چارے کے رویے کو ساری دنیا میں عام کر دے۔ بغور جائزہ لیا جائے تو فطرت کا مقصود بھی یہی ہے اور اسلام کی تعلیمات میں بھی انہی رویوں کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ یہ جو رنگ اور نسل کے بت ہیں ان کو توڑ کر ہی تو ملت کا ایک جزو بن سکتا ہے۔ یہ رنگ و نسل تو اخوت اور محبت کے لیے زہر قاتل سے کم نہیں ہیں۔ اتحاد و اتفاق کے لیے اب ضرورت اس امر کی ہے کہ تہہ پہن شناخت تو رانی، ایرانی اور افغانستانی باشندے کے حوالے سے نہیں بلکہ ملت کے فروغ کے طور پر ہو۔ ملت واحدہ کا تصور اسی صورت میں عام ہو سکتا ہے کہ علاقائی حدود کو یکسر مسترد کر دیا جائے۔

اے مرد مسلمان! تو غیروں کے درمیان کب تک اپنی انفرادیت کو گم کرتا رہے گا جب کہ تیرے بازو میں ایسی قوت ہے کہ تو اپنا جہاں آپ تعمیر کر سکتا ہے تیری ذات تو شاہین جیسی ہے جو دوسرے پرندوں کا مارا ہوا اور پس خوردہ کھانے سے گریز کرتا ہے اور بلند پروازی کے ذریعے اپنے لیے خوبی شکار کرتا ہے۔ یوں بھی تیری ذات میں یقین و اعتماد کا جو عنصر ہے وہ اس اعتماد و یقین سے خالی دنیا میں ایک روشن چراغ کے مانند ہے اور اس روشن چراغ کی ہیئت اس انداز کی ہے جیسے صحرا کی اندھیری رات میں کوئی دیا جگمگا رہا ہو۔

تو اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ ہو گا کہ ایران و روم کے قبیر و کسریٰ کی ہیبت و سطوت کو حضرت علی مرتضیٰؑ کی قوت و شجاعت، ابوذر غفاریؓ کے فقر اور درویشی کے علاوہ حضرت سلمان فارسیؓ کی صداقت نے

ہی تہہ و بالا کر رکھ دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ تو بھی انہی خصوصیات کا امین اور وارث ہے۔ گویا علیؑ جیسی بے لوث قوت و شجاعت، ابوذر غفاریؓ جیسا بے ریا فقر اور سلمان فارسیؓ جیسی پیباک صداقت ہی ملت اسلامیہ کو کفر و باطل کے ظلم و ستم کے خلاف صف آرائی کا اہل بنا سکتے ہیں۔

اے مرد مسلمان! تیرے بزرگوں کی تاریخ اس امر کی غماز ہے کہ تیرے جرائع مند و بہادر اسلاف کس شان و شوکت سے اپنے دشمنوں کے خلع صف آرا ہوئے تھے اور ان کو شکست فاش دی۔ یہ مناظر ابھی تک تاریخ کا حصہ ہیں۔ یہ بھی جان لے کہ ایمان محکم ہی وہ خصوصیت ہے جس کے طفیل زندگی پائیدار و استوار ہو سکتی ہے۔ اس کی مثال جرمن اور ترک ہیں کہ جرمن ہر طرح کے اسلحہ سے لیس ہونے کے باوجود بے وسیلہ ترکوں کے جذبہ حریت سے شکست کھا گئے۔

جان لے کہ مسلمان میں جب یقین و اعتماد جنم لیتا ہے تو اسے بے سرو سامانی میں بھی حضرت جبریلؑ جیسی قوت پرداز حاصل ہو جاتی ہے۔

پانچواں بند : معنی : ذوق یقین : ایمان کی قوت۔ حذر : ڈر، خوف۔ چیرہ دستاں : ظالم۔ تعزیریں : سزائیں۔ نابے : خالص۔

مطلب : یہ بند اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اقبال نے یہاں یقین و اعتماد کے موضوع کو نسبتاً زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ غلامی کے دور میں اسلحہ اور تدابیر عملاً اس وقت تک مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں جب تک کہ متعلقہ قوم کے افراد یقین و اعتماد کی منزل تک نہ پہنچ جائیں۔ یہی وہ صورت ہے جو غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ اگلے شعر میں یوں گویا ہیں کہ جو مرد مومن یقین کامل کا اہل ہو اس کے زور بازو کا اندازہ کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں کہ اس کی نگاہ ہی قوموں کی تقدیر بدلنے کی صلاحیت کی حامل ہوتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ سلطنت، حکومت اور علمی سائنس جس کے ذریعے انسان ہر نوع کی مادی ترقی حاصل کرتا ہے یہ سب ایمان کے ایک نکتے کی توضیح و تشریح سے ہم آہنگ ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اگر ایمان پختہ ہو تو جملہ عناصر فطری طور پر انسان کے زیر ہو کر رہ جاتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جیسا یقین کامل اور پر اعتماد نظر عام انسان میں پیدا ہونا ناممکنات سے نہیں تو یہ عمل اتنا سہل بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ انسانی ہوس اور خواہشات اپنے لیے ایسی راہ متعین کرتی ہیں جو ذاتی مفادات کی آئینہ دار ہو۔

قدرت نے تمام انسانوں کو اگرچہ مادی حقوق کا اہل قرار دیا ہے لیکن مفاد پرست اور خود غرض لوگوں نے انہیں آقا اور غلاموں میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے اور یہی تفریق خلق خدا کے مابین فساد کا سبب بنی ہے لیکن اس تفریق و امتیاز کے ذمے دار لوگوں کو خبردار رہنا چاہیے کہ وہ باز نہ آئے تو قدرت ان کو سخت سزا بھی دے سکتی ہے ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ہر شے خواہ وہ مٹی سے پیدا ہوئی ہو یا نور سے وجود میں آئی ہو ان سب کی حقیقت ایک جیسی ہی ہے یعنی اگر ذرے کا دل چیرا جائے تو اس میں سے سورج کا لوہے کے ٹکے کا امکان ہے۔ اقبال نے ذرے اور سورج کے حوالے سے اس مصرعہ میں جو تمثیل پیش کی ہے۔ انتہائی خوبصورت اور زوردار ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مٹی کا ایک ذرہ اور سورج جو منور ہے عملاً ایک جیسے خواص کے حامل ہیں اس کا حوالہ تابکار ذرات بھی بن سکتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ زندگی کی جدوجہد اور اس کی تسخیر میں یقین کامل، مسلسل جدوجہد اور سب سے محبت و شفقت ایسے اسلحہ کی مانند ہیں جو مومنین کی فتح کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔
ایک مرد کامل کو طبع بلند، مشرب و ملک میں غلوص، دل زندہ حرارت لیے ہو، نگاہ پاکیزہ اور پھر روح مضطرب و بے چین ہو ان سب عوامل کے سوا زندگی میں اور کیا چاہیے۔ مراد یہ کہ مذکورہ خصوصیات ہی ایک فرد کو مرد کامل بنا سکتی ہیں۔

چھٹا بند : معنی: خون شفق، شام کے وقت جب سورج غروب ہوئے لگتا ہے تو آسمان پر سرخی چھا جاتی ہے۔ کیمیا: اکسیر (فن کیمسٹری)۔ پیر حرم: مکہ کا محاذ۔ نوریاں آسمان: مراد فرشتے۔ پابندہ تر: بہت مضبوط۔
مطلب: اقبال اپنے عہد کی سیاست اور مستقبل کے تجزیہ نگار کے طور پر کس قدر بالغ نظر اور دور رس نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے ان امور کا اندازہ زیر تشریح بند کے اشعار سے ہوتا ہے۔ یہاں ان کا اشارہ جنگ عظیم اول کے دوران ایک دوسرے سے نہرو آزما ہونے والی اقوام کی جانب بھی ہے۔ اور ساتھ ہی وہ مسلمانوں کے کردار کا جائزہ بھی لیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو قوم اپنے بے شمار سامان جنگ کے ساتھ اپنے حریفوں کے خلاف نہرو آزما ہوئی اس قدر قوت رکھنے کے باوجود شکست کھا گئی اور یوں لگا کہ وہ تو ایک بے بس قوم کے مانند تھی۔ (اقبال کا اشارہ جرمنی کی طرف ہے) جب کہ وہ قوم جس کے پاس بظاہر وسائل نہ ہونے کے برابر تھے اپنی جنگ آزادی میں بالآخر کامیاب و کامران ٹھہری۔ (اس مصرعہ میں اشارہ ترکی کی جانب ہے) ہر چند کہ اہل جرمنی فنون حرب میں مہارت کے سبب سمندروں کی تہ میں بھی تیرنے کی صلاحیت رکھتے تھے پھر بھی وہ آخر کار وہیں غرق ہو کر رہ گئے۔ اس کے برعکس ترک جو مسائل اور مہارت کی کمی کے سبب موجوں کے تھپیڑے کھا رہے تھے وہ بالآخر سمندر کی تہوں سے کامیاب و کامران بن کر برآمد ہوئے۔ جن لوگوں کو اپنی سائنسی اور مادی ترقی پر ناز تھا ان کو شکست کے سوا کچھ حاصل نہ ہو سکا اور وہ ترک جو زمین پر بڑی عاجزی و انکساری کے ساتھ سجدہ ریز ہوتے تھے وہ دشمن کے بالمقابل قد آور ثابت ہوئے اور ان کا غرور خاک میں ملا گئے۔

یہاں اس امر کی وضاحت بے معنی نہ ہوگی کہ جنگ عظیم اول میں انگریز کے خلاف اگرچہ ترکی جرمنی کا اتحادی تھا جنگ میں شکست تو دونوں نے کھائی۔ جرمنی تباہ و برباد ہوگی جب کہ ترکی اپنی سیاسی بصیرت کے سبب جدوجہد کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔ اس جنگ کے دوران شریف مکہ نے ترکوں کے ساتھ غداری کی جس کے نتیجے میں وہ بدنام و رسوا ہوا جب کہ ترکوں نے عالم اسلام میں بھی سرخروئی حاصل کی۔ اقبال نے یہاں اس واقعہ کی نشاندہی کی ہے۔ فرشتے بھی ان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے تھے کہ یہ ترک تو زیادہ زندہ دل، زیادہ عزم محکم رکھنے والے اور زیادہ روشن دماغ ثابت ہوئے۔ فی الواقع اہل ایمان دنیا میں اسی طرح سے زندگی کا سفر طے کرتے ہیں جس طرح آسمان پر سورج کہ مشرق میں طلوع ہوتا ہے تو مغرب میں ڈوب جاتا ہے اور مغرب میں طلوع ہوتا ہے تو مشرق میں غروب ہو جاتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ فی الواقع کسی قوم کے افراد میں یقین کی دولت ہی اس قوم کا سرمایہ ہوتی ہے یہی قوت ہے جس سے ملت کی تعمیر و تنظیم ہوتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ یقین کامل کے بغیر کسی قوم کی تعمیر و عزم ممکن نہیں۔

ساتواں بند : معنی : کن نکال : خدا نے کن کما اور دنیا وجود میں آئی۔ رنگ و نسب : ذات پات۔ مرغ حرم : مراد مسلمان۔ حلقہ شام و سحر : صبح و شام کا چکر۔ حریر و پرنیاں : ریشم و مخمل۔ جوئے ندی۔

مطلب : طویل نظموں میں خصوصیت کے ساتھ موضوع کے علاوہ تکنیک پر اقبال کی گرفت اس قدر مستحکم ہوتی ہے کہ وہ جہاں سے چاہیں اور جس طرح چاہیں بات کا رخ موڑ دینے پر قادر ہوتے ہیں۔ زیر تشریح نظم میں بھی انہوں نے ایک سے زیادہ دفعہ اس عمل کا مظاہرہ کیا ہے چنانچہ نظم کے اس بند میں بھی وہ ایک بار پھر مسلمانوں سے مخاطبت اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

اے مرد مسلمان! تیری حیثیت اس عالم رنگ و بو میں قدرت کے ایک راز کی سی ہے۔ تیرے لیے یہ امر لازم ہے کہ اپنی حقیقت سے آگہی حاصل کر لے اور خدائے ذوالجلال کے احکامات کی ترجمانی کرتے ہوئے خودی کی حکمت سے آشنائی حاصل کرے۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ لالچ اور خواہشات نے بنی نوع انسان کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔ تجھ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ بھائی چارے اور محبت کے رشتوں میں پرو کر ایک بار پھر انسانی برادری کو گروہی تقسیم سے نجات دلائے اور ان میں اتفاق و اتحاد کی ایسی فضا قائم کر دے کہ وہ ہر طرح کی نفرتوں اور رقابتوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ یہ ہندوستانی ہے وہ خراسانی ہے۔ یہ افغانی ہے اور وہ تورانی۔ غرض لوگ مختلف فرقوں اور ذاتوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان کی مثال ایک سمندر کی موجوں کی طرح ہے جو بے شک الگ الگ اپنا عمل جاری رکھتی ہیں لیکن ایک نقطے پر پہنچ کر آپس میں مربوط ہو جاتی ہیں اور کسی طور پر ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں کہ اسی میں ان کی عافیت ہے۔

اے مرد مومن! تو خود اس نوع کے امتیازات میں الجھا ہوا ہے حالانکہ تیرا تعلق حرم کعبہ سے ہے جو اتحاد و یگانگت کی علامت ہے تیرے لیے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے جدوجہد اور عمل ناگزیر ہے تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ گروہی سیاست اور نفاق کی پالیسی کو ختم کر دے۔ اے غفلت شعار اگر تو اپنی حیثیت ہمیشہ کے لیے مستحکم کرنے کا خواہاں ہے تو پھر صبح و شام کے مخصوص سے نکل کر اپنی خودی میں ڈوب جا کہ یہی حقیقی زندگی کا راز ہے۔ عملی جدوجہد کے مابین جہاں حریفوں سے معرکے درپیش ہوں وہاں تیرا وجود فولاد کی طرح سخت ہونا چاہیے اور جہاں تو اپنوں میں ہو وہاں محبت و شفقت درکار ہے ایسے مقامات پر نرم روی سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب پہاڑوں اور صحراؤں کو عبور کرنا ہو تو سیلاب کی سی تندی و تیزی اختیار کر اور راہ میں کوئی گستاخ آجائے تو پھر اس ندی کی طرح رواں رہ جو نئے نئے گاتی ہوئی بہتی چلی جاتی ہے اس شعر کا مضمون بھی گزشتہ شعر کی مانند ہے کہ دوستوں سے محبت و شفقت اختیار کر اور دشمنوں سے سختی۔

اے مرد مسلمان! اس امر میں کس شک کی گنجائش نہیں ہے کہ تیرا علم اور تیرا جذبہ محبت دونوں بیکراں ہیں یعنی انتہا پر پہنچے ہوئے ہیں اور مظاہر کائنات میں بھی تیرا وجود سب سے اعلیٰ اور بلند ہے۔ غلامہ اقبال نے اس بند کے تمام اشعار میں ملت مسلمہ کو اس کا صحیح مقام یاد دلانے کی کوشش کی ہے اور زیادہ زور ایک طرف تو نفرت و نفاق کو چھوڑ کر اتحاد و یگانگت کی فضا قائم کرنے پر دیا ہے دوسری جانب یہ بھی تلقین کی ہے کہ دنیا میں بلند مقام حاصل کرنے کے لیے عملی جدوجہد ناگزیر ہے۔

آٹھواں بند : معنی : صبر زور و ہمت اور ہمت و ہمتی۔ خیر و شر کا جو کچھ ہو گا وہ تمہارا

جو اہرات جزا۔ فسوں کاری: جادوگری۔ نوری: نور سے بنا ہوا فرشتہ۔ جولانگہ: میدان۔ اطلس: ریٹم۔

مطلب: اقبال یہاں طبقاتی صورت حال کے حوالے سے کہتے ہیں کہ دنیا ترقی کر کے کہیں سے کہیں جا چکی ہے لیکن آج بھی ایک عام انسان ملوکیت اور آمریت کے ردیو اتھائی ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر المیہ اور کیا ہو گا کہ انسان خود ہی آج بھی انسان کا استحصال کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ ہرچند کہ عمر حاضری تمدن بظاہر چمک دکھ اور تزیین و آرائش کے اعتبار سے نگاہوں کو چند حیرا دیتی ہے اس کے باوجود بغور جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مصنوعی تمدن تبہوں موتیوں کی مانند ہے جو چمک تو دیتے ہیں لیکن قدر و قیمت کے اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

اقبال اگلے شعر میں کہتے ہیں کہ وہ حکمت و دانش جس پر مغربی دنیا کے فلسفیوں اور دانشوروں کو ناز رہا ہے دیکھا جائے تو ایک ایسی تلواری طرح ہے جس سے اپنی ہوس کی تکمیل کے لیے خون بہانے کا کام لیا جاتا ہے یعنی اس حکمت و دانش کو محض اپنے ذاتی مفاد اور گمراہ قوموں کے استحصال کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ جان لینا چاہیے کہ جس نظام کی بنیاد سرمایہ داری پر مبنی ہے اسے فکر و تدبیر مستحکم نہیں کر سکتے کہ اس نوع کے تمدن زیادہ دیر پائا ثابت نہیں ہو تا خواہ اس کو کتنا ہی استحکام بخشنے کی کوشش کی جائے۔

اقبال کہتے ہیں کہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف عمل اور جدوجہد ہی ہے جو زندگی کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ انہی کے سبب انسانی زندگی جنت بھی بن سکتی ہے اور اگر عمل درست نہ ہوں تو جہنم کا نمونہ بھی بن سکتی ہے۔ اس لیے کہ پیدا کئی سطح پر انسان نہ تو جنتی ہے نا دوزخی۔ بلکہ اس کے اچھے برے اعمال ہی ہر طرح کی برائی بھلائی کے ذمے دار ہیں۔

اے مسلمان دانشور! یہ قدرت نے تجھ میں ہی صلاحیت پیدا کی ہے کہ ملت مسلمہ کی صحیح رہنمائی کر سکے اور اس کے پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کرے تاکہ وہ کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن ہو۔ زیر تشریح شعر میں اقبال ایک بار پھر یہ خوش خبری سناتے ہیں کہ پھر ایک بار ایشیائی باشندے صورت حال کو سمجھنے لگے ہیں۔ اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ باہمی اتحاد و محبت ہی پر سکون اور خوشحال زندگی کے لیے ناگزیر ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے زمین پر ان ترکوں کے وہ گھوڑے دوڑ رہے ہیں جنہوں نے اطلسی لباس زیب تن کیا ہوا ہے۔

زیر تشریح بند کا یہ آخری شعر معمولی سی ترمیم کے ساتھ نظیری کا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ آگے میرے کمزور و ناتواں جسم کا خریدار آگیا ہے اور ایک مدت کے بعد قافلہ ہمارے قریب سے گزر رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ملت کی بہودی کے دن نزدیک آگئے ہیں اور افراد قوم اب متحد و متفق ہو کر اپنی منزل مقصود کی جانب چل پڑے ہیں۔

نوال بند: معنی: بیا: آ۔ نگار آمد: معشوق۔ از فراز: بلندی۔ سرت گردوم: میں تجھ پر قربان ہو جاؤں۔ خیل: گردہ۔ بانگ ہزار آمد: بلبل کی آواز۔ خواجہ بدر و حنین: حضور سرور کائنات ﷺ جنہوں نے بدر و حنین کے غزوات میں کافروں کو شکست دی۔ وگر شاخ خلیل: حضرت ابراہیم کی اولاد یعنی مسلمان۔ سقف: چھت۔ طرح: بنیاد۔

مطلب: نظم کو تمام کرتے ہوئے زیر تشریح بند میں اقبال نے امید و رجائیت کا انداز اختیار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر تمام مسلمان اس انداز پر چل پڑیں تو جنت کی راہ میں ہر دشمن کو شکست دی جائے گی۔

اور اپنے لہن میں نغمے گا رہے ہیں۔ آمدِ بہار کے ساتھ ہمارا محبوب بھی آگیا ہے اور اس کی آمد کے ساتھ دل کو سکون و اطمینان حاصل ہو گیا ہے۔ موسمِ بہار کے بادلوں نے ہر دواوی اور صحرا میں اپنے خیمے نصب کر لیے ہیں۔ پہاڑوں کی بلند یوں سے آبشاروں نے نغمہ ریزی شروع کر دی ہے۔

اے ساقی! میری زندگی تجھ پر نثار ہو۔ آ اور اپنے انعام و اکرام کا سلسلہ بحال کر دے کہ اب تو نغمہ گروں کے گرد و قطارِ زورِ قطار چلے آ رہے ہیں۔ تو ان عبادت گزاروں سے کنارہ کر لے کہ جو شراب کے مخالف ہیں اور بے جھجک پینا پانا شروع کر دے کہ ایک عرصے کے بعد ہمارے اپنے چمن کی شاخوں سے بلبل کی نغمہ ریز صدائیں بلند ہونے لگی ہیں۔

اے ساقی آ! اور بدر و حنین کے آقا آنحضرتؐ کا ذکر خیر ان کے عشاق کو سنا۔ آنحضرتؐ نے جو راز ہائے دروں محفوظ رکھے تھے وہ اب مجھ (اقبال) پر ظاہر ہو گئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی قوم یعنی ملتِ اسلامیہ ایک بار پھر ہماری جد و جہد اور قربانیوں کے سبب تروتازہ ہو گئی ہے اور بازارِ محبت میں ہماری پونجی کھری ثابت ہوئی ہے میں شہید کی قبر پر لالے کے پھول چڑھا رہا ہوں کہ اس کا خونِ ملتِ اسلامیہ کے پودے کو بے حد راس آیا ہے۔ یہاں اقبال کا اشارہ یقیناً واقعات کر بلا اور شہادتِ عظمیٰ کی جانب ہے۔

نغم کو تمام کرتے ہوئے اقبال حافظہ شیرازی کے اس شعر کی تفسیر کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ ”آہ کہ ہم پھول برسائیں اور اپنے پیالوں میں شراب ڈالیں آسمان کی چھت میں سوراخ کرویں اور نئے دور کی بنیاد رکھ دیں۔“



(حصہ سوم)

ظریفانہ کلام

اور

غزلیات

اس حصے میں بانگِ درا کی وہ غزلیں اور ظریفانہ کلام ہے جو اقبال نے 1908ء کے بعد تخلیق کیا۔ ہرچند کہ غزلوں کا انداز بڑی حد تک کلاسیکی روایت سے ہم آہنگ ہے اس کے باوجود ان کے متعدد اشعار میں اقبال کا عمد اور ان کی فکر کا پتہ چلتا ہے۔ اس اعتبار سے ان غزلوں کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ رہا ظریفانہ کلام کا مسئلہ تو اس ضمن میں بات آگے چل کر ہوگی۔

★
Majlis Iqbal
Quaid-e-Azam Town, Lahore



محسّر اقبال

★
اقبال مملکت
مجلس

غزلیات

①

165

اے باد صبا! کملی والے سے جا کہو پیغام میرا
یہ موج پریشاں خاطر کو پیغام لب ساحل نے دیا
عزت ہے محبت کی قائم اسے قیس! حجاب محفل سے
کی ترک تک و دو قطرے نے تو آبدے گوہر بھی ملی
قبضے سے امت بپاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی
ہے دور وصال بحر ابھی تو دریا میں گھبرا بھی گئی
محفل جو دنیا عزت بھی تھی غیرت بھی گئی لیا بھی سنی
آواری فطرت بھی تھی اور منتظر دریا بھی سنی
نکلی تو لب اقبال سے ہے کیا جائے کس کی یہ صدا
پیغام سکوں پہنچا بھی گئی دل محفل کا ترپا بھی گئی

*

معنی: باد صبا: صبح کی ہوا۔ موج پریشاں: بیقرار موج۔ حجاب محفل: محفل کا پردہ۔ تنگ و دو: بھاگ دوڑ۔

① اس غزل کے اولین شعر میں اقبال باد صبا سے مخاطب ہو کر نہایت یاسیت کے لہجے میں کہتے ہیں کہ اے باد صبا! آنحضرت کو جن کو کملی والے سے موسوم کیا جاتا ہے ازراہ کرم یہ پیغام پہنچا دینا کہ حضور کی امت کے ہاتھوں دین تو خیر گیا ہی تھا اب دنیا بھی چلی گئی یعنی امت مسلمہ کی بے عملی کے سبب اس پر ہر شعبے میں زوال کی کیفیت ظاہر ہے۔

② غزل کے دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ دریا میں جو ایک موج مضطرب تھی اس کو ساحل نے یہ پیغام دیا کہ ابھی سمندر تو بہت دور ہے اور تو اس معمولی سے دریا میں ہی پریشانی سے ہم کنار ہو رہی ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسان آزمائش کی ابتدائی گھڑی میں ہی پریشان ہو جائے تو پھر وہ منزل تک کیسے پہنچ سکے گا۔

③ اے قیس! تیری محبت کا بھرم محض اس لیے قائم ہے کہ حسن پردہ نشین ہے اور اگر یہ پردہ ہی نہ تھا تو پھر تیری عزت و غیرت اور لیا کا ٹھکانہ کہاں ہو گا؟ مراد یہ ہے کہ عشق میں جو کشش ہوتی ہے وہ محض حجاب کے سبب ہی ہوتی ہے اگر یہ حجاب ختم ہو کر رہ جائے تو پھر عشق کی تمام تر کشش بھی ختم ہو جاتی ہے۔

④ پانی کا قطرہ اپنی تمام تر جدوجہد کے بعد جب ایک مقام پر ساکن ہو گیا تو گو ہر آباد بننا اس کا مقدر ہوا یوں ایک معمولی بلبلہ جدوجہد کے بعد بلند مرتبے پر فائز ہو گیا چنانچہ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس کی فطرت میں آوارگی کا جو عنصر موجود تھا وہ بھی ختم ہو گیا اور دریا کے ساتھ جو کشش تھی وہ بھی اختتام کو پہنچی۔

⑤ ہر چند کہ اقبال کے لبوں سے یہ امید افزا صدا بلند ہوئی ہے تاہم نہ جانے اس کا محرک کون ہے

یہ سرود قمری و بلبل فریب گوش ہے باطن ہنگامہ آباد چمن خاموش ہے
 تیرے پیاؤں کا ہے یہ اے مغرب اثر خندہ زن ساقی ہے ساری انجمن بیہوش ہے
 دہر کے غم خانے میں تیرا پتا ملتا نہیں جرم تھا کیا آفرینش بھی کہ تو روپوش ہے
 آہ دنیا دل سمجھتی ہے جسے وہ دل نہیں پہلوئے انساں میں اک ہنگامہ خاموش ہے
 زندگی کی رہ میں چل، لیکن ذرا بچ کے چل یہ سمجھ لے کوئی مینا خانہ بار دوش ہے
 جس کے دم سے دلی و لاہور ہم پہلو ہوئے
 آہ! اے اقبال، وہ بلبل بھی اب خاموش ہے

*

معنی: سرود: نغمہ گیت۔ فریب گوش: کان کو دھوکہ دینے والا۔ آفرینش: پیدائش۔ مینا خانہ: مراہی۔
 ① اس غزل کے ابتدائی دو شعر جو پس منظر رکھتے ہیں وہ اقبال کے عہد اور اس عہد کی سیاسی صورت حال کے حوالے سے کہے گئے ہیں۔ پہلے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ یہ جو قمری اور بلبل کی نغمہ گری ہے وہ دیکھا جائے تو سراسر فریب اور دھوکا ہے اس لیے کہ ان نغموں کے پس منظر میں بظاہر ہنگاموں سے بھرا ہوا چمن اور اس کا باطن خاموشی اور بے زبانی کا منظر نظر آتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ مغربی حکمرانوں کی دل خوش کن باتوں سے فریب نہیں کھاتا چاہیے۔ اس کے بجائے ملک و قوم کی بد حالی کا جائزہ لیتے ہوئے اس کا تدارک کرنا چاہیے۔

② دوسرے شعر کا اشارہ بھی مغربی حکمرانوں کی طرف ہے کہ ان حکمرانوں نے ہندوستان میں جو تہذیب و تمدن مسلط کیے ہیں وہ ہمارے لیے کسی طرح پر بھی سودمند نہیں۔ اس کے باوجود اہل ہند اس تہذیب کے سبب خود کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ جب کہ انگریز ہمیں اس طرح احمق بنانے پر اظہارِ مسرت کر رہا ہے۔

③ انسان اس دنیا میں آکر اس قدر بے عمل ہو گیا ہے کہ اپنا وجود کھو بیٹھا ہے گویا فطرت نے اس کو پیدا کر کے کوئی جرم کیا تھا جو انسان یوں غائب ہو گیا ہے۔

④ اور یہ دنیا جس چیز کو دل تصور کرتی ہے وہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے دل محسوس نہیں ہوتا بلکہ یہ تو انسان کے پہلو میں ایک عضوِ معطل کے مانند ہے۔

⑤ زندگی کا سفر طے تو ضرور کرنا ہے لیکن اس سفر کے دوران احتیاط لازم ہے کہ انسان کو بے شمار ذمے داریوں سے عہدہ برا ہونا پڑتا ہے۔ اور یہ ذمے داریاں بڑی نازک ہوتی ہیں۔

⑥ جس شخص کی وجہ سے دلی اور لاہور کے مابین رابطہ قائم ہوا وہ بھی وفات پا گیا۔ یہاں اقبال کا اشارہ میرزا اشد گورگانی کی موت کی طرف ہے۔

نالہ ہے بلبل شوریہ ترا خام ابھی اپنے سینہ میں اسے اور ذرا تمام ابھی
پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
عشق فرمودہ قاصد سے سبک گام عمل عقل سمجھی ہی نہیں معنی پیغام ابھی
شیوہ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی تو ہے زناری بت خانہ ایام ابھی
عذر پرہیز پہ کتا ہے بگڑ کر سائی ہے ترے دل میں وہی کاوش انجام ابھی
سعی پیہم ہے ترازوئے کم و کیف حیات تیری میزوں ہے شار و سحر و شام ابھی
ابر نیساں! یہ تنگ بخشی شعبنم کب تک؟ مرے کسار کے لالے ہیں حسی جام ابھی
بادہ گردان عجم وہ، علی میری شراب مرے سانرے جھجکتے ہیں سے آشام ابھی
خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نیم
نو گرفتار پھر کتا ہے یہ دام ابھی

*

معنی: بلبل شوریہ: دیوانی بلبل۔ مصلحت اندیش: اچھا برا سوچنے والا۔ فرمودہ قاصد: قاصد کی ہدایت۔ سبک گام عمل: تیزی سے عمل۔ دہر آشوبی: دنیا بھر میں قیامت کا ہنگامہ۔ سعی پیہم: لگاتار کوشش۔ کم و کیف حیات: زندگی کی مقدار اور کیفیت۔ تنگ بخشی: کج سوس کی طرح بہت تھوڑی چیز دینا۔ جھجکتے ہیں: بدکتے ہیں۔

① اے شاعر! تو جس طرح عصری صورت حال میں نا آسودگی کے سبب یوں آہ و زاری کر رہا ہے تو اس واقعہ یہ ہے کہ اس عمل میں سوز دردوں شامل نہیں جس کے سبب تیرے نالے نا پختہ ہیں۔ لہذا تجھ پر لازم ہے کہ ان میں مزید سوز اور درد پیدا کر۔

② اس شعر میں اقبال ایک حکیمانہ نکتہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عقل اگر مصلحت اندیشی کی قائل ہو جائے تو یہ اس کی چٹنگی کی دلیل ہے۔ اس کے برعکس عشق میں مصلحت اندیشی جذبے کی خالی کی مظہر ہے۔

③ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم عشق الہی کے طفیل انجام کی پروا کیے بغیر نمرود کی آگ میں کود پڑے۔ اس کے برعکس اگر یہ عمل عقل و دانش تک محدود ہوتا تو وہ پہلے تمام حالات کا احتیاط سے جائزہ لیتے اور فوری عمل سے گریز کرتے۔

④ محبوب کی جانب سے پیغام ملنے ہی عشق تو بے دریغ اس پر عمل کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے جب کہ اپنی تمام تر تیزی و طراری کے باوجود عقل اس پیغام کو بروئے کار لانے میں تذبذب کا شکار رہتی ہے۔

⑤ عشق کا طرز عمل تو آزادی اور انقلاب سے ہم آہنگ ہے جب کہ تو دعویٰ عشق کرنے کے باوجود ابھی تک اپنے آپ میں گم ہے۔

⑥ اے شخص! تو جو عمل کے سلسلے میں حیل و حجت سے کام لے رہا ہے تو اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ تجھے اس عمل اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج پر یقین نہیں ہے۔

- ⑦ زندگی کی تمام کیفیات کا دار و مدار جد و جہد اور عمل پر ہے جب کہ تو ابھی تک صبح و شام کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔
- ⑧ اس شعر کا مفہوم یہی ہے کہ سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم۔ بخلی یہ ہے رزاتی نہیں ہے۔
- ⑨ میرے نقطہ نظر کو قبول کرنے سے لوگ اس لیے جھجھکتے ہیں کہ یہ ان کی فطرت اور افتاد طبع کے منافی ہے۔
- ⑩ گلستان میں صبح کی تازہ ہوا یہ خبر لے کر آئی ہے کہ نیا نیا گرفتار ہونے والا یہ شخص اپنے قفس میں مضطرب ہے اور آزادی کے لیے جد و جہد کر رہا ہے۔

④

168

پردہ چہرے سے اٹھا، انجمن آرائی کر
تو جو بجلی ہے تو یہ چشمک پنہاں کب تک
نفس گرم کی تاثیر ہے آغاز حیات
کب تلک طور پہ در یوزہ گری مثل کلیم
ہو تری خاک کے ہر ذرے سے تعمیر حرم
اس گلستان میں نہیں حد سے گزرنا اچھا
پلے خوددار تو مانند سکندر ہو لے
پھر جہاں میں ہوس شوکت و آرائی کر
مل ہی جائے گی کبھی منزل لیلی اقبال
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیاپی کر

*

- معنی: چشمک پنہاں: چھپ چھپ کر آنکھوں سے اشارے کرنا۔ در یوزہ گری: بھیک مانگنا۔ باندازہ رعنائی: حسن و جمال کا اندازہ۔ بادیہ پیاپی: جنگل جنگل پھرنا۔
- ① یہ غزل آٹھ اشعار پر مشتمل ہے جس کے مطلع میں کہا گیا ہے کہ اے میرے محبوب! اپنے چہرے سے پردہ اٹھا کر اس طرح دیکھنے والوں کو جلوہ دکھا کہ وہ مبسوت ہو کر رہ جائیں حتیٰ کہ سورج چاند اور ستارے بھی تیرا جلوہ دیکھنے پر مجبور ہو جائیں۔
- ② اگر تو بجلی کے مانند رخشہ ہے تو میں اپنے وجود کو چھپاؤں کیا؟ اے محبوب! اس صورت میں لازم ہے کہ کسی حجاب کے بغیر میرے دل میں جاؤں ہو جا۔
- ③ حیات انسانی میں سانس کی حرارت ایک مجزے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر تیرے میں یہ حرارت موجود ہے تو تجھے بھی حضرت عیسیٰ کی مانند سچائی کا درجہ حاصل ہونا چاہیے۔
- ④ حضرت موسیٰ نے کوہ طور پر رب ذوالجلال سے جلوہ دکھانے کی جو درخواست کی تھی بے شک وہ تو ایک طرح سے بھیک مانگنے کی حیثیت رکھتی تھی لیکن تیرے لیے لازم ہے کہ اس نوعیت کی درخواست کی بجائے اپنے ہی وجود سے کوہ طور جیسے جلوے کو برآمد کر۔

- ⑤ اس شعر میں اقبال براہ راست مرد مسلمان سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیری خاک کے ہر ذرے میں ایسی بھرپور صلاحیت ہونی چاہیے کہ اس سے کبے کی تعمیر ممکن ہو سکے لیکن اس کے لیے لازم ہے کہ تو کلیسا کی تہذیب سے چھٹکارا حاصل کر لے اور اپنے ماضی کی طرف لوٹ آئے۔
- ⑥ اے محبوب! اس عالم رنگ و بو میں حد سے گزرنا کسی طور پر بھی مناسب نہیں کہ تو نے اپنے ناز بھی دکھانے ہیں تو اپنی بساط کے مطابق دکھا۔
- ⑦ پہلے سکندر کی مانند خود را تو بن جا اس کے بعد ہی دارا جیسے بادشاہ کی شان و شوکت کی تمنا درست ثابت ہو سکتی ہے۔ ورنہ خودداری اور غیرت مندی کے بغیر اس نوع کی کامرانی ممکن نہیں۔
- ⑧ اے اقبال آخر کار ایک روز تجھے تیری منزل مقصود ہاتھ آ ہی جائے گی تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ ابھی کچھ مزید جدوجہد کر۔

⑤

169

بہر باد بہار آئی، اقبال غزل خواں ہو
تو خاک کی مٹی ہے، اجزا کی حرارت سے
تو جنس محبت ہے، قیمت ہے گراں تیری
کیوں ساز کے پردے میں مستور ہو لے تیری
اے رہرو فرزانه، رستے میں اگر تیرے
سامان کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل، غارت گر سامان ہو

*

معنی: کم مایہ: کم سرمایہ۔ رہرو فرزانه: عقلمند مسافر۔

① زیر تشریح غزل کے مطلع میں اقبال خود سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ آمد موسم بہار کے ساتھ مست و سرشار ہوا میں چلنے لگی ہیں لہذا تجھ پر غزل خوانی لازم ٹھہرتی ہے۔ اگر تو غنچہ ہے تو پھول بن جا اور پھول ہے تو گلستان میں تبدیل ہو جا۔ مراد یہ کہ موسم بہار کی رنگ آمیز فضا میں اپنے وجود کو بھی عمل و ارتقاء سے ہم آہنگ کر لینا چاہیے۔

② ہر چند کہ تو مشقت خاک کے مانند ہے اس کے باوجود جملہ عناصر کی حرارت کا مفع ہے اور اگر یہ عناصر منتشر ہو جائیں تو صحرا جیسی دشت اختیار کر سکتے ہیں۔ مراد یہ کہ جبر کی فضا میں بھی انسان اختیار کا اہل ہوتا ہے۔

③ اے اقبال! تیرا وجود تو جنس محبت کا ہم پلہ ہے اس اعتبار سے تیری ذات انتہائی گراں قیمت رکھتی ہے لیکن تو جس سر زمین کا باشندہ ہے وہاں تو خریداری کرنے والے سوداگر ہی بہت کم مایہ اور بے وسیلہ ہیں جو تجھے موجودہ قیمت میں خریدنے کی اہلیت نہیں رکھتے لہذا اگر تجھے ان کا پاس ہے تو خود کو ارزاں کر لے اس صورت میں شاید وہ تیرے خریدار بن سکیں۔

④ تیری آواز آخر کار کسی ساز کے پردے میں کس لیے پوشیدہ رہے کہ تو تو ایسا رنگیں نغمہ ہے جس کی رسائی ہر فرد کے کانوں تک ہونی چاہیے۔

⑤ بے شک تو ایک دانشمند مسافر کی طرح سے ہے کہ جس کے دوران سفر راہ میں کوئی باغ ہو جائے تو تو اس کے لیے شبنم بن جائے اور اگر صحرا آجائے تو طوفان کا روپ و حار لے۔

⑥ اے اقبال! اگر تو مسافرت کے دوران ساز و سامان کا آرزو مند ہے تو یہ رویہ تن آسانی کے مصداق ٹھہرتا ہے اور اگر مقصد حصول منزل ہو تو پھر کسی طرح کے زاد راہ کی ضرورت نہیں بلکہ اگر سفر کا کوئی سامان تیرے پاس موجود ہے تو اسے اٹھا کر پیمینک دے کہ ہامت لوگوں کو منزل مقصود تک رسائی کے لیے کسی سامان کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اگر اس کے پاس کوئی مددگار شے بھی ہے تو وہ ہمت، جرات اور بلند حوصلگی ہوتی ہے۔

⑥

170

بہمی اے حقیقت منتظر، نظر آ لباس عجاز میں
 طرب آشنائے خروش ہو، تو تو اے محرم گوش ہو
 تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئندہ ہے وہ آئندہ
 دم طوف کر مک شمع نے یہ کہا کہ وہ اثر کس
 نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
 نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں
 کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
 وہ سرود کیا کہ چمچا ہوا ہو سکوت پروہ ساز میں
 کہ شگفتہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئندہ ساز میں
 نہ تری حکایت سوز میں، نہ مری حدیث گداز میں
 مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں
 نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں
 جو میں سر سجدہ ہوا بھی تو، زمیں سے آنے لگی صدا
 ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں
 شونیاں

*

معنی: حقیقت منتظر: حقیقت جس کا انتظار کیا جائے۔ طرب آشنائے خروش: شور و غل اور ہنگامے سے خوشی حاصل کرنے والا۔ دم طوف: پکڑاگانا۔ کر مک شمع: چراغ کا پتنگا، پروانہ۔ عفو بندہ نواز: ایسی مہربانی جس میں بندے پر لطف و کرم کیا گیا ہو۔

① زیر تفریح غزل کے مطلع میں رب ذوالجلال کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اے مالک حقیقی! تو نے خود کو ابتدائے آفرینش سے حجاب میں چھپا رکھا ہے لیکن تیرے بندے دیدار کے لیے ترس رہے ہیں لہذا اب ضروری ہو گیا ہے کہ حجاب سے نکل کر مادی شکل اختیار کر لے کہ میری عجز و انکسار میں ڈوبی پیشانی میں ہزار بار سجدے مضطرب و منتظر ہیں کہ کب تو سامنے ہو اور ہم سجدہ ریز ہو جائیں۔

② تجھے تو اس عالم رنگ و بو کے ہنگاموں سے لطف اندوز ہونا چاہیے کہ تیرا وجود ایک ایسی صدا کے مانند ہے جس کی رسائی عام لوگوں کی سماعت تک ہو۔ یوں بھی ایسے نغمے کی کیا حیثیت ہے جو ساز کے پردے کی خاموشی میں گم ہو کر رہ جائے۔ اس شعر کا مفہوم بھی مطلع سے ملتا جلتا ہے۔

③ اے محبوب! تیرا دل بے شک ایک آئینے کی مانند ہے یہ بھی فطری امر ہے کہ تو اسے ٹوٹنے سے

بچا رہا ہے لیکن یہ عمل شاید مفید نہ ہو کہ جب دل ٹوٹ جاتا ہے تو باری تعالیٰ کی نگاہوں میں زیادہ عزیز ہو جاتا ہے۔

④ شمع کے گرد طواف کرتے ہوئے پروانے نے کہا کہ اے شمع! کہہ ماضی کی وہ تاثیر نہ تو تیرے جلنے میں موجود ہے نا ہی میرے جل مرنے کے عمل میں باقی ہے۔ اس لیے کہ اب ہمارے عمل میں خلوص موجود نہیں رہا۔

⑤ اے مولائے کائنات! میرے گناہ گار وجود کو ساری دنیا میں کسی مقام پر بھی پناہ نہیں مل سکی جب کہ اس گناہ نے مجھے برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ پناہ ملی بھی تو محض تیرے دامنِ رحمت میں۔ جہاں میرے گناہ کو نہ صرف یہ کہ چھپا لیا بلکہ معاف کر دیا۔

⑥ اب تو صورت حال ایسی ہو گئی ہے یعنی زمانے میں اس طرح کا انقلاب رونما ہوا ہے کہ عشق میں بھی پہل کی طرح حرارت نہیں رہی نا ہی حسن میں وہ شوخیاں باقی رہیں اس کی وجہ سے نہ تو غزنوی میں وہ تڑپ ہے نا ہی ایاز کی زلفوں میں وہ تپ و تھم باقی ہیں جو کشش کے آئینہ دار تھے۔ مراد یہ ہے کہ عاشق اور محبوب دونوں اپنی صفات سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔

⑦ غزل کے آخری شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ اپنی بے عملی کے باوجود میں اگر کبھی سجدہ ریز ہوا تو زمین سے یہ آواز آتی سنائی دی کہ دل تو تیرا بتوں کا پرستار ہے پھر تجھے اس نماز میں آخر کیا ملے گا کہ غلوں کے بغیر کوئی عمل درست نہیں ہوتا۔

⑦

171

= دام بھی غزل آشنا رہے طائرانِ چین تو کیا : دو نغاں دلوں میں تڑپ رہی تھی نوائے زیر لبی رہی
ترا جلوہ کچھ بھی تسلی دلِ ناصبور نہ کر سکا : وہی گریہ سحری رہا، وہی آہ نیم شبی رہی
نہ خدا رہا نہ صنم رہے، نہ رقیب دیر و حرم رہے : نہ رہی کہیں اسدِ الہی، نہ کہیں ابولہبی رہی
مرا ساز اگرچہ ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہیدِ ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مریِ عربی رہی

*

معنی: طائرانِ چین: بانگ کے پرندے۔ زیر لبی: ہونٹوں کے نیچے۔ ناصبور: بے مبر دل۔ اسدِ الہی: حضرت علیؑ کی شان۔ ابولہبی: حضرت رسول کریم ﷺ کے چچا کی کنیت جو حضورؐ کے سخت مخالف تھے۔ ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم: عجم کے معزایوں کے ظلم و ستم۔ نوا مریِ عربی: مراد ہے اسلام کا پیغام۔

① غلامی کے دور میں بھی اگر اہل وطن نغمہ ریزی کرتے رہے تو اس سے کیا فائدہ۔ اس لیے کہ حصولِ آزادی کے لیے دل میں جو تڑپ تھی اس کا اظہار بھی کسی طور پر ممکن نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں نغمہ ریزی محض ایک منافقانہ عمل ہے۔

② اے میرے محبوب! تو نے بے شک اپنا جلوہ دکھایا لیکن اس سے مجھے اطمینانِ قلب حاصل نہ ہو سکا۔ اس لیے کہ اب بھی پہلے کی طرح میں تیرے فراق میں صدمہ گریہ و زاری کرتا رہا اور وہی نصف

شب کے وقت آپں بھرتا رہا۔

③ اب تو وہ دور آگیا ہے کہ لوگ خدا سے تو الگ رہے جنوں کے تصور سے بھی بے نیاز ہو گئے ہیں نہ وہ حق اور سچائی کو اہمیت دینے کے لیے تیار ہیں نہ ہی جھوٹ اور باطل کے پرستار رہے۔ مراد یہ ہے کہ عہد موجود کا انسان کسی بھی عقیدے کا قائل نہیں رہا جس کا سبب ہر طرح کا انتشار ہے۔

④ اقبال کہتے ہیں کہ ہر چند شاعری میں میرا اظہار اور اسلوب مغربی اثرات سے نجات نہ پاسکا اس کے باوجود یہ ملت سے وفاداری کا تقاضا ہی تھا کہ میں نے خود کو ہمیشہ اسلام سے وابستہ رکھا۔

⑧

172

گرچہ تو زندانی اسباب ہے قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ
اے مسلمان ہر گھڑی پیش نظر آئیے لا یخلف المیعاد رکھ
یہ ”لسان العصر“ کا پیغام ہے
”ان وعد اللہ حق یاد رکھ“

*

معنی: زندانی اسباب: ظاہری وسیلوں کا پابند۔ لسان العصر: زمانے کی زبان۔

① اس حصے کی آخری غزل چار اشعار پر مشتمل ہے۔ مطلع میں کہا گیا ہے کہ ہر چند اے شخص تو حالات کا مارا ہوا ہے۔ اس کے باوجود تجھ پر لازم ہے کہ اپنے دل کو اس قید سے ضرور آزاد رکھنے کی کوشش کر۔

② عقل و دانش تو ہمہ وقت تنقید و اعتراضات میں الجھی رہتی ہے چنانچہ اگر زندگی میں کچھ حاصل کرنے کا جذبہ ہے تو اپنے عمل کی بنیاد عشق کے جذبے پر رکھ۔ کہ یہی جذبہ جدوجہد اور کامیابی سے عبارت ہے۔

③ اے مسلمان! تیرے روبرو ہر گھڑی قرآن کی یہ آیت ہونی چاہیے کہ اللہ کے وعدے جھوٹے نہیں ہوتے۔ ہمیشہ سچے ہوتے ہیں۔ آخری مصرعہ اکبر الہ آبادی کا ہے۔ اقبال نے اس پر تفسیریں کی ہیں۔

پیشکش: مجلس اقبال

نشر و توزیع: محمد اسلم باقر

بانگ درا

کا

ظریفانہ کلام

اس مجموعے کے آخری چند صفحات میں اقبال کا ظریفانہ کلام شامل کیا گیا ہے جس کے مطالعے سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال اپنے طور پر اکبر الہ آبادی سے بڑی حد تک متاثر تھے۔ ان کا یہ ظریفانہ کلام بھی شاید اسی سلسلے کی کڑی ہے تاہم شاعری کو ظرافت سے ہم آہنگ کرنا ہر کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس میں تو وہی تخلیق کار کامیاب ہو سکتے ہیں ظرافت جن کی فطرت میں رچی بسی ہو۔ اقبال ایک سنجیدہ شاعر تھے۔ چنانچہ وہ اس سلسلے کو جاری نہ رکھ سکے۔ ملاحظہ ہو۔



ظریفانہ

①

173

مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلے وہاں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

*

معنی: مشین بن جاتے ہیں: مشین کی طرح عمل ہوتا ہے۔

① ظریفانہ کلام کے اس قطعہ میں اقبال کہتے ہیں کہ مشرقی ممالک کے لوگ اس قدر سادہ اور
قدامت پرست ہیں کہ زندگی کے عام اصولوں کو بھی دین کا درجہ دے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس مغربی
ممالک میں سب جانتے ہیں کہ صنعتی ترقی اس پنج پر پکچی ہوئی ہے کہ یہی اصول میکا کی عمل کا حصہ بن
جاتے ہیں۔ نتیجہ بالعموم یہ برآمد ہوتا ہے کہ مشرقی ممالک سے جو نوجوان حصول تعلیم کے لیے مغربی
ممالک میں جاتے ہیں وہ عام طور پر وہاں عیسائیت سے متاثر ہو کر تثلیث کے قائل ہو جاتے ہیں۔ اس
شعر کا دوسرا مفہوم یہ بھی برآمد ہو سکتا ہے کہ مذکورہ نوجوان مغربی تہذیب میں اس طرح سے مکمل مل
جاتے ہیں کہ مقامی لڑکیوں سے شادی رچا لیتے ہیں اور جب ان سے اولاد پیدا ہوتی ہے تو وہ وہیں کے ہو
رہتے ہیں۔ یہاں اسی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

②

174

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مد نظر وضع مشق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین؟
پردہ اٹھنے کی خیر ہے نگاہ

*

معنی: فلاح کی راہ: بہتری کا راستہ۔ روش مغربی: یورپ کی طرز۔ ماثرت۔ وضع مشق: مشرق کے طور
طریقہ۔

① یہ قطعہ ایک طرح سے خالص اکبر الہ آبادی کے رنگ میں ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ
ہندوستان میں اب لڑکیوں میں بھی انگریزی پڑھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ ان کے لیے خصوصی کالجوں
کا اجراء ہو رہا ہے۔ اقبال ایسی تعلیم کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور طنزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ یوں لگتا
ہے لڑکیوں کو انگریزی پڑھا کر قوم فلاح پا جائے گی لیکن ہوا یوں ہے کہ لوگوں نے اس طرح سے مغرب کی
تہذیب اپنائی ہے کہ وہ اپنی وضع کو عملی سطح پر گناہ سے تعبیر کرنے لگے ہیں۔ اگر اس صورت حال کا بغور
جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہ ہو گا کہ لڑکیوں میں جو انگریزی زبان عام کرنے کا عمل اپنایا گیا ہے

وہ ایک ذرا سے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا اندازہ اس وقت ہو سکے گا جب لوگوں کے سامنے نتائج دیں گے۔

(3)

175

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف ”پردہ آخر کس سے ہو جب مردی زن ہو گئے“

*

معنی حامی: حمایت کرا۔ بدظن: ناراض۔

تشریح: اس قطعہ میں کہا گیا ہے کہ ایک عالم دین کی حیثیت سے اگرچہ شیخ صاحب آئے دن پردے کی حمایت میں تقریر کرتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں کالج کے طلباء انہیں قدامت پرست اور جدید اقدار کا دشمن سمجھتے ہوئے شیخ صاحب کے خلاف ہو گئے ہیں حالانکہ اس مخالفت کی ضرورت نہ تھی جب کہ کل انہوں نے اپنے ایک وعظ میں یہ بات صاف صاف کہہ دی ہے کہ اب پردے کی قطعاً ضرورت نہیں رہی اس لیے کہ بناؤ سنگھار کے ذریعے جب نوجوانوں نے ہی خواتین کی سی وضع قطع اختیار کر لی تو پردہ پھر کس سے کیا جائے؟ اس قطعہ کا آخری مصرعہ مردوں پر ایک بیخ طنز کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

(4)

176

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مرد ہوشمند غیرت نہ تجھ میں ہو گی نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض کونسل کی ممبری کے لیے دوٹ چاہے گی

*

زیر تشریح کے پہلے شعر میں اقبال نے جو مضمون پیش کیا ہے وہ اس سے پہلے قطعے کے مضمون سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ یہاں وہ مضمون قدرے مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ اے ہوش مند انسان! وہ دن اب زیادہ دور نہیں بلکہ بہت قریب ہے جب کہ نہ تجھ میں غیرت باقی رہے گی نہ ہی عورت پردے میں مستور رہنا پسند کرے گی اور تو اس بے پردگی پر قطعی طور پر مغرض نہ ہو گا۔ اس لیے کہ مستقبل میں وہ دور آنے والا ہے جب عورت کو اولاد کی قطعاً پروا نہ ہو گی بلکہ اس کی بجائے کونسل کی رکنیت کے لیے الیکشن میں حصہ لے گی اور لوگوں سے دوٹ مانگتی پھرے گی۔

دراصل اقبال کا نقطہ نظر یہ ہے کہ کسی بھی مذہب معاشرے میں مرد کی طرح عورت کی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں اور ان میں سے کوئی ایک بھی اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا تو گھر اور معاشرے کا نظام ٹوٹ چوٹ کر رہ جاتا ہے۔

(۵)

177

تعلیم مغربی ہے بہت جراث آفریں پہلا سبق ہے، مینہ کے کالج میں مار ڈینگ
 بستے ہیں بند میں دو خریدار ہی فقط آغا بھی لے کے آتے ہیں اپنے وطن سے جنگ
 میرا یہ حال، بوٹ کی نو چانٹا ہوں میں ان کا یہ حکم، دیکھ! مرے فرش پہ نہ رینگ
 کہنے لگے کہ اونٹ ہے بھدا سا جانور اچھی ہے گائے رکھتی ہے کیا نکدہ اسیک

*

معنی: جراث آفریں: ہمارے بنائی ہے۔ مار ڈینگ: شنی بگمارنا۔ آغا بھی: مراد ہے افغانستان جیتے پس ماندہ
 ملک کے غلام صاحب بھی۔

① یہ چار غیر مربوط اشعار ایک طرح سے غزل کے ہیں ایسی غزل جو اپنے مزاج کے اعتبار سے
 طرافت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ چنانچہ پہلے شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ مغرب کی تعلیم انتہائی جراث
 انگیز ہوتی ہے اور پہلا سبق جو کسی طالب علم کو کالج میں داخلے کے بعد ملتا ہے وہ ڈینگ مارنے اور شنی
 بگمارنے کا ہوتا ہے۔

② دوسرے شعر میں کہتے ہیں کہ ہندوستان تو ایک منڈی کی طرح ہے جہاں بیرونجات سے اشیائے
 ضرورت آکر فروخت ہوتی ہیں۔ اس ملک میں خود اتنی صلاحیت نہیں کہ صنعتی سطح پر اپنے لیے کوئی سامان
 ضرورت تیار کرے یہاں کی حالت تو اتنی گنی گزری ہے کہ اگر جنگ جیسی معمولی شے بھی درکار ہو تو وہ
 کابل جیسے پسماندہ علاقے کے لوگ یہاں لے کر آتے ہیں۔

③ تیسرے شعر میں اقبال اہل ہند کی غلامانہ ذہنیت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے
 آقاؤں کی خوشامد میں اس حد تک آگے بڑھ جاتے کہ ان کے بوٹ کی نو تک چانٹنے سے نہیں شرما تے اور
 ہمارے آقا (انگریز) اس قدر خوشامد کے باوجود ہم سے انتہائی متکبرانہ سلوک کرتے ہیں اور بوٹ چانٹنے
 ہوئے اپنا فرش خراب ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ غزل کے چوتھے اور آخری شعر میں اقبال نے اونٹ اور
 گائے دو کردار پیش کیے ہیں۔ اونٹ سے مراد مسلمان ہیں اور گائے سے ہندو۔ انگریز ہندوستان میں قیام
 کے دوران مسلمانوں کی بیشہ تفحیک کرتے رہے۔ اس کا بنیادی سبب یہی تھا کہ ہندوستان میں مقیم
 مسلمانوں نے ان کے اقتدار کے خلاف بیشہ نیرو آزمائی کی جب کہ ہندوؤں نے ان کا ساتھ دیا۔ چنانچہ
 انگریز اس حوالے سے کہ مسلمان عرب سے آئے تھے اور اونٹ وہاں کا کار آمد ہونے کے باوجود بھدا سا
 جانور ہے اس کے برعکس ہندو چونکہ گائے کی پرستش کرتے ہیں اس لئے انہیں گائے سے تشبیہ دی ہے۔

(۶)

178

کچھ غم نہیں جو حضرت داعی ہیں تنگدست تہذیب نو کے سامنے سر اپنا خم کریں
 رو جماد میں تو بہت کچھ لکھا گیا تردید ج میں کوئی رسالہ رقم کریں

*

معنی: تہذیب نو: نئی تہذیب۔ خم: ہٹکاؤ۔

تشریح: اس قطعہ میں اقبال نے ان مفاد پرست و اعظفوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو محض چھوٹے چھوٹے مذاہبات کے لیے دین کے بنیادی اصولوں کی تردید سے بھی نہیں بچتے۔ یہ اقبال کہتے ہیں کہ اگر حضرت واعظان دنوں معاشی طور پر پریشان ہیں تو انہیں اس کی زیادہ فکر نہیں کرنی چاہیے۔ بس کے لیے وہ بڑے طنزیہ انداز میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اسلام میں اصول ہمارے، تاہم بعض واعظوں نے غیروں کو خوش کرنے اور مال بنانے کے لیے بہت کچھ لکھا اب اس مقصد کے لیے مناسب موقع ہے کہ واعظ حضرت اصول حج کے خلاف بھی کوئی رسالہ لکھ ڈالیں۔

179

(7)

تمذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ دفع مرض کے واسطے پل پیش کیجیے
تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض دل چاہتا تھا بدیہ دل پیش کیجیے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق کہتا ہے ماسر سے کہ "بل پیش کیجیے"

*

نئی تمذیب کے مارے ہوئے کسی مریض کو اگر ڈاکٹر دوا دیتا ہے اور وہ مریض سے کہتا ہے کہ یہ گولی کمالیہ کیجیے تو وہ اس سے متاثر ہونے کی بجائے دفع مرض کے لیے "پل" (گولی) پیش کرنے پر اظہار مسرت کرتا ہے۔ ایک دور وہ بھی تھا کہ تعلیمی اداروں میں اساتذہ جس شفقت کے ساتھ درس دیتے تھے تو ان کی اس عنایت پر دل پیش کرنے کو جی چاہتا تھا۔ جب کہ اب اس طرح سے زمانہ اور اس کی تمذیب بدل چکی ہے کہ طالب علم استاد سے سبق لینے سے قبل اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ یہ فرمائیے آپ کا "بل" (معاوضہ) کتنا ہے۔

ان اشعار میں اقبال نے اپنے عہد کے تضادات کو طرفانہ انداز میں بعض علامتوں اور کرداروں کے حوالوں سے بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انگریزی زبان و تمذیب نے افراد کو اس طرح اندھی تقلید پر مجبور کر دیا ہے کہ بات اپنی زبان میں کی جائے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتی لیکن یہی بات اگر انگریزی زبان میں کہی جائے تو ان پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔ یوں انگریزی زبان پر فخر کیا جاتا ہے۔

(8)

180

انہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک پھرتیاں، رومال، مفلز، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی بھی حالت اگر قائم رہی آئیں گے غسل کابل سے، کفن جاپان سے

*

معنی: غسل: غسل دینے والے۔

زیر تشریح قطعہ اور بعض دوسرے اشعار کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اقبال اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے کہ کوئی ملک اس وقت نہ صحیح معنوں میں ترقی کر سکتا ہے تاہی حقیقی معنوں میں دوسرے ممالک کے اثرات سے آزاد ہو سکتا ہے تاوقتیکہ وہ معاشی اور صنعتی میدان میں

خود کفیل نہ ہو۔ اسی حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ آخر کسی چیز کی انتہا بھی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں صورت حال یہ ہے کہ وہ دوسرے ممالک کی اشیاء کی منڈی بنا ہوا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ چھتریاں، رومال، مظر اور لباس جیسی معمولی اشیاء بھی جاپان سے درآمد کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔

اقبال آگے چل کر کہتے ہیں کہ ہماری غفلت اور بے عملی کا یہی عالم رہا تو اس امر سے کچھ بعید نہیں کہ اگر یہاں کوئی شخص وفات بھی پا گیا تو ہم اس قدر مجبور و معذور ہیں کہ اس کی میت کو منلانے کے لیے غسل کاٹل سے اور اس کے لیے کفن بھی جاپان سے منگوانا پڑے گا۔

(9)

181

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جاٹکا ہے
اس دور میں سب مٹ جائیں گے، ہاں باقی وہ بدہ جائے گا
اے شیخ و برہمن! سنئے ہو کیا اہل بصیرت کہتے ہیں؟
یا باہم پیار کے جلنے تھے، دستور محبت قائم تھا
واں کنفرسب بلوری ہیں یاں ایک پرانا منکا ہے
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے
گروں نے سختی بندی سے ان قوموں کو دے پکا ہے
یا بحث میں اردو ہندی ہے، یا قربانی یا جھکا ہے

*

معنی: اہل بصیرت: دل کی آنکھوں سے دیکھنے والے۔

زیر تشریح چار اشعار طرانت کی بجائے طنزیہ انداز کے حامل ہیں چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ کس قدر بد قسمتی کی بات ہے کہ ہم مشرق کے لوگ اب مغربی تہذیب کی طرف مائل ہو چکے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کی تہذیب میں جو چمک دکھ ہے وہ مشرق کی قدیم تہذیب میں نہیں ہے۔ مغرب میں بڑی تیزی کے ساتھ نظریات اور فکر میں تبدیلی آ رہی ہے جب کہ مشرق کے لوگ اپنی پرانی ذکر سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ مغربی تہذیب کے اثر و نفوذ سے اگر چھٹکارا حاصل نہیں کیا جاسکتا تو یہ عمل تباہی کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے اب تو صرف وہی لوگ زندہ رہنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے اصولوں پر قائم رہیں گے۔

اس شعر میں اقبال شیخ و برہمن یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سنو اہل بصیرت کیا کہتے ہیں کہ جو قومیں باہم دست و گریبان رہیں اور آپس میں اتحاد و اتفاق قائم نہ رکھ سکیں وہ انتشار و زوال کا شکار ہوئیں اور پستی کی تہ میں گر کر چلی گئیں۔ وہ زمانہ بھی تھا جب ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے مل کر محفلیں سجاتے تھے لیکن اب ان میں نفرت اور ففاق کا یہ عالم ہے کہ کبھی مل بیٹھنے کا موقع بھی ملا تو ان میں یا تو اردو ہندی کی بحث چھڑ جاتی ہے یا قربانی اور جھکے کے معاملات پر بحثی پیدا ہو جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ ان میں قطعی طور پر قوت برداشت نہیں رہی اور چھوٹی چھوٹی باتیں ان کے مابین سر پھول کا سبب بن جاتی ہیں۔

(10)

182

اصل شہود و شاید و مشہود ایک ہے غالب کا قول سچ ہے تو پھر ذکر غیر کیا
کیوں اے جناب شیخ سنا آپ نے بھی کچھ کہتے تھے کعبہ والوں سے کل اہل دیر کیا
ہم پوچھتے ہیں مسلم عاشق مزاج سے الفت بتوں سے ہے تو برہمن سے ہیر کیا

*

معنی: شہود: کسی چیز کا ظاہر ہونا۔ شاہد: دیکھنے والا۔ مشہود: دیکھا گیا۔ ہیر: دشمنی۔
زیر تشریح تین اشعار بھی اقبال نے طنزیہ انداز میں لکھے ہیں وہ کہتے ہیں کہ غالب نے اپنے مصرعہ میں
کہا ہے کہ خدا کی ذات 'اس کی ذات دیکھنے والوں اور اس کی ذات کی گواہی دینے والوں میں' یعنی ان تینوں
میں بظاہر کوئی فرق نہیں۔ وحدت الوجود کے عقیدے کے مطابق انسان 'کائنات اور خدا درحقیقت ایک
ہی وجود کی ظاہری شکلیں ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگر غالب کا یہ قول حقیقت پر مبنی ہے تو پھر ان مسلمانوں
کو جو بتوں سے تو عشق کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ اس صورت میں برہمن سے دشمنی کا مظاہرہ کیوں ہو؟ ان
اشعار میں اہل کعبہ سے مسلمان اور اہل دیر سے ہندو مراد ہیں۔ غالب کے قول کے حوالے سے اقبال کہتے
ہیں کہ انسان جب ایک عمل کرتا ہے تو اس سے متعلق دوسرے عمل کو بھی اپنا پڑتا ہے۔ اس صورت
میں ایک جانب تو ہندو دیویوں سے محبت کا اظہار اور دوسری جانب برہمن سے نفرت یہ امر کچھ مناسب
معلوم نہیں رہتا۔

(11)

183

ہاتھوں سے اپنے دامن دنیا نکل گیا رخصت ہوا دلوں سے خیال معاد بھی
قانون وقف کے لیے لڑتے تھے شیخ جی پوچھو تو وقف کے لیے ہے جائداد بھی

*

معنی: خیال معاد: آخرت کا خیال۔
اس قطعے میں اقبال مسلمانوں کی ایک مخصوص صورت حال پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب دنیا
ہی ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تو سمجھ لو کہ ہم نے دین کو بھی بڑی حد تک نظر انداز کر دیا۔ اور ہمارے دلوں
میں بے دینی نے راہ پالی۔ ان حالات میں شیخ صاحب قانون وقف علی الادلاد کے لیے آئینی جنگ تو بے
شک لڑ رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس نوع کے وقف کے لیے جائیداد بھی موجود ہے یا نہیں کہ وہ تو ہم
نے اپنی عیاشیوں میں اڑا دی۔

(12)

184

وہ مس یولی ارادہ خود کشی کا جب کیا میں نے مہذب ہے تو اے عاشق قدم باہر نہ دھر حد سے
نہ جرات ہے نہ خنجر ہے تو قصد خود کشی کیا یہ مانا درد ناکاں گیا تیرا گذر حد سے

کما میں نے کہ "اے جانِ جہاں کچھ نقدِ دلوا دو کرائے پر مڑکا لوں گا کوئی افغان سرحد سے

*

زیرِ تشریح اشعار میں اقبال نے مغرب اور مشرق کے مابین محبت کے نفسیات کے بارے میں جو رویہ ہے اس کا طرِ فغانہ انداز میں تجزیہ کیا یہ اشعار دراصل ایک انگریز دو شیزہ اور ہندوستانی عاشق کے مابین مکالمے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ نوجوان عاشق کہتا ہے کہ جب اپنی انگریز محبوبہ سے مایوس ہو کر میں نے اس پر خودکشی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ محبوبہ بولی کہ اے مجھے چاہئے والے! تو تو انتہائی مذہب ہونے کا دعویدار ہے پھر اس طرح خودکشی کا ارادہ کر کے آپے سے باہر کس لیے ہو رہا ہے کہ خودکشی تو بزدل اور غیر مذہب لوگ کیا کرتے ہیں۔ یوں بھی اے عاشق نامراد! نہ تو تیرے پاس خودکشی کرنے کے لیے کوئی خنجر یا پستول ہے نہ ہی اتنی جرات اور حوصلہ کہ یہ قدم اٹھا سکے۔ ہر چند کہ محبت میں ناکامی کے سبب تیری مایوسی حد سے بڑھ چکی ہے پھر بھی خودکشی تیرے بس کا روگ نہیں۔ انگریز محبوبہ کا یہ جواب سن کر میں نے کہا۔ اے دل و جان سے عزیز دو شیزہ! یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اس کے لیے تو اجرت پر کسی پٹھان کو سرحد سے بلوالوں کا تم تو بس یہ کرو کہ اس مقصد کے لیے کچھ نقدِ دلوا دو۔

(13)

185

نازاں تھے اس قدر کہ نہ جانی عیب کی قدر
مغرب میں ہے جہازِ بیاباں ستر کا نام

حاصل ہوا یہی نہ بچے مار پیٹ سے
ترکوں نے کام کچھ نہ لیا اس فلیٹ سے

*

معنی: جہازِ بیاباں: صحرا کا جہاز۔ ستر: اونٹ۔

اس قلمے میں اقبال نے ایک جنگ کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں ترکی کو محض اس لیے شکست ہو گئی کہ میدانِ جنگ تک اسلحہ اور رسد نہ پہنچ سکے۔ اس وقت ترکی کے پاس کوئی بحری بیڑہ نہ تھا۔ عربوں سے بھی شدید اختلافات تھے۔ حالانکہ ان کی مدد اور اونٹوں کے ذریعے سامانِ رسد میدانِ جنگ تک پہنچ سکتا تھا۔ جب کہ انہیں اس امر کا علم بھی تھا کہ اہل مغرب اونٹ کو صحرا کا جہاز کہا کرتے ہیں۔

(14)

186

ہندوستان میں جزوِ حکومت ہیں کونسلیں
ہم تو فقیر تھے ہی ہمارا تو کام تھا

آغاز ہے ہمارے سیاسی کمال کا
سیکسین سلیقہ اب امرا بھی "سوال" کا

*

معنی: امرا: بیع امیری۔

اس قلمے میں کونسلوں اور اقتدار کے حوالے سے امراء کے اس طبقے پر بڑا خوبصورت اور بلیغ طنز کیا ہے جو اس مقصد کے لیے انتظامات میں حصہ لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اب ہندوستان میں کونسل کا وجود حکومت کا جزو تصور کیا جانے لگا ہے۔ یوں سیاست میں ہم ہندوستانیوں کے انتہائی عروج کا یہ نقطہ آغاز ہے۔ ہم عام ہندوستانی نوخیز فقیر کی مانند اپنے مسائل کے سلسلے میں۔

تھے تاہم اب یہ امراء پر بھی لازم ہو گیا ہے کہ وہ کونسل کے رکن کی حیثیت سے یہاں اپنے مطالبات منوانے کے لیے دست طلب دراز کرنے کا سلیقہ سیکھ لیں کہ اس کے بغیر تو ان کی شنوائی نہ ہو سکے گی۔ اقبال چونکہ ہمیشہ اس طرح کے نظام حکومت کے مخالف رہے اس لیے یہاں بھی وہ امراء کے طبقے پر طنز کرتے نظر آتے ہیں اس کا ایک پلاویہ بھی ہے کہ اقتدار تک عام آدمی کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔

187

(15)

مہری امپیرل کونسل کی کچھ مشکل نہیں دوٹ تو مل جائیں گے پیسے بھی دلوائیں گے کیا؟
میرزا غالب خدا بخشے، بجا فرما گئے ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے کیا؟

*

اس قطعہ میں اقبال نے انتخابات کے ضمن میں ایک ایسی لعنت کی طرف اشارہ کیا ہے جو بیسویں صدی کے آغاز میں بھی موجود تھی اور یہ سلسلہ آج تک رائج چلا آتا ہے۔ اسمبلی اور کونسلوں کے انتخابات میں اس وقت بھی سرمایہ دار طبقہ ہی حصہ لینے کا اہل سمجھا جاتا تھا اور اسی نوے سال گزرنے کے بعد جب ہم اپنی قومی جمہوریت کے مراحل میں داخل ہو چکے ہیں یہ سلسلہ ماضی کی طرح جاری و ساری ہے یعنی امیدوار سرمایہ دار ہوتا تھا جو اپنے اقتدار کے لیے ووٹروں کو خریدتا تھا۔ ظاہر ہے کہ آج بھی صورت حال پہلے سے بھی زیادہ بدتر ہو چکی ہے۔

چنانچہ اس قطعہ میں اقبال نے متذکرہ قسم کے ایک امیدوار اور ووٹر کے مابین مکالمہ نظم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت بے شک آپ پوری کونسل کی رکنیت کے اہل بھی ہیں اور اپنی انتخابی مسم میں کامیاب ہو کر کونسل میں پہنچ بھی جائیں گے۔ اور انگریز برسر اقتدار حکومت سے اپنے مفادات بھی حاصل کر لیں گے چنانچہ ہم اس مقصد کے لیے آپ کو ووٹ دینے کے لیے بھی بے شک تیار ہیں لیکن یہ تو فرمائیے کہ اس کا معاوضہ ہمیں کیا دوائیں گے۔ اگلے شعر میں علامہ نے غالب کے ایک مصرعہ سے استفادہ کرتے ہوئے ووٹر کی زبان سے یہ مکالمہ دوہرایا ہے کہ حضرت! آپ نے ممتاز شاعر حضرت غالب کا یہ مصرعہ تو ضرور سنا ہو گا کہ جس میں وہ فرماتے ہیں کہ بے شک ہم یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ دہلی میں قیام کرنا اپنی جگہ۔ تاہم گزرا ہوا رکھانے پینے کے لیے کچھ ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے سو اس کا اہتمام بھی کر دیجیے۔

(16)

188

دلیل مرد وفا اس سے بڑھ کے کیا ہو گی
مصر ہے حلقہ، کینٹی میں کچھ کہیں ہم بھی
سند تو لہجے لڑکوں کے کام آئے گی
زمین پر تو نہیں ہندیوں کو جا ملتی
مثال کشتی بی۔ جی مطیع فرماں ہیں
نہ ہو حضور سے الفت، تو یہ ستم نہ سہیں
مگر رضائے کلکٹر کو بھانپ لیں تو کہیں
وہ مہربان ہیں اب، پھر رہیں، رہیں نہ رہیں
مگر جہاں میں ہیں خالی سمندروں کی تھمیں
کو تو بستہ ساحل رہیں، کو تو نہیں

*

معنی: دلیل: ثبوت۔ مصر: امراء۔ کشتی: محسوس۔ بے حس کشتی۔ مطیع فرماں: فرمانبردار۔ بستہ ساحل:

سائل سے چنے رہتا۔

زیر تشریح پانچ اشعار میں انتخابات اور اس سے متعلق مسائل کے حوالے سے ہی کہے گئے ہیں لیکن ان میں کسی کو نسل کی بجائے کمیٹی کی رکنیت کے انتخاب کا تذکرہ ہے۔ تاہم ان اشعار میں مزاج کی جگہ بالعموم نظر سے کام لیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک خوشامدی شخص نے انگریز افسر سے کہا - ہمیں حضور سے جس قدر محبت ہے اس کا اندازہ لیں ہو سکتا ہے کہ ہمارے اپنے من بھائی آپ سے محبت و نواہری کی بنا پر ہمیں ملین و تفتیح اور ظلم و ستم کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہی بات حضور سے ہماری وفاداری کی دلیل ہے۔

② دوسرے شعر میں یہی بات قدرے مختلف انداز میں کہی گئی ہے کہ جس حلقے سے ہم یعنی کا انتخاب لڑ رہے ہیں وہاں کے لوگ جو ہمارے رائے دہندگان بھی ہیں یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان کے حقوق کی بات بھی کریں جب کہ ہم اس امر کا اندازہ لگا رہے ہیں کہ ضلع کے حاکم اعلیٰ یعنی کلکٹر کا ان معاملات میں کیا نقطہ نظر ہے اور اس کی مرضی کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کی ہاں میں ہاں ملانا ہماری مجبوری ہے۔ مراد یہ ہے کہ کمیٹی کے منتخب ہونے والے کو نسل اپنے رائے دہندگان کے حقوق کے ضمن میں حاکم ضلع کا عندیہ معلوم کیے بغیر کوئی بات کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

③ اس شعر میں ایک ایسے مسئلے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جو انگریزی دور میں عام روایت بن گیا تھا یعنی متعدد لوگ انگریز افسروں کی خوشامدی کی بدولت خوشنودی کی سند حاصل کر لیتے اور بعد میں اسی سند کو دکھا کر اس افسر یا اس کے بعد آنے والے افسروں سے اپنے کام نکھواتے۔ بیٹے بیٹیوں کو ملازمتیں دلواتے۔ چنانچہ ایسا ہی ایک خوشامدی شخص لکھتا ہے کہ میں اس افسر سے سند تو حاصل کر لوں۔ تاکہ اپنے کام نکھوائے جا سکیں بعد میں کیا پڑے کہ یہ لوگ اسی طرح مہربان رہیں یا نہ رہیں کہ ہوا کا رخ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ بد قسمتی یہ ہے کہ آج سالہا سال گزرنے کے باوجود انگریز کی یہ بدعت آج بھی بدستور قائم ہے۔ انتخابات ہوں رائے دہندگان کے ووٹ خریدنے اور ملازمتوں کے حصول میں ایسی ہی قباحتیں موجود ہیں۔

④ اس شعر میں اقبال کہتے ہیں کہ انگریزی غلامی کے دہرے دہرے یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی باشندوں کے لیے زمین تنگ کر دی گئی ہے اور کسی جگہ پر بھی انہیں عزت و وقار سے نہیں دیکھا جاتا چنانچہ غیرت ہندی کا تقاضا تو یہی ہے کہ سمندروں میں کود کر خودکشی کر لیں کہ ان کی تموں میں لاشوں کو پناہ تو بہر حال مل ہی جائے گی کہ غلامی میں دکھوں اور تکلیفوں کا علاج موت کے سوا اور کچھ نہیں۔

⑤ ہم ہندوستانی تو اس دور غلامی میں ایک ایسی کشتی کی مانند ہیں جو ساحل پر بندھی ہوئی ہے۔ جب علاج چاہتا ہے اسے کھول لینا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق جس طرف چاہے کھیتا چلا جاتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی انگریزوں کے احکام کے اس طرح مطیع ہیں کہ ان کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اٹھاتے۔

(17)

189

فرما رہے تھے رجز طریق عمل پہ و عطا کفار ہند کے ہیں تجارت میں سخت کوش

مشرک ہیں وہ جو رکھتے ہیں مشرک سے لین دین ناپاک چیز ہوتی ہے کافر کے ہاتھ کی اک بارہ کش بھی وعظ کی محفل میں تھا مشرک کہنے لگا ستم ہے کہ ایسے قیود کی میں نے کہا کہ ”آپ کو مشکل نہیں کوئی

*

معنی: سخت گوش: سرگرم۔ حق نبوش: سننے کا حق۔

زیر تشریح اشعار میں جہاں ایک مخصوص صورت حال اور رویے کا ذکر کیا گیا ہے وہاں آخری شعر میں بات ایک انتہائی خوبصورت طنز پر ختم کی گئی ہے چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے واعظ کہہ رہا تھا کہ ہندوستان میں جو غیر مسلم تاجر ہیں وہ لین دین اور تجارت کے سلسلے میں بڑے سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ یہ جان لو۔ کہ وہ لوگ جو مشرک سے لین دین رکھتے ہیں وہ بھی مشرک ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی ہماری قوم عقل و ہوش سے محروم ہے۔ امر واقعہ ہے کہ کافر جس چیز کو چھو لے وہ ناپاک و نجس ہو کر رہ جاتی ہے چنانچہ اے مسلمانوں اگر تم میں خالق کا سامنا کرنے کی جرات ہے تو یہ بات کان کھول کر غور سے سن لو۔

اقبال کہتے ہیں کہ واعظ کی اس محفل میں ایک شرابی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس شرابی نے واعظ کی اس نامحمانہ تقریر کو سنا تو اسے یہ بات بڑی ناگوار گزری اس نے اٹھ کر میسافتہ کہا کہ حضرت آپ تو کھانے پینے کی اشیاء پر جس طرح پابندی عائد کر رہے ہیں یہ طرز فکر تو بڑی افسوسناک ہے۔ بھلا تجارت میں اس نوعیت کی پابندیاں جو آپ عائد کر رہے ہیں وہ کس طرح روا رکھی جاسکتی ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ میں نے اس شرابی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ گھبرائیے نہیں آپ کو اپنے خفل میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی کہ یہاں مسلمان شراب فروش بھی موجود ہیں۔

(18)

190

دیکھیے چلتی ہے مشرق کی تجارت کب تک شیشہ دیں کے عوض جام و سبو لیتا ہے ہے مداوائے جنوں نشتر تعلیم جدید میرا سرجن رگ ملت سے لو لیتا ہے

*

(19)

191

نہیں اک حال پہ دنیا میں کسی شے کو قرار
ستی ہوں آپ نے بھی توڑ کے رکھ دی ہے مدار
ریل چلنے سے مگر دشت عرب میں بیکار
تھی لگتے ہوئے اونٹوں پہ صدائے زنمار
نہ رہا آئندہ دل میں وہ دیرینہ غبار
ہے ترے چاہنے والوں میں ہمارا بھی شمار
ہم تو ہیں ایسی کلیوں کے پرانے بیار
بے زبانوں میں بھی پیدا ہے مذاق گفتار
گرچہ کچھ پاس نہیں چارہ بھی کھاتے ہیں ادھار
ایک ہی رنگتہ میں رنگیں ہوں تو ہے اپنا وقار
ہمزایا ہو کے رہیں کیوں نہ طیور گزار
تو بھی سرشار ہو، تیرے رفقا بھی سرشار
وانگہش مست و خراب از رہ بازار بیار

گائے اک روز ہوئی اونٹ سے یوں گرم سخن
میں تو بدنام ہوئی توڑ کے رسی اپنی
ہند میں آپ تو از روئے سیاست ہیں اہم
کل تک آپ کو تھا گائے کی محفل سے حذر
آج یہ کیا ہے کہ ہم پر ہے عنایت اتنی
جب یہ تقریر سنی اونٹ نے شرا کے کما
رنگ صد غزہ اشتر ہے تری ایک کلیل
ترے ہنگاموں کی تاثیر یہ پھیلی بن میں
ایک ہی بن میں ہے مدت سے بھرا اپنا
گوسفند و شتر و گا و پلنگ و خرنگ
باغبان ہو سبق آموز جو یک رنگی کا
دے دی جام ہمیں بھی کہ مناسب ہے یہی
”ولق حافظہ بچہ ارزد بہ میث رنگیں کن“

*

معنی: حذر: دور بھاگنا۔ صدائے زنمار: خدا کی پناہ کی آواز۔ گوسفند: بکری۔ پلنگ: چیتا۔ خرنگ: نظر
گردما۔

یہ نظم علامہ حافظ شیرازی کے ایک شعر پر تفسیر ہے۔ موضوع کے اعتبار سے تو اسے قدرے اہمیت
دی جاسکتی ہے کہ یہ انگریز کے عہد میں ہندو اور مسلمانوں کے باہمی روابط اور ان کے سیاسی نظریات کی
آئندہ دار ہے۔ اس نظم کو ایک تمثیل قرار دیا جاسکتا ہے جس کے کردار ہندو اور مسلمان ہیں۔ اقبال نے
علی الترتیب ان کرداروں کو گائے اور اونٹ کی علامتوں کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ تاہم تکنیکی سطح پر
یہ انتہائی کمزور نظم ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ اسے عرفانہ کام میں شامل کیا گیا ہے جب کہ اس میں نہ تو
عرفان ہے نہ ہی طنز موجود ہے۔ محض ہندو کو گائے اور مسلمان کو اونٹ کی علامت سے تعبیر کرنا تو عرفان
نہیں ہو سکتی۔ حتیٰ کہ یہ اصلاح کے زمرے میں بھی نہیں آتی۔ بے شک اقبال بہت بڑے شاعر اور نظم
نکار تھے لیکن محض اسی بناء پر تو اس نظم کو اہمیت نہیں دی جاسکتی کہ یہ اقبال کی نظم ہے۔ یہ امر بھی بڑی
حد تک حیرت کا سبب ہے کہ اقبال نے اسے اپنے مجموعے میں شریک کیے کر لیا جب کہ ان کی مسترد کی
ہوئی بہت سی نظمیں اور اشعار جو ”باتیات اقبال“ میں موجود ہیں اس نظم سے کہیں بہتر ہیں۔

تاہم چونکہ یہ نظم ”بانگ درا“ میں شامل ہے اس لیے ضرور اس کی تشریح بھی ناگزیر ہے۔ اقبال
کہتے ہیں کہ ایک روز گائے نے اونٹ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ حالات بے شک ہمیشہ ایک جیسے
نہیں رہتے میں تو اپنی رسی توڑ کر بدنام ہوئی تھی۔ اب سنا ہے کہ آپ بھی اپنی مدار تڑا بیٹھے ہیں۔
ہندوستان میں تو آج بھی اہمیت حاصل ہے لیکن صحرائے عرب میں ریل کا وجود ناکارہ ہے کل تک آپ
گائے کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتے تھے اور جسے مجھ کو اس ضمن میں آپ سے کچھ بات ہوئی ہرگز نہیں

ہرگز نہیں کی صدا آتی تھی لیکن آج یہ کیسا انقلاب آگیا کہ ہم پر یہ عنایت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کے دل میں ہمارے خلاف کسی قسم کا کینہ باقی نہیں رہا۔

اونٹ نے گائے کی یہ تقریر سنی تو قدرے شرما کر بولا! سچ تو یہ ہے کہ تیرے چاہنے والوں میں ہمیشہ ہمارا اشارہ رہا ہے اور جب تو مستان دار جلتی ہے تو ہم تیری ہر ہوا پر فدا ہونے کو تیار رہتے ہیں اور تو نے اب جو بنگائے برپائے ہیں تو جنگل کے دوسرے بے زبان جانوروں میں بھی شعور پیدا ہو گیا۔ ہم اور تو آخر ایک عرصے سے اس جنگل میں یکجا رہتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ ہم چارہ بھی اوحار کھاتے ہیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ جنگل کے تمام جانور ایک سے خیالات اختیار کر لیں تو ان کا وقار بحال ہو سکتا ہے۔ باغ کا مالک اگر سب کو باہمی اتحاد و یک رنگی کا درس دے تو باغ کے سارے پرندے محبت اور یکانگت کے لہجے میں گفتگو کرنے لگیں گے۔ سوائے گائے! بستر یہی ہے کہ باغ کا مالک ہونے کے ناطے ہمیں بھی کچھ دے تاکہ ہم بھی خوش رہیں اور ہمارے رفقاء بھی خوش رہیں۔

آخری شہر حافظ شیرازی کا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حافظ کی گدڑی کو جس قیمت پر بھی ہو رنگین کرو۔ اور اس انداز میں اسے شراب سے بدست کر کے بازار جاتے ہوئے پکڑ لاؤ۔

اقبال کی یہ تمثیل گائے (ہندو) اور اونٹ (مسلمان) دو کرداروں کے حوالے سے اس امر کی غماز ہے کہ ہندوستان میں مغلوں کے زوال اور انگریز کے تسلط کی بنا پر ہندوؤں نے انگریزوں سے خوشگوار تعلقات قائم کر لیے۔ دوسری طرف چونکہ انگریز کو بھی یہاں اپنی حمایت و رکار تھی اس لیے انہوں نے بھی مسلمانوں کے مقابلے پر ہندوؤں کی پذیرائی کی لیکن جب اول الذکر نے اقتدار کے خلاف تحریک چلائی تو مسلمانوں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لیے انگریز سے تعاون کیا۔ حتیٰ کہ تحریک خلافت کے سبب ان کا بھی انگریز سے شدید اختلاف ہو گیا۔

اس صورت حال میں بیشتر ہندو اور مسلمان رہنماؤں نے ہندوستان کی سیاسی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے اس فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کی کہ دونوں متحد ہو کر آزادی کے لیے انگریز کے خلاف تحریک چلائیں جب کہ ماضی کے تجربات کی روشنی میں بعض مسلم رہنماؤں کا مطالبہ تھا کہ ہندو چونکہ تعداد کے اعتبار سے اکثریت میں ہیں اس لیے اقلیت ہونے کے ناطے مسلمانوں کے حقوق کو تسلیم کریں۔ یہی داستان اس نظم کی لب لباب ہے۔

(20)

192

رات چمھرنے کہہ دیا مجھ سے ماجرا اپنی ناتما کا
بجھ کو دیتے ہیں ایک بوند لبو صلہ شب بھر کی تشنہ کامی کا
اور یہ بسوہ دار بے زمت پی گیا سب لبو اسامی کا

*

معنی: ناتما: ناکامی۔ بسوہ دار: یعنی زمیندار۔ اسامی: کاشت کار۔

اقبال کہتے ہیں کہ رات ایک چمھرنے مجھ سے کہا کہ میں تو انتہائی تنگ و دو کے بعد انسان کے جسم سے لبو کی ایک بوند حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہوں جب کہ زمیندار ہاتھ چڑھائے بغیر کاشتکار کا تمام

مال و متاع ہڑپ کر جاتا ہے۔ اس قطعہ میں جاگیرداری نظام پر کھری چوٹ کی گئی ہے کہ محنت کاشتکار کرتا ہے اور پیداوار سمیٹ کر جاگیردار لے جاتا ہے اور غریب کاشتکار ہاتھ مٹا رہ جاتا ہے۔

(21)

193

یہ آئیہ نوجیل سے نازل ہوئی مجھ پر گیتا میں ہے قرآن تو قرآن میں گیتا
کیا خوب ہوئی آشتی شیخ و برہمن اس جنگ میں آخر نہ یہ ہارا نہ وہ جیتا
مندر سے تو بیزار تھا پہلے ہی سے بدری مسجد سے نکلا نہیں ضدی ہے مسیتا

*

معنی: آشتی: صلح۔ شیخ و برہمن: مراد ہے مسلمان اور ہندو۔ بدری: یعنی ہندو۔ مسیتا: مراد ہے مسلمان۔
زیر تشریح قطعہ کا پس منظر ایک روایت کے مطابق یہ ہے کہ انگریز کے خلاف ترک موالات اور
تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد گاندھی کو زیر حراست رکھا گیا تو انہوں نے نیل سے اپنے اخبار ”نوجین“
کو ایک مضمون اشاعت کے لیے بھجوایا جس میں بنیادی بات یہ تھی کہ میں نے قرآن اور گیتا دونوں کا
سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا تو مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ دونوں کی تعلیمات میں یکسانیت ہے۔

اقبال نے جب یہ مضمون پڑھا تو طنزیہ انداز میں زیر تشریح قطعہ لکھا جس میں گاندھی کے اس نقطہ
نظر کا ذکر کرتے ہوئے کہ قرآن اور گیتا کی تعلیمات میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے
زیادہ محکمہ خیریات اور کیا ہو گی کہ اسلام اور ہندو مت کے مابین یکسانیت پیدا کی جا رہی ہے اور شیخ و
برہمن کو ایک ہی لاشی سے ہانکا جا رہا ہے کہ دونوں ہی ایک جیسے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندو تو اپنے عقائد
سے بہت عرصے قبل بیزار ہو چکا ہے جب کہ گاندھی مسلمانوں کو بھی اسی سطح پر لانا چاہتے ہیں کہ وہ بھی
اپنے مذہب سے لاتعلق ہو جائیں۔

(22)

194

جان جائے ہاتھ ہے جائے نہ ست ہے کی اک بات ہر مذہب کا ت
چنے بے ایک ہی تھیلی کے ہیں ساہو کاری، بسوہ داری، سلطنت

*

معنی: ست: بچ۔ ست: روت۔ بسوہ داری: زمینداری۔

اس قطعے میں کہا گیا ہے کہ صبح کردار کا انسان وہ ہے جو اس امر کا پوری طرح قائل ہو کہ بے شک
جان جاتی ہے تو چلی جائے لیکن صبح کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔ کہ سچائی ہی کائنات میں بنیادی
حقیقت کی حامل ہوتی ہے۔ یہی اصول دنیا کے ہر مذہب اور عقیدے کا سب سے اہم جزو ہے چنانچہ اس
حقیقت کا اظہار بلا تامل کیا جاسکتا ہے کہ ساہو کاری، جاگیرداری اور حکومت ایک ہی تھیلی کے چنے بے
ہیں۔ تیوں علی الترتیب مقروض، کاشتکار اور عوام کا خون چوستے ہیں۔

(23)

195

دیکھتے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خون
نہل آئیں سکتا "وَلَدَ كُنْتُمْ" تستعجلون
چشم مسلم دیکھ لے تفسیر حرف "ہنسلون"
رکھ کے میٹانے کے سارے قاعدے بالائے طاق
رنگ اک پل میں بدل جاتا ہے یہ نیلی رواق
حکم برداری کے معدے میں ہے ورد لایطاق
کیا یہ چورن ہے پے ہنم فلسطین و عراق؟

معت و سرمایہ دنیا میں صف آرا ہو گئے
حکمت و تدبیر سے یہ فتنہ آشوب خیز
کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام
شام کی سرحد سے رخصت ہے ورنہ لم یزل
یہ اگر سچ ہے تو ہے کس درجہ عبرت کا مقام
حضرت کرزن کو اب فکر مداوا ہے ضرور
دند ہندوستان سے کرتے ہیں سر آغا خاں طلب

*

معنی: صف آرا: صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ فتنہ آشوب خیز: طوفان پا کرنے والا فتنہ۔ یاجوج اور ماجوج: دو قوموں کے نام ہیں۔ ورد لایطاق: شدید درد۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اقبال ہر نوع کے سرمایہ دارانہ نظام کے مخالف تھے۔ اس حقیقت کے اظہار ان کے اشعار میں جا بجا ہوتا ہے چنانچہ زیر تشریح قطعہ میں بھی انہوں نے اسی حوالے سے ایک نکتہ اٹھاتے ہوئے کہا ہے کہ عصری صورتحال یہ ہے کہ محنت کش اور سرمایہ دار اب ساری دنیا میں ایک دوسرے کے مقابلے پر صف بستہ ہو گئے ہیں۔ بالفاظ دیگر سرمایہ دار اور اشتراکی ممالک ایک دوسرے کے خلاف صفیں باندھے کھڑے ہیں۔ اقبال قرآنی آیات کے حوالے سے یہ مفہوم پیدا کرتے ہیں کہ اس کا تو علم نہیں کہ ان دونوں طاقتوں کے مابین جو جنگ ہوگی اس میں کون جیتے گا اور کون ہارے گا البتہ یہ طے ہے کہ اس جنگ میں دونوں طاقتوں کی بہت سی تمناؤں کا خون ہو جائے گا۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے مسلمانوں یا دُرکھو کہ یہ طاقتیں خدا کے وعدوں پر شک کرتی ہیں ان پر خدا کا عذاب جلد ہی نازل ہونے والا ہے اور یہ دونوں نظام ایک دوسرے کو نیست و نابود کر کے رکھ دیں گے۔ قطعے کے ایک مصرع میں اقبال نے یاجوج ماجوج کا جو حوالہ دیا ہے تو ایک روایت کے مطابق زمانہ قدیم میں یاجوج ماجوج دو جنگجو قومیں ہوتی تھیں جو ہر لمحے تباہی پھانتی رہتی تھیں۔ حکم خداوندی کے پیش نظر ایک پیغمبر نے ان کے درمیان بلند دیوار تعمیر کر دی جس کو یہ لوگ دن بھر چانتے رہتے ہیں لیکن رات کو یہ دیوار پھر سے بلند ہو جاتی ہے تاہم روز قیامت کے نزدیک یہ قومیں دیوار کو چاٹ لیں گی اور پھر سے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو کر دنیا بھر کی تباہی کا سبب بن جائیں گی۔ ایک طرح سے اقبال نے سرمایہ دار اور اشتراکی ممالک کو یاجوج ماجوج سے تعبیر کیا ہے۔

یہ قطعہ ایک مخصوص سیاسی پس منظر کی روشنی میں خاصا اہم ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے دور میں ترکی ایک وسیع مملکت شمار ہوتی تھی۔ عرب بھی اس کے زیر نگیں تھے۔ انگریزوں نے ترکی کو کمزور کرنے کے لیے عرب ممالک کو اکسایا کہ وہ ترکی کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔ اس بغاوت کو انگریزوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ چنانچہ حجاز کی سلطنت شریف حسین کے حصے میں آئی۔ شام کی مملکت امیر فیصل کو تفویض ہوئی۔ امیر عبداللہ شرق اردن اور عراق امیر زید کے زیر تسلط آگیا۔ فلسطین کو انگریزوں نے اپنے زیر انتظام رکھا بلکہ عراق اور فلسطین کے لیے ایسا نظام حکومت طے کیا جسے سیاسی اصطلاح میں "منڈٹ" یا

حکم برداری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ عراق اور فلسطین کے حکمران دونوں انگریز کی زیر کفالت نظام حکومت چلائیں گے۔

مگر یہ تجویز پوری طرح سے کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس لیے کہ شام کے باشندوں نے امیر فیصل کی حکمرانی کو مسترد کر دیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہی جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا اور اس میں شرکت کے لیے فرانس کو شام سے اپنی افواج بلوانی پڑیں۔ یہ سلسلہ یوں تو جنگ عظیم کے بعد بھی جاری رہا لیکن اقبال نے زیر تشریح قطعہ شام سے فرانسیسی فوج کی واپسی کے پس منظر میں ہی لکھا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ۔

فرانسیسی عساکر جو ہمیشہ شراب میں بدمست رہا کرتے ہیں اب مجبور ہو کر شام کی سرحدوں سے واپس جا رہے ہیں۔ رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے پیانی کے وہ اطوار بھی نظر انداز کر دیئے ہیں جو مہازرت کے حوالے سے پیش آیا کرتے ہیں۔ سرکرف فرانسیسی افواج شام سے فرار ہو گئی ہیں۔ یہ بڑا عبرت انگیز مقام ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالات کس طرح تغیر پذیر ہوا کرتے ہیں۔ لارڈ کرزن جو ان ایام میں برطانیہ کا وزیر خارجہ تھا اور بعد میں ہندوستان کا وائسرائے بنا اسے عراق و فلسطین میں حکم برداری کا نظام ناکام ہوتا نظر آیا تو سر آغا خاں کے مشورے سے ہندوستان کے سرکردہ مسلمانوں کا ایک وفد انگلستان طلب کیا۔ اس ضمن میں اقبال استفسار کرتے ہیں کہ کیا یہ وفد اس لیے ترتیب دیا جا رہا ہے کہ اس کی وساطت سے انگریز عراق و فلسطین کو باسانی ہضم کریں۔ اس قطعے سے اقبال کی سیاسی بصیرت کا پتہ چتا ہے۔

(24)

196

تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز
کہتا تھا وہ 'کرے جو زراعت اسی کا کھیت
پوچھا زمیں سے میں نے کہ ہے کس کا مال تو
مالک ہے یا مزارع شوریدہ حال ہے
دونوں یہ کہہ رہے تھے مرا مال ہے زمیں
کہتا تھا یہ کہ عقل ٹھکانے تری نہیں
بولی مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقین
جو زیر آسماں ہے وہ دھرتی کا مال ہے

*

معنی: مزارع شوریدہ حال: بد حال کاشت کار۔

زمین کی ملکیت کے پس منظر میں اقبال نے ایک اہم اور دلچسپ نکتہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک روز مالک اور مزارع کے مابین یہ تکرار ہو رہی تھی کہ زمین کا مالک کون ہے؟ دونوں ہی اس امر کے وعیدار تھے کہ زمین اس کی ملکیت ہے مزارع کا کہنا تھا کہ جو بھی زمین پر کاشت کرے وہی شخص اس کا مالک بھی ہوتا ہے۔ مالک نے جواباً کہا کہ شاید تیری عقل ٹھکانے نہیں ہے۔ زمین پر چونکہ قبضہ میرا ہے اس لیے میں ہی اس کا مالک بھی ہوں۔

اقبال کہتے ہیں کہ مزارع اور مالک کی تکرار اور استدلال کو سن کر میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس ضمن میں زمین سے ہی پوچھ لیا جائے کہ آخر کار تو کس کی ملکیت ہے۔ زمین نے چند لمحے سوچ کر جواب میں کہا کہ اے اقبال! مجھے تو صرف اس امر پر یقین ہے کہ یہ مزارع و مالک کی تکرار قطعی بے معنی ہے۔ میں تو بس اسی قدر جانتی ہوں کہ نہ مزارع ہی میرا آقا ہے نہ ہی مالک کو میری ملکیت سے کچھ سروکار ہے۔ اس

کے برعکس حقیقت بس اسی قدر ہے کہ جو اس آسمان کے نیچے بود و باش رکھتا ہے۔ وہ میرا ہی مال ہے یعنی یہ کہ بالاخر ایسے ہر شخص کا مقدر موت ہے اور فنا ہونے کے بعد اسے یقیناً زیر زمین ہی دفنایا جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ کون کس کا مال ہے۔

197

(25)

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الکشن، ممبری، کونسل، صدارت بنائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

اس قطعہ میں اقبال انگریز کی لائی ہوئی تہذیب پر شدید طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تہذیب جدید تو گندے انڈوں کی مانند ہے۔ اور یہ گندے انڈے چونکہ استعمار نہیں کیے جاسکتے اس لیے ان کو باہر گلی میں پھینک کر ضائع کر دینا چاہیے۔ مراد یہ ہے کہ ہندوستان میں انگریز کی آمد کے ساتھ ساتھ ایک نئی تہذیب بھی آ گئی ہے اور ہمارے نوجوان اس تہذیب سے متاثر ہو رہے ہیں تو انہیں بتادینا چاہیے کہ یہ تہذیب کسی طور پر بھی ان کے لیے کارآمد ثابت نہیں ہو سکتی۔

انتخابات، ممبری، کونسل اور صدارت یہ سب اسی تہذیب کے پیدا کردہ ہیں۔ جن کو انگریز نے ہندوستانوں پر آزادی کے نام سے مسلط کیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ حقیقی آزادی نہیں بلکہ ان کے ذریعے آزادی کو دور تر لے جانے کا ذریعہ ہیں۔ دراصل یورپی استعمار نے آزادی کے نام پر جو عیاریاں مقامی رہنماؤں کو سکھائی ہیں کہ جب وہ ان کو بروئے کار لاتے ہیں تو خود ہی ان عیاریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

زیر تشریح قطعہ کے آخری شعر سے یہ مراد بھی لی جاسکتی ہے کہ یورپ میں نئی ایجادات کے حوالے سے جو مشینری یہاں ہندوستان میں بھیجی جاتی ہے مقامی ماہرین جب ان کو استعمال کرتے ہیں تو بات اس مشینری تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ وہ یورپی تہذیب کے اثرات بھی قبول کرتے نظر آتے ہیں۔

(26)

198

کارخانے کا ہے مالک مردک ناکارہ کار عیش کا پتلا ہے، محنت ہے اسے ناسازگار
حکم حق ہے لیس انسان الاماسعی کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

معنی: لیس للانسان الاماسعی انسان اسی چیز کا حقدار ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔ اقبال کا یہ قطعہ بھی ظرافت اور طنز دونوں سے یکسر عاری ہے۔ نہ جانے انہوں نے اسے اپنے ظریفانہ کلام میں کس لیے شریک کیا ہے جب کہ اس سے قطعی طور پر یہ عناصر غائب ہیں۔ بہر حال اس قطعے میں اقبال کہتے ہیں کہ کارخانے کا سرمایہ دار مالک ناکارہ اور عیاش ہے کہ مالک ہوتے ہوئے کوئی کام بھی

اپنے ہاتھ سے نہیں کرتا اور شب و روز چین کی بنسری بجاتا رہتا ہے جب کہ قرآن کریم کی رو سے خدائے پاک کا یہ حکم ہے کہ انسان اسی شے کا حقدار ہے جو اس نے ذاتی کوشش اور جدوجہد سے حاصل کی ہو اس حکم کے پیش نظر کارخانے دار جو مزدور کی محنت کا پھل ہڑپ کر جاتا ہے اس کا بھلا کیا جواز ہے؟ دراصل اس قطعہ میں اقبال نے اسلام اور قرآن کے نقطہ نظر سے محنت و سرمائے کے مسئلے کا جائزہ لیا ہے اور محنت کش کے حقوق کو واضح کیا ہے۔ اقبال نے بعض دوسری نظموں اور اشعار میں بھی اس موضوع پر بڑے واضح اور جرأت مندانہ انداز میں بات کی ہے۔

(27)

199

سنا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں
مگر سرکار نے کیا خوب کنسل ہال بنوایا
پرانے جھوپڑوں میں ہے ٹھکانا دستکاروں کا
کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

اقبال کہتے ہیں کہ میرے علم یہ بات آئی کہ کل کارخانے میں محنت کشوں کے مابین یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ہم لوگ تو خیر پرانے اور بوسیدہ جھوپڑوں میں رہائش پر مجبور ہیں اور وہیں کسی ایک جھوپڑے میں ضرورت کے دقت اکٹھے ہو کر اپنے برے بھلے مسائل پر گفتگو کر لیتے ہیں لیکن سرکار نے یہ بہت اچھا کیا کہ کنسل ہال تعمیر کروادیا۔ اس لیے کہ سرمایہ داروں کے پاس ہماری طرح مذاکرات کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

دراصل اقبال نے یہ طنز اس کنسل ہال کے تعمیر کے حوالے سے کیا ہے جو انگریزوں نے جمہوریت کا فریب دینے کے لیے ہندوستان میں تعمیر کرایا تھا تا کہ لوگ انتخابات میں کامیاب ہو کر جب وہاں پہنچیں تو دنیا پر یہ امر واضح کیا جاسکے کہ مقامی سطح پر عوامی نمائندے ملکی قومی مفادات کو زیر بحث لانے کے لیے یہاں جمع ہو سکتے ہیں۔ جب کہ اس نوع کے عوامی نمائندوں کی حیثیت محض خوشامدیوں کی تھی اور وہ انگریز حاکموں کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہہ سکتے تھے۔

(28)

200

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایمان کی حرارت والوں نے
کیا خوب امیر فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا
تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں، پر کیا لذت اس رونے میں
اقبال بڑا پدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
من اپنا پرانا پانی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا
تو نام و نسب کا حجازی ہے، پر دل کا حجازی بن نہ سکا
جب خون جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی نہ بنا

معنی: پدیشک: معلم، مباح

اس غزل کے چار اشعار میں سے تیسرے شعر کے علاوہ باقی اشعار میں طنزیہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ پہلا

شعر تقسیم سے قبل ایک خاص واقعہ کی نشاندہی کرتا ہے جس کے مطابق شاہ عالمی کے قریب دوسڑکوں کے قریب ایک قطعہ زمین پر مقامی مسلمانوں نے راتوں رات مسجد تعمیر کر دی تھی۔ یہ مسجد آج بھی اسی طرح موجود ہے بلکہ اس شعر کے سبب بھی اسے تاریخی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس پس منظر میں اقبال طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایمان کی حرارت رکھنے والوں نے راتوں رات مسجد تو تعمیر کر دی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارے دل تو پرانے گناہگار ہیں۔ برسا برس گزرنے کے باوجود نماز کے عادی نہ ہو سکے۔

بعض شارحین اور نقاد حضرات کا خیال ہے کہ پہلے مصرعے میں اقبال نے ان مسلمانوں کو خراج تحسین پیش کیا ہے جنہوں نے جوش ایمانی کی مدد سے متنازعہ علاقے میں مسجد تعمیر کرنے کا اہتمام کیا تھا۔ تاہم پورے شعر سے واضح طور پر بات سامنے آتی ہے کہ یہ وضاحت درست نہیں۔

اس شعر میں اقبال نے حبشہ کے حکمران سنوسی کے ایک پیغام کے حوالے سے بات کی ہے جو اس نے والی جاز امیر فیصل کو بھجوایا تھا اور وہ پیغام یہ تھا کہ تو محض نام و نسب کے اعتبار سے حجازی یعنی عرب ہے جب کہ تجھ میں قلبی سطح پر عربوں والی کوئی بات نہیں۔ اس کے برعکس تو تو فرنگیوں کا حاشیہ بردار بنا ہوا ہے۔ اس پیغام کا پس منظر یہ ہے کہ افریقی باشندہ ہوتے ہوئے بھی سنوسی نے ترک جرنیل انور پاشا کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جنگ میں حصہ لیا تھا۔ جب کہ فیصل اور دوسرے عرب حکمرانوں نے انگریزوں کی اعانت کی تھی چنانچہ یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ عربوں اور ترکوں کے باہمی آویزش کی بنا پر انگریز اور دوسرے یورپی ممالک نے بڑا فائدہ اٹھایا اور ادھر ترکی ہی نہیں بلکہ خود عرب حکومتیں بھی کمزور اور غیر مستحکم ہوتی گئیں۔

تیسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ اسلام کا نام سننے ہی ہماری آنکھیں تو آنسو بہانے لگتی ہیں لیکن اس نوعیت کے رونے میں آخر کیا لطف ہے۔ رونا تو وہ ہوتا ہے جب جگر کا خون بھی آنسوؤں میں شامل ہو اور ان کا رنگ پیاز کی مانند گلابی ہو جائے۔ جس سے یہ اندازہ بھی ہو سکے کہ رونے والے کے دل میں انتہائی خلوص شامل ہے۔ بصورت دیگر اسلام کے نام پر آنسو پکانے والے اور عملاً اسلام کے لیے کچھ نہ کرنے والے حقیقتاً اسلام کی کوئی خدمت نہیں کرتے۔

چوتھے اور آخری شعر میں کہا گیا ہے کہ وعظ و نصیحت کے سلسلے میں تو اقبال بے شک لا جواب ہے۔ وہ اتنے خوبصورت انداز میں نصیحت کرتا ہے کہ سننے والوں کے دل مٹھی میں لے لیتا ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ گفتار کا غازی تو بن گیا مگر اپنے ذاتی کردار کے حوالے سے بلند نہ ہو سکا۔ دراصل اس شعر میں اقبال نے نمیشلی سطح پر تو اپنا نام بنالیا ہے لیکن اس کا اشارہ مذہبی اور قومی رہنماؤں کی طرف ہے کہ محض باتیں ہی باتیں کرتے ہیں عملی سطح پر ان کا کردار منفی حیثیت کا حامل ہے۔ ان کی بے عملی نے ہی مسلمانوں کو بحیثیت قوم بے حد نقصان پہنچایا ہے لطافت اور لفاظی میں ان کا جواب نہیں لیکن عمل سے بے بہرہ ہیں۔



پیشکش: مجلس اقبال
نشر و توزیع: محمد اسلم باقر



بانگِ درا

شارح: اسرار زیدی

تشریح الفاظ: نثار اکبر آبادی

